انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	4000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	5000 روپے

مستقل سلسلے

جون 2011
جلد 34 شمارہ 3
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

جون کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

پاکستان کے موجودہ حالات پر نگاہ ڈالی جائے تو غیر متوازن معاشی پالیسیوں کی وجہ سے افراطِ زر، مہنگائی، لاقانونیت اور دہشت گردی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ نتیجتاً عوام میں اضطراب بڑھ رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران ملک کے داخلی اور خارجی امور پر واضح حکمت عملی اپنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ایک طرف پاکستان میں جاری دہشت گردی اور لاقانونیت کو ملک کے معاشی بحران کا اہم سبب گردانتے ہوئے فوجی ساز و سامان کے حصول کی مد میں بیرونی قرضہ جات لینے کی تگ و دو جاری ہے تو دوسری جانب عوام سے مختلف ٹیکسوں کے ذریعے رقوم حاصل کرنے کا کام زور و شور سے جاری ہے۔

عوام ایک طرف مہنگائی اور بے روزگاری کا شکار ہیں تو دوسری جانب توانائی کے بحران کی وجہ سے روزمرہ کی لوڈشیڈنگ کا شکار ہوتے ہوئے مہنگی بجلی خریدنے پر مجبور ہیں۔

وزیرِ خزانہ نے عندیہ دیا ہے کہ حکومت کوشش کر رہی ہے آئندہ مالی سال میں بجٹ کے خسارے کو کم کرنے کے لیے عالمی ادارے سے قرضہ لیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرض پر معیشت کب تک چلتی رہے گی۔

ہمارے اربابِ اقتدار کو چاہیے ملکی، سیاسی، معاشی مشکلات اور عالمی دباؤ سے نکلنے کے لیے مناسب اور پائیدار حل تلاش کریں۔ جمہوری اداروں کو مستحکم کریں۔ غیر جمہوری اور بیرونی طاقتوں کو حکومتی معاملات سے دور رکھیں تاکہ پاکستان ایک جمہوری قوت بن کر ابھر سکے۔

اس شمارے میں

- نیوز کاسٹر "فرید رئیس" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار نعمان اعجاز قارئین کی عدالت میں،
- "آواز کی دنیا" سے ایف ایم 101 کی پریزنٹر "فرحت علی گوہر" کی باتیں،
- "مجھ سے ملیے" شگفتہ بھٹی کی باتیں،
- "دستِ کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "دردِ دل" نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "اسیرِ موسمِ ہجراں" صنوبر یہ ساحر کا طویل مکمل ناول،
- "دل ربا" نفیسہ سعید کا مکمل ناول،
- "شہرِ طلب" سفینہ یاسمین کا مکمل ناول،
- "گوشۂ عافیت" شگفتہ بھٹی کے دلچسپ ناولٹ کی آخری قسط،
- "خوابِ سراب" مہر النساء کا ناولٹ،
- سلویٰ علی بٹ، بشریٰ احمد اور راتم طیفور کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت

کرن کتاب "فرحت بخش مشروبات" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت حاصل کیجیے۔

حمد باری تعالیٰ

حمد ربِ جلیل کیا کہیے
جو بھی کہیے وہ سب بجا کہیے

حمد کا حق ادا نہیں ہوتا
لفظ کتنے ہی خوشنما کہیے

وہ علیم و خبیر ہے تو پھر
حال کیسے نہ ماجرا کہیے

نعمتوں سے نوازنا اس کا
یاد آتا ہے بارہا کہیے

مالک و خالقِ حقیقی کو
دو جہانوں کا آسرا کہیے

اور کیا کیا تمہیں نہ بخشے گا
جس نے بخشا ہے مصطفیٰ ﷺ کہیے

ہم سے مسرور یہ کہاں ممکن
حرف اس کی صفات کا کہیے

مسرور کیفی

نعت رسولِ مقبول ﷺ

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

الطاف حسین حالی

فرید رئیس سے ملاقات

شاہین رشید

نیوز کاسٹر ایک ایسی شخصیت ہوتا ہے کہ جو ٹی وی اسکرین پہ آکر غلط بیانی سے بھی کام لے تو لوگ سچ ہی سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ اس کا اپنا ہی ایک مقام اور احترام ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک بہت ہی ذمہ داری کا کام ہے لیکن نیوز کاسٹر سے کہیں زیادہ ذمہ دار نیوز پروڈیوسر ہوتے ہیں جو نیوز کاسٹر کو خبریں فراہم کرتے ہیں۔ بس نیوز کاسٹر کا تو یہ کام ہے کہ خبریں اس انداز میں پڑھے کہ سب کچھ سچ معلوم ہو اور میرا خیال ہے کہ ہمارے سب ہی نیوز کاسٹر یہ کام بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

"فرید رئیس" نجی چینل سے خبریں پڑھتے ہیں آج ان سے کچھ باتیں آپ کی نذر کرتے ہیں۔

★ "کیسے ہیں؟"

✻ "میں الحمدللہ ٹھیک ٹھاک۔"

★ "شروع کریں ... انٹرویو؟"

✻ "ضرور ... لیکن کیا مجھے اتنی رعایت ہوگی کہ اگر میں کچھ سوالوں کے جواب نہ دینا چاہوں تو ..."

★ "بالکل ہوگی ... تو پہلے آپ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✻ "جی مجھے فرید رئیس کہتے ہیں تاریخ پیدائش بائیس اگست ہے اور جنم شہر کراچی ہے۔ اس لحاظ سے میرا ستارہ لیو ہے اور میں نے انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ماسٹرز کیا ہے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ پہلا نمبر میرا پھر میری بہن پھر بھائی اور پھر بہن یعنی ہم دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔"

★ "بیچلر ہیں؟"

✻ "جی ... اور جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا شادی ہو جائے گی۔"

★ "بے شک ... اس فیلڈ میں آمد کیسے ہوئی؟"

✻ "بالکل اتفاقیہ ... کبھی نہیں سوچا تھا اس فیلڈ میں آنے کا ... ہوا یہ کہ جس فیلڈ میں میں نے ماسٹر کیا اور ایک کمپنی میں جاب کی۔ لیکن جب اس فیلڈ میں کچھ کرائسس آیا، آپ کو پتا ہے کہ جب مارکیٹ ڈاؤن ہوتی ہے۔ تو کام کرنے والوں کو ان کی صلاحیتوں اور ضرورت کے مطابق تنخواہ نہیں ملتی۔ حالانکہ میں نے کافی کام بھی کیا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ دوسرا راستہ اختیار کروں اور اس جاب کو چھوڑ دوں اور جب مجھے پتا چلا کہ چینل لانچ ہو رہا ہے تو میں نے اپلائی کر دیا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ قسمت میں کیا لکھا ہے ... اور مجھے یہی امید تھی کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کیونکہ ریڈیو ہو یا ٹی وی یہاں تو سفارش ہی چلتی ہے اور میرے پاس تو کوئی سفارش نہیں تھی ... اپلائی کرنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد کال آگئی۔ اور اس کے بعد مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا اور پوچھا کہ کیا کیا ہے۔ میں نے اپنی فیلڈ بتائی تو کہنے لگے کہ ہمارا تو نیوز

چینل ہے اور ہمیں تو نیوز اینکرز اور نیوز کاسٹر چاہیے۔ میں نے کہا کہ میں نے اس فیلڈ میں کبھی کام ہی نہیں کیا۔ تو کہنے لگے کہ ہم آپ کو اس کی ٹریننگ دیں گے ... تو میں نے کہا کہ آپ مجھے سیلری ٹائم پر دیں گے۔ تو کہنے لگے ہاں آپ اس کی فکر نہ کریں۔

خیر پھر آڈیشن ہوا اور مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں آڈیشن میں پاس ہو جاؤں گا۔ آڈیشن کے دو ہفتوں کے بعد کال آگئی اور نیوز کاسٹر کے لیے انتخاب ہوا ٹریننگ ہوئی اور پھر آج میں جو ہوں اور آپ کے سامنے ہوں۔"

★ "کتنے سال ہو گئے اس چینل کے لیے کام کرتے ہوئے؟"

✻ "ماشاء اللہ پانچ سال ہو گئے ہیں اس چینل کے لیے کام کرتے ہوئے۔"

★ "ابتدا سے ہی لائیو نیوز پڑھ رہے ہیں یا ریکارڈنگ ہوتی تھی؟"

✻ "ابتدا تو ریکارڈنگ سے ہوئی۔ کیونکہ جب یہ چینل شروع ہوا تو اس وقت ریکارڈڈ نیوز دکھائی جاتی تھیں مطلب یہ تھا کہ ریکارڈنگ کے چند منٹوں کے بعد ہی اسے آن ایئر کر دیتے تھے۔"

★ "کوئی دلچسپ بات جو یاد ہو ... یا جس وقت لائیو گئے تو کیا کیفیت تھی؟"

✻ "جس دن یہ نیوز چینل آن ایئر ہوا اس وقت ٹی وی چینل بھی اپنی ٹیسٹ نشریات میں مختلف چیزیں دکھا رہا تھا اتفاقاً انہی دنوں اسٹاک مارکیٹ کریش ہوئی اور جس دن اسٹاک مارکیٹ کریش ہوئی اس صبح مجھے نیوز پڑھنے کے لیے آنا تھا اور اسی دن چینل "لائیو" کے سسٹم کو بھی ٹیسٹ کرنا تھا۔ لائیو میں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ تو جب میں آیا تو مجھے کہا گیا کہ آپ نے اس ایونٹ (اسٹاک مارکیٹ) کو کرنا ہے اور کچھ لوگوں سے بات بھی کرنی ہے اور یہ سب کچھ لائیو ہوگا۔ تو بس اس وقت جتنا حصہ اسکرین پہ نظر آ رہا تھا اس کو تو میں نے بہ مشکل قابو کیا۔ لیکن ٹانگیں بری

طرح کانپ رہی تھیں۔"

★ "اور اب کیا صورت حال ہوتی ہے؟"

✻ "اور اب صورت حال یہ ہے کہ مجھے ریکارڈڈ نیوز یا پروگرام میں کوئی مزا نہیں آتا بلکہ اب لائیو میں زیادہ مزا آتا ہے۔"

★ "پریکٹیکل لائف میں کب آئے؟"

✻ "پریکٹیکل لائف میں تو میں دوران تعلیم ہی آگیا تھا ... ٹیوشن بھی پڑھائی اور دیگر کام بھی کیے اپنی پاکٹ منی کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا تھا اور اب تو میں تقریباً" پانچ سال سے اس چینل سے وابستہ ہوں اور اللہ کا بڑا کرم ہے۔"

★ "آپ کے چینل نے دو نیوز کاسٹرز کے ساتھ خبریں پڑھنے کا سلسلہ اب شروع کیا ہے جبکہ دیگر چینلز تو کافی عرصے سے ایسا کر رہے ہیں؟"

✻ "نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ بہت شروع میں ہمارے دو ہی نیوز کاسٹرز ہوا کرتے تھے لیکن پھر جب ہمارا سسٹم تبدیل ہوا تو سنگل نیوز کاسٹر پر آگئے اور اب کچھ عرصے سے پھر دوبارہ پرانا سسٹم شروع کر دیا گیا ہے۔"

★ "آپ کس کے ساتھ نیوز پڑھتے وقت ایزی فیل کرتے ہیں؟"

٭ ”سب ہی اچھے ہیں۔ لیکن میرا تجربہ تو یہ ہے کہ جب میں تنہا خبریں پڑھ رہا ہوتا ہوں تو زیادہ ایزی فیل کرتا ہوں کیونکہ اس طرح دوسرے لوگوں سے بات کرتے ہیں اور باتوں کو ایکس پلین کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے اور جب دو ہوں تو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دونوں کو یکساں ٹائم ملے اور جس کے ساتھ اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو اس کے ساتھ خبریں پڑھنا زیادہ اچھا بھی لگتا ہے اور انسان ایزی فیل بھی کرتا ہے۔“

★ ”اس فیلڈ میں آپ اتفاقاً“ آگئے۔ بنیادی تعلیم انفارمیشن ٹیکنالوجی ہے۔ دوران تعلیم کیا سوچتے تھے کہ کیا بننا ہے؟“

٭ ”دوران تعلیم بہت سے شوق ہوتے ہیں جو انسان پورے کرنا چاہتا ہے۔ میری بھی خواہش تھی کہ میں فائٹر پائلٹ بنوں۔ لیکن میری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ شاید انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جو اس کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔“

★ ”تھکے ہوئے گھر آتے ہیں تو موڈ آف ہوتا ہے یا اچھا لگتا ہے؟“

٭ ”تھکن کے بعد گھر آکر بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی موڈ آف بھی ہو تو کم سے کم گھر والوں کے ساتھ اظہار نہیں کرتا..... اور میری کوشش ہوتی ہے کہ گھر میں اپنے امی، پاپا اور بہن بھائیوں کے ساتھ جو وقت گزاروں خوشگوار موڈ کے ساتھ گزاروں۔ کیونکہ مجھے یہ رشتے بہت پیارے ہیں۔“

★ ”گھر سے باہر آپ کا اٹھنا بیٹھنا زیادہ ہے۔ لوگوں سے ملنا جلنا بھی زیادہ ہے۔ لوگوں کو کس معاملے میں بے بس دیکھتے ہیں؟“

٭ ”مجھے تو بے چاری عوام ہر بات میں ہی بہت بے بس لگتی ہے۔ خواہ وہ مہنگائی کا معاملہ ہو، روزگار کا ہو یا سواری کا ہو اور مجھے ان لوگوں پر بہت ترس آتا ہے جو بسوں کی چھتوں پہ بیٹھ کر، دروازوں پر لٹک کر سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ یعنی اپنی سواری کا اتنا فقدان ہے کہ بسوں میں بھی لوگ پورے نہیں آ رہے ہوتے۔“

★ ”اور کچھ لوگوں کے پاس اتنا ہے کہ شاہانہ گاڑیوں میں بیٹھے ہوتے ہیں؟“

٭ ”بالکل اور یہی شاہانہ گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ قانون کو توڑتے ہیں۔ جہاں سگنل ہو ان کی بے صبری دیکھنے والی ہوتی ہے اور کئی بے صبرے لوگ تو سگنل توڑ کر آگے چلے جاتے ہیں مگر ان کو کوئی پکڑنے والا نہیں ہوتا۔“

★ ”ہمارے یہاں کام کا جو سسٹم ہے یا لوگوں کے جو رویے ہیں اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

٭ ”ہمارے یہاں کا سسٹم بہت تکلیف دہ ہے۔ آپ ایمان داری کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ آپ بہتری چاہتے ہیں لیکن جب دوسرے لوگ آپ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں تو بہت بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ بہت دکھ اور تکلیف ہوتی ہے اور اس وقت خیال آتا ہے کہ ہمارے پاس بھی کوئی سفارش ہوتی، ہمارا بھی کوئی بڑا ہوتا۔ آج کل کے حالات دیکھ کر دکھ ہی ہوتا ہے۔“

★ ”کیا آپ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ جو قسمت میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے! اور کیا قسمت ہاتھوں پہ لکھی ہوئی ہوتی ہے؟“

٭ ”مجھے یقین ہے کہ جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ ہی ملتا ہے اور میں اس بات پر قطعی یقین نہیں رکھتا کہ قسمت ہاتھ کی لکیروں میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ زندگی تو وہ انسان بھی گزار رہے ہیں جن کے ہاتھ نہیں ہوتے بلکہ وہ اسی لکھے ہوئے پہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں جو اوپر والا لکھ دیتا ہے۔“

★ ”کیا نیوز کاسٹر کا کام اسٹوڈیو آنا، خبریں پڑھنا اور واپس چلے جانا ہے؟“

٭ ”نہیں ایسا نہیں ہے پروفیشن کی یہ ڈیمانڈ ہے کہ مجھے ہر وقت حالات حاضرہ، گزرے ہوئے حالات اور دیگر معلومات سے باخبر رہنا چاہیے۔ اس لیے میں ہر وقت ریسرچ ورک کرتا رہتا ہوں اور جو کرنٹ ایشوز ہوتے ہیں ان سے باخبر رہنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔“

★ ”آپ کی کوئی عادت جو آپ کو دوسروں سے منفرد کرتی ہو؟“

٭ ”بالکل ہے ایک ایسی عادت جو شاید آپ بھی سن کر حیران ہوں کہ میں اپنے کمرے میں بیڈ نہیں رکھتا بلکہ زمین پہ گدا (Mattress) ڈال کر سوتا ہوں۔ مجھے بیڈ پہ سونا پسند نہیں۔“

★ ”ایسا کیوں؟“

٭ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ جب میرے دوست آئیں تو کوئی بیڈ پہ بیٹھا ہو اور کوئی گدے پہ بیٹھا ہو، یعنی کچھ اوپر کچھ نیچے اور کچھ کرسیوں پہ ہوں تو مجھے بہت عجیب سا فیل ہوتا ہے تو میں نے اپنا کمرہ جس طرح سیٹ کیا ہوا ہے اس میں ایک سائیڈ پہ میٹرس ہے۔ ایک سائیڈ پہ کشن ہیں۔ باقی جگہوں پہ سائیڈ ٹیبل ہیں اور کمرے میں ریک بنوایا ہوا ہے جہاں ممی پاپا کی تصاویر رکھی ہوئی ہیں۔ میری تصاویر ہیں۔ میری بہنوں اور بھائیوں کی تصاویر رکھی ہوئی ہیں اور چونکہ مجھے فائٹر پائلٹ بننے کا شوق تھا تو آپ کو میرے کمرے میں فائٹر ایئر کرافٹ کے ماڈلز بھی نظر آئیں گے۔“

★ ”یعنی مکمل طور پر ایک مشرقی انداز کا کمرہ ہے آپ کا؟“

٭ ”جی بالکل مجھے ایسا سیٹ اپ بہت متاثر کرتا ہے، اس لیے میں نے ایسا سیٹ رکھا ہوا ہے۔“

★ ”آپ کی فیلڈ وقت کی پابندی بہت مانگتی ہے..... آپ کرتے ہیں؟“

٭ ”بالکل ٹھیک کہا آپ نے..... واقعی ہماری فیلڈ میں وقت کی پابندی بہت ضروری ہے اور میں وقت کی پابندی کرتا ہوں اور وقت کی پابندی سے ہی آپ دوسروں کے آگے اپنی پہچان کروا سکتے ہیں۔“

★ ”فیلڈ نے آپ کو عام لوگوں سے مختلف کیا یا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے؟“

٭ ”تھوڑے سے الفاظ میں وضاحت کرنا مشکل ہے۔ لیکن لوگ میرے بارے میں کہتے ہیں کہ تم بہت مختلف ہو دیگر لوگوں کے مقابلے میں اور ایسا وہ دو تین ملاقاتوں کے بعد کہتے ہیں۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ میں کچھ مختلف ہوں۔“

★ ”نیوز کاسٹر اپنے ملک کے حالات سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ آپ کیا کہیں گے پاکستان کے حوالے سے؟“

٭ ”ہمارا ملک بہت اچھا ہے بہت زرخیز ہے۔ بہت خوب صورت ہے۔ جو پوٹینشل، جو طاقت اس کے پاس ہے کسی اور کے پاس نہیں ہے..... لیکن اس طاقت کو درست طریقے سے استعمال نہیں کیا جا رہا۔ یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں اور نیچرل ریسورس بہت ہیں۔ اگر ان سب کا استعمال درست طریقے سے کرنا شروع کر دیں تو ہمارا ملک دنیا کے بہترین ممالک میں سے ایک ہوگا۔“

★ ”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ..... اب کچھ ہلکے پھلکے سوال ہو جائیں لڑکیاں کب بری لگتی ہیں اور لڑکیوں کا آپ کو گھورنا کیسا لگتا ہے؟“

٭ ”جب بہت زیادہ بولنے پر آجائیں..... کوئی لڑکی یا لڑکیاں مجھے گھورتی ہیں تو گھورتی رہیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا میرا کیا بگڑ رہا ہے۔ (قہقہہ)“

★ ”کون سا محاورہ زیادہ استعمال کرتے ہیں؟“

٭ ”بھوک میں پکوڑے تلنا۔“

★ ”انٹرویو کا کوئی سوال جو برا لگتا ہو؟“

٭ ”کوئی جب پرسنل ہونے کی کوشش کرتا ہے یا پرسنل سوال کرتا ہے تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ ہماری فیلڈ کے بارے میں بات کریں یا کوئی ہلکے پھلکے سوال کریں لیکن پرسنل نہ ہوں۔“

★ ”نیند جلدی آجاتی ہے؟“

٭ ”ہاں..... مجھے تو جلدی آجاتی ہے..... شاید تھکن ہوتی ہے..... لیکن اگر تھکن نہ بھی ہو تو اپنے بستر پر اتنا سکون ملتا ہے کہ فوراً نیند آجاتی ہے۔“

★ ”زندگی انجوائے کرتے ہیں اور چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟“

٭ ”زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بہت بڑی نعمت ہے۔ بہت انجوائے کرتا ہوں اور جب خوشحالی ہو تو پھر زندگی اور بھی حسین لگنے لگتی ہے اور چھٹی کا دن اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا مجھے اچھا لگتا ہے۔“

نعمان اعجاز

نازیہ کنول نازی

قارئین اس ماہ آپ بہنوں کی فرمائش پر آپ کے پسندیدہ اداکار "نعمان اعجاز" کو اس سلسلہ میں دعوت دی جارہی ہے اگلے دو ماہ کے لیے "میکال ذوالفقار اور ماریہ واسطی" ہمارے مہمان ہوں گے اپنے سوالات جلد از جلد ہمیں ارسال فرمادیں تاکہ وہ سلسلہ میں شامل ہوسکیں۔

★ "السلام علیکم نعمان اعجاز صاحب، کیسے ہیں آپ؟"

✻ "میں جی الحمدللہ ٹھیک ہوں آپ کی دعائیں ہیں آپ سنائیں۔"

★ "ہم بھی ٹھیک ہیں الحمدللہ، ہماری بہت سی قارئین نے اس سلسلہ میں آپ کی شرکت کی فرمائش کی تھی اسی لیے آپ کو زحمت دینی پڑی۔"

✻ "جی بہت شکریہ۔ آپ پوچھیں کیا پوچھنا ہے۔"

بہت سے سوالات ہیں آپ سے یہ پہلا سوال ڈاکٹر روبینہ اکمل کا ہے ٹاؤن شپ لاہور سے۔

★ "اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے کہاں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟"

✻ "میں جی 14 فروری کو لاہور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم بھی لاہور میں ہی حاصل کی۔ پھر ایڈیشنل پبلک اسکول چلا گیا۔ پھر ایف سی کالج چلا گیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی سے لاء کیا۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔"

دوسرا سوال ہے ان کا آپ سے کہ۔

★ "ٹیلی ویژن کی طرف آنے کا اتفاق کیسے ہوا؟"

✻ "ٹیلی ویژن میں مجھے خبریں پڑھنے کا شوق تھا۔ لیکن جب میں خبریں پڑھنے کے لیے آڈیشن دینے گیا تو انہوں نے مجھے کہا کہ آپ ایکٹنگ کیجیے تو پھر انہوں نے مجھے نیوز کاسٹر کے بجائے بطور اداکار لے لیا۔"

سلمٰی بیگ سرفراز ٹاؤن ہارون آباد سے پوچھتی ہیں۔

★ "آپ میرے آئیڈیل ہیں مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ آپ ٹیلی وژن اسکرین پر اپنے کرداروں میں جیسے نظر آتے ہیں کیا حقیقت میں بھی ویسے ہی ہیں یا اس سے مختلف ہیں؟"

✻ "زمین آسمان کا فرق ہے جی، اب پتا نہیں وہ کس کریکٹر کی بات کررہی ہیں یہ کلیئر نہیں ہے اگر "میرا سائیں" یا "ہائے میں مرگئی شوکت علی" کی بات کررہی ہیں تو میں اس سے تو سو فیصد مختلف ہوں۔"

ہارون آباد سے مشحون علی کا سوال ہے۔

★ "میں آپ کا ہر ڈرامہ بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ آپ کا ڈرامہ "ہائے میں مرگئی شوکت علی" میرا موسٹ فیورٹ ہے۔ اس میں آپ کا جو گیٹ اپ ہے وہ ہمیں بہت پسند ہے آپ اسی گیٹ اپ میں ہر بار کیوں نہیں آتے؟"

✻ "دیکھیں جی اس طرح تو انفرادیت ختم ہوجائے گی ہر کردار کا اپنا رنگ ہوتا ہے، اگر سب میں ایک ہی طرح کا آؤں گا تو آپ لوگ بہت جلد بور ہوجائیں گے۔"

دوسرا سوال ہے ان کا کہ۔

★ "تقریباً" ہر ڈرامے میں جیسے "میرا سائیں ہائے میں مرگئی شوکت علی" وغیرہ میں اتنی ڈھیر ساری شادیاں کیوں کرتے ہیں؟"

✻ ہنستے ہوئے "بھئی یہ سوال تو آپ میرے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز سے پوچھیں ان کے خیال میں میں واحد آدمی ہوں جو ڈھیر ساری بیویوں کو ایک ساتھ ہینڈل کرسکتا ہوں، جتنے بھی مشکل کردار ہیں اللہ کی کرم نوازی سے وہ میری جھولی میں آجاتے ہیں۔ میرے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز سمجھتے ہیں کہ شاید میں وہ بہت بہتر Deliverd کرسکتا ہوں جو وہ دکھانا چاہتے ہیں۔"

عنبرین مشتاق اسلام آباد سے سوال کرتی ہیں۔

★ "اگر شوبز میں شادی کروانے کا موقع ملتا تو کس کے ساتھ اپنی جوڑی بناتے؟"

✻ "یہ ایک بڑا مشکل سوال ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ جب آپ ڈبل روٹی بنتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں نا تو پھر آپ کا وہ ڈبل روٹی کھانے کو دل نہیں کرتا (ہنستے ہوئے) شوبز میں ویسے تو سب ہی اچھی ہیں مگر مجھے ایسی کوئی لگی نہیں جو گھر کی Requeirments کو اچھی طرح سمجھ سکے اور پورا کرسکے اس لیے شوبز میں شادی نہیں کی۔ اگر لگی ہوتی تو شاید میں نے شوبز میں شادی کرلی ہوتی۔"

وہاڑی سے صائمہ آصف پوچھتی ہیں۔

★ "کیا آپ نے بچپن میں سوچا تھا۔ کہ بڑے ہوکر اداکار بنیں گے؟"

✻ "نہیں جی، بچپن میں تو سچی بات ہے یہی سوچا تھا کہ ڈاکٹر بنوں گا۔ میرا بچپن جس زمانے کا تھا اس میں یہی دو رواج تھے کہ ڈاکٹر بنیں گے یا انجینئر..... ماں باپ بھی یہی چاہتے تھے مگر..... یہ اللہ کے فیصلے ہوتے ہیں کہ کس کو کیا بننا ہے؟ انسان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے وہ جتنی چاہے ڈینگیں مارے، اللہ ہی سبب بناتا ہے، انسان تو سوچتا کچھ اور ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔ بہت کم خوش قسمت لوگ ہیں جو جیسا سوچتے ہیں ویسا ہو جاتا ہے۔ میں تو ان خوش نصیب لوگوں میں سے نہیں ہوں۔"

ثروت رشید گل ڈگری سے سوال کرتی ہیں
★ "آپ کی وجاہت و چارمنگ پرسنالٹی کا راز کیا ہے۔"
* "ایک کریم ہے جس کا نام ہے "وضو کریم" اور میں الحمدللہ جتنی دیر اسکرین پر رہتا ہوں باوضو رہتا ہوں اور سب دوستوں کو بھی یہی کہتا ہوں کہ کام چاہے جتنا اچھا برا ہو یا نہ ہو آپ باوضو ضرور رہیں اور یہی میری کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔"
حاصل پور سے شازیہ الطاف ایڈووکیٹ پوچھتی ہیں
★ "ہم آپ کی فیملی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں کہ کون کون لوگ ہیں؟"
* "میرے والدین تو حیات نہیں ہیں۔ ایک بڑا بھائی ہے جو امریکہ میں سیٹل ہے ایک چھوٹی بہن ہے جو لاہور میں ہی ہوتی ہے۔ ایک عدد بیوی ہے جو کہ دنیا کی سب سے زیادہ خوب صورت اور مکمل ترین عورت ہے الحمدللہ جو سب بھی مجھے مل رہا ہے اسی کے نصیب کا مل رہا ہے وہ کہتے ہیں نا کہ رزق عورت کے نصیب کا اور اولاد مرد کے نصیب کی میرا ایسا ہے کہ میں بیٹی کی نعمت سے محروم ہوں میرے ماشاءاللہ تین بیٹے ہیں اور بہت اچھے ہیں۔"
عائشہ ملک کاوہاڑی سے آپ کے لیے سوال ہے۔
★ "ٹی وی پر پہلا ڈرامہ کون سا تھا اور وہ کیسا رہا؟"
* "پہلا ڈرامہ نصرت ٹھاکر صاحب کی ایک سیریز چلا کرتی تھی "دن" کے نام سے اس میں پہلا رول استاد اور شاگرد کا تھا اور ایک لائن تھی جو مجھے بولنی تھی کہ "یہ رکھ لو" ثمینہ پیرزادہ اس میں ہیروئن تھیں اور مجھے پہلی بار چانس ملا تھا اس میں۔ آج میں سوچتا ہوں کہ وہ جملہ "یہ رکھ لو" اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لیے تھا کہ یہ رکھ لو تمہیں اسی فیلڈ سے رزق ملنا ہے۔"
ثمرہ شوکت اسلام آباد سے سوال کرتی ہیں۔
★ "جواد احمد کی انٹرنیشنل فلم "ورثہ" میں کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا اور اس فلم کے حوالے سے کیا آپ کی خواہشات پوری ہوئیں کہ نہیں؟"
* "دیکھیں جواد احمد بالکل میرے بھائیوں کی طرح ہیں۔ میں تو سچی بات ہے فلم کرتا ہی نہیں ہوں۔ لیکن انہوں نے جس چاہت، محبت اور اپنائیت سے کہا کہ آپ کو کرنا ہے تو میں نے کر دیا باقی "ورثہ" کے حوالے سے پہلے یا بعد میں میری کوئی خواہش تھی ہی نہیں، اس سے پہلے "رام چند" ایک انٹرنیشنل مووی تھی، ہاں انٹرنیشنل سطح پر کام کرنے کی خواہش تو شاید ہر ایکٹر کی ہوتی ہے، لیکن میں نے ایسا کوئی تیر نہیں چلایا اس فلم میں کہ اس سے میری کوئی خواہش پوری ہوئی ہو۔"
رفعت انعم لاہور سے پوچھتی ہیں۔
★ "اب تک کتنے ٹی وی ڈرامے کر چکے ہیں اور سب سے زیادہ کس کردار کو انجوائے کیا؟"
* "میں تو ہر کردار کو ایمان داری سے کرتا ہوں، مجھے محبت ہے اپنے کام سے، جنون اور عشق نہیں ہے۔ جنون اور عشق میں انسان غلطیاں کرتا ہے۔ لہٰذا میں اپنے ہر کردار کو انجوائے کر رہا ہوتا ہوں۔ اپنے سارے کردار ہی مجھے تو اچھے لگتے ہیں باقی میرے ناظرین کو پتا ہوگا۔"
ساہیوال سے سمیرا کنول پوچھتی ہیں۔
★ "میرا سائیں" کی بے پناہ مقبولیت کے بعد سنا ہے اس کا دوسرا حصہ بھی بن رہا ہے کتنی سچائی ہے اس بات میں؟"
* "جی بالکل سو فیصد سچائی ہے۔ اس کی جو ون لائن کہانی ہے وہ میں نے اور بابر جاوید صاحب نے بیٹھ کر سوچی اور اس کی مقبولیت دیکھتے ہوئے "میرا سائیں" پارٹ ون ختم ہونے کے بعد پانچ یا چھ ماہ کے وقفے کے بعد ہم اس کو دوبارہ شروع کریں گے۔"
زینب فاروق صاحبہ کا کراچی سے سوال ہے۔
★ "ایک لمبے عرصے کے بعد بابر جاوید جیسے ڈائریکٹر کے ساتھ کام کرنا کیسا لگا؟"
* "بابر کے ساتھ میں نے جتنے بھی پروجیکٹ کیے ہیں وہ ان کے کریڈٹ میں سب سے بڑے ہیں۔

"من و سلویٰ" پھر "جھمکا" اس کے بعد "خاموشیاں" سب سپرہٹ رہے اب "میرا سائیں" کیا وہ بھی سپرہٹ گیا تو ان کے اور میرے ستارے ملتے ہیں۔ میرے لیے تو چھوٹے بھائی کی طرح ہیں بہت ادب و احترام کرتے ہیں میں کچھ بھی کہہ دیتا ہوں کہ یہ صحیح ہے وہ غلط ہے وہ سنتے اور مانتے ہیں آپ دیکھیں ہمیشہ اسی درخت کو پھل لگتا ہے جو جھکتا ہے۔"
انہی کا آپ سے دوسرا سوال ہے کہ۔
★ "کیا آپ کو امید تھی کہ "میرا سائیں" مقبولیت کی انتہاؤں کو چھوئے گا؟"
* "مجھے امید تو نہیں تھی مگر کوئی بھی کام اگر آپ ایمانداری سے کریں تو ضرور پھر کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے، اس سے پہلے بھی میرے جو ڈرامے تھے "ہائے میں مر گئی شوکت علی" پھر "یہ زندگی" تھا بہت سے تھے تو یہ سب اللہ کا کام ہے کہ کسے کتنا عروج دیتا ہے، یہ میرے اختیار کا کام نہیں ہے ساری کاسٹ نے بہت محنت سے کام کیا اور اپنے اپنے کردار کے ساتھ خوب انصاف سے کام کیا، یہ ان کی محبت ہے کہ جیسا کہتا ہوں کر لیتے ہیں۔"
نعمان صاحب فیصل آباد سے ناہید علی صاحبہ بہت مزے کا سوال کر رہی ہیں۔
★ "آپ کی مونچھیں ہمیں بہت پسند ہیں آپ نے مونچھیں کیوں ختم کر دیں؟"
* ہنستے ہوئے "دیکھیں مونچھیں جو ہیں وہ آپ کی عمر کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہیں۔ میں نے کوئی 14/15 سال مونچھیں رکھی ہیں اب مسئلہ ہم پاکستانیوں کے ساتھ یہ ہے کہ ہم ایک ہی وقت میں کئی کئی کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں تو اب روز مونچھ کا ڈیزائن تو نہیں بدلا جا سکتا نا؟ آپ سمجھ رہی ہیں نا میری بات؟"
★ "جی میں سمجھ رہی ہوں لیکن آپ کے ناظرین کا کیا کریں جو آپ کو مونچھوں میں پسند کرتے ہیں؟"
* "ہا، ہا، اچھا چلیں ٹھیک ہے آگے وقت نے موقع دیا تو دوبارہ رکھ لوں گا۔"
فیصل آباد سے آپ کی بہت بڑی فین ہیں نگاہ علوی پوچھتی ہیں۔
★ "پہلے آپ بہت جلالی قسم کے کردار کرتے تھے مگر اب ہر ڈرامے میں بہت نرم خو بہت پرنور سے دکھائی دیتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟"
* "دیکھیں میں پھر وہی بات کروں گا کہ جب میں سیٹ پر جاتا ہوں تو جو وقت میرا کیمرے کے سامنے گزرتا ہے وہ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے کیا کیا ہے۔ میں جب باوضو ہوتا ہوں تو اللہ ہی کچھ کروا جاتا ہے مجھ سے، مجھے تو پتا نہیں چلتا اور میں آپ کو بتاؤں جو لوگ اندر سے صاف ہوتے ہیں اللہ ان سے کچھ خاص کروا جاتا ہے۔"
کراچی سے نجم انجم پوچھتی ہیں۔
★ "آپ کو ٹیلی ویژن پر کام کرتے ہوئے طویل عرصہ ہو گیا۔ اس طویل دورانیے میں کسی ساتھی فنکار سے کچھ سیکھنے کو ملا؟"
* "جی بالکل میرے بہت سے سینئر ہیں جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان میں قوی خان ہیں

جن سے میں نے سیکھا کہ چہرے کے مسلز کیسے گرائے ہیں۔ طلعت خان صاحب ہیں ان سے میں نے سیکھا کہ بالز جب دیتے ہیں تو اسے کیسے کھیلتے ہیں۔ فردوس جمال صاحب نے مجھے فٹ بال سکھایا' باڈی لینگویج سکھائی' شفیق صاحب نے مجھے آواز کا اتار چڑھاؤ سکھایا' مسعود اختر صاحب سے میں نے آنکھ کا اتار چڑھاؤ سیکھا کہ آنکھ بولتی کیسے ہے؟ عابد علی صاحب سے میں نے کریکٹر کی انوالمنٹ سیکھی خیام سرحدی صاحب سے میں نے سیکھا کہ کردار کے دوران اچانک غیر متوقع کام کیسے کرتے ہیں۔"

کوٹ رادھا کشن سے بہن حمیرا عرفان کا سوال ہے۔

★ "کھانے میں کیا کیا چیز شوق سے کھاتے ہیں؟"

✳ "سب کچھ' الحمدللہ' میں آپ کو مزے کی بات بتاؤں' ہماری والدہ نے کبھی یہ عادت نہیں ڈالی کہ ہم نے یہ کھانا ہے یہ نہیں کھانا' اس لیے کبھی نخرہ کیا ہی نہیں' میرے بچے آج جب مجھے یہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ کھانا ہے یہ نہیں کھانا تو میرا دل کرتا ہے۔ میں ان کے سر پھاڑ دوں۔"

★ ہنستے ہوئے "اس کا مطلب ہے، گھریلو زندگی میں بھی آپ کا کردار بہت سخت قسم کا ہے؟"

✳ "نہیں ایسا نہیں ہے۔ دیکھیں سب اللہ کی نعمتیں ہیں سب کی قدر کرنی چاہیے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو میری بیگم نہیں کھاتیں' لہٰذا وہ گھر میں نہیں بناتیں' مگر میں جب کسی دوست کی طرف جاتا ہوں تو وہاں وہ چیزیں اگر بنی ہوں تو کھا لیتا ہوں۔ یعنی اروی گوشت' کریلے وغیرہ۔ نخرہ نامی چیز میرے اندر ہے ہی نہیں۔"

نور فاطمہ گلزار کا بہاول نگر سے سوال ہے کہ۔

★ "فرصت کے لمحات میسر ہوں تو کیا کرتے ہیں ان لمحات کو کیسے گزارتے ہیں؟"

✳ "فرصت کے اوقات میں سوائے اپنی بیگم اور بچوں کے میں کسی سے نہیں ملتا۔ ہاں ایک دو دوست ہیں بچپن کے تو ان کے ساتھ اچھا وقت گزر جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اگر کوئی مجھے ملنا چاہے یا ڈھونڈنا چاہے تو میں نہیں ملوں گا۔"

چنیوٹ سے ذکیہ ابراہیم پوچھتی ہیں۔

★ "ورثہ کو کرنے کا خیال کیسے آیا؟"

✳ "یہ خیال یوں آیا کہ جواد احمد میرے لیے بالکل بھائیوں کی طرح ہے۔ میں تو فلم کرتا نہیں ہوں' سچی بات ہے لیکن انہوں نے جس اپنائیت' محبت اور چاہت سے کہا کہ آپ کو کرنا ہے تو میں نے کر دیا اور جن کے ساتھ بھی میں نے کام کیا وہ لوگ ہم پاکستانیوں سے زیادہ اپنے کام کے حوالے سے ایماندار ہیں تو اچھا لگا مجھے "ورثہ" میں ان لوگوں کے ساتھ کام کرنا کہ اتنی عزت دی دوسرا وہ لوگ ہر کام میں مذہب کو بہت اہمیت دیتے ہیں جو کہ ہم نہیں کرتے۔ یہ بات ان کی مجھے بہت اچھی لگی ہے۔"

دبئی سے اقصیٰ کائنات اور مری سے ماہین ندا کا مشترکہ سوال ہے کہ۔

★ "کوئی آپ کو پیار سے تحفہ دینا چاہے تو کیا لینا پسند کریں گے؟"

✳ کھلکھلاتے ہوئے "محبت کی دعائیں۔ خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں بول رہا' بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ کسی قسم کی بناوٹی گفتگو نہیں کر رہا آپ سے۔ اکثر آپ دیکھیں کہ میں اپنے کولیگز کو ڈانٹ رہا ہوتا ہوں جب وہ مصروف ہوں اور اچھی طرح کسی سے بات نہ کریں تو میں کہتا ہوں اللہ سے ڈرو۔ جب وہ ناراض ہوتا ہے تو انسان کہیں نظر نہیں آتا' آپ کی گفتگو سب عیاں کر دیتی ہے کہ آپ کتنے پانی میں ہیں آپ کی کیا اوقات ہے۔"

سمندری سے ہماری ایک بہن ابابیل سوال کرتی ہیں۔

★ "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" ایک یادگار ناول کے سدابہار کردار عالم شاہ کے لیے آپ ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا؟"

✳ "یہ سوال تو میرا خیال ہے آپ کو میرے پروڈیوسر صاحب سے کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ میرے ساتھ یہ ہے کہ سب سے مشکل اور پیچیدہ کردار میری جھولی میں آتے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں بھائی پہلے آپ کسی اور سے بات کر لیں' جب کوئی نہیں کر سکتا' پھر میں وہ کرتا ہوں تو اس ناول کے لیے بھی میرے پروڈیوسر کو لگا شاید میں یہ بہتر کر سکتا ہوں۔ تو اس کے جو ڈائریکٹر ہیں ندیم صدیقی جیسے جیسے وہ مجھے کہتے گئے میں کرتا گیا۔ مگر میں آپ کو ایمانداری سے بتاؤں مجھے اس کریکٹر کی خاص سمجھ نہیں لگی۔"

★ "کیوں؟ میرا مطلب ہے عالم شاہ کا کردار تو بہت جاندار کردار ہے؟"

✳ "ہوگا' مگر مجھے اس میں بہت تضاد نظر آیا ہے۔ سچی بات کہوں اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے عالم شاہ کوئی عورت لگا ہے۔ آپ نے پڑھا ہے یہ ناول؟"

★ "جی میں نے بہت بار پڑھا ہے۔ آپ بھی اسکرپٹ کے ساتھ ناول ضرور پڑھیے گا تاکہ صحیح طور سے اس کردار کو سمجھ سکیں؟"

✳ "ہاں میں پڑھوں گا' میں نے جب اسکرپٹ پڑھا تو اس کردار میں کافی تضاد نظر آیا' دیکھیں ہر وقت ایک عام سی لڑکی کو اپنی محبت کا یقین دلاتے رہنا' اور پھر یہ کہنا کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں مطلب خود سے ہی طے کر لینا' یہ کیا ہے؟ اور پھر جب وہ اسے پا لیتا ہے تو اسے ماضی کے طعنے دینا شروع کر دیتا ہے۔ یہ تو دودھ میں 'مینگنیاں ڈالنے والی بات ہوئی نا' آپ ماضی کے طعنے بیوی کو نہیں دے سکتے۔"

جی بالکل صحیح ہم ان شاء اللہ اس پر بات کرتے ہیں پہلے یہ ایک بہن ہیں سیال موڑ سے منزہ سعید ان کے سوال کا جواب دے دیجیے پوچھتی ہیں۔

★ "زندگی کے کچھ ایسے یادگار پل' جنہیں آپ کبھی فراموش نہ کر سکیں؟"

✳ "ہاں.... ایک سال پہلے مجھے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ میں ہسپتال پہنچا اور جب وہ ڈاکٹر سب آپریٹ کر رہے تھے' مطلب آکسیجن لگا رہے تھے تو ایک لمحے کے لیے میں نے اپنی بیگم کو دیکھا جو اس وقت ایک عجیب سچویشن میں تھیں' میں نے اس عورت کو اس سے پہلے کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا تو اس وقت میں نے غصے میں آ کر وہ ساری مشینیں وہ سب اتار دیا کہ میں اس کو پریشان نہیں دیکھ سکتا' مجھے چھوڑ دیں' میں ٹھیک ہوں۔ دوسرا پل وہ تھا جب میری والدہ فوت ہوئیں اور والد کی جو آخری چند گھڑیاں تھیں وہ شاید میں کبھی نہ بھول پاؤں' پھر بچوں کی ولادت' جب ڈاکٹر نے لیبر روم میں پہلا بچہ مجھے لا کر تھمایا یہ ایسے لمحات ہیں جو شاید میں کبھی نہ بھول پاؤں۔"

کوٹ رادھا کشن سے لبنیٰ نذیر چوہدری نے خصوصی سوال بھجوایا ہے آپ کے لیے کہ۔

★ "اگر آپ سے پوچھا جائے آپ کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تو کیا کہیں گے جواب میں؟"

✳ "جی میں نے تین آئل فیکٹریز لگائی ہیں (تین بیٹے) اور ان کو یہی نصیحت کی ہے کہ سب سے ادب سے ملو' کسی کے گھر جاؤ تو پہلے چوکیدار سے ملو' وہ گھر کا رکھوالا ہوتا ہے اور الحمدللہ میرے بچوں کو انسانوں کی پہچان ہے۔"

نعمان صاحب آج کا یہ آخری سوال جو ہمیں بہاول پور سے موصول ہوا ایمن صادق کا یہ آپ سے پوچھتی ہیں۔

★ "کن ساتھی فنکاروں کے ساتھ کام کرنا ہمیشہ اچھا لگتا ہے؟"

✳ "میں تو سب سے محبت کرتا ہوں اپنے سینئرز سے بھی اور جونیئرز سے بھی' میرے کچھ کولیگ ہیں جو مجھ سے حسد کرتے ہیں اور کچھ جونیئرز بہت ادب و احترام بھی کرتے ہیں' بات بھی مانتے ہیں تو میرا سب کے ساتھ بہت پیار و محبت کا تعلق ہے۔"

اللہ کرے یہ تعلق یونہی بنا رہے اور آپ جتنے عظیم فنکار ہیں ہم نے آپ کو اتنا ہی سادہ اور عظیم انسان بھی پایا ہے۔ بہت شکریہ نعمان صاحب اس گفتگو کے لیے اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نعمان اعجاز سے اجازت چاہی۔

✡ ✡

شہروز سبزواری

شاہین رشید

1 "وہ نام جن کے لیے آپ کی خواہش ہو کہ یہ میرے ہوتے؟"

★ "میرا اپنا نام اتنا یونیک ہے کہ میں سوچتا ہوں کہ اگر میرا نام شہروز نہ ہوتا تو میں "شہروز" ہی نہ ہوتا..... اور لوگوں کو بھی میرا نام بہت پسند ہے۔ جس کی وجہ سے اپنے نام کے لیے میری پسند اور بھی بڑھ گئی ہے اپنے نام کے علاوہ مجھے "شاہ زین" پسند ہے۔"

2 "آپ کے دو لکی نمبر؟"

★ "لکی نمبر میں یقین ہی نہیں کرتا..... میرے لیے لکی نمبر وہی ہے جس تاریخ کو میں پیدا ہوا "25" بس یہی میرا لکی نمبر ہے۔"

3 "کن دو تاریخی ادوار میں جانے کی خواہش ہے؟"

★ "ایک تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں جانا چاہوں گا اور دوسرا صلاح الدین ایوبی کے دور میں جانا چاہوں گا۔"

4 "وہ افراد جن کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتے ہیں؟"

★ "اپنے دوستوں کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتا ہوں اور اپنی مما کو..... کیونکہ اگر مما کو فوراً جواب نہ دوں تو وہ گھبرا کر فوراً فون کرنا شروع کر دیتی ہیں۔"

5 "اپنی کن دو بری عادتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟"

★ "ناخن بہت چباتا ہوں بلکہ ناخن کھاتا ہوں۔ اس عادت کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور میری طبیعت میں غصہ ہے اسے تھوڑا کم کرنا چاہتا ہوں۔"

6 "دو جھوٹ جو اکثر بولتے ہیں؟"

★ "اداکار تو جھوٹ ہی بول رہے ہوتے ہیں اپنے کردار کے ذریعے لیکن اصل زندگی میں جھوٹ نہیں بولتا۔ بہت صاف ستھرا آدمی ہوں۔ ہاں کسی کی عزت بچانے کے لیے میں جھوٹ بولنے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔"

7 "اپنے بارے میں کن دو باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور غصہ آجاتا ہے؟"

★ "آج تو آپ بڑا نیگیٹو انٹرویو لے رہی ہیں۔ لیکن مجھے مزا آرہا ہے جواب دینے میں..... تو جناب اگر کوئی میری فیملی کے بارے میں کچھ برا بولے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا..... ویسے میں کسی بات کا برا نہیں مانتا۔"

8 "کرنٹ افیئرز کے دو اینکرز جو پرچی سے آئے ہوئے لگتے ہیں؟"

★ "کوئی بھی اینکر پرچی سے نہیں آسکتا۔ لوگ انہیں پسند کرتے ہیں تو انہیں پروگرام ملتے ہیں۔ پرچی صرف دو تین دن کی ہوتی ہے اگر اس فیلڈ میں کوئی ٹکے گا تو اپنے ٹیلنٹ کی وجہ سے۔"

9 "آپ کی نظر میں مارننگ شو کے دو بہترین اینکرز؟"

★ "جگن کاظم" اور "نور" کیونکہ نور مجھے بہت خوب صورت لگتی ہیں اور ہیں بھی خوب صورت۔"

10 "وہ دوست جو قابل اعتماد ہیں؟"

★ "Washane" بگٹی میرے بچپن کے دوست ہیں اور اپنی فیملی پہ بہت بھروسہ کرتا ہوں۔"

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ دنیا گھومنا چاہتے ہیں؟"

★ "ایکٹریس کے ساتھ ہی جانا چاہوں گا۔ "بار ریفائلی" یہ ایک ماڈل ہیں ان کے ساتھ اور وہ جنہوں نے ابھی آسکر ایوارڈ حاصل کیا ہے کسی لڑکے کے ساتھ بالکل بھی دنیا نہیں گھومنا چاہوں گا۔"

12 "دنیا کی کن دو شخصیات کی قسمت پر رشک آتا ہے؟"

★ "میں تو بچپن سے ہی بہت بڑے اسٹارز کی فیملی میں بڑا ہوا ہوں جاوید شیخ کا اپنا نام ہے۔ والد صاحب کا [illegible] نام ہے۔ اس لیے رشک کے لیے تو میری فیملی میں ہی لوگ موجود ہیں۔ تو ایسی کوئی بات نہیں۔"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتے ہیں؟"

★ "عید، رمضان المبارک مجھے پسند [illegible] بلکہ بہت پسند ہیں اور عیدالاضحی بہت اہتمام سے مناتا ہوں۔"

14 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"

★ "صبح فجر کا وقت بہت اچھا لگتا ہے۔ جس دن صبح اٹھ جاؤں تو وہ وقت بہت خوب صورت لگتا ہے۔ جب میں لندن میں تھا اور صبح اٹھتا تھا تو بہت اچھا لگتا تھا اور عصر کا وقت بھی اچھا لگتا ہے۔"

15 "کسی سے بھی پہلی مرتبہ ملنے پر کون سے دو جملے بولتے ہیں؟"

★ "السلام علیکم کرنے کی بہت زیادہ عادت ہے۔ پھر حال چال پوچھتا ہوں۔"

16 "وہ کھانے جن کو کھا کر بور نہیں ہوتے؟"

★ "فاسٹ فوڈ، جیسے برگر، چاہے وہ کسی بھی قسم کا ہو اور جاپانی کھانے، چاہے روز کھلا دیں۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتے؟"

★ "لڑکیوں سے اور اپنی امی سے۔"

18 "کن دو کھلاڑیوں کی وجہ سے آپ کرکٹ دیکھتے ہیں؟"

★ "شاہد آفریدی، عمر اکمل۔"

19 "کن دو خوب صورت دنوں کے منتظر ہیں؟"

★ "میرے پاپا نے میرے فیوچر کے بارے میں جو سوچا ہے اس کی تکمیل کر دوں وہ میرے لیے خوب صورت دن ہوگا..... اور آپ نے کہا شادی، تو ایسا کچھ نہیں ہے، جب قسمت میں ہوگا ہو جائے گی۔"

20 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتے؟"

★ "موبائل فون اور کریڈٹ کارڈ۔"

21 "کون سے دو الفاظ آپ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں؟"

★ "Brother کی شارٹ فارم Bro بہت استعمال کرتا ہوں۔ اس سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ بس یہی زیادہ استعمال کرتا ہوں۔"

22 "دو پسندیدہ صحافی؟"

★ "ایک تو آپ جو خاص ہیں اور باقی سب بھی اچھے ہیں۔"

23 "سات دنوں میں سے کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"

★ "ساتوں دن اچھے لگتے ہیں لیکن چونکہ ہم آرٹسٹ ہیں اور ہماری زندگی میں ویک اینڈ کوئی بھی دن بن سکتا ہے تو وہ دن جس کے اگلے دن کوئی شوٹ نہ ہو اچھا لگتا ہے۔"

24 "بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"

★ "اگر لندن میں ہوں تو جون اور جولائی اور اگر پاکستان میں ہوں دسمبر اور جنوری۔"

25 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟"

★ "اپنا کمرہ اور نیچے کے فلور پہ میرا ایک اور کمرہ ہے جہاں میں اپنے دوستوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتا ہوں۔"

26 "گھر کے دو کام جو آپ کرنا نہیں چاہتے؟"

★ "استری کرنا اور ہمارے گھر میں ایک پریشر پمپ ہے جس کو چلائیں تو پانی تیز آتا ہے۔ اس کو چلانا مجھے بہت مشکل لگتا ہے۔"

27 "دو پسندیدہ پکنک پوائنٹ؟"

★ "فرنچ بیچ کراچی اور جب ملک سے باہر جاتا ہوں تو ہر جگہ انجوائے کرتا ہوں۔"

28 "دو سیاست دان جو ملک کے لیے بوجھ ہیں؟"

★ "ہم لوگ جو سارا دن گھر پر بیٹھے اور کچھ بھی نہیں کر رہے وہ سارے لوگ ملک کے لیے بوجھ ہیں۔ سیاست دانوں کو کیا کہیں پہلے ہم سب خود تو ٹھیک ہو جائیں۔"

29 "کن دو ممالک کی ترقی نے متاثر کیا؟"

★ "جاپان اور چین۔"

30 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"

★ "کالا اور سفید۔"

31 "اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"

★ "کراچی اور نتھیا گلی۔"

32 "اگر ایک دن کے لیے ساری دنیا سو جائے سوائے آپ کے تو آپ کیا کریں گے؟"

★ "بہت بور ہو جاؤں گا اور خود بھی سونے کی کوشش کروں گا... اگر میرے پاس کوئی پلان نہیں ہے۔"

33 "لڑکیوں کے لیے کوئی دو نصیحتیں؟"

★ "ایک تو یہ کہ ماڈرن دماغ سے ہو جائیں لباس سے نہیں اور جب گھر سے نکلیں تو سوچ سمجھ کر نکلیں کہ ماں باپ کی عزت ہیں اور آپ ایک لڑکی ہیں۔"

34 "سال کے چار موسموں میں سے کون سے دو موسم پسند ہیں؟"

★ "بہار اور سردی۔"

35 "لڑکیوں کی دو پسندیدہ باتیں؟"

★ "جب وہ جھوٹ بولتی ہیں یہ سوچ کر کہ وہ پکڑی نہیں جائیں گی اور لڑکی ہوتی ہی بہت خوب صورت ہے اور مجھے ان کی ساری باتیں پسند ہیں۔"

36 "دو خواتین جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا؟"

★ "ایک ہی ہیں اور وہ میری ماں ہیں اور کوئی نہیں۔"

37 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"

★ "ایکٹنگ اور گلوکاری مگر میرے گلے میں سر نہیں ہے۔"

38 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں؟"

★ "پرویز مشرف اور چرچل۔"

39 "والدین کی دو نصیحتیں جو آپ نے گرہ سے باندھ لی ہوں؟"

★ "چوری کبھی نہیں کرنا اور کسی کا حق نہیں مارنا۔"

40 "آپ کے دو پسندیدہ ڈرامے؟"

★ "میرے پاس پاس" اور "ان کہی۔"

41 "غصے میں کون سی دو گالیاں منہ سے نکلتی ہیں؟"

★ "ایسی گالیاں نکلتی ہیں جو میں کرن ڈائجسٹ میں نہیں لکھوا سکتا۔"

42 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"

★ "کافی فیصلے غلط ہوئے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسان اپنی ہر غلطی سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔"

43 "کن دو باتوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں؟"

★ "بری صحبت اور ایسی محفل سے جہاں سے مجھے جھوٹ بول کر نکلنا پڑے۔"

44 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سی دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتے ہیں؟"

★ "میں کوشش کرتا ہوں کہ پانچوں وقت کی پڑھوں لیکن پھر بھی عصر اور ظہر کی لازمی پڑھ لیتا ہوں۔"

45 "بیرون ملک شاپنگ میں کون سی دو چیزیں لازمی خریدتے ہیں؟"

★ "ٹی شرٹس اور جوتے۔"

46 "دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

★ "لوگوں کے غصے سے ڈر نہیں لگتا صرف اللہ تعالیٰ کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔"

47 "کن دو لوگوں کی تعریف میں کنجوسی سے کام نہیں لیتے؟"

★ "میں کسی کی بھی تعریف میں کنجوسی سے کام نہیں لیتا۔"

48 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

★ "نہیں ایسا کچھ نہیں... میں نے اپنے آپ کو کسی مشروب کا عادی نہیں بنایا۔"

49 "ملک میں کون سی دو تبدیلیاں ضروری ہیں؟"

★ "ملک میں دو نہیں بلکہ دو سو تبدیلیاں ضروری ہیں۔"

50 "آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟"

★ "راحت فتح علی، حمیرا چنا۔"

51 "شادی کی دو رسمیں جو انجوائے کرتے ہیں؟"

★ "مہندی اور نکاح۔"

52 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟"

★ "اگر کوئی مجھ سے جھوٹ بولے اور اگر کوئی ڈیڑھ ہوشیاری کرے۔"

53 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خیال رکھتے ہیں؟"

★ "ایسی کوئی ڈریسنگ نہ ہو کہ جس کی وجہ سے مجھے بھی شرم آئے اور دیکھنے والوں کو بھی۔"

54 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتے ہیں؟"

★ "بارش کے وقت جس کے ساتھ ہوتا ہوں اسی کے ساتھ انجوائے کر لیتا ہوں۔"

55 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

★ "مجھے کیڑوں سے ڈر نہیں لگتا۔"

56 "دو ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

★ "سکورا اور کیفے فلو۔"

57 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرتے ہیں؟"

★ "اپنے ملک میں میں بہت کم شاپنگ کرتا ہوں مگر ضرورت ہو تو پھر فورم اور پارک ٹاور چلا جاتا ہوں۔"

58 "دو چینل جو شوق سے دیکھتے ہیں؟"

★ "ہم، جیو اور اے آر وائی میں کوئی اچھا ڈرامہ آرہا ہو تو دیکھ لیتا ہوں۔ ورنہ اسٹار موویز اور ڈسکوری چینل۔"

59 "دو تبدیلیاں جو اپنی شخصیت میں لانا چاہتے ہیں؟"

★ "میرا غصہ کم ہو جائے اور میں Humble ہو جاؤں۔"

60 "کھانے کی ٹیبل پہ کون سی دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"

★ "سلاد اور پانی۔"

61 "دو چیزیں جو آپ کے والٹ میں لازمی ہوتی ہیں۔"

★ "کریڈٹ کارڈ اور میرا شناختی کارڈ۔"

62 "کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تاوان میں کیا وصول کریں گے؟"

★ "کسی کو بھی نہیں اور جب کسی کو اغوا ہی نہیں کرنا تو تاوان کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

☆ ☆

فرحت علی گوہر

شاہین رشید

* "کیسی ہیں فرحت؟"

☆ "الحمدللہ ٹھیک ہوں۔"

* "آواز کا جادو جگانے کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

☆ "ایک ڈاکٹر کی جو مصروفیات ہوتی ہیں وہی میری بھی ہیں۔ ساتھ ساتھ پڑھائی بھی چل رہی ہے۔"

* "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

☆ "جی میرا نام فرحت علی گوہر ہے اور میں 23 جون 1978ء میں کراچی میں پیدا ہوئی اور اللہ کا شکر ہے کہ میرا نام کسی نے بگاڑا نہیں۔ سب مجھے فرحت ہی کہتے ہیں اور ہم تین بہنیں اور تین بھائی ہیں اور ان میں میرا نمبر دوسرا ہے اور میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں اور چائلڈ اسپیشلسٹ ہوں..... شادی ابھی ہوئی نہیں اور اس کے لیے میرا ایمان ہے کہ جوڑے آسمانوں میں بنتے ہیں اور جو وقت مقرر ہے اسی پہ شادی ہوگی وقت سے پہلے کچھ نہیں ملتا اور یہ بھی بتادوں کہ میں ارینج میرج کی قائل ہوں کیونکہ اس میں بڑوں کا تجربہ بھی شامل ہوتا ہے جبکہ لو میرج سوائے جذباتی فیصلے کے اور کچھ نہیں ہوتی..... اور آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ میں ایک شاعرہ بھی ہوں۔"

* "ریڈیو پہ آمد کیسے ہوئی' ایف ایم کا انتخاب کرنے کی وجہ؟"

☆ "بزم طلبہ میں ایک مقابلہ ہوتا تھا "ایک منٹ" کے عنوان سے اس پروگرام میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا اور میں نے اپنی لکھی ہوئی غزل پڑھی جس کو پہلا انعام ملا..... اور یہ میری پہلی پریزنٹیشن تھی اور مجھے ریڈیو پہ بولنے کا شوق بھی بہت تھا اور جب پہلا انعام ملا تو میں نے پروڈیوسر سے بات کی کہ مجھے پروگرام کرنے کا بہت شوق ہے تو انہوں نے مجھے کہا کہ آپ آڈیشن دیں اور پھر میں نے آڈیشن دیا اور تمام مراحل کو کامیابی سے پاس کیا تو مجھے بزم طلبہ پروگرام ہی کرنے کو مل گیا اور میں کافی عرصے تک بزم طلبہ پروگرام کرتی رہی ساتھ ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھی پھر ہاؤس جاب شروع ہوگئی تو تھوڑا سا گیپ آگیا پھر 2002ء میں ایف ایم کی طرف آنے کا خیال آیا کیونکہ اس زمانے میں آڈیشن وغیرہ ہو رہے تھے تو میں نے بھی آڈیشن دے دیا اور کامیاب ہوگئی اور پروگرام کرنے لگی۔

اور آپ کا سوال کہ ایف ایم کا ہی انتخاب کیوں کیا تو آپ کو بتاؤں کہ بچپن سے ہی ریڈیو سے متاثر تھی پتا نہیں کیوں مجھے اس میں بہت کشش محسوس ہوتی تھی۔ میرا ابھی دل چاہتا تھا کہ میں اس میں بولوں اور یہ میرا خواب تھا کہ ریڈیو پہ میں بولوں اور لوگ مجھے سنیں۔"

* "یہ شوق نہیں ہوا کہ لوگ دیکھیں بھی؟"

☆ "یہ شوق بھی میں نے پورا کیا ہے اور پی ٹی وی پہ نیوز پڑھی ہے اور یہ بات ہے 2007ء کی اور چھوڑ اس لیے دی کہ سب چیزوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا بہت مشکل ہو رہا تھا..... اس لیے ٹی وی چھوڑ دیا اور ریڈیو کو جاری رکھا۔"

* "دیکھا لوگوں نے آپ کو؟ کیونکہ لوگ اب پی ٹی وی بہت کم دیکھتے ہیں؟"

☆ "جی ہاں پی ٹی وی کم دیکھا جاتا ہے اور میں نے لوکل نیوز پڑھیں۔ تو ایسا نہیں ہے کہ لوگوں نے بالکل نہیں دیکھا' اکثریت نے مجھے نیوز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور میں اگر مسلسل آتی تو لوگ مجھے پہچان بھی لیتے۔ مگر میری پڑھائی بھی ٹف تھی اور پڑھائی ابھی بھی جاری ہے کہ ڈاکٹرز کو تو ساری عمر پڑھنا ہوتا ہے۔"

* "کبھی فیوچر میں آنے کا ارادہ ہے۔ جب آپ کی پڑھائی مکمل ہو جائے گی؟"

☆ "پڑھائی کا تو میں نے آپ کو بتایا نا کہ کبھی مکمل نہیں ہوتی روز نئی ریسرچ آرہی ہوتی ہیں جن سے باخبر رہنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن مجھے ٹی وی پہ آنے کا بھی شوق ہے اور میں اپنے شوق کے لیے ضرور وقت نکالوں گی اور بحیثیت "اینکر" نے کا مجھے شوق ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میں یہ کام کر بھی سکتی ہوں۔"

* "ریڈیو ٹی وی پہ آنے سے گھر والے خوش ہیں۔ کسی نے منع کیا؟"

☆ "گھر والے بہت خوش ہیں اور کسی نے مجھے منع نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اپنی پڑھائی میں کوتاہی نہیں کی..... اور تمام کاموں پر اپنی پڑھائی کو ہی ترجیح دی اور کچھ بھی غلط نہیں ہونے دیا میں نے اور میری امی اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ بہت شوق تھا انہیں کہ ان کی بیٹی ریڈیو پہ آئے ٹی وی پہ آئے نیوز پڑھے یا اینکر بنے۔ مجھے جب پی ٹی وی پہ دیکھتی تھیں تو انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ میری امی کی میرے لیے دو خواہشات تھیں ایک تو یہ کہ میں ڈاکٹر بنوں اور دوسری یہ کہ میں ٹی وی پہ نیوز پڑھوں اور اللہ کا شکر ہے

کہ یہ دونوں خواہشات ان کی زندگی میں پوری ہو گئیں۔"

* "ریڈیو پہ لائیو پروگرام ہوتے ہیں۔ کبھی مشکل ہوئی؟"

☆ "ریڈیو پہ میرا پہلا پروگرام میوزک آن ڈیمانڈ تھا اور شروع میں مشکل بھی ہوتی تھی۔ لائیو کالز لینا' ریکارڈ پروگرام اور لائیو میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تھوڑا ٹمپو بدل جاتا ہے شروع میں لائیو پروگرام کرنا مشکل لگتا تھا مگر اب بہت آسان لگتا ہے۔"

* "کہتے ہیں کہ ریڈیو سے معاوضہ بہت کم ملتا ہے۔ کیا آج بھی یہ صورت حال ہے؟"

☆ "جی بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے..... اس وقت بھی یہ حالات ہیں کہ آپ کی گاڑی کا فیول بھی ان پیسوں سے پورا نہیں ہوتا۔ جو چیک ملتا ہے اس کو بینک میں ڈال دیتی ہوں' کیونکہ اتنا اماؤنٹ نہیں ہوتا کہ کچھ کام پلان کر لیے جائیں اس رقم سے' میری جو بنیادی کمائی ہے وہ میرے پروفیشن سے ہی ہوتی ہے۔"

* "ریڈیو اور پھر آپ کا جو پروفیشن ہے اس میں لوگوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ سب سے پہلے شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟"

☆ "عموماً" میں شخصیت میں اس کی ڈریسنگ دیکھتی ہوں اس کے جوتے دیکھتی ہوں اور یہ کوئی مذاق کی بات نہیں ہے یہ چیزیں انسان کی شخصیت میں بہت اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ یہ چیزیں ہی آپ کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہیں اس سے آپ کا بیک گراونڈ آپ کا رہن سہن سب کچھ آپ کی شخصیت سے پتا چل جاتا ہے۔ کیونکہ جب آپ کسی کو دیکھتے ہیں تو ایک دم سے آپ کے ذہن میں اس کے بارے میں خیالات ابھرنے لگتے ہیں۔"

* "تنہائی پسند ہیں یا بھرے گھر میں رہنا پسند ہے؟"

☆ "بنیادی طور پر مجھے فیملی لائف میں رہنا بہت پسند ہے۔ میں تنہائی پسند بالکل بھی نہیں ہوں۔ فیملی کے ساتھ رہنا گھومنا پھرنا ملک سے باہر ملک کے اندر ایک ساتھ کھانا پینا سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔"

* "اور ان سب خواہشات کی تکمیل کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے؟"

☆ "جی بالکل..... بہت ضروری ہے۔ اور مجھے ملک سے باہر جانے کا بہت شوق ہے اور میرا ارادہ بھی ہے کہ مزید تعلیم کے لیے میں ملک سے باہر ضرور جاؤں گی۔"

* "اپنے فیوچر کے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟"

☆ "بہت کچھ سوچتی ہوں اور میرا خواب ہے بلکہ مشن ہے کہ میں کنسلٹنٹ بن جاؤں میری لائف میرے پروفیشن کے اعتبار سے بہت اسٹرانگ ہو جائے اور سوسائٹی میں میرا ایک مقام ہو میری عزت ہو۔"

* "موڈ خراب ہو تو پروگرام پہ اثر پڑتا ہو گا؟ یا جلدی ریلیکس ہو جاتی ہیں؟"

☆ "عموماً" میرا موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے۔ جب مجھے وقت پر کھانا نہ ملے۔ کیونکہ مجھے بھوک برداشت نہیں ہوتی یا پھر تھک جاؤں تو اور جہاں تک پروگرام کی بات ہے تو اگر انسان اپنے پروفیشن سے سنجیدہ ہے تو اسے ایکٹنگ کرنی پڑتی ہے۔ تو میں کوشش کرتی ہوں کہ اپنے موڈ کو اپنے پروگرام یا اپنے پروفیشن پہ حاوی نہ ہونے دوں۔"

* "قسمت پہ کتنا یقین ہے آپ کو؟"

☆ "سو فیصد..... کیونکہ جو چیز آپ کے نصیب میں آپ کی قسمت میں لکھ دی جاتی ہے وہی آپ کو ملتی ہے چاہے آپ دعا کریں نہ کریں جو لکھ دیا گیا ہے وہ ہی آپ کو ملے گا۔"

* "اپنی شخصیت میں کیا خامی دیکھتی ہیں؟"

☆ "مجھے لگتا ہے کہ مجھ میں غصہ ذرا زیادہ ہے اور کوشش کرتی ہوں کہ اپنی اس خامی پر قابو پالوں اور ٹھنڈے مزاج کے ساتھ معاملات کو ہینڈل کروں۔ ایک پڑھے لکھے شخص میں برداشت کی قوت زیادہ ہونی چاہیے اور کسی بات کو ایگو کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔"

* "ریڈیو آپ کا شوق ہے۔ کچھ برائی بھی نظر آتی

ہے؟"

☆ "ہاں کیوں نہیں ہر فیلڈ میں برائی ہوتی ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ یہاں لوگوں کے پاس فالتو ٹائم بہت ہوتا ہے۔ اپنی انرجی کو پوزیٹو وے میں استعمال نہیں کر رہے ہوتے۔ پلاننگ نہیں کر رہے ہوتے اور نہ ہی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں نہ بہت اچھی پروگرامنگ کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ پرائیویٹ اداروں میں جا کر دیکھیں آپ کو اندازہ ہوگا کہ کام کیا ہوتا ہے اور کوالٹی آف ورک کیا ہوتا ہے۔"

* "ریڈیو کے ذریعے سے نام بنانا مشکل ہے یا آسان ہے؟"

☆ "میرا خیال ہے ٹی وی کی نسبت مشکل ہے۔ ٹی وی پہ تو آپ اسکرین پر نظر آ رہے ہوتے ہیں لوگ فوراً آپ کو پہچان لیتے ہیں لیکن آواز کے ذریعے پہچان بنانا مشکل ہے۔ کبھی کوئی آواز پہچان کر کے کہے کہ آپ "فرحت علی گوہر" ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

* "فضول خرچ ہیں کیا؟ کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتی ہیں؟"

☆ "نہیں آپ مجھے فضول خرچ نہیں کہہ سکتیں کیونکہ میں جو بھی خرچ کرتی ہوں وہ ضرورت کی چیزوں پر ہی خرچ کرتی ہوں۔۔۔۔ ویسے زیادہ تر کپڑوں، جوتوں اور بیگز پہ خرچ کرتی ہوں یا پھر مجھے اپنی گاڑی پر خرچ کرنا اچھا لگتا ہے۔"

* "اپنی کمائی سے اپنے لیے کیا قیمتی چیز خریدی؟ اور کون سی چیز اپنے پاس لازمی رکھتی ہیں؟"

☆ "میں نے اپنے لیے گولڈ کا ایک سیٹ خریدا ہے۔ جو مجھے بہت عزیز ہے اور میں اے ٹی ایم کارڈ پیسے اور موبائل اپنے پاس لازمی رکھتی ہوں۔"

* "ایک عام انسان اور آپ کی زندگی میں کیا فرق ہے؟"

☆ "میرے خیال میں کافی فرق ہے۔۔۔۔ میری پہلی ترجیح پڑھنا ہے۔ پروفیشن کے لحاظ سے مختلف ہے میں ڈاکٹر ہوں میری مصروفیات ایک عام آدمی سے زیادہ ہیں۔ پھر میڈیا میں بھی ہوں۔ کوکنگ کا بھی شوق ہے۔ ڈریس ڈیزائننگ بھی خود ہی کرتی ہوں تو بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو بیک وقت اتنے سارے کام سرانجام دیتے ہیں۔"

* "بحیثیت ایک انسان کے آپ لوگ میں کس چیز کی کمی محسوس کرتی ہیں؟"

☆ "یہی کہ ہمارے یہاں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ ہمارا معیار زندگی اچھا نہیں ہے۔ ہمارے حکمرانوں اور خاص طور پر میڈیا میں پڑھے لکھے لوگوں کی کمی ہے۔ تو میں بہت کمی محسوس کرتی ہوں تعلیم کی۔"

* "آپ سے مل کر لوگ پہلا جملہ کیا بولتے ہیں اور کالرز تو تعریف ہی کرتے ہوں گے۔ کیونکہ آپ کے بولنے کا اسٹائل بہت اچھا ہے؟"

☆ "پہلا جملہ تو یہی ہوتا ہے کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی اور واقعی کالرز مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اچھی اچھی باتیں بھی کرتے ہیں، پیار بھی کرتے ہیں محبت سے بات کرتے ہیں اور مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ایک کالر نے مجھے کہا کہ آپ کی آواز میں بہت پاکیزگی ہے اور بہت اچھا لگ رہا ہے آپ کی آواز سن کر تو یقین جانیے کہ ان کی بات سن کر مجھے بہت اچھا لگا۔"

* "آپ بتا رہی تھیں کہ آپ کو دنیا گھومنے کی خواہش ہے تو کسی مشہور شخصیت کے ساتھ گھومنے کی خواہش ہے کیا؟"

☆ "نہیں ایسی کوئی خواہش نہیں ہے اور نہ ہی میں ڈریم لینڈ میں رہتی ہوں۔ مجھے اچھا لگے گا اگر میں اکیلی ہی جاؤں، مجھے اچھا لگے گا اگر میں اپنی فیملی کے ساتھ جاؤں اور میرا خیال ہے کہ فیملی کے ساتھ زیادہ انجوائے کروں گی۔"

* "حالات حاضرہ سے باخبر رہتی ہیں اور اخبار شوق سے پڑھتی ہیں؟"

☆ "بالکل باخبر رہتی ہوں۔ کیونکہ جس فیلڈ سے میرا تعلق ہے اس میں ہر وقت حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے اور میں اخبارات کا مطالعہ کرتی ہوں لیکن جب اخبار پڑھنے بیٹھتی ہوں تو پہلے قرآنی آیات کا مطالعہ کرتی ہوں پھر خبریں پڑھتی ہوں۔"

* "آواز کی دنیا کے لوگوں کی اپنی ایک پہچان ہوتی ہے۔ کبھی سوچا کہ یہ پہچان ختم ہو گئی تو؟"

☆ "تو کوئی بات نہیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کسی چیز کو کریز بنا لیا جائے تو پھر آپ ڈرنے لگتے ہیں کہ کہیں یہ چیز چھن نہ جائے اور مجھے شہرت کا کریز نہیں ہے اور اسے میں نے سر پر سوار نہیں کیا۔"

* "آپ ڈاکٹر بھی ہیں اور آر جے بھی شاعری بھی کرتی ہیں تو ان سب باتوں کے لیے وقت نکالنا مشکل تو ہوتا ہی ہوگا اور شاعری کی کتاب منظر عام پر آئی؟"

☆ "جب چیزوں کا آپ کو شوق ہو اس کے لیے وقت نکالنا بالکل بھی مشکل نہیں ہوتا اور شاعری کرتی ہوں مگر بہت زیادہ نہیں۔ غزلیں وغیرہ میں نے لکھی ہیں۔ اور فی الحال کتاب تو نہیں چھپوائی۔ ارادہ ضرور ہے۔"

* "گھریلو امور سے کتنا لگاؤ ہے؟"

☆ "لگاؤ تو بہت ہے اور میں بہت اچھی کوکنگ بھی کر لیتی ہوں۔ لیکن گھریلو امور نبھانے کا بہت کم ٹائم ملتا ہے مجھے۔۔۔۔ اور میری بہن بہت اچھی ہیں۔ میرا خیال رکھتی ہیں اور انہیں یہ احساس ہے کہ میں تھک جاتی ہوں اس لیے ان کے ساتھ زیادہ ہاتھ نہیں بٹا سکتی۔"

* "فلمیں اور ڈرامے دیکھنے کا شوق ہے آپ کو؟"

☆ "نہیں۔۔۔۔ بہت زیادہ شوق نہیں ہے۔ ٹائم نہیں ہوتا، فلمیں تین گھنٹے کی ہوتی ہیں اور اتنا بہت سارا وقت ضائع کرنے کی میں قائل نہیں ہوں، چونکہ بھائیوں کو اسپورٹس سے لگاؤ ہے تو زیادہ تر اسپورٹس چینلز ہی لگے ہوتے ہیں۔"

* "آپ کو اسپورٹس سے اور خاص طور پر کرکٹ سے لگاؤ ہے؟"

☆ "نہیں مجھے اسپورٹس سے بالکل بھی لگاؤ نہیں ہے اور نہ ہی کرکٹ سے کوئی دلچسپی ہے، بس اتنی سن گن رہتی ہے کہ کون جیتا اور کون ہارا۔"

* "کوئی تہوار ہو یا نیا سال ہو۔۔۔۔ اہتمام کرتی ہیں؟"

☆ "عیدین پر تو اہتمام کرتی ہوں۔ لیکن جہاں تک نئے سال کی بات ہے تو آج کل ایس ایم ایس کا اتنا رواج چل پڑا ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بہترین ذریعہ ہے لوگوں کو مبارک باد دینے کا اور پھر اگلا دن روٹین کا ہی دن گزرتا ہے۔"

* "آپ میڈیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر کچھ کرنے کا موقع ملے تو کیا کریں گی؟"

☆ "میڈیا کو سب سے زیادہ ضرورت پڑھے لکھے لوگوں کی ہے۔ کیونکہ جب لوگ آپ کو سنتے ہیں تو آپ کی بہت سی باتوں کا اثر لیتے ہیں اور آپ کو فالو کرتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اتنے بڑے میڈیا پہ بیٹھنے والے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ اس لیے اگر میڈیا میں اچھے پڑھے لکھے لوگ ہوں گے تو وہ لوگوں کو بھی اچھی سوچ دیں گے اس لیے اگر میرے اختیار میں ہو تو سب پڑھے لکھے لوگوں کو میڈیا میں جاب دوں گی۔"

* "صبح کا آغاز تو ظاہر ہے کہ اچھے کام سے ہی ہوتا ہوگا۔ پھر اس کے بعد کیا دل چاہتا ہے؟"

☆ "صبح اٹھ کر ناشتا کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ کیونکہ مجھے صبح اٹھتے ہی بھوک لگنا شروع ہو جاتی ہے اور مجھے بھوک برداشت نہیں پھر مجھے غصہ آنے لگتا ہے اگر مجھے کچھ کھانے کو نہ ملے تو۔ اگر میں پڑھ رہی ہوں تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا پڑھ رہی ہوں۔۔۔ بس برداشت نہیں ہوتا۔"

* "تو آپ خود اٹھ کر اپنا کھانے پینے کا انتظام کیوں نہیں کرتیں؟"

☆ "کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں اسپتال میں ہوتی ہوں اور بہت مصروف ہوتی ہوں اور اگر میری دوست کو میرے ساتھ کھانے کے لیے جانا ہے اور وہ دیر کر رہی ہے تو میں اس سے لڑنا شروع کر دیتی ہوں کہ بھئی جلدی چلو۔۔۔۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔۔۔۔ تو بس بھوک برداشت نہیں اور یہی میری کمزوری ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ڈاکٹر فرحت علی گوہر سے اجازت چاہی۔

☆ ☆

حسن و صحت

ادارہ

گرمیوں میں پیروں کی حفاظت

باہر کی سیر و تفریح، کام کاج اور دھوپ اور آپ ایسے میں چاہتی ہیں کہ فل میک اپ کے ساتھ آپ گرم گرم ہوا میں باہر نکلیں اور اپنے سارے کام انجام دیں اور یہ بھی چاہتی ہیں کہ آپ اچھی بھی نظر آئیں۔ جلد کی حفاظت سے لے کر پروڈکٹس تک کے لیے ذیل کی گائیڈ لائن آپ کے لیے بہترین ہے اور موسم گرما میں آپ کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

چھ کار آمد باتیں: گرمیوں میں معاملات ہاتھوں سے نکلنے لگتے ہیں اور جیسے جیسے موسم گرم ہوتا جاتا ہے آپ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ایسے جوتوں اور چپل سے دور ہو جائیں جو آپ کے پاؤں کے لیے نقصان دہ ہوں۔ سردیوں کے بعد آپ خود بخود اپنے پیروں کے حوالے سے حساس ہو جاتی ہیں اور سینڈل کو زیادہ ترجیح دینے لگتی ہیں۔

ڈیڈ اسکن اور سخت کھال

خلیے یعنی سیل (Cell) ایک تسلسل کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور پرانے خلیوں کی جگہ نئے خلیے لیتے رہتے ہیں۔ یہ نئے خلیے آپ کی جلد کی گہرائی میں بنتے ہیں۔ نئے خلیے پرانی جلد کو اوپر کی طرف پش کرتے ہیں اور تب ان کو چھلکے کی طرح اتارنا یعنی ایکس فولیٹ (Exfoliate) کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ سردیوں میں ہمارے پاؤں خشک ہو کر سخت ہو جاتے ہیں اور ان کی پرانی کھال اس تیزی سے نہیں اترتی ۔ جس تیزی سے اترنی چاہیے۔ سالٹ اسکرب اور جھانواں اس معاملے میں جادو گر ثابت ہو سکتے ہیں۔

پاؤں کے ناخن

گرد و غبار سے بچانے کے لیے جوتے کا استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے ناخنوں میں میل بھر جاتا ہے اور اگر بروقت صفائی نہ کی جائے تو انفیکشن بھی ہو سکتا ہے۔ مجموعی صحت کو درست رکھنے کے لیے ناخنوں کی صفائی بھی ضروری ہے۔ ناخنوں کے نیچے کی صفائی کی جائے۔ میل موجود ہو تو صاف کیا جائے۔ اس کے لیے نوک دار کیوٹیکل اسٹک استعمال کی جائے۔ ہولے ہولے میل نکالیں اس کے بعد نیل برش سے ناخنوں کی چاروں طرف سے صفائی کرلیں۔ ناخنوں پر موجود گوشت کو کیوٹیکل اسٹک کی نوک پر کپڑا لپیٹ کر اوپر کی طرف پش کریں۔

فنگل انفیکشن

اسے اردو میں اسفنج ابھار کہا جاتا ہے کیونکہ جلد پر اسفنج کی طرح پھیلتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان کے گروپ کو ظاہر کرنے کے لیے "ڈرماٹوفائٹس" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ایتھلیت کے پاؤں میں یہ عموماً" ہو جاتا ہے اور جلد کو تکلیف دینے لگتا ہے۔ جس کا مطلب ہے آگے چل کر تکلیف میں مزید اضافہ ہو گا۔ ناخنوں میں ہو جائے تو ناخن کے رنگ تبدیل ہو جاتے ہیں اور یہ ٹیڑھے میڑھے نکلنے لگتے ہیں۔ کچھ معاملات میں یہ سخت بھی ہو جاتے ہیں اور ناخن کی جڑوں کو کمزور کر دیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو کیمی سل کریم استعمال کرنا چاہیے اور پورے ایک ماہ تک اور پبلک لاکرز اور جم میں حفاظتی شوز پہننے چاہئیں۔ غسل کے بعد پاؤں کو خوب اچھی طرح صاف کرنا چاہیے اور اینٹی فنگل اسپرے

استعمال کے ساتھ جوتوں اور چپل وغیرہ پر کرنی چاہیے۔

نیل کا فنگس اور بھی مشکل ہوتا ہے اور اس سے نجات بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اس کا بہترین علاج اینٹی فنگل لوشن یا کریم ہے۔ ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے بعد یہ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

موئسچرائزر کا استعمال

پیروں کی نمی کم یا ختم ہو سکتی ہے اور ایسا محض موسم کی وجہ سے ہی نہیں ہوتا ہے۔ اور بھی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں اس کی وجہ سے پاؤں کھردرے لگنے لگتے ہیں۔ پاؤں کو اچھی طرح دھونے اور خشک کرنے کے بعد کوئی بہت اچھی قسم کی موئسچرائزر لگائیں تاکہ نمی کی کمی کو پورا کیا جا سکے اور پاؤں کی جلد نرم اور شگفتہ رہے۔

پیڈی کیور: آپ اپنے پیروں کو ظاہر ہے کہ ہر موسم میں خوب صورت دیکھنا چاہتی ہیں اور ساتھ ہی اپنے ناخنوں کو بھی.... آپ باقاعدگی سے پیڈی کیور بھی کرواتی ہیں مگر آپ کو غیر محفوظ آلات سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر پیڈی کیور میں استعمال ہونے والے آلات حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق صاف نہیں ہوں گے تو بیکٹیریا اپنی جگہ بنا سکتے ہیں اور فنگل انفیکشن بھی ہو سکتا ہے اور صورت حال اور زیادہ خراب ہو جائے تو جلد کی کوئی بیماری بھی ہو سکتی ہے۔ ان سے بچنے کے لیے ذیل کی ہدایات پر عمل کریں۔

ایسے سیلون سے دور رہیں جہاں آلات کو صاف کرنے کے لیے بڑے سائز کے ٹب استعمال کیے جاتے ہیں۔ ٹب میں آسانی سے بیکٹیریا گھر بنا لیتے ہیں اور انہیں مکمل طور پر ختم کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔

ایسے سیلون میں جائیں جہاں اوزار آلات کی صفائی واش بیسن میں کی جاتی ہے۔ زیادہ محفوظ ہوتے ہیں اور واش بیسن میں بیکٹیریا کا خاتمہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

اس بات کا یقین کر لیں کہ انسٹرومنٹس جو استعمال ہونے والے ہیں، انہیں اچھی طرح اسٹرلائز کر لیا گیا ہو۔

اگر کسی طرح کا شبہ ہو تو آپ اس کا برملا اظہار کریں۔

بو اور نمی

گرمیوں میں پاؤں سے پسینہ زیادہ نکلتا ہے جس سے پاؤں اور جوتے اور سینڈل میں بھی بو آجاتی ہے ... ان سے بچنے کے لیے مارکیٹ میں فریگرنٹ فوٹنگز دستیاب ہیں جنہیں جوتے اور سینڈل میں استعمال کرنے سے بو دور ہو جاتی ہے۔ یہ آسانی سے ہر طرح کے جوتے میں اسٹیکر کی طرح چپک جاتے ہیں۔

ان میں کئی طرح کے فلیور ہوتے ہیں مثلاً "منٹ، یاسمین اور لیمن فلیور۔

آپ کے پاؤں کو خوشبو کے ساتھ ساتھ تازگی بھی ملتی ہے۔

☼ ☼

نبیلہ عزیز

دو دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے جس کے پیشِ نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے یاور امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

۱۰

دسویں قسط

"حد سے زیادہ وزن ڈالو گے تو کیسے سہہ پائے گی۔۔۔؟ بے چاری ٹوٹ ہی جائے گی نا۔۔۔؟" مبارک خان اس کے انداز پہ ہنس کر بولا تھا۔
"تو پھر ایسا کرو اس کی جگہ کوئی مضبوط سی چارپائی لا کر رکھو' ورنہ یہ سچ مچ ٹوٹ ہی جائے گی۔ میں بڑی "ا تھری" نیند سوتا ہوں۔" منصور حسین نے مبارک خان کو پہلے سے اطلاع دی تھی۔
"رنگلے پایوں والا بڑا پلنگ منگوا لوں تمہارے لیے؟" مبارک خان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔
"ارے یار! اس سے بڑی نیکی اور کیا ہوگی؟ نواڑی پلنگ پہ سونے کا بھی اپنا ہی مزا ہے' ہر کروٹ پہ ڈھیلا پڑتا ہے۔" منصور حسین مزا لیتے ہوئے بولا۔
"ویسے یار آپس کی بات ہے اگر تم بڑے صاحب کے سامنے رنگلے پایوں والے نواڑی پلنگ کی فرمائش کرو گے تو وہ یہ فرمائش بھی پوری کر دیں گے۔" مبارک خان نے آہستہ آواز میں کہا۔
"وجہ۔۔۔؟" منصور حسین نے حیرت سے پوچھا۔
"آخر تم علیزے بی بی کے ڈرائیور ہو' ان کے ملازم ہو' کیا یہ وجہ کم ہے؟" مبارک خان اس گھر کا خاص ملازم تھا وہ علیزے اور اس کے ملازموں کی اہمیت خوب جانتا تھا اس کے ملازموں کی بھی گھر میں بڑی قدر اور اہمیت جانی جاتی تھی۔
"اوہ! اچھا' اچھا۔" منصور حسین نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ لیکن اتنے میں ان دونوں کو کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی وہ دونوں ہی چونک گئے مگر مبارک خان فوراً" ہی ریلیکس ہو گیا۔ اسے آواز کی سمجھ آگئی تھی۔
"یہ کس کی آواز ہے۔۔۔؟" منصور حسین انجان تھا اسی لیے پوچھ رہا تھا۔
"خیرو بابا کی۔"
"کون خیرو بابا؟"
"علیزے بی بی کے ڈرائیور۔۔۔"
"ڈرائیور۔۔۔؟" منصور حسین کو اچنبھا ہوا۔
"چند روز پہلے تک وہی علیزے بی بی کے ڈرائیور تھے۔"
"یار! صاف صاف بات کرو۔ "تھے" سے کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟"
"مطلب کہ اب تم ہو' وہ نہیں ہیں۔"
"لیکن کیوں۔۔۔؟"
"کیونکہ چند روز پہلے۔۔۔" مبارک خان بات بتاتے بتاتے رک گیا تھا۔
"چند روز پہلے کیا ہوا۔۔۔؟"
وہ پوچھ رہا تھا اور مبارک خان تذبذب کا شکار تھا کہ اسے بتائے یا نہ بتائے۔
"کیا کوئی راز کی بات ہے؟" منصور حسین نے اس کے چہرے پہ کھوجا۔
"خیر جو بھی بات ہے تمہیں بتانی تو پڑے گی' آخر تمہیں اسی لیے تو اس نوکری پہ رکھا گیا ہے۔" مبارک خان ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔
"اچھا۔ بتاؤ پھر۔"
"بتاتا ہوں یار۔" مبارک خان نے خود کو سب بتانے کے لیے تیار کیا تھا۔
"بچپن سے علیزے بی بی نے جب اسکول میں ایڈمیشن لیا تھا خیرو بابا تب سے ان کے ڈرائیور ہیں ان کو پک اینڈ ڈراپ کرنا ان کی ذمہ داری تھی' علیزے بی بی نے کہیں اور بھی آنا جانا ہوتا تھا تو وہی لے کر جاتے تھے لیکن

چند روز پہلے وہ علیزے بی بی کو کالج ڈراپ کرنے گئے تو راستے میں گاڑی پہ فائرنگ شروع ہو گئی' خیرو بابا بہت وفادار ملازم ہیں خود زخمی ہو گئے لیکن علیزے بی بی پہ ذرا سی بھی آنچ نہیں آنے دی' پچھلے کئی دنوں سے ہسپتال میں داخل تھے کل ہی واپس آئے ہیں' ابھی کمزور ہیں' اٹھتے بیٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے اسی لیے درد سے کراہ اٹھتے ہیں۔" مبارک خان نے اسے تفصیل سے بتایا۔
"اوہ! یہ تو واقعی پریشانی کی خبر سنائی ہے تم نے' لیکن یار سوچنے کی بات ہے' فائرنگ کروائی کس نے تھی۔۔۔؟ کیا تمہارے بڑے صاحب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ چل رہی ہے؟" منصور حسین پر سوچ انداز میں پوچھ رہا تھا۔
"ارے نہیں یار! اس حویلی کے سبھی افراد بہت نیک' شریف اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں' نمازی اور پرہیزگار ہیں' کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے' اگر دشمنی ہوتی تو فوراً" پتا چل جاتا کہ فائرنگ کروانے والا کون تھا۔۔۔؟ یہ تو پتا نہیں اچانک کون دشمن اٹھ کھڑا ہوا ہے' جس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔" مبارک خان اس بات سے خود بہت پریشان ہو رہا تھا۔
"ہوں! یہ تو اور بھی پریشانی کی بات ہے یار' پھر کیا سوچا ہے تمہارے صاحب نے۔۔۔؟"
"ارے سوچنا کیا ہے' بس چھان بین میں لگے ہوئے ہیں ابھی' اب دیکھو کہ کب مسئلہ حل ہوتا ہے؟" مبارک خان پریشانی سے سر ہلا کر بولا۔
"اتنا بڑا واقعہ ہونے کے بعد تمہارے صاحب پھر اپنی بیٹی کو باہر بھیجنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ انہیں ڈر نہیں لگتا؟" منصور حسین تعجب سے پوچھ رہا تھا۔
"ڈر کس کو نہیں لگتا؟ ماں باپ ہیں' آخر علیزے بی بی بڑی منتوں مرادوں کے بعد ملنے والی اولاد ہیں ان کی' وہ تو اس دنیا کی ہوا بھی نہ لگنے دیں پر مجبوری ہے' پڑھنے کے لیے تو بھیجنا ہی ہے۔ ان کے امتحان سر پہ پہنچ چکے ہیں' کالج نہیں جائیں گی تو پورے سال کی محنت کا نقصان ہوگا' اسی لیے تو ایمرجنسی میں انہوں نے تمہیں ڈرائیور رکھ لیا ہے' ورنہ کوئی اور حالات ہوتے تو سو سو طرح کی چھان بین کرتے اور پھر بھی مطمئن نہ ہوتے۔" مبارک خان صاف صاف بات کر رہا تھا۔
"اور کیسی چھان بین کرنا تھی انہوں نے؟ شناختی کارڈ' لائسنس' نام و پتا' گھر بار سب پوچھا ہے انہوں نے؟" منصور حسین کو حیرت ہوئی تھی۔
"یار بے شک پوچھا ہے انہوں نے لیکن پھر بھی وہ مطمئن ہونے والے نہیں' خیر شاید اللہ نے تمہاری دعا سن لی تھی اسی لیے تمہارے لیے نوکری کا سبب بنا دیا۔"
"ہاں یار! میرے لیے تو سبب بن گیا لیکن خیرو بابا کا کیا ہوگا؟ وہ بے چارے تو بے روزگار ہو گئے نا؟" اسے افسوس ہو رہا تھا۔
"خیرو بابا کی فکر نہ کرو صاحب نے ان کے لیے بڑا اچھا انتظام کر دیا ہے۔۔۔"
"انتظام۔۔۔ کیسا انتظام؟" منصور حسین کو سمجھ نہ آیا۔
"بڑے صاحب خیرو بابا کو ان کے گوٹھ بھجوا رہے ہیں۔ جہاں ان کے بیٹے بیٹیاں اور پوتے پوتیاں رہتے ہیں وہ بھی اب انہی کے پاس رہیں گے اور ان کو بغیر کوئی کام کیے' گھر بیٹھے ہر مہینے تنخواہ ملتی رہے گی۔ اس طرح ان کا بڑھاپا بھی سکون میں گزرے گا اور ماہانہ خرچ بھی ملتا رہے گا۔" مبارک خان نے مزید اطلاع دی تھی اور منصور حسین سچ مچ مرعوب ہوا تھا۔
"پھر تو تمہارے بڑے صاحب واقعی نیک آدمی ہیں۔ اپنے ملازموں کے لیے بھی اتنا اچھا سوچتے ہیں' نرم دل رکھتے ہیں سینے میں۔" منصور حسین توصیفی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ان کے اچھا سوچنے کے لیے' ہمارا اچھا بننا ضروری ہے منصور حسین' ورنہ لوگ برے کے ساتھ برا ہی پیش آتے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ تم اچھے بن کے ہی رہو گے۔" مبارک خان نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے تھپکی دی اور منصور حسین اس کی بات پہ دلچسپی سے مسکرا دیا تھا۔

"میں ہوں ہی اچھا' مجھے بننے کی کیا ضرورت ہے؟" اس کے دلچسپ انداز پہ مبارک خان بھی مسکرا دیا تھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"خیرو بابا کی طبیعت پوچھنے' لگتا ہے وہ اکیلے ہیں اس وقت؟" مبارک خان نے اندازہ لگایا۔

"تو مجھے بھی ساتھ لے چلو' میں بھی ان کی عیادت کر لوں گا۔" منصور حسین کھڑا ہو گیا تھا اور پھر مبارک خان کے ساتھ اپنے کوارٹر سے نکل کر خیرو بابا کے کوارٹر میں آ گیا۔

"السلام علیکم۔" اس کی بھاری دبنگ سی اجنبی آواز پہ خیرو بابا نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں اور مبارک خان کے ساتھ کسی اور کو دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم خیرو بابا۔" مبارک خان قریب آ کے بولا۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے نقاہت زدہ آواز میں سلام کا جواب دیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" منصور حسین نے پوچھنے میں پہل کی تھی جبکہ وہ اجنبی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"یہ منصور حسین ہے خیرو بابا' علیزے بی بی کا نیا ڈرائیور۔" مبارک خان نے ان کی مشکل آسان کی۔

"اچھا' اچھا یہ ہے نیا ڈرائیور؟ ماشاء اللہ بڑا گھبرو جوان ہے۔" انہوں نے بڑی محبت سے اسے دیکھا اور سراہا تھا۔

"شکریہ۔" منصور حسین نے ان کی ستائش بھری نظروں پہ سر جھکا لیا تھا۔

"اللہ تجھے زندگی دے پتر' چہرے سے ہی بہادر لگتے ہو' آئندہ بھی بہادر بن کے ہی رہنا۔" انہوں نے منصور حسین کو نصیحت کی وہ ان کے قریب ہی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔" اس نے خیرو بابا کے ہاتھ تھام لیے' لہجہ واقعی شرمندگی لیے ہوئے تھا۔

"کیوں پتر؟ میرا اور تیرا تو ایسا کوئی واسطہ ہی نہیں کہ تجھے شرمندہ ہونا پڑے۔" خیرو بابا کو حیرت ہوئی۔

"بس اوپر والا کسی نہ کسی سے کوئی نہ کوئی واسطہ بنا ہی دیتا ہے' میں بہت دنوں سے نوکری کے لیے دھکے کھاتا پھر رہا تھا لیکن کہیں کوئی خالی جگہ ہی نہیں مل رہی تھی' صاحب نے بھی انکار کر کے مجھے واپس بھیج دیا' لیکن اب جب آپ زخمی ہوئے ہیں تو صاحب کو آپ کے بڑھاپے کا خیال آ گیا ہے اسی لیے انہوں نے آپ کے بڑھاپے کی جگہ میری جوانی کو نوکری پہ رکھ لیا ہے۔ میری جوانی اور طاقت سے آپ کا بڑھاپا مات کھا گیا ہے' آپ کو ہٹا دیا گیا ہے اور مجھے رکھ لیا گیا ہے' خیر دین کی جگہ منصور حسین کو اوکے کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے منصور حسین کو شرمندگی ہو رہی ہے کہ اس نے آپ کی جگہ لے لی ہے۔" منصور حسین نے ان کے ہاتھ تھامے اپنی شرمندگی کا جواز پیش کیا تو خیرو بابا اور مبارک خان حیرت سے اسے دیکھنے لگے وہ کتنا حساس ہو رہا تھا ورنہ اسے تو اس نوکری پہ خوش ہونا چاہیے تھا مگر خیرو بابا کا سن کر اس کی خوشی ماند پڑ گئی تھی۔

"یہ کیسی بات کر رہے ہو پتر؟ سب کے اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں' میں نے اپنے نصیب کا کما لیا ہے' اب تجھے تیرے نصیب کا ملے گا' اور ویسے بھی اللہ کسی کا حق نہیں چھوڑتا' صاحب نے مجھے نوکری سے الگ کیا ہے' مجھے میرے نصیب سے تو الگ نہیں کیا' اللہ نے ان کے دل میں رحم ڈال دیا ہے میرے لیے' میرے حصے کا رزق مجھے ملتا رہے گا۔" خیرو بابا بھی بہت صابر و شاکر تھے انہوں نے منصور حسین کی شرمندگی کو کم کر دیا تھا۔

"یہ تو انہوں نے واقعی بہت اچھا کام کیا ہے' مجھے سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔" منصور حسین نے ان کے جذبے کو سراہا تھا۔

"خوشی تو مجھے بھی بہت ہوئی ہے' اچھا ہے اپنے بچوں کے پاس اپنے گوٹھ میں رہوں گا' ساری عمر شہر میں کام کرتے ہی گزار دی۔" خیرو بابا نے گہری سانس کھینچی اور اپنا گزرا وقت یاد کرنے لگے منصور حسین کو ان کے پاس بیٹھنا اور باتیں سننا بہت اچھا لگا تھا وہ کافی دیر تک اپنی جوانی کے قصے سناتے رہے اور وہ دونوں سنتے رہے۔

☼ ☼ ☼

"جودت.....!" وہ گاڑی سے اتر کر ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتے ہوئے روش سے لان کی سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہا تھا جب لان کے بائیں حصے سے ابھرنے والی کومل کی آواز پہ ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"کومل آپا؟"

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے سیڑھیوں سے اتر کر چھوٹی سی ندی کے پل سے گزر کر لان میں آ گیا تھا۔

"جی ہاں! کومل آپا۔" اس نے سر اثبات میں ہلا کر اعتراف کیا کہ میں ہی ہوں۔

"رات کے اس پہر یہاں کیوں...؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی سوال اگر میں تم سے کروں تو؟" کومل نے جودت کو سر تا پا گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں تو لوفر آوارہ ہوں' یقیناً اس وقت آوارہ گردی ہی کر کے آیا ہوں گا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"لگ تو نہیں رہا کہ تم اس وقت آوارہ گردی کر کے آئے ہو...؟"

"تو پھر کیا لگ رہا ہے آپ کو کہ کیا کر کے آیا ہوں۔" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"تھکے تھکے لگ رہے ہو' کیا بات ہے"

"آپ بتائیں آپ کیا کھوجنا چاہتی ہیں...؟"

"یہی کہ آج تمہاری چال کیوں بدلی ہوئی ہے؟"

"آپ کے خیال میں میری چال کیوں بدلی ہوئی ہے؟" وہ الٹا اسی سے پوچھے جا رہا تھا۔

"کوئی لڑکی چھوڑ کر چلی گئی ہے تمہیں۔" کومل نے برملا کہہ دیا' وہ بہت بری طرح چونک گیا تھا اس کا اندازہ کافی حد تک درست ہی تو تھا۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

"تمہاری چال بتا رہی ہے۔"

"کافی تیز نظر ہے آپ کی۔" وہ مسکرایا۔ "اسی بات کا تو رونا ہے۔" کومل نے سر جھٹک کر آہستگی سے کہا۔

"خیر یہ بتاؤ' کون چھوڑ کر گئی ہے' اور کیوں گئی ہے؟" اس نے بات ٹال دی۔

"چھوڑ کر گئی بھی ہے اور نہیں بھی۔"

"کیا مطلب...؟"

"مطلب کہ ابھی اسے صرف دیکھا ہے' ہیلو ہائے نہیں ہوئی' اگر ہیلو ہائے ہو جاتی تو اس طرح چھوڑ کر نہ جاتی۔" وہ بات کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"کون ہے وہ؟"

"یہی تو پتا کرنا ہے ابھی' اور اسی سوچ نے تو چال کا رنگ بدل دیا ہے۔"

"گویا معاملہ ابھی صرف نظروں تک ہے؟"

"نظروں تک نہیں، نظر تک ہے، صرف میری نظر تک، اک نظر کا معاملہ دوسری نظر تک پہنچے تو تبھی نظروں کا معاملہ کہلاتا ہے اور فی الحال اس کی نظر میری نظر کے ساتھ شامل نہیں ہے، لیکن ان شاء اللہ بہت جلد شامل ہو ہی جائے گی۔" جودت شرارت سے کہہ کر ہنسا تھا۔

"بڑا یقین ہے؟"

"ہاں! کیوں نہیں، جسے خود پہ یقین نہ ہو وہ بھی کوئی آدمی ہے بھلا۔؟"

"اور تمہاری بات سن کے مجھے بھی ایک بات پہ یقین ہو گیا ہے۔" کومل نے گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

"کیسا یقین۔؟"

"یہی کہ جس نے تم سے آج نظر نہیں ملائی وہ تم سے کل بھی نظر نہیں ملائے گی۔" کومل کے انداز میں یقین تھا جودت سن کر بے ساختہ ہنس دیا۔

"میں پرانے دور کی لڑکی کی بات نہیں کر رہا، آج کے دور کی لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں بھی آج کے دور کی لڑکی کی بات کر رہی ہوں، اگر وہ واقعی۔ نظر نہ ملانے والی شریف گھرانے کی لڑکی ہے تو۔" کومل نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی کومل آپا۔"

"تم خود ہی تو کہتے ہو کہ میری نظر بھی تیز ہے اور اندازہ بھی درست ہے؟" کومل نے اسے جتایا تھا۔

"ضروری نہیں کہ ہر بار درست ہی ہو؟" جودت ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"او کے تو پھر ایسا کرنا جب وہ لڑکی تم سے نظر ملائے تم مجھے آکر ضرور بتانا۔" کومل نے اسے ہلکا پھلکا چیلنج دیا۔

"او کے منظور ہے۔"

"اگر نہ ملائے تب بے شک نہ بتانا۔" اس نے اپنی طرف سے جودت کے سامنے راستہ رکھا۔

"ہوں....!" وہ صرف ہوں کر کے رہ گیا تھا۔

"اندر چلو گے؟" کومل نے اندر جانے کے لیے پر تولے۔

"ہوں! چلیں۔" وہ اس کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے ثروت آنٹی تمہارا ہی پوچھ رہی تھیں۔"

"آپ نے کیا کہا؟"

"یہی کہ تم ابھی تک نہیں آئے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"پھر انہوں نے کیا کہا؟"

"تمہارے خیال میں کیا کہا ہو گا انہوں نے۔؟"

"برا بھلا۔"

"ہاہاہا۔" کومل اس کے جواب پہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی اور حویلی کی پر سکون، خاموش دیواریں اس کی ہنسی کی جلترنگاہٹ سے چمک اٹھی تھیں سناٹے میں آواز کا شگاف پڑتا چلا گیا تھا۔

"تمہارا ابھی اندازہ درست ہے۔" اس کی بات پہ جودت بھی ہنس پڑا تھا۔

"او کے گڈ نائٹ۔" سیڑھیوں کے قریب جا کر وہ رک گیا تھا کومل نے پلٹ کر اسے دیکھا ایک ہاتھ سیڑھیوں کے لکڑی سے بنے موٹے سے ستون پہ تھا اور ایک قدم پہلی سیڑھی پہ!

"کہاں جا رہے ہو اب؟"

"کچن میں۔"

"کیوں؟"

"بھئی! کھانا کھانے اور کیوں؟"

"جہاں سے آ رہے ہو، وہاں سے کھانا نہیں ملا؟" کومل نے خفگی سے کہا۔

"ملا تھا، لیکن میں نظر سے نظر ملانے کے چکر میں کھانا کھانا بھول گیا تھا۔ جب ہوش آیا، تب سارے مہمان کھانا کھا چکے تھے۔" جودت نے وجہ بتائی اور کومل خفگی سے گھورتی ہوئی اس کے پیچھے کچن میں ہی آگئی۔

"بیٹھو! میں کھانا نکال دیتی ہوں۔" اس نے کرسی کی سمت اشارہ کیا اور خود فریج کی طرف بڑھ گئی۔

"آج کل کیا مصروفیات ہیں موصوف کی۔؟" جودت نے ریموٹ اٹھا کر کارنر میں رکھا ٹی وی آن کر لیا۔

"موصوف؟ کس کی بات کر رہے ہو؟" وہ فریج سے سالن کا ڈونگا نکال کے پلٹی تو جودت سے پوچھا تھا۔

"اس گھر میں صرف ایک ہی "موصوف" ہیں، باقی سب تو لڑکے لڑکیاں ہیں پیاری آپا۔" وہ چینل سرچ کرتے ہوئے لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے ان کی مصروفیات کی کیا خبر۔؟ خبر تو تمہیں ہونی چاہیے، تم ان کے بھائی ہو۔" وہ اوون آن کرتے ہوئے بولی۔

"اب مجھ پہ اتنا برا وقت بھی نہیں آیا کہ میں اپنی گرل فرینڈز کو چھوڑ کر آپ کے موصوف کی خبر رکھنے لگوں، یہ کام آپ پہ ہی بجتا ہے۔"

"مجھ پہ کیوں بجتا ہے؟ میرا کیا تعلق ان سے؟" اس نے بے گانگی اور لاپروائی ظاہر کی۔

"اورے تعلق کیوں نہیں ہے؟ آخر کزن ہیں آپ کے۔"

"وہ صرف میرے ہی کزن نہیں ہیں، اور بھی بہت سے کزنز ہیں ان کے۔" وہ سالن گرم کر کے قریب آگئی۔

"او اچھا! تو آپ ان کو "صرف اپنا" دیکھنا چاہتی ہیں؟" جودت نے مطلب نکالا۔

"لیکن افسوس ایسا نہیں ہو سکتا، البتہ ایک حل ہے ان کو صرف اپنا دیکھنے کے لیے۔" وہ پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے مزے سے بولا، کومل اسے مسلسل گھور رہی تھی۔

"ان کے ساتھ رشتہ بدل لیں، کوئی نیا رشتہ استوار کریں پھر وہ صرف ایک کے۔"

"جودت! آرام۔ اور خاموشی سے کھانا کھاؤ، رات کے اس پہر بھی تمہاری زبان ایسے چل رہی ہے جیسے دن ابھی شروع ہوا ہو۔" کومل نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

"کیوں کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟" وہ معصومیت سے بولا۔

"کھانا کھا کر ٹی وی اور کچن بند کر دینا ورنہ صبح ڈانٹ پڑے گی، میں اب سونے کے لیے جا رہی ہوں۔" وہ کہہ کے باہر کی سمت چل دی۔

"یہ کہیے کہ میں اب جاگنے کے لیے جا رہی ہوں۔" اس نے پیچھے سے آواز دی۔

"اب ایسی بھی نوبت نہیں آئی کہ میں کسی کے لیے اپنی نیندیں قربان کرتی پھروں۔" کومل نے پلٹ کر اسے جواب دیا تھا۔

"آجائے گی نوبت، فکر نہ کیجیے۔" وہ بلند آواز سے بولا اور کومل مسکرا کر سر جھٹکتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"واؤ بیوٹی فل۔" وہ روش پہ سلور کلر کی جگمگاتی کرولا دیکھ کر بے ساختہ خوش ہوئی تھی اور نبیل حیات اس کی خوشی دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"تھینکس گاڈ! تمہیں پسند تو آئی۔" اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔
"میں اسے ڈرائیو کر سکتی ہوں۔" وہ گاڑی کے قریب آکر پوچھ رہی تھی۔
"وائے ناٹ۔۔۔" نبیل حیات نے ہاتھ میں پکڑی چابیوں میں سے ایک چابی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔
"واؤ! تھینک یو۔" وہ خوشی سے بہت نارمل ری ایکٹ کر رہی تھی۔
"یو ویلکم۔" نبیل بے ساختہ مسکرایا اور مدحیہ گاڑی کا ڈور کھول کر اندر بیٹھ گئی تھی۔
"کہاں جا رہی ہوں مدحیہ۔" فائزہ بیگم اچانک باہر آئی تھیں اور صبح صبح مدحیہ کو گاڑی اسٹارٹ کرتے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔
"لاہور کی سڑکوں پہ گاڑی اڑانے۔" اس نے شیشہ فولڈ کرتے ہوئے ماں کو جواب دیا۔
"لیکن اس وقت اس حلیے میں؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا مدحیہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی اس نے ابھی تک اپنا وائیٹ ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر اور بے بی پنک ہاف سلیو ٹاپ پہنا ہوا تھا۔ پیروں میں پنک کلر کی نرم سی قینچی چپل تھی اور سیاہ گھنے گھنگھریالے بال چہرے کا احاطہ کیے شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے وہ اس کا حلیہ دیکھ کر جز بز ہو رہی تھیں۔
"کیوں اس حلیے کو کیا ہوا ہے؟" اس نے لاپروائی سے پوچھا۔
"لیکن مدحیہ! نائیٹ ڈریس نائیٹ ڈریس ہی ہوتا ہے۔ چینج کر لو پھر چلی جانا۔" فائزہ بیگم نے اسے ٹوکا تھا۔
"مام پلیز! میرے فریش موڈ کو خراب مت کریں جینز اور ٹاپ کی بجائے ٹراؤزر اور ٹاپ پہننے میں کیا حرج ہے؟"
"مگر مدحیہ۔"
"پلیز مام۔" اس نے ماں کو روک دیا کہ وہ مزید اعتراض نہ کریں۔
"لیکن جا کہاں رہی ہو؟"
"دل آور بھائی کے گھر۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن وہ تو گھر پہ نہیں ہے۔" اب کی بار نبیل نے جواب دیا تھا۔
"کیا مطلب؟ کہاں ہیں وہ۔۔؟" وہ ٹھٹکی۔
"وہ کراچی گیا ہے کسی کیس کے سلسلے میں چند دن میں آجائے گا۔"
"مجھے تو نہیں بتایا انہوں نے۔۔۔؟"
"فون کیا تھا اس نے لیکن تمہارا نمبر بزی تھا اور اس کی فلائیٹ کا ٹائم بھی ہو چکا تھا۔"
"گئے کب ہیں؟"
"کل شام کو آج شاید اس کے کیس کی پہلی پیشی ہے۔"
"ہوں! اوکے میں ان سے فون پہ بات کر لوں گی۔" وہ کہہ کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے گاڑی نکال لے گئی تھی۔ اور جاتے جاتے ان دونوں کو ہاتھ بھی ہلایا تھا۔
لندن کی سڑکوں پہ تو اس نے بارہا ڈرائیونگ کی تھی لیکن آج اسے لاہور کی سڑکوں پہ ڈرائیونگ کرنے کا شوق ہو رہا تھا وہ بھی شاید اس لیے کہ نبیل عبداللہ اور دل آور اسے کئی بار یہ بات بتا چکے تھے کہ پاکستان کی سڑکوں پہ ڈرائیونگ کرنا جان جوکھم میں ڈالنے والی بات ہوتی ہے کیونکہ یہاں ٹریفک کا کوئی نظام نہیں ہے کوئی قانون نہیں ہے اسی لیے تو پاکستان میں ایکسیڈنٹ زیادہ ہوتے ہیں۔ اسے راستوں کا صحیح پتا نہیں تھا اسی لیے تو گاڑی بے سمت دوڑا رہی تھی لیکن یونہی بے ارادہ ہی ایک بڑی سی سویٹس شاپ دیکھ کر اسے بھوک کا احساس ہوا اور ناشتے

کا خیال آیا تھا اور اسی خیال کے تحت اس نے گاڑی کو یکدم بریک لگائے تھے اس کی گاڑی کے ٹائر چرچرا کے رہ گئے۔ لیکن ساتھ ہی یکدم ایک "ٹھا" کی آواز کے ساتھ مدحیہ کی گاڑی ہل کے رہ گئی تھی خود مدحیہ ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ اس نے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا کسی لڑکے نے اس کی گاڑی کو اپنی بائیک دے ماری تھی۔ وہ دیکھ کر غضب ناک ہوتی ہوئی خونخوار تیور لیے اپنی گاڑی سے نکل آئی اور گاڑی کے سامنے سے گھوم کر دندناتی ہوئی پیچھے کی طرف آئی تھی۔

"ایڈیٹ! اندھے ہوگئے ہو؟ تمہیں اتنی بڑی گاڑی دکھائی نہیں دی؟" سلو کی بائیک کو سنبھالتے عدیل نے اس تیز آواز پہ چونک کر اسے دیکھا۔ نظریں ٹھٹک گئی تھیں۔ اس کے سامنے غضب کا حسن تھا یا غضب کی جوانی تھی وہ فیصلہ نہیں کرپایا تھا۔

"کیا اب تمہیں سنائی بھی نہیں دے رہا؟" وہ تلملا کر بولی تھی۔

"غلطی آپ کی ہے میم، میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔؟" عدیل نے معصومیت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"میری غلطی۔۔؟ تم ہوش میں تو ہو؟ میں نے کہا تھا کہ میری گاڑی کو بائیک دے مارو؟"

"میم! آپ نے یہ بات کہی نہیں ہے لیکن اس پہ عمل ضرور کیا ہے' بیچ سڑک میں اچانک بریک لگا دینا اپنے ایکسیڈنٹ کے ساتھ ساتھ کئی اور ایکسیڈنٹ کروانے کے مترادف ہے' ابھی تو شکر ہے کہ میرے پیچھے اور کوئی گاڑی نہیں آرہی تھی۔ ورنہ مجھے کچلتے ہوئے آپ کو بھی اڑا کے لے جاتی۔" عدیل نے اسے اچانک بریک لگانے کا نقصان بتایا۔

"مجھے ٹالو مت' تم نے میری گاڑی کا نقصان کیا ہے۔ نقصان پورا کرو۔" اس نے چٹکی بجا کے اسے اشارہ کیا تھا۔

"اور جو میرا نقصان ہوا ہے وہ کون پورا کرے گا۔؟" عدیل بائیک کو دیکھ کر بولا۔

"آئی ڈونٹ نو' لیکن میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی' میری نئی نکور' زیرو میٹر گاڑی برباد کرڈالی ہے تم نے۔"

"آپ کو کس نے کہا تھا کہ زیرو میٹر گاڑی لے کر کے صبح صبح روڈ پہ آجائیں۔؟" عدیل آج خلاف مزاج بول رہا تھا۔

"مجھے زیرو میٹر گاڑی لے کر روڈ پہ آنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے تم؟" اس نے انگلی اٹھا کر غصے سے کہا تھا۔

"جی سمجھ گیا' آپ دیکھنے میں ہی خدائی فوجدار لگ رہی ہیں' آپ کو بھلا کس کی اجازت کی ضرورت ہے۔؟"

"اوہ یو شٹ اپ۔" وہ عدیل کے استہزائیہ انداز پہ سلگ اٹھی تھی۔

"کچھ اور نہیں کرسکتے تو بکواس بھی نہ کرو' میں تو تمہاری شکل دیکھ کر ہی پہچان گئی تھی کہ تم کتنے پانی میں ہو؟ بس بائیک پہ سوار خالی جیبیں لے کر ہیرو بنے پھر رہے ہو' میرا نقصان بھلا کہاں سے پورا کرو گے؟" مدحیہ نے اس کو شرمندہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

"آپ کی غلط فہمی ہے میم! میں بائیک پہ سوار ہیرو بننے کی ہرگز کوشش نہیں کررہا تھا۔ بس یہ بائیک کسی سے ایک دن کے لیے ادھار مانگی تھی' وہی دینے جارہا تھا کہ آپ بیچ میں آگئیں ویسے جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے' وہ کیا کہتے ہیں کہ خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آہی جاتی ہے۔ امیر لوگ غریبوں پہ غصہ بھی نہ کریں تو اور کیا کریں؟ پھر انہیں امیر کون کہے گا بھلا۔۔۔؟ اور انسان کے غصے کا کیا ہے' کہتے ہیں کہ انسان

کی تیوری کے تین بل تو نیند میں بھی نہیں جاتے' ہوش ہو تو پھر ہوش ہے گویا انسان نیند میں ہو تب بھی غصے میں ہی رہتا ہے۔" عدیل نے اسے جواب دیا تو وہ دنگ رہ گئی تھی وہ بائیک اٹھا کر سیدھی کرنے لگا اور پھر اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے سوار ہوگیا تھا۔

"ایم سوری میم میری جیبیں اس وقت واقعی خالی ہیں۔ اگر بھری ہوتیں تو آپ کا نقصان کھڑے کھڑے ہی پورا کردیتا۔ خیر پھر بھی ٹکرایئے گا تب آپ کا سارا نقصان پورا کردوں گا اور آئندہ کوشش کروں گا کہ میری جیبیں بھری رہیں ورنہ کل کو آپ جیسی کوئی اور حسینہ غریبی کا طعنہ دے کر دھتکار دے گی۔" وہ بائیک لے کر اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا مدحیہ ہکا بکا کھڑی تھی ابھی اس نے اپنے قدم واپس موڑے ہی تھے کہ وہی بائیک اس کے قریب دوبارہ آرکی تھی۔

"ایک بات کہنا تو بھول ہی گیا کہ آپ بے شک لندن پلٹ ہیں لیکن اپنے لندن پلٹ ہونے کا یوں پرچار تو مت کیجیے۔" اس نے مدحیہ کے ٹاپ کی طرف اشارہ کیا اس کا ٹاپ بے حد ٹائٹ تھا اور اس کے فرنٹ پہ بڑے بڑے حروف میں یو کے لکھا ہوا تھا جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں ہی اپنی طرف متوجہ کرلیتا تھا جیسے عدیل کو کیا تھا لیکن وہ نظر چرا گیا تھا مگر یہ ضروری تو نہیں تھا کہ ہر دیکھنے والا نظر چرا لیتا؟

"اصل یو کے تو پاکستانی بڑی مشکل سے دیکھ پاتے ہیں' لیکن اس یو کے کو ہر کوئی دیکھے گا' کسی کی نظر کو ویزے کی ضرورت نہیں پڑے گی' اس لیے احتیاط کیجیے۔ اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے بائیک کو کک لگاتا ہوا ہوگیا اور مدحیہ غصے سے لال پڑ گئی تھی اس نے بل کھا کے اپنی ہی گاڑی کو ٹھوکر دے ماری تھی۔

"باسٹرڈ! سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔؟ ایڈیٹ۔" مارے غصے کے جو اس کے منہ میں آیا کہتی گئی۔

☆ ☆ ☆

کسی نئی جگہ پہ سونے کی وجہ سے رات بھر نیند کا تسلسل نہیں بن سکا تھا وقفے وقفے سے نیند ٹوٹتی رہی اسی لیے وہ فجر کے وقت ہی اٹھ گیا تھا ڈھیلے ڈھالے قدموں سے کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا اس کا ارادہ پاہر گیٹ تک جانے کا تھا اسی لیے دائیں سائیڈ میں بنے کوارٹرز اور وسیع لان عبور کرکے روش پہ آیا تو قدم تھم گئے تھے گاڑیوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی اور اس قطار میں بلیک مرسیڈیز یوں جگمگا رہی تھی جیسے ابھی شو روم سے لا کر کھڑی کی ہو۔ اس کی چمک دمک ہی نرالی تھی۔

"یہ علیزے بی بی کی نئی گاڑی ہے' رات ہی شو روم سے آئی ہے' تم ہی نے یہ گاڑی ڈرائیو کرنی ہے۔" مبارک خان اس کے عقب سے نکل کر سامنے آیا تو اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا اور اسی لیے اس گاڑی کا تعارف کروا دیا تھا۔

"یعنی زیرو میٹر ڈرائیو کروں گا؟" منصور حسین مسکرا کر بولا۔

"بالکل جی عیش ہیں تمہارے۔" مبارک خان نے کندھے اچکائے۔

"پرائی چیز پہ عیش کیسے یار۔؟" اس نے گاڑی کی ونڈ اسکرین پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بے شک پرائی ہے۔ لیکن اختیار تو تمہارا ہی چلے گا نا؟ تمہارے پاس رہے گی تو تمہاری ہی نظر آئے گی۔"

"چل یار دل کو بہلانے کے لیے خیال اچھا ہے۔" منصور حسین سر جھٹک کر ہنسا اور مبارک خان کے ساتھ گیٹ سے نکل آیا تھا۔

"السلام علیکم۔" چوکیدار عارف نے ان دونوں کو دیکھ کر سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہو؟" منصور حسین بڑی تمیز سے پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے مختصر سا کہا۔
"لگتا ہے ناراض ہو مجھ سے۔؟" اس کی بات پہ مبارک خان مسکراہٹ دبا گیا تھا۔
"میں نے کیوں ناراض ہونا ہے بھلا؟" عارف نے کندھے اچکائے۔
"چلو جو بھی ہے ایسا کرو کہ پچھلی خفگی والی باتوں کو بھول کر آج سے دوستی کر لیتے ہیں' اب تو ہم لوگ نے ساتھ ہی رہنا ہے۔" منصور حسین نے عارف کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔
"ہوں! یہ بھی اچھی بات ہے' عارف کر لو دوستی' منصور حسین دل کا برا نہیں ہے' بس غصے کا اور زبان کا تیز ہے۔" مبارک خان نے ہاں میں ہاں ملائی اور عارف نے جز بز ہوتے ہوئے منصور حسین سے ہاتھ ملا لیا تھا۔
"شاباشا۔" مبارک خان نے اسے تھپکی دی۔
"مبارک خان۔۔۔۔!" آذر جاگنگ کے لیے نکلا تو گیٹ پہ آج پھر ان لوگوں کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔
"جی صاحب؟"
"یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔"
"کچھ نہیں صاحب' ابھی ابھی سو کر اٹھے ہیں تو باہر ذرا تازہ ہوا کھانے کے لیے آ گئے۔"
"تازہ ہوا کھانے کے لیے تم لوگوں کو گیٹ کے سوا کوئی اور جگہ نہیں ملی؟" اسے ان سب کا گیٹ پہ کھڑے ہونا اچھا نہیں لگا تھا۔
"صاحب' ہم پارک تک جانے والے تھے کہ عارف کو دیکھ کر اس کے پاس رک گئے۔" مبارک خان صفائی پیش کر رہا تھا۔
"ٹھیک ہے جہاں جانا ہے جاؤ' لیکن یہاں لوفروں کی طرح کھڑے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' آس پاس کے لوگ دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔۔۔؟" آذر نے اسے جھڑک دیا تھا۔
"جی صاحب ابھی چلے جاتے ہیں۔" مبارک خان نے سر جھکا کر کہا۔
"ہوں! جاؤ۔" اس نے سر ہلایا اور پھر ذرا ٹھہر کر انہیں دیکھا۔
"رکو! ادھر آؤ۔" اس نے ان دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا تھا۔
"تم کون ہو۔۔۔؟" آذر نے چند روز پہلے بھی اسے گیٹ پہ دیکھا تھا لیکن نام بھول گیا تھا۔
"جی! میں منصور حسین ہوں۔"
"کون منصور حسین؟"
"علیزے بی بی کا نیا ڈرائیور ہے یہ' منصور حسین۔" مبارک خان ہر بار اس کی مشکل آسان کر دیتا تھا۔
"علیزے کا ڈرائیور؟" آذر کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔
"لیکن علیزے کا ڈرائیور۔۔۔۔" آذر کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔
"بڑے صاحب نے اسے کام پہ رکھا ہے' علیزے بی بی کی حفاظت کے لیے پستول بھی دیا ہے۔"
"ہیں۔۔۔۔؟ یہ سب کیا چکر ہے؟" آذر سوچ میں پڑ گیا تھا۔
"ہم جائیں صاحب؟"
"ہوں۔" وہ محض سر ہلا کے رہ گیا تھا۔ منصور حسین اور مبارک خان چلے گئے جبکہ آذر جاگنگ پہ جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اندر آ گیا تھا اس کا رخ آنی اور ڈیڈ کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ دستک دے کر اجازت ملنے کا انتظار کرنے لگا۔
"ویلیس کم ان۔" وقار آفندی کی آواز سنائی دی تھی آذر دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا تھا۔

"السلام علیکم۔"
"وعلیکم السلام! خیریت تم اس وقت یہاں؟" انہیں صبح صبح آذر کو اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی۔
"جی خیریت ہی ہے' آپ آرام سے تیاری کر لیں' میں انتظار کر لیتا ہوں۔" وہ صوفے کی طرف بڑھ گیا۔
"میری تیاری ہوتی رہے گی۔ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔؟" وہ اپنا کوٹ اور ٹائی بیڈ پہ ڈال کے اس کے سامنے آ بیٹھے۔
"آپ نے علیزے کے لیے ڈرائیور رکھ لیا ہے؟"
"ہوں! رکھ لیا ہے۔"
"مطمئن ہیں آپ؟"
"آف کورس بیٹا' مطمئن ہوں تبھی تو رکھا ہے۔"
"لیکن ڈیڈ ایم سوری' میں مطمئن نہیں ہوں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"غیر مطمئن ہونے کی وجہ؟"
"بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں' آپ بس اسے فارغ کریں' ہم کوئی اور ڈرائیور رکھیں گے۔" آذر کے لہجے میں خفگی اور ناگواری تھی۔
"تو وہ وجوہات بیان کرو نا بیٹا' بغیر کسی ٹھوس وجہ کے میں اسے نہیں نکال سکتا' کام پہ رکھا ہے اسے' زبان دی ہے' کل سے آیا ہوا ہے' حویلی میں رات گزار چکا ہے' اب صبح اٹھ کر بغیر کسی وجہ کے میں اسے کہہ دوں کہ ہم تمہیں کام پہ نہیں رکھ سکتے' تم اپنا بوریا بستر سمیٹو اور چلتے پھرتے نظر آؤ' کیا یہ سب اچھا لگے گا۔؟" انہوں نے آذر کو سمجھانے کی کوشش کی اور آذر انہیں سمجھانے کی کوششوں میں تھا۔
"دیکھیے ڈیڈ! میں اتنے جوان جہان مرد کو کام پہ رکھنے کے حق میں نہیں ہوں گھر میں جوان بیٹیاں ہیں' اور علیزے۔۔۔۔۔ کیا وہ اکیلی اس کے ساتھ آیا جایا کرے گی؟" اس کی ایک وجہ سن کر وقار آفندی بے ساختہ مسکرا دیئے تھے۔ انہیں اس کی بات سمجھ آ گئی تھی کہ اصل مسئلہ منصور حسین کی جوانی ہے۔۔۔۔!
"دیکھو بیٹا میں نے اسے اسی لیے کام پہ رکھا ہے کہ وہ "جوان جہان مرد" ہے' اگر خدانخواستہ پھر علیزے پہ کوئی حملہ ہو جاتا ہے تو وہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ تو کر سکتا ہے نا؟ خیرو بابا بوڑھے اور کمزور تھے انہیں تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ حملہ آور ہی انہیں اٹھا کر ہسپتال لے جا رہا ہے' منصور حسین جوان اور بہادر مرد ہے' میں نے اس کی چند باتوں سے اسے جج کیا ہے وہ بے خوف اور نڈر ہے' مشکل وقت پڑ گیا تو جھکے گا نہیں' ڈٹ جائے گا' تم بے فکر رہو' رہی بات اس کے جوان ہونے کی تو ایک بات یاد رکھو' شریف اور ایماندار آدمی کا جوانی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی' اور وہ مجھے ایماندار لگا ہے۔" وقار آفندی نے آذر کو تفصیل سے سمجھاتے ہوئے تسلی دی تھی۔
"ڈیڈ! کسی کے ماتھے پہ نہیں لکھا ہوتا کہ وہ ایماندار ہے۔"
"لیکن بیٹا! ایماندار کی آنکھوں میں ضرور لکھا ہوتا ہے کہ وہ ایماندار ہے' ایماندار کی آنکھ کبھی نہیں جھکتی' میں نے منصور حسین کی نظر جھکتے ہوئے نہیں دیکھی۔"
"آپ اس کے اتنے حامی کیوں ہو رہے ہیں؟"
"بیٹا! اس کے خلاف ہونے کی وجہ بھی تو نہیں ہے؟"
"گویا آپ اسے کام سے نہیں نکالیں گے؟"
"یقیناً۔" ان کے جواب پہ آذر لب بھینچتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔
"مبارک خان کو کام پہ رکھتے ہوئے بھی تمہیں ایسے ہی وہم اور اعتراض ہوئے تھے اور آج وہی مبارک خان

ہے جس پہ ہمیں تمام ملازموں سے زیادہ اعتماد ہے اور اس کے بغیر ہمارے سارے کام ادھورے ہیں۔" وقار آفندی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا تھپکا تھا۔

"لیکن ڈیڈ۔"

"پلیز مائی سن! چند روز اس کا کام دیکھو' اس پہ چیک رکھو' پھر کچھ برا لگے تو بے شک کام سے نکال دینا' بس چند دن میری زبان کا پاس رہنے دو۔" انہوں نے کچھ اس انداز سے کہا کہ آذر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

"وقار! اتنا لیٹ کیوں ہو گئے ہیں آپ؟ ناشتا لگ چکا ہے' علیزے اور..." آسیہ آفندی اپنے دھیان میں بولتی ہوئی اندر آئی تھیں لیکن ان کے ساتھ آذر کو دیکھ کر رک گئی تھیں۔

"گڈ مارننگ۔" آذر نے آہستگی سے انہیں وش کیا۔

"گڈ مارننگ مائی سن' کیا بات ہے' تم اس وقت یہاں...؟" وہ صبح صبح اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر پریشان ہوئی تھیں۔

"ڈونٹ وری! کسی کام سے آیا تھا' اوکے ڈیڈ چلتا ہوں اب۔" آذر نے آسیہ آفندی سے کہہ کر وقار آفندی سے کہا تھا۔

"اور ناشتا...؟" آسیہ آفندی نے پیچھے سے آواز دی۔

"جی میں آرہا ہوں بس شاور لے کر تیار ہو جاؤں۔" اس نے پلٹ کر جواب دیا اور باہر نکل گیا تھا۔

"وقار کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی' کوئی مسئلہ ہے کیا؟" آسیہ آفندی کو بھی اب ہر وقت کھٹکا ہی لگا رہتا تھا۔

"ارے! اس نے تمہیں بتایا تو ہے کہ کوئی بات نہیں ہے' بس کسی کام سے آیا تھا۔" وہ اپنی ٹائی اٹھا کر آئینے کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے' آج ان کی میٹنگ تھی اسی لیے کافی اہتمام سے تیار ہو رہے تھے۔

"آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"اگر تم ایسا سمجھ رہی ہو تو ایسا ہی سہی۔" وہ ذرا متبسم سے انداز میں بولے تھے۔

"وقار! میں واقعی پریشان ہو رہی ہوں۔" انہوں نے خفگی سے کہا تھا۔

"مجھے حیرت ہو رہی ہے یہ دیکھ کر کہ وقار آفندی کی بیوی اتنی بے وقوف اور کم عقل بھی ہو سکتی ہے۔" وہ ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے آسیہ آفندی کی طرف پلٹے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ ناسمجھی سے دیکھ رہی تھیں۔

"کم عقل خاتون! اگر علیزے کے حوالے سے کوئی پریشانی والی بات ہوتی تو کیا میں تمہیں اس طرح بے فکر اور ریلیکس نظر آتا۔" انہوں نے آسیہ آفندی کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر جس قدر پر سکون انداز میں کہا وہ واقعی مطمئن ہو گئی تھیں۔

"شکر ہے اللہ کا' ورنہ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔"

"کم عقل جو ہو۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"محبت کم عقل بنا دیتی ہے۔" آسیہ آفندی کہہ کر پیچھے پیٹ گئیں اور وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے تھے وہ پیچھے ان کا کوٹ اور بریف کیس بھی اٹھا کے نیچے لے آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ ویکیوم سے قالین اور کارپٹ صاف کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ باہر ڈور بیل بجنے لگی' کچن میں جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے وہ مختصر سا کوریڈور عبور کر کے بیرونی مین ڈور کے پاس آگئی اور ہول سے دیکھتے ہوئے باہر جھانکا تھا۔ سامنے نگارش کا چہرا نظر آیا تھا زری کھل اٹھی تھی اس نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا تھا۔

"بھابھی۔" اس نے نگارش کو اندر بھی نہ آنے دیا اور وہیں اس سے لپٹ گئی تھی۔

"اللہ خیر کرے کیا ہو گیا ہے؟ اتنی بے قرار کیوں؟" نگارش نے حیرانی سے اسے تھپکتے ہوئے پوچھا۔

"آئی ریئلی مس یو۔" زری نے بچوں کی طرح بڑی معصومیت سے اظہار کیا تھا۔

"ریئلی...؟" نگارش نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"آف کورس۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یقین تو نہیں آرہا۔" نگارش بے یقینی سے کہتی ہوئی اندر آگئی عبداللہ اسے گھر ڈراپ کر کے کام پہ چلا گیا تھا۔

"بے یقینی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں...؟"

"جو بندہ ہر وقت' ہر لمحہ' ہر آن کسی ایک کی یاد میں قید رہتا ہو' اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے لیے اس یاد کے حصار سے باہر آیا ہوگا؟ اسے ایک یاد سے فرصت ملے گی تو وہ دوسرے کو ٹائم دے گا نا؟" نگارش سچ ہی تو کہہ رہی تھی' لیکن جھوٹی تو زری بھی نہیں تھی۔ اس نے حقیقتاً اسے بہت مس کیا تھا۔

"یعنی میں آپ سے جھوٹ بول رہی ہوں...؟" زری کا انداز خفگی لیے ہوئے تھا۔

"خیر جھوٹ تو تم نہیں بول رہیں' لیکن سچ ماننے پہ دل آمادہ بھی نہیں ہے۔" نگارش نے کندھے اچکائے۔

"جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔" وہ ناراضی سے پلٹ کر کچن میں چلی گئی۔

"ارے میری جان! اس میں ناراضی والی کیا بات ہے؟ جو سچ ہے وہی تو کہا ہے' تم اسے یاد کرتی ہو تو اپنا آپ بھول جاتی ہو' پھر کیسے ممکن ہے کہ تمہاری یادوں کی راہ گزر سے ہم غریبوں کا بھی گزر ہو سکے...؟" نگارش نے آکر اس کے رخسار کو چھو کر اسے چھیڑا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے بھابھی' جو مقام آپ کا ہے' وہ صرف آپ کا ہے' محبت اپنی جگہ اور رشتے اپنی جگہ۔ اور ضروری نہیں کہ جس راہ گزر سے ایک گزرے اس سے دوسرا نہ گزرے' آخر راہ گزر کا نام کیا ہے؟ راہ گزر۔ یعنی اس سے کوئی بھی گزر سکتا ہے' سب کے لیے یکساں ہوتی ہے' آپ گزرو' وہ گزرے' کوئی اور گزرے' بس فرق اتنا ہے کہ کبھی کبھی کوئی گزرنے والا اپنے قدموں کی دھمک چھوڑ جاتا ہے وہ بھی ایسا ہی گزرنے والا ہے جو اپنے قدموں کی دھمک چھوڑ گیا ہے۔" زری دھیمے سے بول رہی تھی اور نگارش اس کی بات کی گہرائی میں کھو سی گئی تھی۔

"کتنا خوش قسمت ہے دل آور شاہ۔" نگارش کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"بھابھی...؟" زری یوں بہانگ دہل اس کا نام سن کر لرز گئی تھی۔

"کب تک چھپاؤ گی؟"

"جب تک وہ چھپے گا۔"

"وہ ساری عمر چھپے گا؟"

"تو میں ساری عمر چھپاؤں گی۔"

"زری کبھی گہرائی میں جا کر سوچا ہے تم نے کہ اگر کبھی خلاف آرزو کچھ ہو گیا تو؟" نگارش نے ڈرتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"تو دنیا موحی کی زلیخا ہی یاد ہے مجھے۔"

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟"

"دنیا نے جب کسی کو ایسا نا سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ پاگل ہی ہو جاتا ہے۔" زری نے سر جھکایا' نگارش اس کی بات پہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم ہوش میں تو ہو......؟"

"آپ جانتی بھی ہیں کہ جب وہ میرے حواسوں پہ طاری ہوتا ہے تو میرے ہوش میرے ساتھ نہیں رہتے۔" وہ بکن سمیٹتے ہوئے ہلکے سے مسکرائی۔

"کسی سے اندھا دھند محبت کرتے ہوئے یہ بات بھی نظر میں رکھنی چاہیے کہ جس سے تم محبت کرتے ہو' وہ کس سے محبت کرتا ہے' آپ سے؟ یا آپ کے کسی رقیب سے؟" نگارش نے سمجھانے کے لیے دلیل دی۔

"وہ میرے سوا کسی اور سے محبت نہیں کر سکتا۔"

"اتنا یقین کس بات پہ ہے؟"

"میں نے اس کی کاٹ دار آنکھوں کو کئی بار اپنے لیے جھکتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تمہارے احترام میں جھک جاتی ہوں۔؟"

"ہر گز نہیں! وہ میری محبت کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔"

"تو پھر ابھی تک اس نے کوئی پیش رفت کیوں نہیں کی۔؟" نگارش وہموں میں پڑی ہوئی تھی۔

"شاید اس لیے کہ اسے پتا ہے کہ زری صرف اسی کی ہے' جب بھی ہاتھ بڑھائے گا کھنچی چلی آئے گی۔" آج زری کی سرشاری اس کے انگ انگ سے بول رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ میرے پیچھے کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟" نگارش اسے بغور دیکھتی ہوئی پاس چلی آئی تھی۔ زری نے بے ساختہ پلکیں جھکالی تھیں۔

"آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔" زری نے الیکٹرک کیٹل آن کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! یعنی واقعی کوئی بات ہوئی ہے؟" نگارش کو سگنل مل گیا تھا۔

"کوئی بات نہیں ہوئی بھابھی جی۔"

"کوئی تو بات ہوئی ہے نند جی' سرخ ہونٹوں پہ گلابی تبسم محبوب کی کسی ادا کی نشانی معلوم ہوتا ہے' خاموش ہونٹوں پہ مسکراہٹ بے معنی نہیں ہوتی۔" نگارش نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرا سامنے کیا تھا۔ زری نہ پلکیں اٹھا سکی اور نہ ہی اپنی مسکراہٹ روک سکی تھی۔

"بتاؤ بھی۔" اس نے اصرار کیا۔

"اس کا فون آیا تھا۔"

"ہیں۔؟" نگارش اچھل پڑی تھی۔

"کب؟"

"دو دن پہلے۔"

"فون کس لیے آیا تھا؟ کیا کہا اس نے؟"

"کہا تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ مدحیہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"مدحیہ بات کرنا چاہتی ہے' کیا مطلب ہے اس کا؟"

"مدحیہ اور نبیل اس کے ساتھ ہی تھے' مدحیہ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس اپنا سیل نہیں تھا اس لیے مدحیہ نے اس کے نمبر سے مجھے کال کی' اتنی دیر میرا سیل بجتا رہا اور اسکرین پہ اس کا نام جگمگاتا رہا' میں دیکھتی ہی رہی اور کال بند ہو گئی' پھر اس نے دوبارہ کال کی' میں نے ڈرتے ڈرتے ریسیو کی تو دوسری طرف وہی بھاری گمبھیر آواز تھی جو دل کے نہاں خانوں میں ہر لحہ گونجتی رہتی ہے۔" زری اس کا ذکر نہیں کرتی تھی ورد کرتی تھی ایک دن میں لاکھوں بار۔!

"بس اتنی سی بات تھی....؟" نگارش مایوس ہو گئی۔

"یہ اتنی سی بات ہے؟"

"تو اور کیا ہے؟" نگارش گھور کے بولی۔

"بہت کچھ ہے میرے لیے' میں نے اس کی اور اس نے میری آواز تو سنی ہے نا؟"

"صرف آواز سنی ہے' بات تو نہیں کی نا؟"

"بات کا کیا ہے وہ تو ہم دن میں ہزاروں بار کرتے ہیں۔" وہ آہستگی سے مسکرائی۔

"اف! ایک تو تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاگل کرو گی۔" نگارش نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

"بھابھی! محبت تو آپ نے بھی کی ہے' ایسا پاگل پن آپ پہ کیوں سوار نہیں ہوا۔؟" وہ معصومیت سے سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

"کیونکہ میں تمہاری جیسی بے وقوف نہیں تھی۔"

"میں بے وقوف ہوں؟" زری آنکھیں پھیلا کر بولی۔

"تو سیانی کہاں سے ہو؟"

"یہاں سے۔" اس نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"اوکے اوکے تم جیتیں' میں ہاری' جلدی سے چائے لے آؤ' میرا سر درد کرنے لگا ہے۔" نگارش اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور زری اس کے انداز پہ یکدم کھلکھلا کر ہنسی تھی اور دو کپوں میں چائے انڈیل کر باہر اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

"میری محبت کی تذکرے سے ہی آپ کا سر درد کرنے لگا ہے؟" وہ اسے کپ تھماتی ہوئی بولی۔

"تمہاری محبت آگے نہیں بڑھ رہی' بس یہی سوچ سوچ کر سر درد کرنے لگا ہے' کوئی نشوونما نہیں ہو رہی اس کی۔" نگارش کی بات پہ زری کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"یہ کس چیز سے تشبیہ دے دی میری محبت کو۔" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بچے سے۔" اس کا جواب مختصر تھا۔

"بچے سے؟" زری کو اچنبھا ہوا۔

"بچہ پیدا ہوتا ہے' محبت بھی پیدا ہوتی ہے' بچہ آنکھیں کھولتا ہے تو دنیا کو دیکھتا ہے' محبت آنکھیں کھولتی ہے تو محبوب کو دیکھتی ہے' بچہ دنیا کو دیکھ کر روتا ہے' واویلا کرتا ہے' محبت محبوب کو دیکھ کر مسکراتی ہے' لجاتی ہے' پھر بچہ بڑا ہونے لگتا ہے' پھر محبت بھی بڑھنے لگتی ہے' بچہ سالوں میں بڑا ہوتا ہے' محبت دنوں میں بڑھتی ہے' دونوں کے قد نکلنے لگتے ہیں' پاؤں پاؤں چلنے لگتے ہیں' بچے کی ضدیں بڑھتی ہیں اور محبت کی خواہش بڑھتی ہیں دونوں کو دیکھو تو ایک جیسے ہی دکھائی دیتے ہیں' ضدی بھی اور معصوم بھی۔ بچوں کی نشوونما رک جائے تو ماؤں کو فکر ہو جاتی ہے' ڈاکٹرز کو دکھاتی ہیں' ان کی خوراک بڑھاتی ہیں۔ اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں تمہاری محبت کی نشوونما رکی ہوئی ہے' اس کو ڈاکٹر کو دکھاؤ اور خوراک بڑھاؤ۔" نگارش نے اسے طویل مثال دی اور ساتھ میں مشورہ مفت۔!

"کون ڈاکٹر۔؟" زری نے نا سمجھی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر دل آور شاہ۔"

"واٹ؟ ڈاکٹر دل آور شاہ؟"

"آف کورس یار' بے شک وہ وکیل ہے لیکن تمہارے مرض کا وہی ڈاکٹر ہے' اسے اپنی محبت کا مرض دکھاؤ' الٹیف بیان کرو' وہ خوراک بڑھا دے گا' یا ہمی مشورے سے بڑا فائدہ ہو گا تمہیں دیکھ لینا۔"

"بھابھی کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟"
"میں چاہتی ہوں کہ تمہارا علاج شروع کیا جائے۔"
"علاج....؟"
"مطلب شادی۔" نگارش نے علاج کے لفظ کا مفہوم بتایا۔
"مگر بھابھی۔"
"بس کوئی اگر مگر نہیں، میں آج عبداللہ سے ضرور بات کروں گی۔"
"لیکن ابھی یہ سب مناسب نہیں ہے بھابھی۔" زری پریشان ہوا ٹھی۔
"غیر مناسب بھی نہیں ہے، محبت کے کسی بھی معاملے میں دیر نہیں کرنی چاہیے، تمہیں کیا پتا۔ محبوب کتنے جلد باز ہوتے ہیں۔؟"
نگارش نے اسے سمجھایا تھا۔
"مگر وہ بی جان اور بابا جان۔؟" زری متفکر تھی۔
"ان کو عبداللہ ہینڈل کرلیں گے' ڈونٹ وری ٹرائی تو کرنے دو' عبداللہ بھلا اس معاملے میں کیا کہتے ہیں؟"
نگارش کی بات پہ وہ جز بز ہوتی' چپ ہو گئی تھی وہ مطمئن نہیں تھی جبکہ نگارش نے ارادہ باندھ لیا تھا۔
"بتول آنٹی سے بھی بات کروں گی۔"
"آپ ہوش میں تو ہیں؟ ان سے کیا بات کرنی ہے؟" وہ بدک گئی۔
"یہی کہ وہ بیٹے کی شادی کے معاملے میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھے کیوں بیٹھی ہیں؟"
"بھابھی! ان کا بیٹا ہے' وہ بہتر جانتی ہوں گی کہ کب کیا کرنا ہے؟"
"ان کا بیٹا ہماری بیٹی کے دل کا چور ہے' ہمارا ہونے والا داماد ہے' ہم کیوں نہ بات کریں اس کے بارے میں؟"
تھوڑی دیر پہلے نگارش اسے سمجھا رہی تھی اور اب خود اس کے ساتھ مل کر سہانے خواب سجانے میں مدد کر رہی تھی۔ داماد کے لفظ پہ زری لال ہو گئی تھی۔
"اگر میں اپنے مشن میں کامیاب ہو گئی تو کیا انعام دو گی؟" نگارش شرارت اور معنی خیزی سے پوچھ رہی تھی۔
"اپنے دس تولے کے کنگن آپ کی کلائیوں میں سجادوں گی۔" زری نے سرشاری سے کہا۔
"واؤ! پھر تو بیٹھے بیٹھے امیر ہو جاؤں گی۔" وہ شرارت سے ہنسی۔
"ویسے یار آپس کی بات ہے آج کل دس تولے کے کنگن کتنی مالیت کے ہوں گے۔" نگارش نے رازدارانہ انداز میں پوچھا اور زری اس کے انداز پہ ہنس پڑی تھی' نگارش اب پتا نہیں کیا کیا منصوبے بنا رہی تھی۔

آج صبح اس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی اسی لیے نماز کا وقت لیٹ ہو گیا تھا لیکن پھر بھی وہ عجلت میں اٹھی اور سیدھی واش روم میں چلی گئی۔ جلدی جلدی وضو کیا اور قضا نماز ادا کرنے کھڑی ہو گئی تھی لیکن گہری نیند سے اچانک ہڑبڑا کر اٹھنے اور فوری طور پر وضو کرنے سے اس کی طبیعت پہ برا اثر پڑا تھا چند منٹوں میں ہی اسے چھینکیں شروع ہو گئی تھیں اور چھینکوں کے ساتھ زکام کے اثرات بھی اجاگر ہونے لگے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یقیناً" تھوڑی دیر اور بستر میں لیٹ کر آرام کر لیتی' لیکن وہ پہلے ہی لیٹ اٹھی تھی اسے آج کالج بھی جانا تھا اس لیے مزید لیٹ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ جیسے تیسے ہی سہی کالج کے لیے تیار ہونے لگی تھی۔ یونیفارم پہنا' سینڈل پہنے' اسکارف لپیٹا' اپنا سارا بیگ چیک کیا اور پھر مطمئن ہو کر نیچے آ گئی لیکن چھینکوں نے ابھی بھی اس کا برا حال کر رکھا تھا کچھ ہی دیر میں آنکھیں اور ناک سرخ ہو گئی تھیں اور اس کی یہ حالت دیکھ کر ڈائننگ روم میں موجود تقریباً" سبھی افراد پریشان ہو گئے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا تم ٹھیک تو ہو؟" وقار آفندی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
"ڈونٹ وری پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں' بس وہ شاید ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے کی وجہ سے فلو ہو گیا ہے۔" وہ ٹشو سے اپنی آنکھیں اور ناک پونچھتی ہوئی انہیں تسلی دے رہی تھی۔
"ٹھنڈے پانی سے کیوں؟ رجو نے گیزر آن نہیں کیا تھا؟ رجو! ادھر آؤ۔" وہ پریشانی سے غصے میں آ گئے تھے۔
اٹس او کے پاپا' تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی' رجو کو گیزر آن کرنے سے میں نے ہی منع کیا تھا۔ موسم چینج ہو چکا ہے' اب گرم پانی اچھا نہیں لگتا۔" علیزے نے رجو کی بچت کرا دی ورنہ واقعی اس کی شامت آ جاتی' موسم چاہے جیسا بھی ہوتا علیزے کو زیادہ ٹھنڈا پانی سوٹ نہیں کرتا تھا اور رجو آج گیزر آن کرنا بھول گئی تھی۔
"ڈاکٹر کو بلا لوں؟ میڈیسن سے جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی؟" پریشانی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔
"پاپا! ایم فائن' پلیز کول ڈاؤن۔" اس نے ان کا بازو تھام لیا تھا۔
"بیٹھیے اور ناشتا کیجیے۔" اس نے انہیں کرسی پہ بٹھا دیا اور خود بھی کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی تھی۔
"آج ناشتے میں جوس مت لو' ہاف بوائل انڈے کے ساتھ ڈرائی کیک یا شہد لے لو۔" وقار آفندی اپنا ناشتا بھول کر اس کے ناشتے کی فکر میں تھے۔
"نہیں! ملک شیک ہی ٹھیک ہے۔ آچھ" کہتے کہتے اسے چھینک بھی آ گئی۔
"لیکن بیٹا....؟"
"نو پاپا! پلیز موڈ نہیں ہے۔" اس نے لجاجت سے کہا اور پھر رجو کو ملک شیک لانے کا آرڈر دیا تھا۔
"جی ابھی لے کر آئی۔" رجو پلٹ گئی تھی۔
"اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو کالج مت جاؤ' کل چلی جانا۔" آذر نے بھی لب کشائی کی تھی' کومل نے بے ساختہ پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ اسے دیکھ رہا تھا اس کا من جل اٹھا' رواں رواں میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔
"نہیں! آج بہت اہم کلاسز ہیں' میں اپنی فرینڈ کو بتا چکی ہوں کہ آج میں کالج آ رہی ہوں۔" اس نے انکار کر دیا۔
"تو پھر اپنا بہت سا خیال رکھنا بیٹا' چھوٹی سی تو ہو' ہمیں تو ڈر ہی لگا رہتا ہے۔" اسرار آفندی تاکید کرتے ہوئے مسکرا کر بولے تھے اور کومل وہاں سے جلتی بھنتی ہوئی سب سے پہلے اٹھ گئی تھی۔ اس کے بعد اسرار آفندی اور احمد بھی چلے گئے علیزے بھی جوس ختم کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"میں ڈراپ کر دیتا ہوں تمہیں۔" آذر نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"نہیں تھوڑی دیر کے لیے پک اینڈ ڈراپ لے کر اپنی عادت نہیں بگاڑ سکتی' میری گاڑی اور میرا ڈرائیور تیار ہیں میں چلی جاؤں گی' آپ فکر نہ کریں' گڈ بائے۔" وہ آہستگی سے مسکرا کر کہتی ان سب کو ہاتھ ہلا کر باہر نکل آئی۔
"میرا بیگ....؟" اس نے پلٹ کر رجو کو دیکھا۔
"جی! میں گاڑی میں رکھ آئی ہوں۔" اس کا بیگ گاڑی تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی رجو کی تھی۔ علیزے سر ہلا کر کوریڈور کی سمت بڑھ گئی۔ طویل و عریض کوریڈور عبور کر کے باہر نکلی تو اپنی گاڑی کی تلاش میں نظر دوڑائی تھی اور بہت سی گاڑیوں میں بلیک مرسیڈیز اسے دور سے ہی نظر آ گئی تھی وہ روش کا اتنا لمبا راؤنڈ لے کر گاڑی تک پہنچی اور گاڑی کا ڈور کھولنے کے لیے ڈرائیور کو متوجہ کیا تھا جو گاڑی کی چھت پہ بازو ٹکائے اس کی سمت پشت کیے جانے کس سوچ میں غرق تھا کہ آواز ہی نہ سن سکا۔ اور وہ دوبارہ پکارنے پہ مجبور ہوئی تھی۔
"ڈرائیور۔۔!!"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

بشریٰ احمد

ان کے پورے گھرانے کو دوسروں پر تبصرہ کرنے کا بہت شوق تھا۔

احتشام الدین گھر کے سربراہ تھے۔ مین بازار میں کراکری کی سب سے بڑی دکان ان ہی کی تھی۔ پچھلے چار برس سے انجمن تاجران کے صدر منتخب ہوتے آ رہے تھے۔ اپنی سمجھ بوجھ پر انہیں بہت مان تھا۔ بازار میں دوسرے دکانداروں کے ساتھ مل کر سیاست اور سیاست دانوں پر تبصرے فرماتے تو گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ مل کر خاندان برادری کے افراد کا تمسخر اڑاتے۔ انہیں ہر کوئی اپنے سے کم حیثیت لگتا تھا۔ یہی حال ان کے بیوی بچوں کا تھا بظاہر لوگوں سے بہت خوش اخلاقی سے پیش آتے لیکن پیٹھ پیچھے خاندان والوں اور رشتہ داروں کا خوب ہی مذاق اڑاتے کیسا لطف آتا تھا لوگوں کا ٹھٹھا اڑانے میں۔

"امی آج ندرت باجی کو دیکھا آپ نے پارلر سے بال سیٹ کروا کر آئی تھیں آج کی تقریب میں اور یوں لگ رہا تھا جیسے سر پر چڑیوں کا گھونسلہ سجا رکھا ہے۔"

یہ فریحہ صاحبہ تھیں احتشام الدین اور نصرت بیگم کی منجھلی صاحبزادی اپنی خوب صورتی پر انہیں بہت ناز تھا مگر دوسرا کوئی خوب صورت لگنے کا جتن کرے وہ ان کے تبصروں کی زد میں آئے بغیر نہ رہ پاتا تھا۔

"بس لوگوں کو سینس ہی نہیں ہے۔ جو فیشن اخبار ٹی وی میں دیکھ لیں فٹ نقالی پر اتر آتے ہیں یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یہ چیز ان پر سوٹ کرے گی بھی یا نہیں۔" فریحہ سے بڑی عروج نے اپنے سلکی بالوں میں نزاکت سے انگلیاں چلاتے ہوئے کہا آج سب لوگ احتشام الدین کے چچازاد بھائی کے بیٹے کی منگنی کا فنکشن بھگتا کر لوٹے تھے اور اب ڈرائنگ روم میں پاؤں پسارے اپنے دل پسند مشغلے میں مصروف تھے۔

"اور عادل بھائی کو دیکھا کتنا شرما رہے تھے۔ لڑکیوں کو بھی مات دے رہے تھے بس ناک پر رومال رکھنے کی کسر تھی۔" فرسٹ ایئر کے نومی نے تجھی کزن کا مذاق اڑایا تھا۔

"اور عادل بھائی کی دونوں سالیوں کو دیکھا ایک بالکل سوکھی سڑی سی اور دوسری کتنی موٹی لگتا تھا ایک کے حصے کا سارا کھانا دوسری بہن کھا جاتی ہے۔" فریحہ نے ہنستے ہوئے نواز کی سالیوں کو مشق ستم بنایا۔

"گھرانہ بھی بس واجبی سا چنا ہے نواز نے کریانے کی دکان ہے اس کے سمدھی کی شکل سے ہی مسکین سا بندہ ہے جب نواز نے میرا تعارف کروایا تو بہت مرعوب ہو کر ملا فوراً ہی اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ اس کے منہ پر تو اقرار کر لیا لیکن میرے پاس اتنا فارغ وقت کہاں؟" احتشام الدین نے بھی اپنے ازلی خود پسند لہجے میں گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہاں تو اور کیا آپ کی خالہ زاد بہن ثریا بھی مجھ سے شکوہ کر رہی تھی کہ اس کی بیٹی کے نکاح میں شریک نہیں ہوئے ہم منہ پر تو میں کچھ نہیں بولی لیکن درجن بھر بچے ہیں ثریا کے کبھی کسی کی شادی، کبھی منگنی تو کبھی نکاح ہم ایسے بھی فارغ نہیں کہ بھاگ بھاگ کر ہر فنکشن بھگتانے جائیں۔" نصرت بیگم نے نخوت سے کہا۔

"اور ان فنکشنز میں کھانے کا مینیو کیا ہوتا ہے۔ بڑے گوشت کا قورمہ، سوکھے سوکھے نان اور بدمزا سا زردہ۔ ثریا آنٹی سے بڑا کنجوس میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" عروج ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"کھانا تو آج بھی بس یونہی سا تھا مجھے تو کھا کر ذرا مزا نہیں آیا۔" فریحہ منہ بناتے ہوئے بولی تھی۔

"صحیح کہتی ہو آپی۔ مجھے تو دوبارہ بھوک لگ گئی ہے وہاں پیٹ بھر کر کھایا ہی نہیں گیا ذرا فریج میں دیکھنا کچھ کھانے کو رکھا ہے تو لے آؤ۔" نومی نے فریحہ کو مخاطب کیا۔

"اف نومی میرا اٹھنے کا بالکل موڈ نہیں قسم سے بری طرح تھک گئی ہوں تم خود دیکھ لو۔" فریحہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"دوپہر کو قیمہ بھون کر تو گئی تھی عروج چل میری بیٹی سالن گرم کر کے روٹیاں ڈال لے۔" نصرت بیگم کو بھی بھوک ستانے لگی تھی۔

"قیمہ رکھا ہے تو قیمہ بھرے پراٹھے کیوں نہیں بنا لیتیں آپ۔" احتشام صاحب نے بیوی کو مخاطب کیا۔

"اور کیا امی پراٹھے تو آپ ہی کے ہاتھ کے اچھے لگتے ہیں۔" عروج نے بھی فوراً باپ کی تجویز کی تائید کی تھی مجبوراً نصرت کو ہی اٹھنا پڑا اور رات کے بارہ بجے پوری فیملی نے قیمہ بھرے پراٹھوں کی دعوت اڑائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ مہینہ تو شادیوں کا مہینہ لگتا ہے۔ دیکھ رہی ہیں امی کتنے سارے کارڈ اکٹھے ہو گئے ہیں۔" فریحہ کارڈوں کا پلندہ ماں کو دکھاتے ہوئے بولی۔ آس پڑوس

رشتہ داروں، جاننے والوں اور احتشام الدین کے دوست احباب کے گھروں سے آئے ہوئے واقعی درجنوں دعوت نامے اکٹھے ہو گئے تھے۔

"ہاں پر اتنا فارغ وقت کہاں کہ ساری شادیاں نبٹاتے پھریں جہاں ضروری ہو گا چلے جائیں گے ورنہ کسی ملنے جلنے والے کے ہاتھ لفافہ بھجوا دیں گے۔" نصرت لاپروائی سے بولی تھیں لفافے سے مراد وہ رقم تھی جو رشتہ دار کی حیثیت دیکھ کر تحفے کے طور پر دی جاتی تھی۔

اور اسی شام ایک کارڈ اور آ گیا کارڈ لانے والا نجمہ خالہ کا منجھلا صاحبزادہ تھا۔ نجمہ خالہ نصرت کی فرسٹ کزن تھیں۔ قریبی شہر میں رہائش تھی مگر پھر بھی سالوں سے دونوں گھرانوں کا میل ملاپ نہیں ہوا تھا۔ اب وہ اپنی بڑی بیٹی کی شادی کر رہی تھیں تو بیٹے کے ہاتھ اس شہر میں بسنے والے سارے رشتہ داروں کو دعوت نامے بھیجے تھے۔

"پھر آپ سب لوگ آئیں گے نا خالہ۔" نجمہ خالہ کے بیٹے نے رخصت چاہتے ہوئے ایک بار پھر پوچھا تھا۔

"ہاں بچے دیکھو وعدہ نہیں کرتی پر کوشش کریں گے۔" نصرت اسے چھوڑنے گیٹ تک گئی تھیں اور واپس آئیں تو دونوں بیٹیاں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔

"امی کیسے رشتہ دار ہیں آپ کے' کتنی نیچی قمیص پہنی ہوئی تھی اور تیل میں چپڑے بال بالکل جوکر لگ رہا تھا۔" عروج نے ہنستے ہوئے ماں کو مخاطب کیا نصرت مسکرا دیں۔

"ہاں تو اس کی ماں بھی ایسی ہی ہے۔ بالکل سیدھی اور گنوار سی۔ آگے سے میاں بھی پینڈو مل گیا۔ بچوں کا تو یہ حال ہونا ہی تھا۔"

"پھر کیا پروگرام ہے۔ امی جان ان پینڈوؤں کی شادی میں شرکت کریں گی۔" فریحہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"توبہ کیا دماغ خراب ہے میرا' اپنے شہر کی بات ہوتی تو چلو رسم دنیا نباہنے کو چل پڑتے۔ اتنی دور کیسے جائیں؟" نصرت نے صاف انکار کر دیا۔

"کیسے جائیں کا کیا مطلب امی۔ اپنی گاڑی پر جائیں گے اور اتنی دور بھی نہیں ہے نجمہ خالہ کا گھر' ڈیڑھ' دو گھنٹے کی ڈرائیو ہو گی۔ جب سے ہم نے نئی گاڑی لی ہے گیراج میں ہی کھڑی ہے۔ سارے رشتہ داروں کو تو پتا بھی نہیں کہ وہ کھٹارا بیچ کر ہم نے زیرو میٹر گاڑی خریدی ہے۔" فریحہ نے کہا۔ کھٹارا سے مراد وہ سیکنڈ ہینڈ گاڑی تھی جو کئی برسوں تک احتشام صاحب کی فیملی کے زیر استعمال رہی تھی۔

احتشام الدین کی بازار میں بڑی کمیٹی کھلی تو بچوں کے اصرار پر پرانی گاڑی بیچ کر نئی گاڑی خرید لی تھی۔ اس مقصد کے لیے نصرت بیگم کے دو کنگن بھی بیچنے پڑے تھے مگر نصرت کو اس بات پر چنداں افسوس نہ تھا۔ گھر کے گیراج میں کھڑی چمچماتی گاڑی لاکھوں میں بڑے زیور سے بھلی ہی لگتی ہے۔ اور واقعی بچوں کو کہنا بھی صحیح تھا۔ ابھی سب رشتہ داروں کے سامنے اس گاڑی کی رونمائی نہیں ہوئی تھی۔ رات کو انہوں نے شوہر کے سامنے بچوں کی فرمائش رکھی۔

"ہاں تو ٹھیک کہہ رہے ہیں بچے تیاری کرو ہم سب چلیں گے تمہاری بھانجی کی شادی میں۔" احتشام الدین اتنی جلدی مان جائیں گے نصرت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"آپ بھی جائیں گے تو کیا دکان اتنے دن بند رہے گی۔" نصرت بیگم نے حیرت سے دریافت کیا۔

"دو چار دن ملازم سنبھال لیں گے دکان۔ شادی کا تو بہانہ ہے۔ گاڑی اپنے پاس ہو گی بچوں کو گھما پھرا دیں گے اپنے شہر کے تو سارے تفریحی مقام ازبر ہو گئے ہیں۔" احتشام الدین کا خود کا دل روٹین بدلنے کو چاہ رہا تھا نصرت بیگم نے بچوں کو تیاری کا گرین سگنل دے دیا۔

"پندرہ دن بعد شادی ہے اتنی جلدی تو ٹیلر کپڑے بھی نہیں دے گا۔" فریحہ کو فکر ستائی۔

"بہت کوئی اسٹینڈرڈ کی شادی ہے۔ جس میں تم نئے

کپڑے پہن کر شرکت کرو گی۔ اتنے ڈھیر سارے کپڑے پڑے ہیں ان ہی سے کام چلاؤ۔" نصرت نے اس کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔

"لیکن امی۔" فریحہ ٹھنکی تھی۔

"امی صحیح کہہ رہی ہیں فریحہ تم نے اس پینڈو کو دیکھا جو کارڈ دینے آیا تھا ایسے لوگوں کی تقریب میں شرکت کے لیے نئے کپڑے سلوانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔" عروج نے بھی ماں کی تائید کی تھی۔

"چلیں ٹھیک ہے پھر۔" فریحہ کو بات مانتے ہی بنی تھی۔

اور پورا خاندان شادی سے ٹھیک دو دن پہلے ہی شادی میں شرکت کے لیے نجمہ خالہ کے ہاں پہنچ گیا تھا۔ نجمہ بیگم' ان کے خاوند اور بچے سیدھے سادے اور ملنسار لوگ تھے مہمانوں کی آمد پر بھرپور خوشی کا اظہار کیا۔ احتشام الدین کی فیملی بھی بظاہر بہت اچھے طریقے سے ملی مگر جب تنہائی ملی تو دل کھول کر ان لوگوں کا مذاق اڑایا۔

"نجمہ خالہ کی چھوٹی بیٹی کو دیکھا آپی کیسے فٹ بال کی طرح لڑھکتی ہوئی چلتی ہے۔" ارم کا قد چھوٹا جبکہ جسم فربہی مائل تھا اسی لیے فریحہ کے مذاق کا نشانہ بنی تھی۔

"صحیح کہہ رہی ہو اور دلہن صاحبہ کو دیکھا ہم لوگوں سے بھی ایسے شرماتے ہوئے ملی جیسے ہم ہی اس کے سسرالی ہوں۔" عروج نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اور نجمہ آنٹی توبہ کتنا بھینچ کر انہوں نے ہمیں گلے لگایا تھا۔ لہسن پیاز کی اتنی بو آ رہی تھی ان میں سے مجھے تو سانس روکنی پڑ گئی تھی۔" فریحہ نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

"ویسے شکر ہے پورا کمرہ ہمیں دے دیا کم از کم پرائیویسی تو ہے۔" نومی نے کشن سر کے نیچے رکھتے ہوئے آرام سے قالین پر پاؤں پسارے تھے۔

"ہاں اور لگتا ہے سب سے اچھا اور بڑا کمرہ ہمیں دیا ہے۔" عروج نے بھی بھائی کی بات کی تائید کی۔

"تو ظاہر ہے ہم سے معزز مہمان اور کون آئیں گے ان لوگوں کے گھر۔" فریحہ کھلکھلائی تھی۔ نومی اور عروج نے بھی اس کی ہنسی میں بھرپور ساتھ دیا تھا مگر ان کی غلط فہمی زیادہ دیر برقرار نہ رہ پائی تھی۔ اسی شام نجمہ خالہ کے دیور کی فیملی پہنچ گئی تھی۔

شاندار گاڑی سے اترنے والی فیملی خود بھی شاندار تھی۔ عروج اور فریحہ تو کیا خود نصرت اور احتشام الدین بھی ایسے مہمانوں کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ گریس فل سے ایاز احمد ان کی خوب صورت بیوی اور تین عدد پیاری پیاری الٹرا ماڈرن بیٹیاں۔ ایاز احمد ایک سرکاری محکمے میں اعلا عہدے پر فائز تھے۔ پرسنیلٹی کا رکھ رکھاؤ دیکھنے والا تھا لگتا ہی نہ تھا کہ وہ سیدھے سادے سے نواز خالو کے بھائی ہیں۔ یہی بات احتشام الدین نے نصرت سے کہی۔

"تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا کہ تمہاری بہن کے سسرالیوں میں ڈھنگ کے بندے بھی پائے جاتے ہیں۔" اور نصرت خود حیران تھیں۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ نجمہ باجی کا دیور اتنا بڑا افسر ہو گا سنا تو تھا کہ نواز بھائی کا چھوٹا بھائی پڑھا لکھا بندہ ہے لیکن میں نے سوچا تھا کہ بارہ چودہ جماعتیں پڑھ رکھی ہوں گی لیکن یہ تو کوئی بڑا افسر لگتا ہے۔"

"بڑا افسر تو ہے ایسے لوگوں سے تعلقات بنا کر رکھنے چاہئیں۔ بندہ تو ملنسار لگتا ہے ابھی تو مجھ سے محض سلام دعا ہوئی ہے موقع ملے گا تو تفصیلی گپ شپ بھی لگاؤں گا۔"

"وہاں ویسے تو بیوی بھی ہنس مکھ ہے نجمہ باجی نے تعارف کروایا تو بہت اچھے طریقے سے ملی مجھ سے۔"

"اور ان کی بیٹیاں بھی کتنی فیشن ایبل ہیں۔ لاجواب ڈریسنگ کر رکھی تھی مہندی کے فنکشن میں دیکھیے گا کیسا تیار ہوتی ہیں میں تو امی سے کہتی رہ گئی کہ نئے کپڑے سلوا دیں لیکن امی مان کر ہی نہیں دیں۔" فریحہ کو پرانے کپڑوں کا قلق ستا رہا تھا۔

"ہاں غلطی ہو گئی لیکن خیر ہے اب بھی ہم کسی سے کم نہیں لگیں گے بس خود پر اعتماد ہونا چاہیے۔" عروج نے فریحہ کو سمجھایا تھا اور یہ عروج کا اعتماد ہی تھا کہ مہندی کے فنکشن میں اس نے ایاز صاحب کی

بیٹیوں سے خود بات چیت میں پہل کی فنکشن کے اختتام تک دونوں خاندانوں کی لڑکیوں میں اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔

ایک دن بعد نجمہ خالہ کی بیٹی کی بارات آنی تھی۔ احتشام الدین کی فیملی نے زیادہ وقت ایاز صاحب کی فیملی کے ساتھ ہی گزارا تھا۔ نجمہ خالہ کی بیٹی رخصت ہوئی تو سب مہمانوں نے بھی واپسی کا قصد کیا۔ جو قریب کے تھے انہوں نے رات کو ہی رخصت چاہی۔ احتشام الدین اور ایاز احمد کی فیملی کا رات گزار کر صبح ناشتے کے بعد جانے کا ارادہ تھا۔ رات دیر تک ایاز صاحب کے کمرے میں ہی محفل جمی رہی تھی۔ احتشام الدین اور ایاز احمد سیاست پر تبصرے کرتے رہے۔ لڑکیاں اپنی باتوں میں مشغول تھیں آخر ایاز احمد نے ہی گھڑی پر نگاہ ڈالی تھی۔

"چلیں پھر اب سوتے ہیں صبح ٹھنڈے ٹائم ہی نکلنا ہو گا جیسے جیسے دن چڑھے گا گرمی بڑھ جائے گی ڈرائیونگ مشکل ہو جائے گی آپ لوگوں کا تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر ہے ہمیں تو کم از کم پانچ گھنٹے لگیں گے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ جلدی سوئیں گے تو صبح وقت پر آنکھ کھلے گی۔" احتشام الدین نے ان کی تائید کی تھی پھر بیوی بچوں کو آنکھ کے اشارے سے اٹھنے کا کہا تھا۔ کمرے میں آکر بھی دیر تک عروج اور فریحہ آج کی تقریب پر تبصرے کرتے رہے۔ شہناز باجی کے پینڈو دولہا کا جی بھر کا مذاق اڑایا۔ دولہا کی اکلوتی بہن کے فیشن پر تبصرے کیے۔ بری کے کپڑوں کی بھی خوب ہی ہنسی اڑائی۔

"چلو موبائل دکھاؤ آج جو تصویریں بنائی ہیں وہ تو دیکھیں۔" عروج کو اچانک خیال آیا تو فریحہ کو مخاطب کیا۔

"موبائل۔" فریحہ نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔

"افوہ موبائل تو روما وغیرہ کے کمرے میں رہ گیا۔" وہ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ایاز احمد کی فیملی بھی بالائی منزل کے ایک کمرے میں مقیم تھی۔

"میں ابھی لے کر آتی ہوں کہیں وہ لوگ سونے کے لیے لائٹ آف نہ کر دیں۔" فریحہ جلدی سے اٹھی تھی چند لمحوں بعد وہ ان کے کمرے کے باہر کھڑی تھی مگر اس سے پیشتر وہ دستک دیتی اندر سے آنے والی آوازوں نے قدم جکڑ لیے۔

"توبہ کتنی لسوڑا قسم کی فیملی ہے نصرت آنٹی کی جان چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتی۔" طنز میں ڈوبی آواز بلاشبہ روما کی ہی تھی۔ ایاز صاحب کی منجھلی بیٹی جو فریحہ کی دانست میں دو دن کے اندر ہی اس کی بہترین دوست بن چکی تھی۔

"کمپلیکس کے مارے لوگ ہیں۔ ہاتھ میں پیسہ ہونے کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ انسان کی ذہنی سطح بھی بلند ہو گئی ہے۔ ایسے تو دولتیوں کی طرح شو آف کرتے ہیں کہ طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔" یہ ایاز صاحب کی بیگم شازیہ آنٹی کی آواز تھی فریحہ کو اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔

"صحیح کہہ رہی ہیں بیگم آپ یہ احتشام صاحب بھی اپنے آپ کو بڑی کوئی توپ چیز سمجھتے ہیں بے شک چلتے کاروبار کے مالک ہیں مگر ہیں تو صرف ایک دوکاندار اور ایسی فراست بھری گفتگو فرماتے ہیں جیسے ان سے بڑا کوئی علامہ ہی نہیں۔ میں تو رشتہ داری کے لحاظ میں چپ چاپ ان کی باتیں سنے گیا ورنہ جیسی بے پر کی اڑا رہے تھے ہنسی روکنا دوبھر ہو رہا تھا۔"

"اور ممی نصرت آنٹی کے فیشن دیکھے آپ نے آج کی تقریب میں کس کلر کمبی نیشن کا سوٹ پہنے بیٹھی تھیں۔ بندہ اپنی عمر کے مطابق رنگ منتخب کرے تو ڈھنگ کا لگتا ہے اور چلو انہیں اس چیز کی سینس نہیں تو ان کی بیٹیاں ہی انہیں صحیح مشورہ دے دیں۔" یہ شانزے تھی فیملی کی سب سے چھوٹی بیٹی۔

"کیسی بے وقوفوں والی باتیں کرتی ہو تم شانزے ان کی بیٹیوں کو تو جیسے اس چیز کا بہت سینس ہے نا۔ وہ تو خود ایک دم ڈفر ہیں۔" علیزے نے تمسخر اڑایا تھا۔

"ہاں وہ عروج صاحبہ صرف رنگ ہی گورا ہے اس کا مگر نزاکت کا یہ عالم کہ خود کو ایشوریہ سے کم نہیں سمجھتی۔" روما نے بہن کی بات آگے بڑھائی تھی۔

"اتنی پھینی ناک والی ایشوریہ حد کرتی ہیں آپی۔" شانزے ہنسی۔

"اور وہ فریحہ صاحبہ ہر جملے میں چار لفظ انگلش کے بول کر یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں جیسے انگلش پر بھرپور عبور حاصل ہے انہیں — بعض لفظوں کا تلفظ اتنا غلط ادا کرتی ہے کہ ہنسی چھوٹتے چھوٹتے رہ جاتی ہے۔" روما نے اس بار فریحہ کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"اسکولنگ سے بہت فرق پڑتا ہے بیٹے اب ہر کوئی تمہاری طرح شہر کے سب سے مہنگے اور بہترین اسکولوں میں تو نہیں پڑھا ہوا نا عام سے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے والے بچے۔" ایاز صاحب تفاخر بھرے انداز میں جانے کیا کہہ رہے تھے فریحہ ان کی بات پوری سنے بغیر واپس پلٹ گئی تھی۔

احساس توہین سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ بھاری ہوتے قدم گھسیٹتی وہ اپنے کمرے کی جانب جا رہی تھی اور جانے کیوں اس لمحے اسے برسوں پہلے کی کی گئی اپنی کلاس ٹیچر کی بات یاد آگئی۔

"کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کمی یا خامی ضرور پائی جاتی ہے لیکن کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کے پیٹھ پیچھے اس کی شخصیت کے بخیے ادھیڑے اگر آپ کو کسی کی شخصیت پر کمنٹس پاس کرنے کا شوق ہے تو کسی دوسرے کے اپنی ذات پر کیے گئے تبصرے کو سننے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔"

تین برس پہلے جب فریحہ کا نیا نیا کالج میں ایڈمیشن ہوا تھا تو مس قیصرہ نے فلسفے کی پہلی کلاس لینے کے بعد بہت دوستانہ انداز میں لڑکیوں کو نصیحت کی تھی اور کلاس لینے کے بعد جب فریحہ اپنی دوستوں کے ساتھ کلاس روم سے باہر نکل رہی تھی تو کیسے اپنی دوستوں کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے بولی تھی۔

"دراصل مس قیصرہ کا قد بہت چھوٹا ہے اسی لیے انہوں نے لڑکیوں کو پیشگی وارن کر دیا ہے کہ کوئی ان کا مذاق نہ اڑائے۔" اور آج برسوں بعد اس پیاری ٹیچر کی بات کا مفہوم سمجھ آیا تو ندامت کے احساس نے بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کچھ لمحوں پہلے ایاز صاحب کی فیملی کے اپنی فیملی پر دیے گئے ریمارکس سن کر دل میں رنج اور غصے کے جو جذبات پیدا ہوئے تھے وہ ہوا ہو گئے۔

دوسروں کی شخصیت کی خامیوں کو ہائی لائٹ کرنا خود ان کی اپنی فیملی کا بھی تو پسندیدہ مشغلہ تھا وہ کمرے میں داخل ہوئی تو گھر والے اسی مشغلے میں مصروف تھے۔

"خالو اسلام کی پلیٹ میں بوٹیوں کا وہ انبار لگا تھا کہ خدا کی پناہ میں تو سوچ رہا تھا وہ بوٹیوں کے اس پہاڑ کو کیسے سر کریں گے لیکن انہوں نے تو منٹوں میں پلیٹ صاف کر لی۔" نومی رشتے کے ایک خالو کا تمسخر اڑا رہا تھا۔

"کتنی بری بات ہے نومی خالو اسلام تم سے عمر میں بھی بڑے ہیں اور رشتے میں بھی ہر وقت ہر کسی کا مذاق اڑانا ضروری ہے کیا۔" اس نے چھوٹے بھائی کو سمجھانا چاہا تھا نومی سمیت سب گھر والوں نے ہی حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"تم موبائل لینے گئی تھیں نہیں ملا؟" عروج نے الجھن سے دریافت کیا۔

"نہیں شاید وہ لوگ سو گئے ہیں۔ کمرے کی لائٹ آف تھی۔" اس نے مصلحتاً جھوٹ بولا اگر ابھی وہ سب کو بتا دیتی کہ وہ ان کے کمرے کے دروازے پر دستک کیوں نہ دے پائی تو ساری بات سن کر وہ سب احساس توہین کا شکار ہو کر بھڑک سکتے تھے سو اس نے سب کو سمجھانے کا ارادہ فی الحال موخر کر دیا۔ یہ کام گھر جا کر بھی ہو سکتا تھا۔ تحمل اور رسانیت سے بات سمجھائی جاتی تو شاید وہ اپنے اندر راسخ ہوتی اس بد عادت سے چھٹکارا پانے کو سنجیدہ ہو جاتے فریحہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سوچا اور ماں باپ کی اجازت سے لائٹ آف کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☼ ☼

سحرِ طلب

سفینہ یاسمین

پہاڑیوں کے درمیان گھومتی بل کھاتی ناگن کی طرح کہری سیاہ سڑک پر رات کی تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی سفید ہنڈا سوک اپنی پوری رفتار سے رواں دواں تھی اور راحیل ہلکے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر بیک ویو مرر پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے اس کا پاؤں بے ساختہ بریک پیڈل پر جا پڑا اس نے پورا وزن بریک پیڈل پر ڈال دیا تھا جس کے نتیجے میں چرچراہٹ کی تیز آواز نے شب کے سکوت کو تار تار کر دیا اور گاڑی چند فٹ تک گھسٹنے کے بعد یکلخت رک گئی۔

وہ منظر اتنا ہی حیران کن تھا کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ریورس گیئر لگایا اور گاڑی دھیمی رفتار میں پیچھے کھسکنے لگی۔ اس کی نظریں بدستور بیک ویو مرر پر چپکی ہوئی تھیں اور اس کا ذہن مسلسل یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ رات کے اس پہر اس ویران پہاڑی علاقے میں جہاں دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا اور سڑک پر ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھی ایک تن تنہا لڑکی کا کیا کام؟؟؟

کچھ ہی دیر کے بعد گاڑی اس لڑکی تک جا پہنچی جونہی اس نے بریک لگایا لڑکی نے بلا جھجک آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور دھم سے پچھلی نشست پر براجمان ہو گئی اور گاڑی میں ایک مسحور کن خوشبو پھیلتی چلی گئی۔ راحیل نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے ونڈ اسکرین کے اوپر موجود شیشے کا اینگل درست کیا اور عمیق نظروں سے لڑکی کا جائزہ لینے لگا۔ بیس بائیس سال کی ایک خوش شکل لڑکی تھی جسے خوب صورت کہا جا سکتا تھا سفید شلوار قمیص اور سفید دوپٹہ اوڑھے ہوئے وہ کسی کالج کی اسٹوڈنٹ یا کسی ہاسپٹل کی نرس دکھائی دیتی تھی۔ کانوں میں لمبے لمبے آویزے ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک اور ہاتھ میں موجود سیاہ رنگ کا پرس اس کی شخصیت کو چار چاند لگا رہے تھے۔

"ایسی خوب صورت لڑکی اور اس ویرانے میں؟؟؟" اس خیال کے آتے ہی وہ جیسے گہری نیند سے اچانک بے دار ہو گیا اس نے کھنکار کر جیسے گلا صاف کیا یا پھر لڑکی کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا جو خاموش بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس نے چونک کر راحیل کی طرف دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور راحیل کے کانوں میں جیسے گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ بلاشبہ اس کی ہنسی خرمن ہوش پر بجلیاں گراتی تھی۔ لیکن راحیل شاید اس ہنسی سے لطف اندوز ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جس کا ثبوت گاڑی میں گونج اٹھنے والی راحیل کی جھنجلاہٹ سے بھرپور آواز تھی۔

"محترمہ کیا میں آپ کو پاگل نظر آتا ہوں؟"

"نہیں تو، کیوں؟" لڑکی نے مترنم لہجے میں معصومیت سے سوال کیا۔

"اچھا تو پھر میں آپ کو گھامڑ دکھائی دیتا ہوں گا ہے نا؟" راحیل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟" یہ سوال بھی خاصے معصومانہ انداز میں کیا گیا تھا جو راحیل کو سیخ پا کرنے کے لیے کافی تھا اور راحیل مزید جل اٹھا۔

"اوہ میڈم! یہ گاڑی میری ہے لیکن آپ جس دھڑلے سے اس میں وارد ہوئی ہیں اس سے یہ محسوس

ہوتا ہے کہ میں آپ کا ڈرائیور ہوں اور آپ میرے ہی انتظار میں کھڑی تھیں۔ غضب خدا کا جان نہ پہچان میں تیرا مہمان اور پھر جس لاپرواہی کا مظاہرہ کر رہی ہیں اس کا تو جواب نہیں' کیا کہنے..... " راحیل کا انداز خاصا جھلاہٹ آمیز تھا۔

"اے مسٹر پہلی بات تو یہ کہ میں زبردستی کی مہمان نہیں! گاڑی تم خود بیک کر کے لائے تھے میں نے تمہاری منت نہیں کی تھی' دوسری بات یہ کہ گاڑی تم خود ڈرائیو کر رہے ہو' لہٰذا ڈرائیور تو تم ہو! میرے نہیں تو نہ سہی اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تیسری اور آخری بات یہ کہ تمہیں میری لاپرواہی سے گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں' تمہاری یہ جھنجلاہٹ تمہارے اندر کے خوف کا پتا دے رہی ہے لیکن تمہیں خوفزدہ ہونے کی بھی قطعی کوئی ضرورت نہیں' میں کوئی بدروح یا چڑیل نہیں ہوں' سیدھی سادی لڑکی ہوں اگر بٹھانے کی زحمت کر ہی لی ہے تو اس بد اخلاقی کا مظاہرہ کیوں؟"

لڑکی نے عالمانہ انداز میں اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے سوال داغا تو راحیل کو تھوڑا سا شرمندگی کا احساس ہوا واقعی اس کا انداز کچھ غلط تھا۔

"محترمہ! تھوڑا سا تجسس تو ہر انسان میں موجود ہوتا ہے' رات کے اس پہر ایک تن تنہا لڑکی جو خاصی جوان اور خوب صورت بھی واقع ہوئی ہو اس کا اس ویران پہاڑی علاقے میں پایا جانا اور پھر اس بے تکلفی سے میری گاڑی میں بیٹھ جانا اور اس کے بعد اس شان بے اعتنائی کا مظاہرہ فرمانا یہ ساری باتیں کسی بھی شریف آدمی کے دماغ کی چولیں ہلانے کے لیے کافی ہیں۔

آپ بدروح یا چڑیل ہرگز نہیں ہوں گی۔ لیکن میں تو آپ کے لیے اجنبی ہوں؟ میں تو کوئی وحشی' درندہ یا اس قسم کی کوئی مخلوق ہو سکتا ہوں نا۔ میں کوئی خطرناک قسم کا اسمگلر یا ڈاکو بھی تو ہو سکتا ہوں آپ کا یہ اطمینان مجھے کچھ ہضم نہیں ہو پا رہا۔" راحیل کی جوابی تقریر اسی ٹون میں تھی لیکن اس مرتبہ اس کا لہجہ خاصا نرم تھا۔

"دیکھو مسٹر! یہاں بھی تمہاری باتوں کے تین جواب ہیں میرے پاس' پہلا یہ کہ دماغ کی چولیں ہلنے کے لیے آدمی کا شریف ہونا ضروری نہیں ہوتا چولیں جب ہلنے پہ آتی ہیں تو بدمعاشوں کے دماغ کی بھی ہل جاتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ میں آپ کی گاڑی میں بے تکلفی سے بیٹھ گئی تو وہ میری مجبوری تھی کیونکہ میں ساری رات وہاں کھڑے رہ کر نہیں گزار سکتی تھی۔ تیسرا یہ کہ میں یہاں کیوں کھڑی تھی اور کہاں سے آئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں سے تم نے مجھے لفٹ دی وہیں سے کچھ فاصلے پر میری گاڑی بھی کھڑی تھی جو میں خود ٹھیک نہیں کر سکتی تھی صبح ڈرائیور خود لے جائے گا۔ رہی بات تمہارے وحشی درندہ' چور' ڈاکو' اسمگلر یا اس قسم کی کسی دوسری مخلوق ہونے کے امکانات کی تو اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا' مجھے شہر پہنچنا ہی ہے۔"

لڑکی نے کندھے اچکاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ راحیل جس کے ہونٹوں پر لڑکی کے خوب صورت جوابات سن کر دھیمی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کی آخری بات سن کر ایک بار پھر چونک اٹھا اور اس کے ہونٹ ایک دائرے میں سکڑ گئے۔ لڑکی حد سے زیادہ بااعتماد انداز میں بات کر رہی تھی یا تو خاصی بولڈ تھی یا پھر کھسکی ہوئی اور یہ سوچ کر ایک مرتبہ پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ خاصا دلچسپ کردار تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر لڑکی کا جائزہ لینے کے لیے عقبی شیشے پر نظر دوڑائی تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے اور ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹیں سی دوڑ گئیں لڑکی کا ہاتھ سیاہ رنگ کے پرس کے عقب سے آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور اس ہاتھ میں دبے ہوئے خوفناک پستول کی نال راحیل کی کھوپڑی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کمال پورہ بھی کمال کا گاؤں تھا بالکل اپنے نام کی طرح' قدرتی حسن و خوب صورتی سے سجا یہاں فصل کمال کی ہوتی تھی تو جانور بھی کمال کے تھے لوگ بھی کمال کے تھے سادہ مزاج' سیدھے سادے دیہاتی لوگ بلاشبہ اپنی مثال آپ تھے یہاں کاشت ہونے والی فصلوں میں سب سے قابل ذکر چاول کی فصل تھی یہاں پیدا ہونے والا چاول نہایت لذیذ اور خوشبودار ہوتا تھا اور کیوں نہ ہوتا کمال پورہ کا چاول تھا۔

یوں تو کمال پورہ میں موجود ہر چیز ہی کمال کی تھی لیکن یہاں کی سب سے باکمال چیز ناجی تھی۔ ایک الہڑ' شوخ اور چنچل لڑکی' حسن تھا کہ ٹوٹ کر برسا تھا اس پر! لمبا قد' گلابی رنگت' کتابی چہرہ' صراحی دار گردن' موٹی موٹی آنکھیں' لمبے سیاہ بال اور سب سے بڑھ کر اس کی ہرنی جیسی مستانہ چال سارا دن سارے گاؤں میں چوکڑیاں بھرتی پھرتی' ناجی اپنے حسن اپنی دلکشی سے بالکل بے خبر اور بے نیاز تھی۔ گاؤں کے لڑکے تو لڑکے بڑی بوڑھی عورتیں بھی ناجی کو دیکھ کر دانتوں میں انگلی داب کر رہ جاتی تھیں۔

تاجو جو ناجی کی ماں تھی اسے ناجی کا اس طرح منہ اٹھائے بھاگے بھاگے پھرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا وہ اکثر ناجی کو صلواتیں سناتی رہتی تھی اور اسے اس طرح آندھی اور طوفان بنی پھرنے سے منع کرتی رہتی تھی لیکن جو مان لیتی وہ ناجی تو نہ ہوتی نا؟ وہ بھی ہٹ کی پوری اور دھن کی پکی تھی بھلا تاجو کے ناک بھوں چڑھانے سے ناجی کی صحت پر کیا خاص اثر پڑنا تھا لہٰذا ناجی کے مشاغل جاری تھے۔

آج بھی وہ اپنے ایک خاص پروگرام کے تحت چھیمو اور شادو کے پاس پہنچی تھی۔ کچھ دیر کی کھسر پھسر کے بعد تینوں گاؤں کی مشرقی سمت میں واقع آموں کے باغ کی طرف روانہ ہو گئیں تینوں تیز تیز قدم اٹھاتی گاؤں کی حدود سے باہر نکل آئیں اور پھر بالآخر جوڑے کچے راستے پر چلتی تینوں کی تینوں آم کے باغ میں داخل ہو گئیں۔ چاروں طرف کا جائزہ لیا گیا اور پھر وہ منظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جب دبلی پتلی ناجی کسی بندر کی سی پھرتی سے آم کے ایک درخت پر چڑھ کر پتوں میں غائب ہو گئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد کچے آم زمین پر بارش کی طرح برسنے لگے چھیمو اور شادو جلدی جلدی انہیں سمیٹنے لگیں جب آموں کا خاطر خواہ ذخیرہ جمع ہو گیا تو پھر چھیمو ہی نے ناجی کو آواز دی۔

"نی' ناجی ہن بس وی کر کہ چاچے کرم دین سے چھتر کھانے ہیں۔" جواباً" جس تیزی سے ناجی اوپر چڑھتی نظر آئی تھی اسی تیزی سے واپس اترتی دکھائی دی ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس ناجی جب زمین پر پہنچی تو پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح جھلملا رہے تھے جب کہ اس کے لمبے سیاہ بال ہوا کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے بار بار پیشانی پر آگرتے جنہیں جھٹک کر وہ پیچھے کرا دیتی۔

ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی تو ناجی کے

ساتھ ساتھ چھمو اور شادو بھی بدحواس ہو گئیں آسمان پر یکدم پرندوں کے غول بلند ہوئے جو دھماکے سے خوفزدہ ہو کر راہ فرار اختیار کر رہے تھے اور ادھر زمین پر وہ تینوں۔۔۔ لیکن وہ دھماکے سے زیادہ چاچا کرم دین سے خوفزدہ تھیں کیونکہ دھماکہ اس بات کا ثبوت تھا کہ چاچا کرم دین قریب ہی کہیں موجود تھا اور کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتا تھا۔ ایسے دھماکے اکثر پھل دار باغات میں چلائے جانے والے ان پٹاخوں سے کیے جاتے ہیں جن کا مقصد پھل کو پرندوں سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ لیکن نقصان پہنچایا جا چکا تھا اور پھل سمیٹنے کے بعد پرندے بھی اڑنے کے لیے تیار تھے۔

تینوں تیز رفتاری سے باغ کی حدود سے نکلیں اور گاؤں کی طرف جانے والے کچے راستے پر ہو لیں۔ باغ سے تقریباً" ایک فرلانگ دور نکل آنے کے بعد ناجی کے حلق سے ایک طمانیت آمیز سانس خارج ہوئی وہ خطرے کی حدود سے بخیر و عافیت نکل آئی تھیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب گاؤں کی طرف سے ایک سفید گاڑی اپنے پیچھے گرد و غبار کا بادل لیے نمودار ہوئی گاڑی کا رخ باغ کی طرف تھا اور وہ تیزی سے قریب تر آتی چلی جا رہی تھی۔

ناجی، چھمو اور شادو نے کچے آم اپنی اپنی اوڑھنیوں میں لپیٹ کر مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے اور وہ بھی تیزی سے گاؤں کی طرف بڑھی جا رہی تھیں گاڑی اور ان تینوں کا فاصلہ تیزی سے کم ہوتا جا رہا تھا اور پھر زن کی آواز کے ساتھ گاڑی ان کے قریب سے گزر کر آگے نکلتی چلی گئی لیکن دوسرے ہی لمحے بریک کی تیز چرچراہٹ نے فضا کے سناٹے کو درہم برہم کر گیا۔ گاڑی رک چکی تھی اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد گاڑی بیک ہو کر عین ان کے سامنے آ رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک خوش شکل وجیہہ نوجوان برآمد ہوا اس کی نظریں ناجی پر جم کر رہ گئی تھیں اور اس کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کر کے زندگی میں پہلی مرتبہ ناجی کا دل بڑے عجیب سے انداز میں دھڑکا۔

اس کا سرخ سفید چہرہ قندھاری انار کی طرح مزید سرخ ہو گیا اور وہ ہڑبڑا کر رہ گئی۔ ٹھیک اسی لمحے ہوا کے ایک شریر جھونکے نے پھر شرارت کی اور ناجی کی بالوں کی ایک لٹ کو اس کے چہرے پر لا پھینکا ناجی نے گھبرا کر خوش شکل نوجوان کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اپنی اس کوشش میں اوڑھنی پر سے شاید اس کی توجہ ہٹ گئی یا شاید وہ اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکی جس کے نتیجے میں کچی زمین پر کچے آم گر کر ادھر سے ادھر لڑھکتے چلے گئے۔

"ہائے اللہ میرے آم۔" ناجی کے حلق سے بسورتی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی اور وہ نیچے بیٹھ کر جلدی جلدی زمین پر بکھرے آموں کو اکٹھا کرنے لگی چھمو اور شادو بھی اس کی مدد کرنے لگیں لیکن یہ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر ناجی کی سٹی گم ہو گئی کہ نوجوان بھی زمین پر سے آم اکٹھے کر رہا تھا۔ ناجی نے اپنی اوڑھنی زمین پر بچھائی اور جلدی جلدی آم اکٹھے کر کے اس پر ڈھیر کرنے لگی شادو اور چھمو اس کی تقلید کر رہی تھیں جلد ہی ان تینوں نے صورت حال پر قابو پا لیا ٹھیک اسی وقت ناجی کی نظر خوش شکل نوجوان کی طرف اٹھی اور وہ پوری جان سے لرز کر رہ گئی نوجوان ہاتھ میں پانچ سات کچے آم اٹھائے ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اور پھر اس نے وہ آم ناجی کی طرف بڑھا دیے۔

اس کے ہاتھ ناجی کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور نظریں ناجی کے چہرے کی طرف۔۔۔ ناجی نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے آم لے لیے لیکن ایسا کرتے وقت ناجی کا ہاتھ نوجوان کے ہاتھ سے ٹکرا گیا ناجی کو اپنے پورے وجود میں برقی رو سی سرائیت کرتی ہوئی محسوس ہوئی اس نے جلدی سے آم اپنی اوڑھنی میں لیے اور کئی قدم پیچھے ہٹ گئی اور پھر وہ تیز رفتاری سے گھر کی طرف پلٹیں اور گاؤں کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔

کافی آگے آنے کے بعد ناجی نے جیسے اپنی دھڑکنوں پر قابو پا لیا اور وہ سوچنے لگی کہ آخر ایسا کیا تھا جو اس نوجوان کو دیکھتے ہی اس کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو کر رہ گئی تھیں کیوں اسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا وہ اپنے اندر رونما ہونے والی اس تبدیلی کو کوئی نام دینے سے قاصر تھی اور یہ سمجھنے سے بھی کہ ایسا کیوں تھا لیکن جو بھی تھا بڑا کیف آگیں نشاط انگیز اور پرسحر تھا۔ خوبرو نوجوان کی وجیہہ صورت کا تصور کرتے ہی اس کے قدموں کی رفتار خود بخود سست ہو گئی بالکل غیر ارادی طور پر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ نوجوان ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
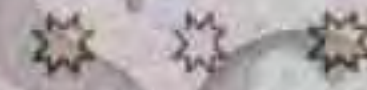
رانا سہیل احمد خان کی حویلی اس وقت بقعۂ نور بنی ہوئی تھی اور کیوں نہ ہوتی آج اس حویلی کا اکلوتا چشم و چراغ اور کمال پورہ کے ارد گرد پھیلی ہوئی سینکڑوں ایکڑ زمین کا اکلوتا وارث راحیل انگلینڈ سے واپس وطن آ رہا تھا۔ حویلی کو خوب صورت روشنیوں سے سجایا گیا تھا اور ملازمین ہاتھوں میں پھولوں کی پتیوں سے لبریز تھال اٹھائے قطار اندر قطار حویلی کے مرکزی دروازے کی دونوں اطراف الرٹ کھڑے تھے۔ زمیندار رانا سہیل بے چینی سے بار بار گھڑی دیکھتے ہوئے وسیع دالان میں بچھی سرسبز گھاس کو اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

بھاری بھرکم وجود، اوپر کو مڑی ہوئی بڑی بڑی نوک دار مونچھیں، کنپٹیوں پر موجود سفید بال، سفید کاٹن کا کرتا شلوار اور پاؤں میں موجود تلے دار جوتا اسے ایک سخت گیر اور بارعب شخصیت ظاہر کر رہا تھا لیکن اس وقت وہ اپنی حرکات و سکنات پر مجموعی طور پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔ شاید یہی اولاد کی محبت ہے کہ سخت سے سخت انسان بھی اس محبت کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وقت پر لگا کر اڑ جائے اور وہ لمحات جلد سے جلد قریب آ جائیں جب اس کا نور نظر لخت جگر اس کی آنکھوں کے سامنے ہو، سرخ و سپید بارعب رانا سہیل اس وقت ایک سخت گیر

زمیندار کی بجائے صرف ایک باپ نظر آرہا تھا جو اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھنے' اسے گلے سے لگانے کے لیے بے تاب تھا اور پھر وہ لمحہ آہی پہنچا جس کا اس وقت حویلی میں موجود ہر فرد کو شدت سے انتظار تھا کچے راستے پر نظر آنے والی روشنیاں ایک سے زائد گاڑیوں کی آمد کا اشارہ دے رہی تھیں جنہیں دیکھ کر ملازمین میں ہلچل سی نظر آنے لگی اور وہ پہلے سے قطار میں کھڑے ہونے کے باوجود اپنی ترتیب کو مزید درست کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

رانا سہیل لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا اور پھر حویلی سے باہر نکل کر استقبالیہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب آنے والی دونوں گاڑیاں رانا سہیل کے بالکل قریب آکر یکے بعد دیگرے رکتی گئیں آگے آکر رکنے والی گاڑی سفید رنگ کی ہنڈا سوک جبکہ اس کے پیچھے گرے کلر کی کرولا تھی۔ اگلی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک پرکشش اور وجیہہ نوجوان برآمد ہوا جو یقیناً "راحیل کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ جبکہ پچھلی گاڑی سے رانا وقار جو رانا سہیل کا سالا اور راحیل کا ماموں تھا اس کے ساتھ ہی تین مسلح باڈی گارڈ بھی نیچے اتر آئے رانا سہیل نے بازو پھیلائے تو راحیل ایک قد آور سڈول جسم کا نوجوان ہونے کے باوجود ان بازوؤں کے حلقے میں سمایا یوں محسوس ہوا جیسے کسی عقاب کے شکنجے میں معصوم چڑیا۔

شاید اس تضاد کی وجہ یہ رہی ہو کہ رانا سہیل کمال پورہ کی تروتازہ اور آزاد فضاؤں میں سانس لینے والا خالص دیہاتی تھا جو دیسی گھی' مکھن اور خالص دودھ استعمال کرتا تھا جبکہ راحیل پیزا اور پیپسی استعمال کرنے والا انگلینڈ پلٹ شہری بابو' لیکن جو کچھ بھی تھا باپ بیٹے کی محبت اور ملاپ کا منظر دیدنی تھا جب راحیل نے کسمساتے ہوئے فریاد کی۔

"ڈیڈ میری پسلیاں۔" تو رانا سہیل کے حلق سے ایک خوشگوار لیکن گھن گرج سے بھرپور قہقہہ آزاد ہوا اور پھر اس نے راحیل کو بازوؤں کے شکنجے سے آزاد کرتے ہوئے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور کہا۔

"اوئے شیر بڈھا وی ہو جاوے تے شیر ای ہندا اے آجا میرے نال۔" اور پھر رانا سہیل راحیل کے گلے میں بازو ڈالے مرکزی دروازے سے حویلی کے اندر داخل ہوا تو ملازمین دونوں اطراف سے مسلسل گل پاشی کر رہے تھے اور راحیل ان پھولوں کو اپنے پیروں تلے کچلتا اور مسلتا ہوا کسی ریاست کے فرماں روا کی طرح چلتا چلا جا رہا تھا۔ پورے کروفر اور زمیندارانہ غرور کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

جینز اور ٹاپ میں ملبوس یہ دبلی پتلی بظاہر نازک اندام خوب صورت لڑکی معروف صنعت کار سیٹھ عاصم کی بیٹی تھی۔ ٹھک ٹھک کی آواز سے زمین کے سینے پر مونگ دلتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اپنا پرس ایک طرف اچھالا اور بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ کوئی طویل سفر طے کر کے آئی ہو اور بہت زیادہ تھک گئی ہو لیکن ایسا تھا نہیں..... کیونکہ وہ کسی لمبے سفر سے نہیں بلکہ یونیورسٹی سے آئی تھی اب یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہی تھی اور تھکن محسوس کیوں نہ ہوتی اس کے کام ہی ایسے تھے بظاہر معصوم نظر آنے والی یہ لڑکی آفت کی پرکالہ تھی۔

یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے عجیب و غریب مشاغل بھی جاری و ساری تھے اور وہ مشاغل بھی خاصے مردانہ قسم کے تھے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ مارشل آرٹ' نشانہ بازی' گھڑ سواری' سوئمنگ اور نہ جانے ایسے کتنے مشاغل اپنائے ہوئے تھی جو اسے دوسری لڑکیوں سے یکسر مختلف اور ایک الجھا ہوا کردار ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔ بیڈ پر لیٹے تھوڑی دیر تک لمبے لمبے سانس لینے کے بعد اس نے دونوں ہاتھ منہ پر لگا کر بھونپو سا بنایا اور پھر اس کی تیز آواز سنائی دی۔

"ہاجرہ او ہاجرہ۔" اور پھر اس کا جوابی ردعمل بھی اگلے چند ہی لمحوں میں ظاہر ہو گیا تھل تھل کرتے

لجلجے وجود والی ایک بے انتہا موٹی عورت ہانپتی کانپتی ہوئی یوں کمرے میں داخل ہوئی جیسے لڑھکتی ہوئی آئی ہو اور پھر اس کی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ مودبانہ آواز بلند ہوئی۔

"جی بی بی جی۔" لڑکی جس کا نام شازیہ تھا لیکن اپنے آپ کو شازی کہلا کر خوش ہوتی تھی یکدم اچھل کر یوں زمین پر آ رہی جیسے اسے الیکٹرک شاک لگا ہو یا بیڈ میں لگے اسپرنگوں نے اسے اچھال کر نیچے پھینک دیا ہو۔

اب وہ دونوں ہاتھ اپنے دونوں کولہوں پر رکھے کمرے میں بچھے خوب صورت ایرانی قالین پر کھڑی ہاجرہ کو خشمگیں نظروں سے گھور رہی تھی۔ ہاجرہ نے جب اس کا یہ انداز دیکھا تو گڑبڑا کر رہ گئی اور اس کوشش میں اتھل پتھل ہو گئی۔

"کک کیا ہوا بی بی جی؟" ہاجرہ کی گھبرائی ہوئی آواز بلند ہوئی تو شازی نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور نپے تلے قدموں کے ساتھ ہاجرہ کی طرف بڑھی پھر اس نے کسی ماہر ریسلر کی طرح ہاجرہ کے گرد ایک چکر لگایا اور اس کی اس حرکت پر ہاجرہ مزید بدحواس ہو گئی اور اس کا بھاری بھرکم وجود تھرتھرا کر رہ گیا۔

"پیٹ اندر کرو۔" شازی کی دھاڑ بلند ہوئی تو ہاجرہ نے سانس روک کر بے ساختہ پیٹ اندر کرنے کی کوشش کی۔

پیٹ تو خیر کیا اندر ہوتا لیکن اس کوشش میں ہاجرہ کی حالت مزید مضحکہ خیز ہو گئی اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں نمی سی آجانے کی وجہ سے شازی اسے دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھی لیکن مجال ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نظر شازی سے ہٹی ہو کیونکہ دھندلی ہی سہی لیکن اسے اپنی مصیبت بہرحال نظر آ رہی تھی۔ اب شازی پھر ساکن کھڑی یک ٹک ہاجرہ کو گھور رہی تھی اور ہاجرہ کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ ملے۔

"چائے لاؤ۔" شازی کی چیختی ہوئی آواز بلند ہوئی اور ہاجرہ فٹ بال کی طرح لڑھکتی ہوئی تیزی سے یوں کمرے سے باہر نکلی کہ دروازے میں گرتے گرتے بچی اسے اتنی جلدی اپنی جان چھوٹ جانے کی توقع نہیں تھی لیکن ایسا ہو چکا تھا۔

اور ہاجرہ اس بات پر اپنے رب کا جتنا بھی شکر بجا لاتی کم تھا۔ کیونکہ ایسی ہی سرپھری تھی شازیہ اور ہاجرہ کی تو جان جاتی تھی اس سے ابھی چند دن پہلے ہی کی تو بات تھی جب شازی نے کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں ہاجرہ سے دس چکر لگوائے تھے اور وہ بھی دوڑا کر' اسے بڑھے ہوئے اور لٹکے ہوئے پیٹ والے لوگوں سے سخت چڑ تھی یہی وجہ تھی کہ ہاجرہ اکثر اوقات اس کے تختہ ستم کا نشانہ بنی رہتی تھی اور چونکہ شازی سیٹھ عاصم کی اکلوتی اولاد تھی اس لیے کم از کم اس گھر میں رہتے ہوئے کوئی بھی فرد اس کی کسی بھی الٹی سیدھی بات سے انکار کی جرات ہرگز نہیں رکھتا تھا بھلا دریا میں رہتے ہوئے مگرمچھ سے بیر کون رکھے؟ اور آج کل اس کی تمام تر محبتیں اور عنایتیں صرف اور صرف ہاجرہ کے لیے تھیں جس کے نتیجے میں ہاجرہ کو آئے دن کسی نہ کسی نئے ورزشی پروگرام کا سامنا کرنا پڑتا۔

پورا ایک مہینہ اس سے ڈائٹنگ بھی کروائی جا چکی تھی لیکن نہ تو اس کے موٹاپے میں کوئی کمی آئی تھی اور نہ ہی اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں..... شاید اسی وجہ سے ایک مہینے کے بعد شازی نے اپنا حکم نامہ واپس لے لیا تھا اور ہاجرہ کو کھل کھیلنے کا موقع دوبارہ سے مل گیا تھا یہ علیحدہ بات ہے کہ ڈائٹنگ کے دوران بھی ہاجرہ پر کوئی خاص پابندی اثر انداز نہیں ہو سکی تھی۔ کیونکہ ہاجرہ شازی کی پرسنل خدمت گار ہونے کے ساتھ ساتھ باورچی خانے کی حکومت بھی سنبھالے ہوئے تھی لہٰذا وہ اس حکومت کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھی بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے ملک کے سبھی حکمران اپنی حکومت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کھانا پکاتے پکاتے کم از کم آدھا کلو مرغی روزانہ اس کے پہاڑ جیسے پیٹ میں منتقل ہو کر غائب ہو جانا معمولی

بات تھی اور یہ عمل ڈائٹنگ کے دنوں میں بھی جوں کا توں رہا تھا۔ لہٰذا اس کا ڈیل ڈول اور مجموعی حسن بھی جوں کا توں تھا۔

لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر ایک بات بہرحال ہاجرہ کے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ ہاجرہ کے ہاتھ میں لذت بہت تھی اور اس کے پکائے ہوئے کھانے اپنی مثال آپ ہوتے تھے یہی وجہ تھی کہ کچن پر اس کی حکومت مارشل لا کی طرح بے خوف و خطر قائم و دائم تھی۔

اور موٹاپے کی "اپوزیشن" اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی تھی۔ جب ہاجرہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو شازی کہنیوں کے بل الٹی لیٹی دونوں ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکائے کسی گہری سوچ میں گم تھی ہاجرہ نے کھنکار کر گلا صاف کرنے کے سے انداز میں شازی کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو شازی نے چونک کر ہاجرہ کی طرف دیکھا چند لمحے خالی نظروں سے ہاجرہ کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد شازی نے ہاتھ کے اشارے سے ہاجرہ کو چائے تپائی پر رکھنے کا کہا۔

ہاجرہ نے جلدی جلدی چائے تپائی پر سجائی اور اس کے بعد لڑھکتی ہوئی اس تیزی سے باہر نکلی جیسے اسے خدشہ ہو کہ شازی پھر اسے آواز نہ دے بیٹھے اور اسے پھر کسی مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ ہاجرہ کے نکلنے کے بعد شازی اپنی جگہ سے اٹھی، اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر دوبارہ بیڈ پر آ بیٹھی پھر ہاتھ بڑھا کر تکیے کے نیچے سے ایک ضخیم ڈائری نکالی شازی نے ڈائری کھول کر اپنے سامنے رکھی اور دوسرے ہاتھ سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

☼ ☼ ☼

راحیل ایک انگڑائی لے کر بے دار ہوا تو صبح کے سات بج رہے تھے اس نے واش روم جا کر منہ ہاتھ دھویا اور پھر تولیے سے ہاتھ پونچھتا ہوا واپس بیڈ پر آ بیٹھا ابھی وہاں بیٹھے اسے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"لیس کون ہے آجاؤ دروازہ کھلا ہے۔" اس نے باآواز بلند کہا تو سانولے سے رنگ کی ایک خوش شکل لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اپنے لباس اور وضع قطع سے وہ کوئی ملازمہ معلوم ہوتی تھی لیکن راحیل کی نظریں تو اسے دور تک دیکھ رہی تھیں۔ انتہائی موزوں اور متناسب جسم کی وہ لڑکی ملازمہ ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک عجیب سی کشش اور جاذبیت رکھتی تھی۔

راحیل کی گستاخانہ نظروں کی تپش کو شاید لڑکی نے بھی محسوس کر لیا تھا اس نے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"صاحب جی! چائے لاؤں یا ناشتا کریں گے؟"

"چائے ہی لے آؤ۔" راحیل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو لڑکی نے نظریں جھکا لیں اور مڑ کر کسی لچک دار شاخ کی طرح لہراتی بل کھاتی کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی راحیل کی بے باک نظریں بدستور لڑکی کے جسمانی نشیب و فراز سے الجھ رہی تھیں اور پھر لڑکی کمرے سے باہر نکل گئی راحیل نے ایک طویل سانس لی اور جیب سے چیونگم کا پیکٹ نکال کر اس میں سے چیونگم نکالی اور منہ چلانے لگا۔

پندرہ یا بیس منٹ کے بعد دروازے پر ہونے والی آہٹوں سے راحیل کو اندازہ ہوا کہ چائے آ پہنچی ہے۔ اور پھر اس کا اندازہ درست ہی ثابت ہوا لیکن چائے لانے والی وہ لڑکی نہیں تھی بلکہ ادھیڑ عمر کی ایک عورت تھی جو شاید کوئی دوسری ملازمہ ہی رہی ہوگی۔ راحیل نے برا سا منہ بنایا اور عورت سے پوچھا۔

"وہ لڑکی کون تھی جو پہلے چائے کا پوچھ کر گئی ہے؟" عورت نے چونک کر راحیل کی طرف دیکھا اور پھر جواب دیا۔

"سرکار وہ جوری تھی۔"

"جوری! یہ کیسا نام ہے۔" راحیل نے حیرت زدہ انداز میں سوال کیا تو عورت دوبارہ گویا ہوئی۔

"سرکار نام تو اس کا منظوراں ہے لیکن سب اسے جوری ہی کہتے ہیں یتیم ہے بے چاری ماں تو اس کے پیدا ہوتے ہی فوت ہو گئی تھی بے چاری کی ایک بوڑھا

اب تھا وہ پچھلے دنوں گولی لگنے سے مر گیا چوہدری صاحب نے ترس کھا کر یہاں کام کاج کے لیے رکھ لیا اب یہیں رہتی ہے۔"

"گولی لگنے سے؟" راحیل نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"جی سرکار! کچھ دن پہلے پانی کی باری پر وڈے چوہدری صاحب اور ساتھ والے پنڈ کے چوہدری نیامت کے بندوں کی آپس میں لڑائی ہو گئی تھی جس پر چوہدری نیامت کے بندوں نے فائرنگ کر دی بس وہیں ہاشے کو گولی لگی بے چارے نے دوجا ساہ وی نہیں لیا (بے چارے نے دوسری سانس بھی نہیں لی) اور وہیں پٹ سے گر کر مر گیا اور سرکار جس کی درخت جیسی جوان بی گھر بیٹھی ہو وہ بے چارہ آدھا تو ویسے ہی مرا ہوا ہوتا ہے گولی لگی تو پورا ہی مر گیا اور جوری بے چاری بے سہارا ہو گئی اللہ بھلا کرے وڈے چوہدری صاحب کا انہوں نے سہارا نہ دیا ہوتا تو پتا نہیں کیا ہوتا جوری کا۔" عورت نے بے تکان بولتے ہوئے بتایا۔

"وڈے چوہدری صاحب کے بندوں سے کچھ نہ ہو سکا جواب میں؟" راحیل نے ہاشے کی موت اور جوری کو سرے سے نظر انداز کرتے ہوئے جاگیردارانہ سوال داغا اس کے چہرے یا آنکھوں کے تاثرات سے اس دلدوز واقعہ پر ذرا بھی تاسف کا اظہار نہیں ہو رہا تھا لیکن وہ دیہاتی عورت ایسی باریک بین نہیں تھی جو پوری جزئیات کے ساتھ راحیل کے تاثرات کا مشاہدہ کر سکتی یا ان پر اپنی کوئی رائے قائم کر سکتی سیدھی سادی ان پڑھ گنوار اور خالص دیہاتی وہ ادھیڑ عمر ملازمہ صرف ایک ملازمہ تھی جسے اپنے مالک کے سامنے صرف سر تسلیم خم کرنا ہوتا ہے اس سے زیادہ کی اسے اجازت ہوتی ہے اور نہ ہی اس میں سکت ہوتی ہے۔

"وڈے چوہدری صاحب کے بندوں نے بھی بندوقیں نکال لی تھیں جی پر وڈے چوہدری صاحب موقع پر پہنچ گئے اور انہوں نے مزید خون خرابہ نہ ہونے دیا پر سرکار انہوں نے ہاشے کے قاتل کو معاف نہیں کیا انہوں نے اسے پلس (پولیس) میں پکڑوا دیا بڑی پنچایتیں ہوئیں، بڑا زور ڈالا ان لوگوں نے صلح کرنے کے لیے پر وڈے چوہدری صاحب نے ان کی ایک نہیں مانی پھا ہے لگوا دیا پلیت کو (پھانسی لگوا دیا پلید کو)۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔" راحیل نے ہاتھ اٹھا کر ملازمہ کی بات کاٹتے ہوئے بے زاری سے کہا "جوری کیوں نہیں آئی چائے لے کر؟" راحیل نے ملازمہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ جی، وہ۔۔۔ وہ کچھ کام کر رہی ہے جی کچن میں اس نے مجھے کہا کہ صاحب جی کو چائے دے آؤ میں نے کہا بھی کہ جا کے خود دے آ پر۔۔۔" ملازمہ نے ہچکچاتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پر کیا؟ بات پوری کرو اپنی۔" راحیل نے غصیلے انداز میں کہا تو ملازمہ کی رنگت زرد پڑ گئی اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور پھر لجاجت آمیز انداز میں بولی۔

"وہ جی بچی ہے نادان ہے، کہنے لگی مجھے چھوٹے سرکار سے ڈر لگتا ہے تم چائے دے آؤ۔ میں کچھ برتن دھو لیتی ہوں بس جی میں نے برتن دھونا چھوڑے اور چائے لے آئی ہوں۔" راحیل نے ہنکارا بھرا اس ساری گفتگو کے دوران راحیل چائے پی چکا تھا۔ لہٰذا خالی کپ تپائی پر رکھتے ہوئے راحیل نے ملازمہ کو اشارہ کیا تو وہ جلدی سے برتن سمیٹنے لگی۔ جب وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی تو راحیل کی آواز بلند ہوئی۔

"جوری کو بھیجو جا کر۔" ملازمہ نے ٹھٹک کر ایک لحظے کے لیے راحیل کی طرف مڑ کر دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ جی سرکار کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی جبکہ راحیل ایک مرتبہ پھر بستر پر گر کر آنکھیں موند چکا تھا۔

اب وہ اس آفت زادی جوری کا منتظر تھا جو پہلی ہی نظر میں اس کے دل دماغ پر کچھ عجیب سا تاثر قائم کر گئی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ انگلینڈ کی لڑکیوں اور یہاں کی لڑکیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے کہاں وہ آزاد خیال ماڈرن لڑکیاں اور کہاں یہ ڈھکی چھپی، سکڑی سمٹی اور

سہمی ہوئی لڑکیاں لیکن جو کچھ بھی تھا یہاں کی لڑکیوں میں اسے ایک عجیب و غریب انوکھی سی سحر انگیز کشش محسوس ہوئی تھی جو اس نے انگلینڈ میں رہتے ہوئے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

وہ اپنی ان کیفیات کا تجزیہ کر رہا تھا اور اس کا دماغ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جو چیز جتنی عامیانہ انداز میں اور آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے وہ اتنی ہی جلدی اپنی کشش کھو بیٹھتی ہے۔

مشرق میں رہنے والوں کے لیے بھلے ہی مغرب کی رنگینیاں کوئی معنی رکھتی ہوں لیکن وہاں رہنے والے مشرقی بہت جلد ان سے بے زاری محسوس کرنے لگتے ہیں وہاں کی عورت گوری چمڑی ضرور رکھتی ہے' خوب صورت ضرور ہے لیکن اپنے آپ کو چھپانا' لیے دیے رکھنا یا شرم و حیا نام کی کسی چیز کا عملی مظاہرہ کرنا ان کے بس کی بات ہے ہی نہیں۔ اس کے برعکس یہاں کی عورت لجاتی' شرماتی' اپنے آپ کو پوشیدہ بھی رکھتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں کی عورت میں اسے کشش محسوس ہوتی ہے۔

"صاحب جی! آپ نے مجھے بلایا؟" جوری کی مترنم آواز اس کے کانوں میں گونجی تو راحیل کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا اور وہ آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھا۔

نہ جانے کتنی دیر وہ اپنے خیالوں کی رو میں بہتا چلا گیا تھا اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ جوری کے اندر داخل ہونے یا دروازہ کھلنے کی آواز بھی اسے سنائی نہیں دے سکی تھی لیکن دروازہ کھلا بھی تھا' کھلنے کے بعد بند بھی ہوا تھا اور جوری بھی کمرے میں داخل ہو چکی تھی جو اس وقت بالکل کمرے کے وسط میں کھڑی راحیل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور راحیل اپنے بستر پر بیٹھا یک ٹک اسے دیکھے چلا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈائری کے صفحات پلٹتے چلے جا رہے تھے اور شازی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے زندگی میں پہلی بار آج اس پر ایسے ایسے انکشافات ہو رہے تھے کہ اس کا سر چکرا کر رہ گیا تھا اسے اپنا ذہن ماؤف ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ یہ ڈائری پڑھنے پر مجبور تھی یہ ڈائری' ڈائری نہیں تھی بلکہ ایک داستان تھی ماضی کے دھندلکوں میں لپٹی محبت کی ایک ایسی داستان جو اپنے اندر عشق و محبت کی چاشنی رکھنے کے باوجود شازی کے دل و دماغ پر قطرہ قطرہ زہر کی صورت ٹپکتی چلی جا رہی تھی ایک ایسا زہر جو اس کی رگوں میں گردش کرتے لہو کو آتش فشاں لاوے کی صورت میں تبدیل کر رہا تھا۔

یہ ڈائری ایک ایسا نشتر تھی جو اس کی روح تک کو زخم زخم کر رہا تھا۔ اس کے جذبات' اس کے احساسات کے تمام تر محلات مسمار ہو رہے تھے اور وہ سر تاپا ایک تند و تیز طوفانی آندھی کی زد پر تھی۔ ڈائری کی تحریر پر اس کی نظریں پھسلتی چلی جا رہی تھیں اور لحہ بہ لحہ وہ اذیت کے نئے سے نئے جہانوں کی سیر کر رہی تھی۔ لیکن وہ یہ اذیت برداشت کرنے پر مجبور تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ خود آگہی کے اس سفر میں اس کا ہر قدم کانٹوں پر پڑ رہا ہے وہ یہ اذیت' یہ کرب برداشت کرتے ہوئے قدم بہ قدم آگے اور آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ آج اسے اپنی ذات کا ادراک ہو رہا تھا آج وہ شعور ذات حاصل کر رہی تھی آج وہ اپنے آپ سے واقف ہو رہی تھی اور آگاہی کا یہ سفر اسے لہولہان کیے دے رہا تھا۔

آج وہ ایک ایسی شازی سے مل رہی تھی جسے آج سے قبل وہ بالکل نہیں جانتی تھی' کیا تھا یہ سب کچھ؟ کیوں تھا؟ اور وہ اس سے آج تک بے خبر کیوں تھی؟ حیرتوں کا ایک بحر بے کراں تھا جس میں وہ ڈوبتی ابھرتی رہی تحیر کا یہ سفر شاید مزید جاری رہتا لیکن دروازے پر ہونے والی دستک نے شازی کو جیسے ایک گہرے سمندر سے اٹھا کر یکلخت ساحل پر لا پٹخا۔

اس نے پلکوں سے بے ساختہ امڈ آنے والے آنسوؤں کو اپنی آستین سے صاف کیا اور پھر اپنی روتی کرلاتی آواز کو بمشکل کنٹرول کرتے ہوئے پوچھا "کون ہے؟" باہر سے حسب توقع ہاجرہ کی آواز سنائی دی۔

"بی بی جی کھانا نہیں کھائیں گی؟"

"نہیں ہاجرہ میں ابھی آرام کے موڈ میں ہوں جب بھوک محسوس ہوئی تمہیں آواز دے لوں گی۔" اس نے نرمی سے کہا اور اس کے بعد ہاجرہ کے دور ہوتے قدموں کی آواز سنائی دی اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ بالکل ایسی ہی خاموشی آج شازی کے اندر بھی چھائی ہوئی تھی ایک ٹھہراؤ' ایک سکوت' ایک ایسا سکوت جو بعض اوقات کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

ڈائری ابھی تک شازی کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی اور وہ سوچوں کی ایک لایعنی یلغار سے نبرد آزما تھی۔ اس ڈائری کا شازی کے ہاتھ لگنا بھی محض ایک اتفاق ہی تھا۔ آج صبح یونیورسٹی کے لیے نکلتے ہوئے اس نے اپنے ڈیڈی کے کمرے کا رخ کیا اور اپنی اس تجوری کے مخصوص نمبرز ملانے کے بعد اسے کھول لیا جسے آج سے پہلے بھی وہ سینکڑوں بار کھول چکی تھی۔

اس نے اپنی ضرورت کے مطابق کچھ رقم نکالی اور پھر تجوری بند ہی کرنا چاہتی تھی کہ اس کی نظر تجوری میں سجے اس خوب صورت فریم پر پڑی جس میں سیٹھ عاصم کی 5x7 کی خوب صورت تصویر لگی ہوئی تھی۔

یہ تصویر شازی آج سے پہلے بھی بہت مرتبہ دیکھ چکی تھی' سیٹھ عاصم کی یہ تصویر دیکھ کر بے اختیار شازی کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگتے چلے گئے۔ پھر بالکل اضطراری سے انداز میں شازی سے وہ حرکت سرزد ہوگئی جو آج سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی اور جس حرکت کے نتیجے میں شازی پر انکشافات کا ایک انوکھا سلسلہ شروع ہوگیا۔

شازی نے ہاتھ بڑھا کر اس مسکراتی ہوئی تصویر کو اٹھانا چاہا تھا لیکن تصویر نے تجوری کی دیوار سے الگ ہونے سے انکار کردیا تھا فریم پوری مضبوطی کے ساتھ دیوار سے چپکا رہا شازی کو حیرت محسوس ہوئی اس نے ایک مرتبہ پھر فریم کو اپنی طرف کھینچا لیکن بے سود اس نے دونوں ہاتھوں سے فریم کو پکڑ کر دائیں طرف گھمانا چاہا تو فریم باآسانی گھوم گیا لیکن ایک مخصوص حد تک گھوم کر رک گیا اور شازی کے زور لگانے کے باوجود فریم اس سے آگے ایک انچ نہیں سرکا تھا۔ شازی نے فریم سے ہاتھ ہٹائے تو وہ آہستگی سے گھومتا ہوا پھر اپنی جگہ پر واپس آگیا۔

شازی نے ایک مرتبہ پھر فریم کو پکڑ کر بائیں طرف گھمانا چاہا تو فریم بائیں طرف بھی گھوم گیا لیکن جوں ہی فریم اپنی گردش کی مقررہ حد تک پہنچا کھٹک کی ایک تیز آواز بلند ہوئی اور تصویر کے بالکل اوپر ایک چوکور خانہ نمودار ہوگیا۔ شازی کو شدید حیرت ہوئی کہ آج سے پہلے وہ تصویر کے اس میکنزم یا اس پوشیدہ خانے کے متعلق بالکل کچھ نہیں جانتی تھی کم و بیش ایک فٹ مربع کا وہ خانہ اس کے لیے کسی اسرار سے کم نہیں تھا اور اس سے بھی زیادہ پراسرار بات یہ تھی کہ اتنے زیادہ خفیہ میکنزم کے ساتھ چھپائے گئے اس خانے میں ہیرے جواہرات' سونے کے زیورات یا نوٹوں کی گڈیاں نہیں تھیں بلکہ براؤن کلر کی ایک خوب صورت اور ضخیم ڈائری رکھی گئی تھی۔

شازی نے ڈائری اٹھائی اور پھر اسے کھول کر پہلے صفحے پر نظر دوڑائی جس پر جلی حروف میں لکھا گیا تھا "روز و شب" اور نیچے سیٹھ عاصم کے خوب صورت دستخط تھے شازی نے ڈائری پر باپ کی تحریر اور دستخط پہچان کر اسے بغل میں دبایا اور پھر تجوری کو مخصوص نمبرز ملا کر بند کرنے کے بعد واپس پلٹی اب اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ ڈائری کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر وہ یونیورسٹی چلی گئی تھی اور اب وہی ڈائری اس کے ہاتھ میں تھی۔

☼ ☼ ☼

ہلکے بادامی کلر کی لان کے پھولدار شلوار سوٹ میں ملبوس سر پر دوپٹہ اوڑھے شہابی رنگت والی یہ لڑکی ناجی تھی جو دوپٹے کے پلو میں کچے چاول لیے مہراں ماچھن کی بھٹی کی طرف رواں دواں تھی تین چار گلیوں سے گزرنے کے بعد آخر اس کی منزل آہی گئی گاؤں کے چوک میں بھٹی بنا کر بیٹھی کھچڑی بالوں والی مہراں پوری تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھی ارد گرد بچوں کا ہجوم تھا کوئی چنے لے کر کھڑا تھا تو کوئی گندم تو کوئی چاول اور مہراں باری باری کڑاہی کی ریت میں ڈال کر ورانتی کی مدد سے ہاتھ ہلاتے ہوئے سب کو دانے بھون بھون کر دیے جارہی تھی لیکن ہر کسی کے لائے ہوئے چنے' چاول یا گندم میں سے اپنے حصے کی ایک مٹھی نکالنا وہ کبھی نہیں بھولتی تھی۔

ناجی بھی جلد ہی بچوں کے اس جتھے میں شامل ہوگئی "ماسی پہلے مجھے بھون کر دے دو' ماسی پہلے مجھے بھون کر دو۔" کی گردان کر رہے تھے جبکہ مہراں ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ سجائے سب کو باری باری جواب بھی دیے جارہی تھی اور اپنا کام بھی کیے جارہی تھی۔

"بس پتر کرمو کے بعد تیری ہی باری ہے الیاسے پتر ایہہ لے پھڑ اپنے دانے' کرموں تو ادھر پھڑا کی اے تیرے کول؟" (بس بیٹا کرمو کے بعد تمہاری ہی باری ہے' الیاس بیٹا یہ پکڑو اپنے دانے' کرمو تم ادھر لاؤ کیا ہے تمہارے پاس) اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد ناجی کی باری بھی آگئی مہراں نے ایک چھلنی کی مدد سے بھنے ہوئے چاول کڑاہی میں سے نکالے ریت کڑاہی میں رہ گئی اور چاول ناجی کے دوپٹے کے ایک پلو میں منتقل ہوگئے۔

اب ناجی کا رخ چھیمو اور شادو کے گھر کی طرف تھا۔ جب ناجی' چھیمو کے گھر میں داخل ہوئی تو وہ چارپائی پر بیٹھی مٹر کے دانے نکال رہی تھی سلام دعا کے بعد چھیمو کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے ناجی نے پلو چھیمو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو دانے چباؤ کیا یاد کرو گی تم بھی کہ کس رئیس سے پالا پڑا ہے۔"

"بس بس رہنے دو اپنی امارت کے قصے' مجھے پتا ہے کہ تو دل کی بادشاہ ہے۔"

چھیمو نے اس کے دوپٹے کے پلو میں بھنے ہوئے چاولوں کی مٹھی بھرتے ہوئے کہا اور ناجی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھا کیا پروگرام ہے آج باغ کی طرف چلیں۔" ناجی نے دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

"لو یہ تو تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ قسم سے منہ میں پانی آرہا ہے کیا مزے کے کچے آم تھے وہ واہ' واہ' واہ۔" چھیمو نے جواباً کہا اور پھر وہ چارپائی سے اٹھ کر لپکتی ہوئی باہر نکل گئی کچھ ہی دیر کے بعد وہ شادو کو ساتھ لیے واپس گھر میں داخل ہوئی اس نے کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی وہ چھبی اٹھائی جس میں مٹر تھے اور ساتھ ہی اسٹیل کا وہ ڈول بھی جس میں مٹروں کے دانے تھے دونوں چیزیں سرکنڈوں کے چھپر کے نیچے چولہا جلائے بیٹھی اپنی ماں کے سامنے رکھیں اور بولی۔

"امی میں ناجی کے ساتھ جارہی ہوں اب باقی مٹر خود نکال لینا میں چلی۔" اور پھر ماں کی بڑبڑاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے لپکتی جھپکتی شادو اور ناجی کے پاس پہنچ گئی کچھ ہی دیر کے بعد تینوں سہیلیاں گاؤں سے باہر جانے والے اسی کچے راستے پر گامزن تھیں جس کا اختتام آموں کے باغ پر ہوتا تھا۔

باغ میں داخل ہونے کے بعد ناجی نے ایک درخت کو تاڑا اور پھر جوتی اتار کر ایک طرف رکھی اور دوپٹہ کمر کے گرد کس لیا اب وہ درخت پر چڑھنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ جبکہ چھیمو اور شادو کی پر اشتیاق نظریں آم کے اس گھنے درخت کی شاخوں سے لٹکتے ہوئے سبز سبز آموں پر جیسے جم کر رہ گئی تھیں۔ ابھی ناجی نے درخت پر چڑھنے کی کوشش شروع ہی کی تھی کہ ایک گرج دار آواز بلند ہوئی۔

"کون اے اوئے ایدھر؟" (کون ہے ادھر) اور ناجی کے اوسان خطا ہوگئے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ چاچا کرم دین کی آواز وہ پہچان چکی تھی اس گھبراہٹ کے عالم میں وہ تنے پر اپنے ہاتھوں کی گرفت کو قائم نہ رکھ سکی اور پٹ سے نرم اور گیلی زمین پر آرہی۔

ادھر شادو اور چھیمو بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئیں۔ ناجی کولہوں کے بل زمین پر گری چونکہ زمین گیلی اور نرم تھی اور ابھی وہ اونچی بھی نہیں تھی اس لیے چوٹ لگنے

رہی لیکن چاچا کرم دین سے نہ بچ سکی باغ کا رکھوالا چاچا کرم دین اس کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اب ــــ ــــ قہر بھری نظروں سے اسے گھور رہا تھا اور ناجی وہیں کی وہیں پڑی ملتجیانہ نظروں سے چاچا کرم دین کی طرف دیکھتی رہ گئی کیونکہ آج وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی اور آج اس کی یہ معصوم چوری صیغہ راز میں نہیں رہ سکی تھی۔

"ناجی تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گی؟ سارا باغ اجاڑ کے دم لے گی نا تو؟" چاچا کرم دین نے گرجتے ہوئے استفسار کیا لیکن ناجی کوئی جواب نہ دے سکی۔ کرم دین مزید بھی گرجتا برستا رہا اور پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا لیکن اب ناجی کے کان اس کی آواز نہیں سن رہے تھے اس کی ساری حسیات سمٹ کر جیسے آنکھوں میں آگئی تھیں اور ذہن ایک نقطے پر مرکوز ہو گیا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ اس نقطے نے انسانی شکل و صورت اختیار کر لی' چاچا کرم دین کے عقب سے سفید شلوار سوٹ میں ملبوس جو وجیہہ نوجوان نمودار ہو رہا تھا وہ کوئی اور نہیں تھا! ہاں وہ وہی تھا جسے دیکھ کر اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی تھیں وہی خوبرو نوجوان' جس نے پچھلی مرتبہ اس کا سامنا کیا تھا تو اس کے ہاتھوں سے سارے آم گر گئے تھے اور پھر ان گرے ہوئے آموں کو اکٹھا کرنے میں اس نے ناجی کی مدد بھی کی تھی اس دن سے لے کر اب تک ناجی کی نظروں سے اس کی شبیہہ معدوم نہیں ہو سکی تھی نہ جانے کیوں؟ اور اب ایک بار پھر اسے اپنے سامنے پا کر ناجی کا دل دھک سے رہ گیا تھا اور دھڑکنیں دیوانی ہو چکی تھیں۔

نوجوان عین چاچا کرم دین کے پیچھے پہنچ چکا تھا لیکن اسے اس بات کا قطعی احساس نہیں ہوا تھا وہ اپنی دھن میں مست پتا نہیں کیا کیا بک جھک کیے جا رہا تھا جبکہ نوجوان اس کے عقب میں ٹھہرا کہنیوں کے بل زمین پر پڑی ناجی کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور ناجی کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھوں سے کوئی غیر مرئی مقناطیسی شعاعیں نکل رہی ہوں' جنہوں نے اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہو وہ ان آنکھوں کی گہرائی میں کہیں ڈوب کر رہ گئی ہو بے خودی کا یہ عالم زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا کیونکہ نوجوان شاید سچویشن کو کسی حد تک سمجھ چکا تھا اس نے ناجی کے چہرے سے اپنی نظریں ہٹا لیں اور پھر اس کا چوڑا چکلا مضبوط ہاتھ چاچا کرم دین کے کندھے پر جم گیا۔ کرم دین نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر ہڑبڑائے ہوئے انداز میں اس کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھ گیا۔

"چھ۔۔۔ چھوٹے چوہدری صاحب! یہ لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہمیشہ یہاں سے آم چرا کر لے جاتی ہے کئی مرتبہ منع کیا ہے لیکن یہ باز نہیں آئی اور آج تو رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے اور۔۔۔ اور ڈھٹائی دیکھیں اس کی کہ میری باتوں کا جواب تک نہیں دے رہی ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری والی بات ہی ہو گئی نا جی؟" کرم دین نے اپنی بات ختم کر کے تائید طلب انداز میں اس خوب صورت نوجوان یعنی اپنے چھوٹے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا لیکن وہاں اسے غیض و غضب کی جھلک تک نظر نہ آئی بلکہ نوجوان کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب اور مسحور کن مسکراہٹ نظر آ رہی تھی اور اس کا سر نفی میں ہل رہا تھا کرم دین حیرت سے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر نوجوان ست قدمی سے دھیرے دھیرے ناجی کی طرف بڑھا تو یہ پیش قدمی دیکھ کر ناجی کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ چھیمو اور شادو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکی ہیں اور وہ اس وقت یہاں بالکل تنہا اور اکیلی پڑی ہوئی ہے۔

نوجوان اس کے بالکل قریب پہنچا اور پھر آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا اور ناجی کا سانس دھونکنی بن گیا چہرہ چقندر کی طرح سرخ ہو گیا اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں جھلملانے لگیں وہ ہراساں نظروں سے اس کا چہرہ تک رہی تھی لیکن نوجوان کے لبوں پر بڑی من موہنی اور جلکوتی مسکراہٹ تھی اس نے مڑ کر کرم دین کی طرف دیکھا جو دیدے پھاڑے اپنے چھوٹے چوہدری صاحب کو اپنے قیمتی سفید لباس کی پروا کیے بغیر زمین پر پھسکڑا مارے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔

نوجوان کی آواز بلند ہوئی۔

"کرم دین! جاؤ کچے آم توڑ کر لاؤ' بہت سارے۔۔۔"

اور کرم دین' جس کی آنکھیں پہلے ہی پھٹی ہوئی تھیں حیرت کی شدت سے مزید پھٹ گئیں چند لمحے حیران نظروں سے نوجوان کا چہرہ تکنے کے بعد کرم دین نے بے بسی کے سے انداز میں کندھے اچکائے اور آم کے درخت کی طرف بڑھ گیا جیسے کہہ رہا ہو "میں تو نوکر ہوں' جو دل چاہے کرو میری بلا سے مجھے کیا؟"

☼ ☼ ☼

رانا سہیل کی حویلی پر اس وقت سنسنی چھائی ہوئی تھی' ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اگر ایسا ہو رہا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا حویلی کے مکینوں کے لیے وہ واقعہ تھا ہی اتنا ــــ روح فرسا کہ ہر شخص کپکپا کر رہ گیا تھا اس وقت حویلی کے سارے ملازمین مرد و عورت کی تخصیص کے بغیر ایک قطار میں سر جھکائے حویلی کے وسیع لان میں موجود تھے اور ایک طرف کرسی ڈالے چوہدری سہیل بیٹھا تھا جس کی پیشانی اس وقت ان گنت شکنوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

لان کے درمیان میں ایک انسانی وجود پڑا ہوا تھا جسے سفید کپڑے سے ڈھکا گیا تھا اور وہ کوئی زندہ وجود نہیں تھا بلکہ ایک لاش تھی۔ اس وقت حویلی کے تمام نفوس یہاں موجود تھے جن میں سے ایک کو اس سفید چادر کے نیچے ڈھک دیا گیا تھا کیونکہ آج وہ جسم زندگی کی حرارت سے محروم تھا۔

اگر اس وقت کوئی شخص حویلی میں موجود نہیں تھا تو وہ راحیل تھا! کیونکہ آج وہ صبح ہی سے اپنے آموں کے باغ کی طرف گیا ہوا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ لان میں اس وقت موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ایک موت ہو بھی چکی تھی سب ہی اپنی اپنی جگہ اس واقعے کے بارے میں اپنی ذہنی اپروچ کے مطابق سوچ بچار کرنے میں مصروف تھے لیکن ذرا اتنی آسانی سے سلجھتی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی ٹھیک اسی وقت گھڑگھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ایک پولیس جیپ حویلی کے پورچ میں رکتی نظر آئی اور پھر چند باوردی کانسٹیبلوں کے ساتھ ایک سب انسپکٹر قریب آتا نظر آیا جس کے سینے پر لگے بیج پر ریحان احمد تحریر تھا۔

چوڑی پیشانی اور موٹی موٹی آنکھوں والا یہ نوجوان پولیس آفیسر خاصا چست و چالاک اور ذہین نظر آتا تھا شاید یہ بھی انہی چند سر پھرے نوجوانوں میں سے ایک رہا ہو گا جو کچھ کر دکھانے کا جذبہ لے کر پولیس میں بھرتی ہوتے ہیں پھر رفتہ رفتہ عمر رسیدہ اور گھاگ پولیس افسران کی طرح ان کو بھی اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ وڈیروں' جاگیرداروں' سیاستدانوں اور وزیروں مشیروں کی سرپرستی میں ہونے والے جرائم کی اس دنیا میں "کچھ کر دکھانا" اتنا بھی آسان نہیں جتنا تازہ خون کے جوش کے زیر اثر وہ سمجھ لیتے ہیں ناچار "سسٹم ہی خراب ہے" کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور پھر یہ سمجھوتہ ہی آہستہ آہستہ ان کو آنکھوں پر دولت کی ملمع کاری سے لے کر بے حسی کی ذلت آمیز چادر میں لپیٹ کر تمام تر انسانی اقدار سے دور مردہ جذبات کے گہرے سرد خانوں تک پہنچانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔

"السلام علیکم رانا صاحب!" ایس آئی نے دبنگ آواز میں رانا سہیل کو سلام کیا اور پھر یہ نظر غائر ارد گرد نظریں دوڑاتے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا جلد ہی اس کی گردش کرتی ہوئی نگاہیں سفید کپڑے کے نیچے ڈھکے ہوئے وجود پر جا ٹھہریں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور پھر اس نے لاش پر سے سفید کپڑا ہٹا دیا لیکن بہت جلد اسے اپنی آنکھوں کا زاویہ تبدیل کرنا پڑا کیونکہ کپڑے کے نیچے موجود انتہائی متناسب وجود کی اس لڑکی کی لاش انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں تھی اس کا پورا وجود زخم زخم اور خون میں لت پت تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر پوری باریک بینی سے لاش اور اس کے گرد و پیش کا مشاہدہ کیا اور پھر لاش کو دوبارہ کپڑے سے ڈھک دیا گیا۔ اب وہ وہاں موجود ایک ایک شخص کو یوں دیکھ رہا

تھا جیسے اس کی نظروں میں ایکسرے مشین فٹ ہو اور وہ ابھی قاتل کو گردن سے پکڑ کر کہے گا کہ یہ ہے لڑکی کا قاتل ...! لیکن یہ سب اتنا بھی آسان نہیں تھا وہ ایک ایک قدم بڑھاتا ملازمین کی قطار کے سامنے سے گزر رہا تھا اور اس کی سخت کھردری نگاہیں ہر چہرے کو جیسے ٹٹول رہی تھیں' جبکہ ملازمین کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں پھر وہ ڈرامائی انداز میں رانا سہیل کی طرف گھومتے ہوئے بولا۔

"رانا صاحب لاش کہاں پائی گئی؟ اور اسے یہاں کیوں لایا گیا؟"

"حویلی کی عقبی طرف موجود باغ سے ملی ہے' ہماری ملازمہ رفعت نے سب سے پہلے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو کر چیخیں مارتی ہوئی واپس حویلی آئی اور یہاں سے دیگر ملازمین اس کے ساتھ ہو لیے ——— ——— یہ ہماری ملازمہ "جوری" کی لاش ہے دیہاتی ملازم اسے اٹھا کر حویلی لے آئے اور یوں میں نے آپ کو یہاں بلوایا۔"

چوہدری سہیل نے سب انسپکٹر کو تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا "میں اس جگہ کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں" سب انسپکٹر ریحان نے اپنا مدعا بیان کیا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ حویلی کے عقبی سمت واقع اس گھنے اور خوب صورت باغ میں موجود تھا ——— یہ جگہ حویلی سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی' درختوں کے ایک جھنڈ میں دھینگا مشتی کے واضح نشانات موجود تھے اور ایک جگہ خون کا ایک بڑا دھبا بھی موجود تھا۔

ریحان نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل کو جائے وقوعہ کا نقشہ بنانے کی ہدایت کی اور خود پوری باریک بینی سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا اور پھر اس کی چکراتی ہوئی نگاہیں ایک جگہ جم کر رہ گئیں وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس درخت کی جڑ کے قریب بیٹھ گیا جہاں اسے کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی تھی یہ ایک چھوٹے سائز کا زنانہ جھمکا تھا ... ایک عام سا بازاری اور سستا زیور ... ریحان نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا ٹشو پیپر نکالا اور اس کی مدد سے وہ جھمکا اٹھا لیا اور پھر وہ جھمکا اس ٹشو پیپر میں لپیٹ کر اپنی جیب میں منتقل کر دیا۔ کافی دیر مزید ادھر ادھر چکرانے کے باوجود اور کوئی قابل ذکر چیز اسے نظر نہ آسکی تو وہ دونوں اہلکاروں کو وہیں مصروف چھوڑ کر واپس حویلی کی طرف پلٹا رانا سہیل اور دو ملازم اس کے ساتھ تھے۔

حویلی پہنچ کر اس نے رانا سہیل اور تمام ملازمین کے بیان قلمبند کیے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کیا اور پھر چوہدری سہیل سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"معاملہ کافی الجھا ہوا ہے لیکن الجھنیں مجھے اچھی لگتی ہیں ویسے کیا اس وقت حویلی کے تمام افراد یہاں موجود ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کچھ بھول رہے ہوں؟" ایس آئی نے حسب سابق ڈرامائی انداز میں سوال کیا تو رانا سہیل نے جواب دیا۔

"تقریباً سارے ہی لوگ موجود ہیں صرف میرا بیٹا راحیل موجود نہیں ہے کیونکہ وہ صبح ہی سے اپنے آموں کے باغ کی طرف گیا ہوا ہے اور اسے تو شاید اس سانحے کی اطلاع بھی نہیں ہے۔"

"اوہ۔" ریحان نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

"ملاقات تو ان سے بھی ضروری ہے لیکن فی الحال اجازت دیجیے پھر ملیں گے اگر خدا لایا اور مجھے یقین ہے کہ خدا جلد ہی مجھے دوبارہ یہاں لائے گا۔"

جملہ مکمل کرتے ہوئے ریحان اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ سے سر نکالتے ہوئے بولا۔

"راحیل صاحب کو میرا اسلام کہہ دیجیے گا۔"

☼ ☼ ☼

عاصم اور فریال کی محبت ایک طوفانی محبت تھی دونوں ایک دوسرے کی سانس کے ساتھ سانس لیتے تھے بلکہ عاصم کا کہنا تو یہاں تک تھا کہ وہ فریال کی خاطر جان دے بھی سکتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو جان لے بھی سکتا ہے عاصم کا باپ سیٹھ معظم اور فریال کا باپ سیٹھ یعقوب دونوں گہرے دوست تھے اس لیے

دونوں گھرانوں کے آپس میں گہرے مراسم بھی تھے سیٹھ معظم نے اپنی بیوی کی وفات کے بعد اپنی زندگی ہی میں اپنا تمام بزنس جو کہ کئی ٹیکسٹائل ملز' جیوٹ ملز اور اسٹیل ملز پر مشتمل تھا عاصم کے حوالے کر دیا تھا اور عاصم کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ صحیح معنوں میں وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا تو کچھ غلط نہ ہو گا۔

سیٹھ معظم کا اکلوتا بیٹا ہونا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی دوسری طرف فریال تھی تو اس کا باپ سیٹھ یعقوب اگر حیثیت میں سیٹھ معظم سے زیادہ نہیں تھا تو کم بھی نہیں تھا مال و دولت اور ظاہری حیثیت و شان و شوکت میں دونوں ہی تقریباً" ہم پلہ تھے۔ عاصم اور فریال دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور بچپن سے لڑکپن میں تقریباً" ایک ساتھ ہی داخل ہوئے تھے ایک ہی کالج میں تعلیم حاصل کی' یونیورسٹی میں بھی ساتھ رہا لہٰذا دونوں میں زبردست یگانگت اور ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی تھی اور دوستی ... دوستی تو بچپن ہی سے تھی یہ دوستی کب محبت کا اور پھر محبت سے جنون کا رنگ اختیار کر گئی دونوں کو اس کا اندازہ ہی نہ ہو سکا احساس تھا تو صرف اس بات کا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں اور ایک دوسرے سے الگ ہو کر جینا ان کے لیے ناممکن تھا ان کا ساتھ پھول اور خوشبو کا ساتھ تھا' ان کی محبت پانی اور مچھلی کی محبت تھی مختصر یہ کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم تھے۔ دونوں خاندانوں کے باہمی تعلقات بھی اچھے تھے لہٰذا راوی چین ہی چین لکھتا تھا فریال کو پانے کے لیے نہ تو عاصم کو خون کی ندیاں بہانے کی ضرورت پیش آئی اور نہ ہی کبھی عاصم سے ملنے کے لیے فریال کو کسی کچے گھڑے کا سہارا لینا پڑا۔

معاملات بڑی خوش اسلوبی سے طے پاتے چلے گئے اور دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے یعنی جہاں عاصم اپنی تقدیر میں مال و دولت عیش و عشرت کی زندگی لکھوا کر اس دنیا میں آیا تھا وہیں ہاتھ کی لکیروں میں کامیاب محبت کی لکیر بھی رقم کروا لایا تھا اور وہ ان چند خوش نصیب لوگوں میں سے ایک تھا جو زندگی میں جو چاہتے ہیں پا لیتے ہیں۔ لیکن مکمل تو اس دنیا میں شاید ہی کوئی ہو۔ کوئی نہ کوئی کمی کوئی نہ کوئی خواہش' کوئی نہ کوئی حسرت تو ہر انسان کے حصے میں ہوتی ہی ہے جو اسے قدرت کے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔

اپنے اس ادھورے پن کا احساس اسے تب ہوا جب فریال نے اسے باپ بننے کی خوشخبری دی۔ وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا اور فریال' فریال تو دن رات مستقبل کے خواب بنتے ہوئے تھکتی ہی نہیں تھی۔

"عاصم! میں اپنے بے بی کو خود اسکول لے کر جایا کروں گی اور خود واپس لایا کروں گی۔" اس نے پیار سے عاصم کے سینے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ "اوہو بھئی آخر ڈرائیورز کو تنخواہیں کس لیے دیتے ہیں ڈرائیور لے کر جائے گا اور لے کر بھی آئے گا۔ اپنے بے بی کے لیے ہم ایک نئی گاڑی پرچیز کریں گے جو اسی کے لیے مخصوص ہو گی۔" عاصم نے سیدھے لیٹے لیٹے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نا عاصم! میں اپنے بے بی کے لیے خود ڈرائیو کروں گی ڈرائیورز پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اس کے کام کر کے مجھے خوشی ملے گی نا؟ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟" فریال نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔

"اچھا بابا اچھا' تمہارا بے بی ہو گا جو دل چاہے کرنا لیکن بے بی آتو جائے پتا نہیں اللہ کو کیا منظور ہو تم ابھی سے منصوبے مت بناؤ۔" عاصم نے جواب دیتے ہوئے کہا تو فریال کی آنکھوں میں یکدم پانی سا چھلک آیا اور پھر وہ بولی تو اس کا لہجہ بھی بھیگ چکا تھا۔

"دیکھیں عاصم! پلیز ایسی باتیں مت کریں' اگر ... اگر میرے بے بی کو کچھ ہوا تو ... تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی ہاں بتا رہی ہوں میں آپ کو۔" فریال نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا تو عاصم گھبرا گیا۔

"ارے ارے پاگل میرا ایسا مطلب تھوڑی تھا اللہ

اپنا رحم و کرم فرمائے ہمارا بے بی بہت پیارا بہت خوب صورت ہو گا ان شاء اللہ عاصم نے کھینچ کر فریال کا سر دوبارہ اپنے سینے پر رکھ لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

اور پھر وہ دن بھی آگیا جب عاصم کو معلوم ہوا کہ آج وہ حقیقتاً "باپ" بن جائے گا وہ عجلت آمیز انداز میں آفس سے باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کردی پھر کچھ ہی دیر کے بعد اس کی آف وائٹ شیراڈ اپنے بنگلے کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی فون بوڑھی گھریلو ملازمہ کا تھا کہ بیگم صاحبہ تکلیف میں ہیں یہ سن کر وہ گھبرا گیا تھا لیکن بوڑھی ملازمہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ تکلیف پریشانی کی نہیں بلکہ خوشی کی علامت ہے اور یہ کہ آج وہ باپ بن جائے گا یہ سنتے ہی عاصم نے چابی اٹھائی تھی اور گاڑی لے کر بھاگ کھڑا ہوا تھا گھر پہنچ کر عاصم سیدھا اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ فریال واقعی تکلیف سے بے حال ہو رہی تھی اور اتنی اذیت میں ہونے کے باوجود عاصم کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی ایک عجیب تفاخر بھری مسکراہٹ تھی شاید یہ تفاخریہ غرور ماں کے درجہ پر فائز ہونے کا تھا یا شاید پیروں میں جنت آجانے کا یا شاید ایک مکمل عورت بن جانے کا! بے اختیار عاصم کے دماغ میں کسی شاعر کا یہ شعر گونج اٹھا۔

خالق کو اپنی خلق سے الفت تھی اس لیے
جنت اتار ڈالی ہے ماؤں کے روپ میں

لیکن اس وقت عاصم مزید کسی شعر یا شاعر کے بارے میں نہیں سوچ سکا اور نہ ہی فریال اپنی مسکراہٹ کو قائم رکھ سکی درد کی ایک شدید لہر کی وجہ سے فریال کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کی مدھم لہر بہت جلد معدوم ہو گئی اور اس کی جگہ کراہوں نے لے لی عاصم بے ساختہ آگے بڑھا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد فریال عاصم کی کار کی عقبی نشست پر نیم دراز تھی اور گاڑی سڑکوں پر فراٹے بھرتی میٹرنٹی ہوم کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔

پھر جونہی اس نے راجپوت میٹرنٹی ہوم والی سڑک پر گاڑی موڑی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے ایک انتہائی تیز رفتار اور بے قابو ٹرک لہراتا ہوا موڑ سے برآمد ہوا اور کسی عفریت کی طرح چیختا چنگھاڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا عاصم کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یکسر مفقود ہو کر رہ گئی تھی اور اس کی قوت فیصلہ بھی مفلوج ہو چکی تھی اور پھر اتنے کم وقت میں وہ کر بھی کیا سکتا تھا اس نے لاشعوری طور پر بے اختیار پوری قوت سے اسٹیرنگ وہیل گھما دیا اور اس ممکنہ حادثے سے بچنے کی کوشش کی لیکن بے سود ٹرک گاڑی سے سیدھا تو نہیں ٹکرایا تھا کیونکہ بروقت اسٹیرنگ وہیل گھما دیے جانے کی وجہ سے گاڑی پوری قوت سے سڑک کے دائیں کنارے کی طرف بڑھی تھی لیکن پھر بھی ٹرک کی سائیڈ گاڑی کی سائیڈ سے زوردار دھماکے سے ٹکرائی تھی اور گاڑی تیزی سے پھسلتی ہوئی سائیڈ پر جانے والے سائیکل سواروں سے جا ٹکرائی اور سائیکل کے دونوں سوار جیسے اڑتے ہوئے فٹ پاتھ پر جا گرے۔

عاصم کے اوسان خطا تھے لیکن گاڑی رک چکی تھی اور وہ خود کو بھی کسی بڑی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ پا رہا تھا اس نے مڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا تو ایک نئی حیرت اس کی منتظر تھی عقبی نشست خالی تھی..... ٹرک کے گاڑی سے ٹکرانے کی وجہ سے جو زوردار دھچکا لگا تھا اس نے نا صرف گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا تھا بلکہ فریال کو بھی اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا اور اب وہ سڑک کے کنارے چت پڑی تھی بالکل بے حس و حرکت... عاصم دیوانہ وار گاڑی سے باہر نکلا اور فریال کی طرف لپکا۔ "فریال' فریال۔" اس نے فریال کا سر گود میں رکھتے ہوئے جھنجھوڑا لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔ ٹھیک اسی وقت اس کی نظر فٹ پاتھ پر پڑی تو ایسا ہی منظر ادھر بھی نظر آیا سائیکل سوار جو

غالباً" کوئی دیہاتی تھا ایک عورت کا سر گود میں لیے اسے جھنجھوڑ رہا تھا لیکن جواباً" وہاں بھی خاموشی تھی اور عورت کا خون میں لت پت سر اور اس آدمی کی خون سے تربتر گود عاصم کو صورت حال کی سنگینی کا احساس دلا رہی تھی مزید ستم یہ تھا کہ وہ عورت بھی حاملہ نظر آرہی تھی۔

عاصم کے اس مختصر جائزے کے دوران بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے اور پھر ان لوگوں کی مدد سے کچھ ہی دیر کے بعد دیہاتی عورت، جو یقیناً" اس دیہاتی شخص کی بیوی تھی وہ اور فریال راجپوت میٹرنٹی ہوم میں منتقل ہو چکی تھیں جبکہ تمام اخراجات کی ذمہ داری عاصم قبول کر چکا تھا۔

عاصم سخت بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ فریال کو کچھ نہ ہو اور شاید یہی قبولیت کی گھڑی بھی تھی کیونکہ ایک لیڈی ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر نکلی تھی اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی جلد ہی عاصم اس لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ ایک دفتر میں بیٹھا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے شاید اپنی بے چینی کم کرنے کی کوشش کی یہ بالکل اضطراری سی حرکات تھیں لیکن انہیں دیکھ کر عاصم کا دل ہول رہا تھا۔

"ڈاکٹر خیریت تو ہے نا؟" جب عاصم سے مزید سننی برداشت نہ ہوئی تو آخر کار اس نے پوچھ ہی لیا

..."آپ کی مسز خیریت سے ہیں مسٹر عاصم! لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم بچے کو نہیں بچا سکے۔" لیڈی ڈاکٹر نے جھٹکے دار آواز میں کہا تو عاصم کے اندر جیسے کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹ گئی۔

"اور مسٹر عاصم! مزید دکھ کی بات یہ ہے کہ اب وہ آئندہ کبھی ماں نہیں بن سکیں گی۔" لیڈی ڈاکٹر نے جیسے کسی بہت بڑے بوجھ سے آزاد ہوتے ہوئے طویل سانس لیتے ہوئے کہا تو عاصم لرز کر رہ گیا۔

"دیکھیں عاصم! پلیز ایسی بات مت کریں۔ اگر..... اگر میرے بے بی کو کچھ ہوا تو..... تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔ ہاں..... بتا رہی ہوں میں آپ کو۔"

"نہیں نا عاصم! میں اپنی بے بی کے لیے خود ڈرائیو کروں گی ڈرائیورز پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔" عاصم کے دماغ میں جیسے کوئی فلم سی چلنے لگی اور وجود جیسے آندھیوں کی زد میں آگیا۔ ایک زلزلہ تھا جو اس کے چاروں طرف ہر چیز کو تہہ و بالا کیے دے رہا تھا ایک عجیب سی ٹوٹ پھوٹ تھی جو اس کے اندر ہی اندر بہت کچھ ملیا میٹ کر گئی تھی لیکن اسے بہر حال اپنے اعصاب پر قابو پانا ہی تھا کیونکہ اگر وہ اپنی اس اندرونی شکست و ریخت کے ہاتھوں ہار جاتا تو پھر سب کچھ برباد ہو جانا تھا کچھ بھی باقی نہیں بچتا وہ اپنے بچے سے تو ہاتھ دھو بیٹھا تھا لیکن..... لیکن فریال اس کی زندگی تھی اور وہ اس کے لیے کوئی رسک ہرگز نہیں لے سکتا تھا اسے فریال کو بچانا تھا ہر حال میں..... ہر قیمت پر۔

کیونکہ وہ فریال کی انتہا پسندی سے اچھی طرح واقف تھا وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ خبر جہاں فریال کے لیے ایک بم دھماکا ثابت ہو گی وہیں گرتی ہوئی دیوار کے لیے آخری دھکا بھی اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

"کیا کیا جائے؟" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اس کا دماغ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیزی سے مصروف عمل تھا لیکن کوئی حل ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا لیڈی ڈاکٹر کی آواز جیسے اسے کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی لیکن اس کے الفاظ نے اسے امید کی ایک کرن دکھا دی تھی وہ یکلخت پوری طرح ہوش و حواس میں آگیا اور سیدھا ہو کر پوری توجہ سے ڈاکٹر کی بات سننے لگا جو کہہ رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے عاصم صاحب! لیکن ایک اور بری خبر آپ کے لیے موجود ہے جو آپ کو سنانے کے لیے میں مجبور ہوں۔"

آپ کے ساتھ آنے والے ہاشم صاحب کی مسز کو

شاید ہم نہیں بچاپائیں گے وہ زندہ تو ہیں لیکن.... لیکن ہم لوگ زیادہ پر امید نہیں ہیں آپ دعا کیجیے۔" اور عاصم نے یکلخت اٹھ کر لیڈی ڈاکٹر کے پیروں میں سر رکھ دیا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی آبشاریں تھیں جبکہ لیڈی ڈاکٹر حیرت زدہ انداز میں شہر کے اس جانے پہچانے رئیس کو اپنے قدموں میں سجدہ ریز دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ناجی کا ہنسنا مسکرانا' کھیلنا کودنا' چھلاوے کی طرح طرح بھاگے بھاگے پھرنا سب ختم ہو چکا تھا اس کا پارہ پارہ وجود جیسے برف بن کر رہ گیا تھا اور یہ سب چھمو اور شادو کے لیے تو پریشان کن تھا ہی لیکن ناجی کی ماں تاجو بھی کچھ کم پریشان نہیں تھی ناجی تو پانی کا ایک سرکش ریلا تھی ایک تندو تیز موج' صحرائی آندھی کا بگولا بھلا اس سیماب فطرت لڑکی کی بے چین روح کو قرار کہاں؟ پھر ایسی لڑکی کا یوں خاموش اور گم سم رہنا اس کے لیے پریشانی کا باعث تو تھا۔

ادھر ناجی تھی کہ اس کو کسی پل چین نہیں آرہا تھا کیونکہ بقول شخصے اس کی راتوں کی نیند' دن کا چین' دل کا قرار وغیرہ وغیرہ سب کچھ کھو چکا تھا اور اسے اٹھتے بیٹھتے بس ایک ہی من موہنی صورت کا خیال تھا۔ اس وقت بھی وہ چارپائی پر اوندھی لیٹی ہوئی تصور جاناں کیے ہوئے تھی۔

اسے باغ کا وہ منظر یاد آرہا تھا جب اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے زمین سے اٹھایا تھا اور پھر اس کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا تھا کتنی ہی دیر اپنائیت بھری نظروں سے اس کو تکتا رہا تھا کتنا والہانہ پن تھا اس کی آنکھوں میں کتنی انوکھی کشش تھی وہ جس نے اس کے پورے وجود میں ایک میٹھا میٹھا سا درد جگا دیا تھا وہ آپ ہی آپ اس کے لیے اپنے دل اپنے جذبات میں کوئی انجانی کوئی انوکھی کیفیت محسوس کرنے لگی تھی جو اس کے لیے عجیب ضرور تھی لیکن ناخوشگوار ہرگز نہیں تھی پھر اس کے ہونٹوں سے وہ سحر انگیز آواز نکلی تھی۔

"میرا نام راحیل ہے اور تمہارا؟"

"ناجی۔" جواب جیسے خود بخود ہی اس کے ہونٹوں سے پھسل کر نکل گیا تھا۔

"ناجی تم بہت پیاری ہو' بہت ہی خوب صورت بالکل فرشتوں جیسی جیسے کوئی پری زمین پر اتر آئی ہو۔ ..... تم بہت ہی اچھی لگتی ہو۔ مجھے" راحیل نے فقرہ مکمل کیا تو ناجی کے ہونٹ صرف کپکپا کر رہ گئے وہ کچھ بھی نہیں بول سکی' لیکن اس کے الفاظ کسی نرم اور ٹھنڈی پھوار کی مانند سیدھے اس کے دل سے ٹکرائے تھے اور اسے اپنے چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھرتے محسوس ہو رہے تھے جیسے آسمان سے دھنک اتر آئی ہو اور اس کے اردگرد پھیل گئی ہو ایسے الفاظ اور ایسا انداز اس نے آج تک کہیں نہیں دیکھا تھا' کہیں نہیں پایا تھا' کوئی ایسا سحر کوئی ایسا جادو تھا ان الفاظ میں کہ وہ مسحور ہو کر رہ گئی۔

اور ویسے بھی کچھ جگہوں پر بنا الفاظ کے بھی بہت کچھ کہہ اور سن لیا جاتا ہے اور ناجی تو اسی دن سے اسے سن رہی تھی جس دن اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا وہ تو اس کے اندر ہی کہیں سرگوشیاں کرتا تھا۔ الگ بات ہے کہ یہ زبان ناجی کے لیے بالکل نئی تھی لیکن وہ اس کے جادو سے بچ نہیں سکی تھی۔ کیونکہ یہ وہ جادو تھا جو سر چڑھ کے بولتا ہے اور ناجی پر یہ جادو چل چکا تھا وہ خیالوں ہی خیالوں میں پریوں کے دیس کے اس شہزادے کو بہت سی باتیں سنا چکی تھی اور بہت سی سن چکی تھی۔

اور اس وقت بھی وہ کچھ سن رہی تھی' یہ شاید کسی مشین کی آواز تھی جو اس کے پردہ سماعت سے ٹکرا رہی تھی آواز زیادہ واضح نہیں تھی لیکن اس کے حساس کانوں نے اپنے رنگین و سنگین خیالات کے طوفانی مدوجزر کے باوجود اس آواز کو سن لیا تھا اور اب وہ پوری توجہ سے اس آواز کو سننے کی کوشش کر رہی تھی جو لحہ بہ لحہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے آواز کے متعلق اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی البتہ اتنا ضرور سمجھ گئی کہ آواز باہر گلی کی طرف سے آرہی تھی اس نے تیزی سے جوتی پہنی اور باہر کے دروازے کی طرف لپکی پھر اس نے کنڈی ہٹاتے ہوئے کواڑ کو تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا تو دوسرے ہی لمحے اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا اور وہ دھک سے رہ گئی یہ ایک سفید رنگ کی گاڑی تھی جو آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی جبکہ سفید گاڑی کے عقب میں ایک دوسری گاڑی بھی دکھائی دے رہی تھی دونوں گاڑیاں تیز رفتاری سے اسی سمت بڑھی چلی آرہی تھیں اور ناجی بوکھلا کر رہ گئی آگے آنے والی سفید گاڑی کو وہ دور سے پہچان سکتی تھی اور اس کی شناخت میں ہرگز ہرگز غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ راحیل کی گاڑی تھی وہی راحیل جو اس کے خیال اس کی سوچ کے ہر راستے پر قابض ہو گیا تھا اور جسے دیکھ کر خود بخود اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونا شروع ہو جاتی تھیں۔

وہی راحیل جو باغ میں اس سے بہت ساری باتیں کر چکا تھا' بہت کچھ کہہ چکا تھا اس کے گھر' اس کی امی' اس کی ذاتی زندگی کے بارے سب کچھ پوچھ چکا تھا' جان چکا تھا اور ناجی..... وہ تو شاید صدیوں سے اسے جانتی تھی البتہ یہ بات ناجی کو بھی باغ میں اسی دن پتا چلی تھی کہ "راحیل" کمال پورہ کے چوہدری سہیل کا اکلوتا بیٹا ہے اور گاؤں کے اردگرد کی تمام زمینوں اور باغات کا اکلوتا وارث بھی..... اور اب وہی راحیل اس کے دروازے پر تھا گاڑیاں اس کے گھر کے سامنے رک چکی تھیں اور یہ دیکھ کر ناجی کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ راحیل کے ساتھ ساتھ گاڑی میں سے راحیل کا باپ چوہدری سہیل بھی برآمد ہوا تھا۔

"ہائے میں مر گئی۔" ناجی کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ بھاگ کر گھر کے اندرونی حصے میں کہیں غروب ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

ریحان اپنی پولیس جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر براجمان تھا جبکہ عقبی حصے میں چار باوردی کانسٹیبل بھی موجود تھے جیپ کا رخ رانا سہیل احمد خان کی حویلی کی طرف تھا۔

کمال پورہ میں جوری نامی لڑکی کی موت کے بعد یہ اس کا تیسرا اور مجموعی طور پر چوتھا چکر تھا۔ جوری کو قتل ہوئے ——— تقریباً پچیس دن گزر چکے تھے لیکن ابھی تک قاتل کا کوئی سراغ اسے نہیں مل سکا تھا۔ جیپ ابھی حویلی سے کافی فاصلے پر تھی جب اس کی نظر حویلی سے برآمد ہونے والی اس سفید پراڈو پر پڑی جو تیز رفتاری کے ساتھ دھول اڑاتی اسی سمت بڑھی چلی آرہی تھی۔ نجانے ریحان کے دماغ میں کیا آئی کہ اس نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"گاڑی سائیڈ پر کر کے روک لو اور اس آنے والی گاڑی کو روکو۔" چند لمحوں کے بعد پولیس جیپ کچی سڑک کے کنارے رک چکی تھی اور ڈرائیور کے ساتھ ساتھ چاروں مسلح کانسٹیبل بھی آنے والی گاڑی کو رکنے کا اشارہ کر رہے تھے اور پھر گاڑی پولیس جیپ کے قریب ہی رک گئی ریحان نے بغور ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا جہاں سے دروازہ کھول کر ایک خوب صورت اسمارٹ لڑکی نیچے اتر رہی تھی چست پتلون اور شرٹ میں ملبوس لڑکی نے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے جو اس کی کمر تک بکھرے ہوئے تھے اور ریحان کو بہت بھلے لگے تھے۔

زور دار آواز کے ساتھ گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے جیسے ہی لڑکی پولیس جیپ کی طرف گھوم کر سیدھی ہوئی ریحان بری طرح چونک گیا لیکن ریحان کے اس بری طرح سے چونکنے کی وجہ لڑکی کی خوب صورتی اس کا متناسب بدن یا اس کے کھلے ہوئے بال نہیں بلکہ کچھ اور تھی

ریحان نے اب مزید گہری نظروں سے لڑکی کا مشاہدہ کیا جو غصیلے انداز میں تنی کھڑی تھی اور پھر وہ جیپ کے بالکل قریب آکر پھٹ پڑنے والے انداز میں بولی۔

"جی فرمایئے؟ میں قانون کے محافظوں کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟ کیوں روکا گیا ہے مجھے؟ کیا میری گاڑی میں سے

چرس کی خوشبو آرہی ہے آپ لوگوں کو؟" لڑکی جس طرح خود شاندار تھی اس کا اعتماد اور لہجہ بھی ویسا ہی شاندار اور بااعتماد بلکہ کسی حد تک بارعب تھا۔

ریحان نے اپنی بے ساختہ ہنسی ضبط کرتے اور زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

"اپنا انٹروڈکشن کرادیں پلیز۔"

"دیکھیے میں کوئی الزبتھ ٹیلر نہیں ہوں اور نہ ہی اتنی فیمس شخصیت کہ ہمارے ملک کی پولیس باقاعدہ ایک گاؤں کی کچی سڑک کے کنارے ناکہ لگائے صرف میرے انٹروڈکشن کی خاطر کھڑی ہو اور نہ ہی آپ کوئی نوجوان ہیں جو میرے آٹوگراف کی خاطر یہاں سوکھ رہے ہوں مجھے آپ لوگوں کی یہ حرکت بالکل اچھی نہیں لگی۔" لڑکی نے تنک مزاجی سے جواب دیا تو ریحان سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"دیکھیے میڈم میں ایک قتل کی تفتیش کے سلسلے میں یہاں موجود ہوں اور ایک اچھی شہری ہونے کی حیثیت سے قانون کی مدد کرنا آپ کا فرض بنتا ہے۔"

"ویل ڈن۔" لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

"پاکستانی پولیس کی شہرت تو ویسے بھی انٹرنیشنل لیول پر ہے اور آج آپ کو دیکھ کر اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ قاتل ابھی یہاں پہنچے گا اور یقیناً" دونوں ہاتھ بڑھا کر درخواست بھی کرے گا کہ جناب آپ جس قاتل کی تلاش کر رہے ہیں وہ میں ہی ہوں' دست بستہ عرض گزار ہوں مہربانی فرما کر مجھے گرفتار فرمالیں واہ واہ واہ کیا ہی اچھی تفتیش ہے۔" اور لڑکی کا طنزیہ انداز اور اس کا لہجہ سن کر بے اختیار ریحان کے ہونٹ بھنچ گئے پھر جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی پائی جاتی تھی۔

"دیکھیے محترمہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اور میں یہاں پولیس کے کردار اور انداز تفتیش پر لیکچر سننے کے لیے بھی نہیں کھڑا ہوں بہتر ہو گا کہ آپ صرف میرے سوالات کا جواب عنایت فرمادیں۔" ریحان نے شائستگی سے کہا۔ لڑکی نے بھرپور نظروں سے ریحان کا جائزہ لیا جو اس دوران جیپ سے باہر نکل آیا تھا اور اب جیپ ہی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا پھر برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔

"ابھی تک آپ نے سوال ہی کون سا کیا ہے؟ یہی ناکہ میرا انٹروڈکشن کیا ہے تو سنیے میرا نام شازیہ عاصم ہے اور عاصم گروپ آف انڈسٹریز کی مالک ہوں اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلہ میں کمال پورہ آئی تھی کام کیا تھا؟ یہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتی اور اب میں واپس اپنے گھر جارہی ہوں اور کچھ؟"

ریحان نے چند لمحوں تک پُرخیال نظروں سے اسے گھورا اور اس کے بعد بولا۔

"آل رائٹ! آپ جاسکتی ہیں لیکن یاد رکھیے گا کہ میں آپ کو دوبارہ بھی زحمت دے سکتا ہوں۔" جواباً شازیہ نے تیکھی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر شاید اس کا ارادہ ملتوی ہو گیا وہ خاموشی سے واپس پلٹی اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد اس کی سفید پراڈو اپنے پیچھے گرد و غبار کے بادل چھوڑتے ہوئے اڑی چلی جارہی تھی اور ریحان گرد کی اوٹ میں گم ہوتی گاڑی کو دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

☆ ☆ ☆

عاصم کی گریہ زاری سے زیادہ طاقت دولت کی چمک میں تھی اب یہ اللہ جانتا ہے کہ لیڈی ڈاکٹر عاصم کے آنسوؤں سے متاثر ہوئی تھی یا پانچ لاکھ کی اس خطیر رقم سے جو عاصم نے اسے دینے کا وعدہ کرلیا تھا لیڈی ڈاکٹر عاصم کو شہر کے معروف بزنس مین کی حیثیت سے پہچانتی تھی اور ویسے بھی فریال کی پریگنینسی کے بعد عاصم راجپوت کلینک سے مسلسل رابطے میں تھا یہی وجہ تھی کہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا اور پھر وہ ہو گیا جو بظاہر بہت مشکل تھا۔

دونوں عورتوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ ان پر کیا بیت گئی ہے۔ فریال کی گود اجڑنے کے بعد بھی آباد ہو

گئی تھی اور ادھر اس سیدھی سادی عورت کو پتا بھی نہ چلا کہ اس نے دو بچیوں کو جنم دیا ہے اور اس کی ایک بچی' اس کے جگر کا ایک ٹکڑا نیلام ہو چکا ہے دونوں بچیوں میں سے ایک نہایت خوب صورتی سے فریال کے پہلو میں منتقل ہو چکی تھی اور ان دونوں بچیوں کو جنم دینے والی ماں زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھی۔ عاصم اس پُروقار انتظار گاہ میں ہاشم کے ساتھ موجود تھا اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یقین کرو ہاشم میرا اس واقعے میں سرے سے کوئی قصور نہیں ہے۔ جو بھی ہوا اچانک ہوا پھر بھی میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں تم گھبرانا نہیں ان شاء اللہ تمہاری بیوی کو کچھ نہیں ہو گا۔"

"صاحب جی قصور تو سارا نصیبوں کا ہے۔ جی یہ تو مقدر کی کھیڈ ہے میں نے اس ٹرک کو اچانک آتے دیکھا تھا جی آپ کی غلطی نہیں ہے مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے ہونی تو ہو کر ہی رہتی ہے نا جی۔" اس نے سادہ انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا اور عاصم سوچنے لگا کہ میں نے تو تمہارا نصیب ہی چوری کرلیا ہے سادہ آدمی پتا نہیں اللہ مجھے معاف کرے گا یا نہیں لیکن میں بھی تو مجبور ہوں اس نے خود کو ایک کمزور دلیل سے بہلانے کی کوشش کی پھر خاموشی ختم کرتے ہوئے بولا "کہاں کے رہنے والے ہو تم لوگ؟"

"ہم لوگ کمال پورہ کے رہنے والے ہیں جی بڑی پیارا ہے جی ہمارا پنڈ یہاں سے چار کوس دور ہی تو ہے جی۔" ہاشم نے جواباً اپنے گاؤں کی تعریف کرتے ہوئے کہا تو عاصم نے کمال پورہ کا نام ذہن نشین کرتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔ "کام کیا کرتے ہو؟"

وہ جی گاؤں میں رہتے ہیں تو کھیتوں کا کام ہی کریں گے نا جی ہمارے پنڈ کے چوہدری سہیل احمد خان بہت بڑے زمیندار ہیں ان ہی کی زمینوں پر کام کرتا ہوں جی آج برکتے کی طبیعت خراب تھی تو سائیکل پر دوا لینے شہر آرہے تھے کہ یہ حادثہ ہو گیا۔" ٹھیک اسی وقت ایک نرس قریب آئی اور بولی۔

"ہاشم صاحب اگر آپ اپنی بیوی سے ملنا چاہیں تو مل لیں۔"

ہاشم آگے بڑھا تو عاصم بھی اس کے ساتھ ہو لیا وہ اس عظیم عورت کو ایک بار دیکھنا چاہتا تھا جس نے بے خبری میں ہی سہی لیکن عاصم کی زندگی پر بہت بڑا احسان کیا تھا اور عاصم مشکل وقت میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا وہ ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا ان کے کام آنا چاہتا تھا آخر ضمیر بھی تو کوئی چیز ہے؟ ہاشم کے پیچھے عاصم بھی اندر داخل ہو گیا برکتے کا سارا سر سفید پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ چت لیٹی دروازے کی طرف تک رہی تھی گردن تک سفید کپڑے میں ڈھکی وہ تقدس اور پاکیزگی میں ڈھلی ہوئی کوئی دیوی نظر آرہی تھی اور عاصم کے لیے تو اس کی حیثیت تھی بھی دیوی ہی کی۔

اس نے ایک نظر ہاشم کی طرف دیکھا پھر اچٹتی ہوئی سی ایک نظر عاصم پر ڈالی ایک لمحے کے لیے عاصم کی نظر اس کی نظروں سے ملی اور عاصم جھرجھری سی لے کر رہ گیا اس کی آنکھوں میں زندگی کے آثار نہیں تھے ایک عجیب ویرانی اور حسرت ویاس کی کیفیت تھی اس کی آنکھوں میں پتا نہیں کیوں اس وقت عاصم کو بڑی ندامت' بڑی شرمندگی سے محسوس ہوئی وہ نظر بھر کر اپنے سر کے سائیں ہاشم کو دیکھ رہی تھی ہاشم نے آگے بڑھ کر اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا چند لمحوں تک ایک ٹک ہاشم کو تکنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ اپنے سر اور گردن کو گردش دیتے ہوئے اپنے پہلو میں لیٹے اس ننھے سے وجود کو دیکھا پھر شاید اس کی معصوم صورت کی تصویر اس نے اپنی آنکھوں میں بھرلی اس نے ایک مرتبہ پھر ہولے ہولے سر کو اور گردن کو حرکت دی اب وہ پھر ہاشم کو دیکھ رہی تھی ایک عجیب محویت کے عالم میں ہاشم کو دیکھتے دیکھتے اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن بول نہ سکی شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے ہونٹ محض کپکپا کر رہ گئے اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکلے اور اس کے رخساروں پر بہہ نکلے اور پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

وہ مر چکی تھی شاید دو بچیوں کو جنم دے کر ایک سے

جدا رہنا اسے قبول ہی نہیں تھا عاصم ساکت و جامد اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا اور اس کے ذہن میں کسی شاعر کے یہ شعر گونج رہے تھے۔

مورخ جب کبھی تاریخ لکھو
مرے غم کی کہانی یاد رکھنا

سبب شہر طلب کے ڈوبنے کا
مری آنکھوں کا پانی یاد رکھنا

شازی نے ڈائری بند کر کے ایک طرف رکھی تو اس کی آنکھوں سے بھی دو موٹے موٹے آنسو نکلے اور اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

آج وہ اپنے آپ سے واقف ہو چکی تھی اپنی اصلیت اپنی حقیقت جان چکی تھی۔ وہ سیٹھ عاصم اور فریال سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ سب کچھ اس سے کیوں چھپایا گیا اس کی ماں کا کیا قصور تھا؟ اس کا غریب باپ اس کی معصوم بہن ان کا کیا ہوا؟ لیکن ان سب سوالوں کا جواب دینے کے لیے نہ تو فریال اس دنیا میں موجود تھی اور نہ عاصم کیونکہ تین سال پہلے ایک ایئر کریش میں ان کی ڈیتھ ہو چکی تھی اور شازی آخری بار ان کی شکل تک نہیں دیکھ پائی تھی ڈائری کی تحریر کے مطابق فریال تو اس حقیقت سے واقف ہی نہیں تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ لیڈی ڈاکٹر اور سیٹھ عاصم کے علاوہ کوئی بھی اس راز سے واقف نہیں تھا تو غلط نہ ہو گا۔

بہت سے سوال بہت سی سوچیں اور بہت سے خیالات تھے جو شازی کے دل و دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے تھے لیکن ان کا جواب دینے والا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ کیسا انکشاف کیسی آشنائی تھی یہ جو اسے زخم زخم کر گئی تھی کیا کرے وہ آخر کیا کرنا چاہیے اسے؟ یہ سچ ہے کہ عاصم اور فریال نے اسے اتنا پیار اتنی محبت دی تھی کہ اگر اتفاق سے یہ ڈائری اس کے ہاتھ نہ لگ جاتی تو وہ ایسی کسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن ایسا ہو چکا تھا ڈائری بالکل اس کے سامنے پڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی اور شازی کے دل و دماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا۔

اس نے بے خیالی میں ایک مرتبہ پھر ڈائری اٹھائی اور غائب دماغی سے اس کے صفحات الٹنے پلٹنے لگی کہ اچانک جیسے روشنی کا ایک کوندا سا لپکا اس کے دماغ میں ایک خیال آیا اور اس نے تیزی سے ڈائری کے ورق الٹنا شروع کر دیے پھر جلد ہی اس کی نظریں ایک صفحے پر جم کر رہ گئیں چند لمحوں تک اس صفحے پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد اس نے ایک طویل سانس لی اور ڈائری دوبارہ بند کر دی اس کا دماغ ایک نتیجہ پر پہنچ چکا تھا اور وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی اور وہ فیصلہ تھا کمال پورہ جانے کا فیصلہ.....!

☼ ☼ ☼

تاجی ایک کھڑکی کی اوٹ میں کھڑی تھی اور اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو ایک جا رہا تھا رنگوں کی ایک دھنک تھی جو اس وقت اس کے چہرے پر سجی ہوئی تھی اور کان دوسری طرف سے سنائی دی جانے والی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔

جو ہو رہا تھا اور جو ہونے جا رہا تھا وہ تاجی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا لیکن بہرحال وہ سب اس کی سوچ اس کی خواہش کے خلاف نہیں تھا اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا اور آج پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی یہ حالت جو پچھلے کئی دنوں سے تھی جو تبدیلی اسے اپنے اندر ہی اندر امر بیل کی طرح پھیلتی اور آپوں آپ ہی بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی وہ کچھ اور نہیں تھا بلکہ پیار تھا۔ ہاں اسے پیار ہو گیا تھا گاؤں میں وارد ہونے والے اس شہری بابو سے جو دور دیس سے شاید اسی کے لیے واپس آیا تھا اور آج ...... آج تو اسے اس پر بہت پیار آ رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ لپک کر جائے اور جھپٹ کر اس کا منہ چوم لے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی آخر شرم و حیا اور بڑوں کی عزت بھی تو کوئی چیز تھی آج اس کے ان دیکھے ان جانے جذبوں کو زبان مل گئی تھی اور ایسا اس کی وجہ سے تو ہوا تھا صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی

تھیں اور اس کی ماں وہاں بیٹھی راحیل اور اس کے باپ چوہدری سہیل سے گفتگو کر رہی تھی اور یہ اسی گفتگو کا اعجاز تھا کہ آج تاجی کو محبت جیسے جذبے کا "ادراک" ہو گیا تھا۔

جب وہ دونوں گھر میں داخل ہوئے تو اس کی ماں تو جیسے بوکھلا کر رہ گئی تھی ان کو اندر آنے کا تو کہہ بیٹھی تھی لیکن اب اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ انہیں کہاں بٹھائے ان کی خاطر مدارات کیسے کرے بھلا گاؤں کا اتنا بڑا چوہدری اور اس غریب کے گھر؟ اس کی یہ مشکل راحیل نے خود ہی حل کر دی اس نے آرام سے آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائیوں کو ایک ایک کر کے بچھا دیا اور پھر تاجو کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دونوں باپ بیٹا بیٹھ گئے تاجو بھی ہڑبڑا کر بیٹھ گئی تھوڑی دیر کے بعد چوہدری سہیل نے کھنکار کر جیسے گلا صاف کیا اور پھر بولا۔

"تاجو بی بی آج میں تیرے در پہ سوالی بن کر آیا ہوں امید ہے کہ تو مجھے نامراد واپس نہیں بھیجے گی۔" اور تاجو گڑبڑا کر رہ گئی پھر وہ بولی تو اس کی آواز خاصی سنبھلی ہوئی تھی شاید وہ حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

"بولو چوہدری جی! اگر ہم غریبوں کے بس میں ہوا تو آپ خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے لیکن ہمارے پاس ہے ہی کیا جس کی ضرورت آپ کو ہماری چوکھٹ تک لے آئی؟" تاجو کے لہجے میں کسی قدر حیرانی اب بھی موجود تھی۔

"تاجو بی بی جو تمہارے پاس ہے وہ دنیا میں اور کسی کے پاس نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں تیرے دروازے پر آنا ہی پڑا تیرے پاس میرے اکلوتے بیٹے کی خوشیاں ہیں وہ میری جھولی میں ڈال دے تاجو بی بی" چوہدری سہیل نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" جہاندیدہ تاجو کچھ کچھ سمجھ چکی تھی تصدیق طلب لہجے میں بولی۔

"تمہیں کچھ بھی سمجھ نہیں؟"

"دیکھ تاجو بی بی میرا بیٹا تیری بیٹی کو پسند کرتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اسے تاجی سے پیار ہو گیا ہے ہمارے وقتوں میں باپ یا ماں سے ایسی بات کرنا بے حیائی کہلاتا تھا لیکن بھلی مانسے اب دور تبدیل ہو گیا ہے اور ویسے بھی زندگی جس نے گزارنی ہو فیصلے کی اسے پوری آزادی بھی ہونی چاہیے میں تجھ سے تاجی کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔ میرا بیٹا انگلینڈ سے پڑھ کر آیا ہے لاکھوں میں ایک ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرا اکلوتا بیٹا ہے تیری بیٹی کو خوش رکھے گا۔ اگر تجھے یہ رشتہ قبول ہے تو ایک بار دھی رانی سے بھی پوچھ لے اگر اسے بھی کوئی اعتراض نہ ہو تو پھر شادی کا دن بھی طے کر لیتے ہیں۔"

چوہدری سہیل نے بالآخر بات کھول کر کرتے ہوئے کہا۔ تاجو کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر بولی۔

"چوہدری جی بیٹی تو میری بھی لاکھوں کیا کروڑوں میں ایک ہے لیکن کہاں آپ کہاں ہم؟ یہ تو مخمل میں ٹاٹ کے پیوند والی بات ہو جائے گی اور کل کو میری بیٹی کو کسی نے اس کی غربت کا طعنہ دیا تو کیا ہو گا؟ ہم غریب لوگ اپنے حال میں خوش ہیں محلوں کو خواب ہمیں راس نہیں آئیں گے چوہدری صاحب میں تو اپنی بیٹی کو کچھ دینے کے قابل بھی نہیں ہوں۔"

"میں ان باتوں کو نہیں مانتا تاجو بی بی! امیری غریبی مالک کی دین ہے انسان صرف انسان ہوتا ہے اور پھر میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب میرے بچوں ہی کا تو ہے تم سے کچھ نہیں مانگتا تم نے بیٹی دے دی تو سمجھو سب کچھ مل گیا اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

چوہدری سہیل نے گیند ایک مرتبہ پھر تاجو کے کورٹ میں پھینکتے ہوئے کہا اور تاجو پریشانی سے چوہدری سہیل کا منہ تکنے لگی بلاشبہ چوہدری سہیل جیسے بڑے زمیندار کا اس طرح تاجو کے گھر چلے آنا اور اپنے بیٹے کے لیے اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگنا بہت بڑی بات تھی جہاں تاجو یہ سب سوچ کر خوشی محسوس کر رہی تھی وہیں ان دیکھے اندیشوں کے ناگ بھی اس کے ذہن میں سرسرانے لگے تھے۔ یہ بات اتنی سادہ بھی نہیں تھی کہ تاجو کو آسانی سے ہضم ہو جاتی وہ

فیصلہ نہیں کرپارہی تھی کہ اسے کیا جواب دینا چاہیے؟ ہاں کرے یا نہ کرے وہ ایک عجیب دوراہے پر آن کھڑی تھی اس نے ایک نظر خوب صورت اور وجیہہ نوجوان راحیل کی طرف دیکھا جو بڑی سعادت مندی سے سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا پھر اس نے چوہدری سہیل کے چہرے پر نظریں دوڑائیں جو سوالیہ نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ کچھ بول نہ سکی۔

چوہدری سہیل نے بھی شاید اس کی مشکل کو محسوس کرلیا۔

"دیکھو بہتر یہ ہوگا کہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ ناجی سے بھی پوچھ لو۔" چوہدری نے تاجو سے مخاطب ہو کر کہا تو تاجو نے سکون کی سانس لی اور اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھی تاجو نے بھاگ کر کھڑکی سے ہٹنا چاہا لیکن تاجو کی نظر اس پر پڑ چکی تھی اور وہ اس کے چہرے پر کھلے ان گنت رنگوں کو بھی دیکھ چکی تھی۔

"ناجی؟" اس نے استفہامیہ انداز میں صاف ایک لفظ کہا اور ناجی نے شرما کر اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر نظریں جھکا دیں۔ تاجو نے ایک طویل سانس لی اور وہیں سے واپس پلٹ گئی۔ ناجی کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

شازی کچی سڑک کے کنارے موجود تھی اور گاڑی سے نیچے اتر کر کچھ دیہاتی عورتوں سے ہاشم کے بارے میں پوچھ رہی تھی جس کی بیوی کئی سال پہلے مر چکی تھی۔ جلد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ جس طرح کمال پورہ کے لوگ برکتے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بالکل اسی طرح ہاشم کو بھی ہاشمے کے نام سے یاد کیا جاتا تھا لیکن روح فرسا خبر یہ تھی کہ ہاشم اب اس دنیا میں موجود نہیں تھا اور کچھ عرصہ قبل ہونے والی چوہدریوں کی لڑائی میں گولی کھا کر مر چکا تھا گیہوں کے ساتھ گھن بھی تو پس جاتا ہے نا؟ اور ہاشمے بھی گھن کی طرح پس چکا تھا شازی دل مسوس کر رہ گئی لیکن کر بھی کیا سکتی تھی؟

ایک خیال کے آتے ہی اچانک اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی اور اس نے ایک عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"سنو! برکتے اور ہاشمے کی ایک بیٹی بھی تو تھی کیا نام تھا اس کا....؟" شازی نے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا تو عورت نے اسے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا بالکل یوں جیسے اچانک شازی کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں یا وہ کسی خلائی مخلوق کا روپ دھار گئی ہو پھر وہ عورت شازی سے مخاطب ہو کر بولی۔

"جوری" نام تھا اس کا بی بی جی! اور آپ کو خدا کا واسطہ آپ کو جو کچھ بھی پوچھنا ہے جا کر حویلی والوں سے پوچھو ہم غریب لوگ ہیں ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟" عورت نے عجیب سے انداز میں کہا اس کے لہجے میں سراسیمگی اور چہرے پر واضح خوف و ہراس کے تاثرات پائے جاتے تھے جنہیں دیکھ کر شازی کوئی بھی اندازہ قائم کرنے سے قاصر تھی۔

"چلو نی چلو جلدی کرو پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔" اس عورت نے ساتھی عورتوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گئیں جبکہ شازی ہونق بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ٹھیک اسی لمحے دو گاڑیاں تیز رفتاری کے ساتھ اس کے پاس سے گزر کر تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئیں آگے والی گاڑی ایک سفید ہنڈا سوک تھی جسے ایک وجیہہ نوجوان ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ اس کے برابر والی سیٹ پر ایک چوہدری ٹائپ آدمی براجمان تھا۔

پچھلی گاڑی میں موجود لوگوں کا تفصیلی جائزہ تو وہ نہ لے سکی لیکن اس میں سے نظر آنے والی بندوقوں کی جھلک اسے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ اس میں باڈی گارڈ بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑیاں گزر چکی تھیں اور اب ان کے عقب میں اڑتے ہوئے گرد و غبار کے علاوہ یہاں اور کچھ نہیں تھا شازی نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اپنی پراڈو کا دروازہ کھولا اور پھر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے گاڑی کو بیک کیا پھر گاڑی آگے بڑھا دی اب اس کا رخ حویلی کی طرف تھا جس کا جائزہ

وہ آتے ہوئے لے چکی تھی۔

پورے گاؤں میں سب سے خوب صورت عمارت وہی تھی اور یقیناً" اسے ہی یہاں حویلی کہا جاتا تھا۔ حویلی پہنچنے کے بعد اسے پتا چلا کہ ابھی جو گاڑیاں اس کے پاس سے گزری تھیں وہ حویلی ہی کے مکین تھے آگے والی سفید ہنڈا سوک میں رانا سہیل احمد خان اور اس کا بیٹا راحیل سوار تھے جبکہ پچھلی گاڑی میں اس کے اندازے کے عین مطابق ان کے باڈی گارڈز تھے اور یہ معلومات پہنچانے والی ہستی حویلی کی ادھیڑ عمر ملازمہ رفعت تھی شازی رفعت سے سوال جواب تو کر رہی تھی لیکن ایک عجیب سا احساس اسے بے کل کیے دے رہا تھا کچھ تھا جو عام روٹین سے ہٹ کر تھا جو اسے بے چین کر رہا تھا لیکن شازی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور پھر جب گفتگو کے دوران اچانک شازی کی نظریں رفعت کی نظروں سے ٹکرائیں تو اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا جیسے ایک پردہ سا اس کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹتا چلا گیا۔ اسے اپنی بے چینی کا سبب معلوم ہو گیا تھا لیکن یہ معلوم ہونا بھی اسے مزید حیران کر رہا تھا۔

عورت کے اندر محسوس کرنے والی ایک مخصوص حس موجود ہوتی ہے جو مردوں کے معاملے میں خاصی فعال ہوتی ہے اور جب بھی کوئی مرد کسی بھی عورت کو ہوس ناک نظروں سے گھورتا ہے بھلے ہی وہ یہ حرکت کہیں چھپ کر کر رہا ہو عورت کو فوراً" اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ صلاحیت تقریباً" ہر عورت میں موجود ہوتی ہے کسی میں کم تو کسی میں زیادہ.....!

اور شازی کی بے چینی کا سبب بھی یہی مخصوص حس اور یہی احساس ہی تھا لیکن حیرت ناک بات یہ تھی کہ شازی کو دیکھنے اور تاڑنے والا کوئی مرد نہیں بلکہ کمال پورہ کے چوہدری سہیل کی حویلی میں موجود یہ ادھیڑ عمر لیکن لحیم شحیم خالص دیہاتی ملازمہ تھی۔

شازی کو اس کی آنکھوں میں گہری ہوس کی نظر آئی تھی اور وہ پرشوق نظروں سے شازی کے انگ انگ کا جیسے ایکسرے کرنے میں مصروف تھی اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے سے تیرتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور یہ صورت حال شازی کے لیے حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ گڑبڑا دینے والی بھی تھی اس نے جلدی سے بے خیالی میں ڈھلک جانے والے آنچل کو درست کیا اور خفت زدہ انداز میں اس سے جوری کے بارے میں پوچھا شازی کا چہرہ اس مختصر سے عرصے میں سرخ ہو گیا تھا اب پتا نہیں یہ سرخی شرم کی تھی یا غصے کی؟ اس کا اندازہ لگانا ایک مشکل امر تھا کیونکہ شازی بذات خود ایک الجھا ہوا کردار تھی اور کس وقت وہ کس کیفیت میں ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہی تھا۔

رفعت نے چونک کر شازی کی طرف دیکھا اور پھر سنبھلتے ہوئے بولی "جوری کو آپ کیسے جانتی ہیں بی بی جی؟"

"بس جانتی ہوں ایک دفعہ جب پہلے کمال پورہ آئی تھی تب اس سے بھی ملی تھی بڑی پیاری لڑکی ہے۔" شازی نے بات بناتے ہوئے کہا۔ رفعت نے گہری نظروں سے شازی کو دیکھا اور بولی۔

"ہے نہیں..... تھی! اب جوری اس دنیا میں موجود نہیں بی بی جی! اسے قتل کر دیا گیا ہے۔" اور شازی کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا وہ ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے پتا نہیں کیا کیا سوچا تھا اس نے کیا کیا پلاننگ کی تھی اس نے اپنے بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی لیکن قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا برکتے، ہاشم، جوری، سیٹھ عاصم، فریال..... شازی سے جڑا ہر کردار کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہو چکا تھا اور شازی ایک مرتبہ پھر وہیں کی وہیں کھڑی تھی جہاں ڈائری کے ملنے سے پہلے تھی۔

"اگر یہی سب ہونا تھا تو کیوں ملی وہ منحوس ڈائری، کیوں بخشا گیا اسے سچ کا یہ کرب؟ کیوں آخر کیوں؟" لیکن اس کیوں کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا شاید قدرت کے پاس بھی نہیں..... شازی کی ذہنی رو یکلخت پلٹی اور اس کی مٹھیاں بھینچتی چلی گئیں پھر جب وہ بولی تو

اس کی آواز میں سمندروں کا ٹھہراؤ تھا۔
"کس نے قتل کیا اسے؟"
"وہ۔جی بی بی جی! ادھر باغ میں سے لاش ملی تھی۔جی اس کی بڑا برا حال تھا جی توبہ توبہ کسی نے اس کی عزت ......" رفعت نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو شازی کے دل و دماغ میں جیسے کوئی طوفان جاگ اٹھا خون اسے اپنی کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارتا محسوس ہوا۔
وہی آدم و حوا کی ازلی کہانی تھی مرد کے ظلم و ستم کی شکار کمزور عورت اور ہر بار عورت ہی پستی تھی' وہی ماری جاتی تھی مرد کیوں نہیں' آخر مرد کے حصے میں موت کیوں نہیں لکھ دی جاتی' اس نے وحشت زدہ انداز میں سوچا ہمیشہ عورت پر ہی ظلم کے پہاڑ کیوں ٹوٹتے ہیں کیا صرف اس لیے کہ اس کا خمیر ہی محبت سے اٹھایا گیا ہے؟ ماں' بہن' بیٹی' بیوی ہر روپ میں اس مرد پر پیار ہی تو نچھاور کرتی ہے بے چاری کیا یہی اس کا جرم ہے؟ اور اگر یہ جرم ہے بھی تو کیا اتنا شدید جرم ہے کہ جس کی پاداش میں اسے ذلیل و رسوا کرنے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا جائے؟ اس کے ذہن میں ان گنت سوال آندھیوں کی طرح گردش کر رہے تھے لیکن ان سوالوں کا جواب دینے والا یہاں کوئی نہیں تھا۔
اور پھر آندھی آخر کار گزر ہی جاتی ہے ہر طوفان تھم ہی جاتا ہے لیکن یہ شازی تھی جو بظاہر تو پرسکون ہو گئی تھی لیکن اس کے اندر کیسے جوار بھاٹے اٹھ رہے تھے اس کا اندازہ شازی کے علاوہ اور کوئی لگا بھی کیسے سکتا تھا۔ "کچھ اندازہ ہے؟" اس نے سرد آواز میں رفعت سے استفسار کیا۔
"وہ۔جی بی بی جی چھوٹا منہ بڑی بات لیکن۔" رفعت نے پھر جملہ ادھورا چھوڑا تو شازی گویا اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔
"بے جھجک بتاؤ میں کوئی پولیس والی نہیں ہوں۔"
اور رفعت ٹیپ ریکارڈر کی طرح اسٹارٹ ہو گئی۔ راحیل کے آنے اگلے دن چائے لانے' جوری کو بلانے اور پھر اسی رات جوری کے قتل ہو جانے کا واقعہ من و عن شازی کی میموری میں فیڈ ہو چکا تھا۔
اور یہ سب کچھ سننے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ایک خوبرو نوجوان کا چہرہ اس کے تصور میں اجاگر ہو رہا تھا اور ایک نام مسلسل اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ راحیل...... راحیل...... راحیل۔
شازی نے پرس میں سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ گن کر نکالے اور ساتھ ہی اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی جو اس نے رفعت کے ہاتھ میں دیا کچھ دیر رفعت سے سرگوشیوں میں گفتگو کرنے کے بعد شازی پلٹی اور پھر جلد ہی اس کی سفید پراڈو حویلی سے باہر نکل رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے کیس کو مزید الجھا دیا تھا رپورٹ کے مطابق تمام تر تشدد کے باوجود جوری کے ساتھ نازیبا کارروائی نہیں کی گئی تھی یعنی اس کی عزت محفوظ رہی تھی۔
یہ بات عقل چکرا دینے والی تھی کیونکہ لاش کی ظاہری حالت دیکھ کر اور جس قسم کا تشدد اس پر کیا گیا تھا اسے دیکھ کر جو پہلا تاثر ذہن میں ابھرتا تھا وہ یہی تھا جو بعد میں قتل کی وجہ بھی سمجھا جا سکتا تھا لیکن یہاں معاملہ سرے سے ایک نیا رنگ اختیار کر گیا تھا اب سوال یہ تھا کہ قاتل اگر کوئی ایسا ارادہ نہیں ——— تھا تو پھر ایسا وحشیانہ تشدد کیا معنی رکھتا تھا اور قتل کی وجہ کیا تھی؟ شاید قاتل نے اپنی شناخت چھپانے اور تفتیش کو غلط رخ پر ڈالنے کے لیے اس قسم کا ڈرامہ رچایا تھا کہ لاش کو دیکھتے ہی پہلا خیال یہی ابھرے کہ لڑکی کے ساتھ بدسلوکی ہوئی ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی رہا تھا کیونکہ ریحان کے ذہن میں بھی پہلا خیال یہی آیا تھا اور اس معاملے میں اسے سب سے زیادہ مشکوک راحیل نظر آیا تھا لیکن وہ اس جھمکے کو کس خانے میں فٹ کرتا جو اسے جائے وقوعہ سے ملا تھا۔
جوری کے دونوں کانوں میں بالیاں موجود تھیں جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ جھمکا جوری کا نہیں تھا بلکہ وہاں آنے والی کسی دوسری عورت کا تھا جو یا تو خود قاتل تھی یا قاتل کے ساتھ وہاں موجود رہی تھی دوسری بات ریحان کو زیادہ قرین قیاس لگی کہ ایک عورت تو کسی دوسری عورت کے ساتھ یہ سلوک کر نہیں سکتی تھی ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ دوسری عورت قاتل کی معاونت کے لیے وہاں موجود رہی ہو۔
بہرحال جو کچھ بھی تھا وہ جھمکا ریحان کے لیے سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے رسٹ واچ پر نظر ڈالی رات کے نو بج رہے تھے کچھ لمحوں تک پرخیال انداز میں بیٹھا کچھ سوچتا رہا اور پھر سر پر کیپ جماتا ہوا تھانے سے باہر نکل آیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس کی جیپ کمال پورہ کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی جیپ میں اس وقت ریحان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا نہ جانے بیٹھے بٹھائے اس کے دماغ میں کیا آئی تھی کہ وہ اس وقت کمال پورہ کی طرف چل پڑا تھا گاؤں سے باہر ہی اس نے جیپ کی ہیڈ لائٹس آف کر دیں اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ ایک مناسب جگہ جیپ روکنے کے بعد جیپ سے اترا اور پھر گھومتے ہوئے حویلی کی عقبی طرف موجود باغ میں پہنچ گیا۔
آسمان پر گہرے بادل شام ہی سے چھائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے ماحول پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس گہرے اندھیرے میں باغ میں موجود درخت کسی عفریت کی شکل میں دکھائی دے رہے تھے لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز آگے ہی آگے چلا جا رہا تھا اور پھر کچھ لمحوں کے بعد ہی وہ درختوں کے اسی جھنڈ میں موجود تھا جہاں جوری کی لاش پائی گئی تھی۔ یہاں آنے کا اس کا کوئی خاص مقصد ہرگز نہیں تھا یہ شاید کوئی سراغ ہاتھ نہ لگنے پر پیدا ہونے والی جھلاہٹ ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ اس وقت یہاں موجود تھا۔
ابھی اسے یہاں رکے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اسے ایک تیز نسوانی کراہ سنائی دی دوسرے ہی لمحے وہ چیتے کی طرح چوکنا ہو چکا تھا اس نے تھپتھپا کر بغلی ہولسٹر میں ریوالور کی موجودگی کو محسوس کیا اور پھر جیب سے ایک طاقتور ٹارچ نکالتا ہوا آواز کی سمت کا اندازہ

کرتے ہوئے ایک طرف بڑھنے لگا۔ ٹھیک اسی لمحے عقب سے اسے کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی شاید سمت کا تعین کرتے ہوئے وہ دھوکہ کھا گیا تھا لیکن ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا تھا وہ تیزی سے پلٹا اور بھاگتے ہوئے سائے کے پیچھے لپکا جس کا رخ حویلی کے عقبی دروازے کی طرف تھا۔

"رک جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔" اس نے للکارتے ہوئے کہا لیکن اس کی للکار کا جوابی رد عمل اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا بھاگتے ہوئے سائے نے یکدم کوئی چیز اس کی طرف اچھالی تھی ریحان لاشعوری طور پر نیچے جھکا اور یہ جھکنا ہی اس کی جان بچا گیا کوئی چیز سرسراتی ہوئی اور اس کے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی جو یقیناً "کوئی خطرناک ہتھیار ہی رہا ہو گا ریحان کے اندازے کے مطابق وہ خنجر ہو سکتا تھا۔ سایہ بڑی پھرتی سے بھاگا چلا جا رہا تھا اور ریحان اس کے تعاقب میں تھا یقیناً" یہ ایک اندھا اقدام تھا لیکن جو خطرات سے ڈر جاتا وہ ریحان ہی کیا؟ ٹھیک اسی لمحے بادل زور سے گرجا اور ایک لمحے کے لیے ماحول پر سے تاریکی کا پردہ چاک ہو گیا۔

لیکن کڑکتی ہوئی آسمانی بجلی کی چمک نے ریحان پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ دیے دوڑنے والا انسانی وجود ایک گرانڈیل عورت کا تھا قیم شخیم ہونے کے باوجود اس کے بدن میں حیوانی پھرتی تھی ٹھیک اسی لمحے عورت عقبی دروازے میں داخل ہو گئی اور اس سے اگلے ہی لمحے دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا ریحان بھی بھاگتا ہوا دروازے پر پہنچا پہلے اس نے دروازہ دھڑ دھڑانے کے لیے ہاتھ اٹھائے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا وہ دیوار کے ساتھ چلتے چلتے حویلی کے سامنے کے رخ پر آگیا چند لمحے سن گن لینے کے سے انداز میں ساکت کھڑا رہا اور پھر اچک کر اس نے اپنے ہاتھ دیوار پر جما دیے۔

ہاتھوں کے بل پر اپنے جسم کو تولتے ہوئے دوسری طرف پہنچنا ریحان کے لیے ذرا بھی مشکل ثابت نہیں ہوا جس جگہ پر وہ موجود تھا وہاں ایک سفید کار کھڑی تھی اور وہ اس کی عقبی طرف موجود تھا ابھی وہ پوری طرح ماحول کا جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا کہ کسی کے قریب آتے قدموں کی آواز سن کر بوکھلا گیا اس نے ادھر ادھر چھپنے کی کوئی مناسب جگہ تلاش کی لیکن بے سود ٹھیک اسی لمحے اس کی نظریں گاڑی کی ادھ کھلی ڈگی سے ٹکرائیں اور وہ بنا سوچے سمجھے بے اختیار ڈگی کے اندر اتر گیا اور اس کے بعد اس نے ہلکی سی جھری رکھتے ہوئے با آہستگی ڈگی کا ڈھکن واپس جما دیا لیکن ریحان کے ستارے ہی گردش میں تھے کیونکہ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد گاڑی حویلی سے باہر نکل رہی تھی۔ ریحان نے ایک طویل سانس لی اور اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا......!

☆ ☆ ☆

"گاڑی ایک سائیڈ پہ روک دو میرے ہیرو۔" لڑکی کی سرد اور تحکمانہ آواز بلند ہوئی اور راحیل بے اختیار بریک پیڈل پر دباؤ ڈالتا چلا گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد گاڑی سڑک کے کنارے رک چکی تھی۔

"نیچے اترو اور اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔" لڑکی نے دوسرا نادر شاہی حکم جاری کیا اور راحیل چون و چرا کیے دوسرا حکم بھی بجا لایا۔

"ڈھلوان کی طرف چلو۔" یہ اس کا تیسرا حکم تھا راحیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارادہ کیا ہے؟ اگر گاڑی لے جانا چاہتی ہو تو اس پہاڑی ویرانے میں مرنے سے اچھا ہے کہ تمہارے ہاتھوں گولی کھا کے مر جاؤں گاڑی تم میرے بغیر نہیں لے جا سکو گی۔"

"بکواس بند کرو اور جو میں کہتی ہوں وہ کرو۔" لڑکی نے خطرناک انداز میں ریوالور کو جھٹکتے ہوئے کہا تو راحیل طوہاً "کرہاً" اس حکم کو بھی ماننے پر مجبور ہو گیا۔ کافی حد تک نشیب میں آنے کے بعد لڑکی بولی۔

"بس کافی ہے، یہیں رک جاؤ" اور راحیل کے بڑھتے ہوئے قدم ساکت ہو گئے۔

"اپنے خدا کو یاد کر لو مسٹر راحیل اور کلمہ پڑھنے سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہو تو وہ بھی مانگ لو کیونکہ میں تمہیں گولی مار رہی ہوں۔" اور راحیل بری طرح چونک گیا یہ بات اس کے لیے حیران کن ہی تھی کہ لڑکی اسے اس کے نام سے جانتی تھی یعنی اس کا اس سے ٹکرانا محض اتفاق نہیں تھا لیکن کیسے؟ اور کیوں؟ اس نے ایک بار پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیم تاریک ماحول میں لڑکی کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ لڑکی کے نقوش ضرور کچھ جانے پہچانے سے لگ رہے تھے لیکن یہ بات طے تھی کہ وہ اس لڑکی سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا پھر کیا وجہ تھی کہ وہ اس کی جان لینے کے درپے تھی؟

لیکن راحیل اس معمے کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"گولی تو تم مجھے مار ہی دو گی لیکن مرنے سے پہلے مجھے میرا جرم تو بتا دو کیوں مارنا چاہتی ہو مجھے؟" جب راحیل کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے لڑکی ہی کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ "میرا نام شازی ہے۔" لڑکی نے گویا اپنا تعارف کرایا لیکن ظاہر ہے کہ راحیل کے لیے یہ نام بھی اجنبی ہی تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد شازی نے دھماکہ خیز لہجے میں کہا "جوری" کو جانتے ہو۔"

اور راحیل اچھل پڑا اب اسے سمجھ آ رہی تھی کہ اس لڑکی کے نقوش اسے جانے پہچانے کیوں لگ رہے تھے لڑکی کے چہرے میں بڑی حد تک جوری کی شباہت موجود تھی۔ لیکن بات پھر بھی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔

ادھر شازی شاید اسے پوری طرح سمجھانے کا تہیہ کیے ہوئے تھی "جوری میری بہن تھی اور میں تمہیں اس کے قتل کے جرم میں گولی مار رہی ہوں۔" شازی نے ریوالور سیدھا کرتے ہوئے کہا تو راحیل جلدی سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"اوہ مس شازی! قاضی بن کے فیصلہ تو سنا دیا لیکن کان کھول کر سن لو میں نے اسے نہیں مارا بھلا میری اس معصوم لڑکی سے کیا دشمنی تھی جو میں اسے مارتا؟"

"جھوٹ بکتے ہو تم..... تم ایک خونی درندے ہو جانور ہو تم اپنی ہوس کے ہاتھوں اندھے ہو کر پہلے تم نے اپنی بھوک مٹائی اور پھر اسے جان سے مار ڈالا قاتل ہو تم۔" اس نے چیختے ہوئے کہا ریوالور پہلے ہی اس نے راحیل پر تان رکھا تھا اور اب ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بھی خطرناک حد تک بڑھ چکا تھا ٹھیک اسی لمحے کوئی چیز اڑتی ہوئی سی شازی سے آٹکرائی ایک زوردار دھماکا ہوا گولی چلی لیکن اپنے ہدف کو نشانہ نہ بنا سکی کیونکہ شازی کے وجود کو لگنے والے زوردار دھکے کی وجہ سے جہاں اس کا نشانہ خطا گیا تھا وہیں ریوالور بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اندھیرے میں کہیں غائب ہو چکا تھا اور شازی پہلو کے بل زمین پر آگری۔

پولیس کی وردی میں ملبوس ایک اسمارٹ وجود شازی سے الجھا ہوا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے شازی اچھل کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے زمین نے اسے اوپر اچھال دیا ہو پولیس والا بھی اسی تیزی سے اٹھا تھا جو یقیناً" ریحان کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ وہ اچھی طرح اس بات کا اندازہ لگا چکا تھا کہ شازی لڑائی بھڑائی کے

سلوی علی بٹ

فن سے واقف ہے اور موجودہ حالات میں اس پر قابو پانا خاصا مشکل ثابت ہو سکتا تھا اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مس عاصم' راحیل صاحب درست کہہ رہے ہیں جوری کا قتل انہوں نے نہیں کیا بلکہ قاتل کوئی اور ہے اور میں اس کے قریب پہنچ چکا ہوں اور جہاں تک میرا خیال ہے شاید آج حویلی یا اس کے اردگرد کوئی مزید حادثہ بھی ہو چکا ہے۔" اس کے بعد اس نے مختصراً" باغ میں ہونے والے واقعہ اس عورت کا تعاقب ڈگی میں چھپنا اور یہاں تک پہنچنا سب بتا دیا۔

"راحیل صاحب ایک بات پر میں حیران ہوں کہ آپ اس وقت کہاں جا رہے تھے اور مس عاصم یہاں کیسے پہنچ گئیں؟"

"میری شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں ریحان صاحب اور میں یہ سوچ کر شہر جا رہا تھا کہ رات وہیں رک جاؤں گا اور صبح کچھ زیورات اور کچھ سوٹ وغیرہ خرید کر واپس آجاؤں گا۔ شازی یہاں کیسے پہنچ گئیں یہی زیادہ بہتر بتا سکیں گی۔" راحیل نے جملے کے اختتام پر شازی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جواباً" شازی نے بھی سارا واقعہ سنا دیا اس دوران وہ چڑھائی چڑھتے ہوئے گاڑی میں آبیٹھے تھے۔

شازی نے یہ بھی بتا دیا کہ راحیل کی روانگی کی اطلاع شام میں ہی اسے مل چکی تھی اور اس اطلاع کا ذریعہ راحیل کی ادھیڑ عمر تجیم شحیم ملازمہ رفعت ہی تھی وہی رفعت جس نے شازی کو یہ باور کرایا تھا کہ جوری کا قاتل راحیل کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ راحیل نے فیصلہ کیا تھا کہ موجودہ حالات میں شہر جانے کی بجائے انہیں فوراً" کمال پور واپس پہنچنا چاہیے اور ان دونوں نے اس کی تائید کی تھی لہٰذا اب راحیل کی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی واپسی کا سفر طے کر رہی تھی۔

اچانک شازی نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ریحان صاحب' آپ نے بتایا کہ جس عورت کا آپ نے تعاقب کیا وہ تجیم شحیم اور گرانڈیل قسم کی تھی۔" ریحان نے اثبات میں سر ہلایا تو شازی بولی "یہ رفعت آپ کے بتائے حلیے پر بالکل پوری اترتی ہے۔" اور پھر اس نے وہ عجیب واقعہ بھی ریحان کے گوش گزار کر دیا جسے سناتے ہوئے شازی کا چہرہ شرم سے گلنار ہو رہا تھا اور وہ ریحان سے نگاہیں نہیں ملا پا رہی تھی رفعت کی مردانہ نظربازی اس کے نزدیک ایک حیران کن بات تھی۔ راحیل عقبی شیشے میں دیکھ رہا تھا کہ شازی گفتگو کرتے ہوئے سرخ ہو رہی تھی اور ریحان والہانہ نظروں سے اسے دیکھے جا رہا تھا راحیل کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

شازی کی بات ختم ہوئی تو ریحان بولا۔

"کیس حل ہو چکا ہے مس شازی دراصل رفعت ہارمونز کی گڑبڑ کا شکار ایک جنونی عورت ہے جس میں زنانہ اور مردانہ دونوں ہارمونز پائے جاتے ہیں اور شاید آج کل اس میں مردانہ ہارمونز کی زیادتی نے اسے قتل جیسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرنے پر مجبور کر دیا۔" اور شازی' ریحان کی ذہانت پر سر دھنتی رہی۔

فجر کی اذان کے وقت رفعت کو گرفتار کر لیا گیا اور جیسا کہ بعد کی تفتیش سے ثابت بھی ہو گیا کہ ریحان کے اندازے درست تھے اس رات اس کا شکار ہونے والی گاؤں کی ایک دوسری لڑکی چھمو تھی لیکن ریحان کی بے وقت مداخلت کی وجہ سے وہ اس کی جان نہیں لے سکی تھی۔ چھمو معمولی زخمی ہوئی تھی رفعت کے خلاف ایک مضبوط گواہ ثابت ہوئی۔

چند دن بعد ناجی دلہن بن کر حویلی آگئی۔ راحیل اور ناجی کی شادی کو دس یا بارہ دن گزرے تھے جب شازی اور ریحان ایک ساتھ راحیل کی حویلی پہنچے ریحان اپنی اور شازی کی شادی کا انویٹیشن کارڈ راحیل کے ہاتھ میں تھمایا تو وہ شرارت بھری نظروں سے اسے گھور کر رہ گیا۔

1951ء

"ونگا چڑالو' ونگا..... اے ونگا چڑالو' ونگا۔"

بھاری سریلی آواز گاؤں کی کئی گلیوں میں گونج رہی تھی۔

ونگا چڑھانے کی شوقین بہت سی عورتوں کے کان اس ہانک پر کھڑے ہو گئے۔ بے اختیار ہی ان کے ہاتھ اپنے کمر بند اور انگیا کے ساتھ بندھی ہوئی تھیلیوں کو ٹٹولنے لگے۔ جن میں پڑے چند ایک سکے ان کا دن بھر کا خرچہ پورا کرنے کے لیے بھی ناکافی تھے۔ ڈھیلے ہاتھوں سے تھیلیاں کس کے اس ونگا کی پکار پہ کان لپیٹ کر بے دلی سے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ کچھ عورتیں ایسی بھی تھیں جو اپنے ہار سنگھار کے لیے پیسے الگ سے چھپا کے رکھتی تھیں۔ انہی میں سے ایک گاماں کی ماں تھی۔

"اے گاماں' اس ونگا والی کو ٹھہرا' چڑانی (چڑھانی) ہے مجھے۔" اس نے گاماں کو اس کے پیچھے دوڑایا اور خود کوٹھری میں چھپا کے رکھی پٹاری میں سے پیسے لینے چل دی۔

"نی پینترا' میرے ساجرے سے مال نئیں ویکا' جے فن در جن چڑانی ہے تے گل کر۔" کھجور کے پتوں کا بنا بڑا سا ٹوکرا سر پر درست کرتے اس لمبی دھڑنگی سوکھی سی عورت نے لٹھ مار انداز میں کہا۔ اس کے چہرے کی بے زاری اور لہجے کا روکھا پن بتا رہا تھا کہ واقعی صبح سے بکری نہیں کر سکی۔

مگر اس میں گاماں کی ماں کا کیا قصور تھا؟ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"نی وڈی چالاک نہ بن' تیرا سودا نئیں ویکا تو تو نے یہ کسر میری غریب ہڈیوں سے کڈنی (نکالی) ہے۔" وہ اپنی حیرت پہ قابو پا کے تیزی سے بولی۔

"نا بار تو تو اویں (ایسے) آئی ہے جینوے نمبردار کی ووہٹی ہو۔" وہ بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی بھلا کیوں لحاظ رکھتی۔

"اچھا بوہتی گل نہ ودا (بڑھا) بہ جا' تے دو درجن میری وٹوی (کلائی) پہ چاڑ دے۔" اس نے ذرا نرمی اختیار کر لی۔ وہ اس چوڑیوں والی کو کئی سالوں سے جانتی تھی اور اس کی طبیعت سے بھی اچھی خاصی واقفیت تھی۔ اس کے رشتے داروں میں عقیقہ تھا ورنہ وہ اسے ایک کی چار سنا کر یہاں سے چلتا کرتی۔

"پیچھے بچی ایک درجن' تے او۔" اس کی نرمی کا ذرا بھی اثر لیے بغیر وہ اپنے کہے پر اڑی تھی۔

"وہ میرے خصم کے لیے دے جا' وہ چاڑے گا۔" اس نے جل کر جواب دیا۔ اس کے پاس صرف تھوڑی سی بچت تھی۔ جس میں سے اس نے سرمہ بھی خریدنا تھا اور چھوٹی کاکی کی جوتی بھی لینی تھی۔

"آہو' خصم بھلا اتنے چنگے ہووے ہیں۔" اس کے تیے ہوئے طنز بر دل سے مسکراتے' اپنی سیاہ ملگجی دھوتی کو گھٹنوں تک سمیٹ کر احتیاط سے ٹوکرا اتارتے ہوئے زمین پہ بیٹھ گئی۔

"کرو نیڑی اگاں۔" (بازو آگے کرو)۔ ایک سرخ اور ایک ہری چوڑی جوڑ کر اس نے سیٹ ترتیب دے لیا۔

"پر اک شرط اے میری۔" اس کے ہاتھ کو اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں میں مروڑ مروڑ کر نرم کرتے اس نے کہا۔

"اوہ کی۔" گاماں کی ماں نے دل میں اسے موٹی سی گالی دے کر بظاہر نرمی سے استفسار کیا۔

"دو درجن کے ترے کول پیسے ہیں نا' اوہ دے دے' باقی اک درجن کا پاوے ادھار کر لے۔"

"یعنی تو تن ہی دیویں گی۔" اس نے بری سی شکل بناتے نفی میں سر ہلایا۔

"چل فیر اینج کر اک درجن گاماں نوں ڈال دے۔" اس نے نیم رضامندی سے بیٹی کی طرف دیکھا۔

"میں نئیں چڑھانی چوڑیاں' میٹوں نئیں پتہ۔" ٹوکرے کے پاس ہی بیٹھی چودہ سالہ ٹھیکریوں سے کھیلتی گاماں اچھل کر ذرا پرے ہٹ گئی۔

"تاں تینوں کوئی تکلیف اے۔" اس کی ماں نے اس کا گال کھینچ کر مروڑا۔ بیٹی کے انکار نے اس غصے کو اور ہوا دی تھی۔

"میں جاری آں پانی بھرن' دارو کے ڈالوا دے۔" وہ ماں کے مزید اصرار اور مار سے بچنے کے لیے تیزی سے اٹھ کر کچی سڑک پر بھاگ گئی ساتھ ہی خود سے چھوٹی بہن کا مشورہ بھی دے دیا۔

"میں بولاں پیچھے مڑ آ گاماں۔" اس نے گلا پھاڑ کر ہانک لگائی۔ پیچھے تو وہ نہ مڑی البتہ پیلیوں کی طرف ضرور مڑ گئی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں بھولنے والوں میں سے نہیں ہے جو اس نے صبح سنی ان سنی کی ہے اس کی ٹھکائی وہ ضرور کرے گی۔ وہی ہوا شام کو اس کے پراندہ باندھتے ماں کو بات یاد آ گئی۔

"اب بول چنڈالے' خصم نوں کھانئیں' سویرے کدھر دفع دور ہو گئی تھی' فیر پانی لے کے اپڑی نئیں۔"

اس کی گردن میں ہتھڑ لگا کے' اب جو پراندے میں بال اتنے زور سے گوندھے تھے کہ ایک لمحے کو اسے لگا کہ گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ سارے پٹھے اکڑ گئے تھے۔

"ہائے میں مر گئی مائے۔" وہ درد سے چلائی۔

"مرجا' مرہی جائے چنگا اے' دس (بتا) گل کیوں نئیں سنی۔" انہوں نے اس پہ ذرا بھی ترس کھائے بغیر اپنی بات دہرائی۔

"ہائے اماں' کنواریوں کی خالی کلائیاں ہی چنگی لگتی ہیں' یہ چوڑیاں اور ہار سنگھار سہاگن کے چاہ ہوتے ہیں۔" اس نے کراہتے ہوئے بڑے مدبرانہ انداز میں اپنی تئیں معقول وجہ بتائی۔

"تا تجھے کس نے بتایا۔" اس کے ہاتھ چوٹی پہ ڈھیلے پڑ کے پژمردہ سے ہو گئے تھے۔

اس تیس سالہ سہاگن کو اس کی چودہ سالہ بیٹی' جسے ابھی ٹھیک سے چنری بھی اوڑھنی نہیں آتی تھی کیا سمجھا رہی تھی۔

"میں نے خود ریاجو کی لڑکی کو دیکھا ہے' ویاہ سے پہلے وہ کتنی سادہ ہوتی تھی' اب وہ سارا سرخی پاوڈر کر کے بنی سنوری رہتی ہے۔" اس نے اپنے محلے کی لڑکی کا ذکر کیا۔ جس کی شادی کو چند ماہ بیتے تھے۔

"پر تیرا ریاجو کی چھور سے کیا جوڑ میل۔" بیٹی کی سمجھداری نے ماں کو پریشانی میں گھیر دیا تھا۔

"لو کر لو گل جوڑ میل کی' اوہ ویاہی وری (شادی شدہ) میں کنواری' میں تو صرف اتنا کہتی ہوں کہ جب میرا ویاہ ہو گا' تب اکو واری چوڑیاں چڑھاؤں گی' کریم پاوڈر اور سرخی بھی لگاؤں گی۔"

چارپائی کے نیچے سے چپل گھسیٹ کر پاؤں میں اڑستے اس نے اپنی طرف سے ماں کو پورا مطمئن کر دیا۔ تاکہ آئندہ اس کے ساتھ دوبارہ ایسا سلوک نہ کیا جائے۔

"لڑکی اپنے منہ سے بر مانگے تو ویلا نئیں کرنا چاہیے۔" اس نے آج پہلی بار نظر بھر کر بیٹی کی اٹھان دیکھی۔

اس رات گاماں تو بڑی پرسکون نیند سوئی مگر اس کی ماں ساری رات نہ آنکھ لگا سکی گاماں کی باتیں اس کے ذہن سے نکل ہی نہیں رہی تھیں۔ ان باتوں نے تب ہی نکلنا تھا جب گاماں کی ڈولی اس گھر سے اٹھنی تھی۔

صرف ڈیڑھ سال بیچ کے گزرے تھے اور گاماں کی رخصتی ایک پچیس سال کے جوان کے ساتھ ہو گئی۔ اس کا شوہر غلام وزیر ایک غریب مزارعہ' اکلوتا بیٹا تھا۔ صرف ایک بہن وہ بھی شادی شدہ۔

1953ء میں دیہاتوں میں بجلی کا تصور بھی نہیں تھا۔ تب دیہاتی لوگ واقعی بڑے سیدھے سادے' ملنسار اور اپنی تہذیبوں' رسم و رواج کی قدر کرتے تھے۔

شادی والے گھر میں یہ رواج عام تھا کہ جب تلک گھر مہمانوں سے بھرا رہتا دولہا' دلہن کے پاس جانا تو دور اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مہمانوں کا قیام جتنا طویل ہوتا نئے جوڑے کو اتنے ہی صبر کے گھونٹ بھرنے پڑتے۔

غلام وزیر اور گاماں بہت خوش قسمت تھے کیونکہ ان کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ درپیش نہ آیا۔ غریب غلام وزیر کے گھر کوئی لمبی چوڑی ذات برادری نہیں

آئی تھی۔ جو آئے سر شام ہی چلے گئے۔ بس ماں بہن اور رشتے کی کچھ بڑی بوڑھیاں رہ گئیں۔

یہ اس کی بڑی بیاہی بہن کی ہی مہربانی تھی کہ اسے اپنی پہلی رات کی دلہن کے پاس جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

گھپ اندھیر کمرے میں لالٹین کا تیل کم ہونے سے مدھم سی چمک تھی۔ چمک اتنی ضرور تھی کہ غلام وزیر کو سامنے بڑی چارپائی پہ گٹھری سا بنا وجود نظر آگیا۔

پردہ سرکا کر وہ قریب جا بیٹھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر وہ گٹھری مزید سکڑ سمٹ گئی۔ گھونگھٹ جو پہلے ہی گود میں لٹک رہا تھا اب اسے اندر سے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے دبوچ لیا گیا۔ خود اس کی مرد ہونے کے باوجود بھی دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔

"السلام علیکم!" شرماتے ہوئے وہ ذرا فاصلے پہ ہو گیا۔

"وہ..... وہ میرا نام غلام وزیر ہے' آپ کا گھر والا۔"

اس کے جواب میں بھی جب ہاں یا نہ کی ذرا سی بھی جنبش نہ ہوئی تو اس نے کچھ سوچتے ہوئے مزید تعارف کروایا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ پہلی رات ہی بیوی کو اپنے متعلق سب سچ بتا دینا چاہیے۔ تاکہ بعد میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہ رہے۔

"وہ..... جی یہ میرا اپنڑا (اپنا) گھر ہے' پورے پنج (پانچ) مرلے کا' دو کمرے ہیں' چوہدری صاحب کی زمینوں پہ مزارعہ ہوں' صرف ایک ہمشیرہ وہ بھی اپنے گھربار کی' باپ مرحوم ہے اور کلی (اکیلی) ماں ہے' وہ اج سے آپ کی وی ماں ہی ہے۔" وہ پھر خاموش ہو گیا۔ ابھی بھی چوں چرا نہیں ہوئی تھی۔

اسے اچانک یاد آیا اسے منہ دکھائی دینا ہوگی' اس نے اپنی بوسکی کی قمیص کی جیب سے چاندی کی انگوٹھی ٹٹول کر نکالی' ذرا جھجکتے ہوئے بڑی مشکل سے اس کے دائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں پہنا دی۔ اگلا مرحلہ گھونگھٹ الٹنے کا بھی کوئی گوشوار نہیں تھا۔ بڑا زور لگا کر اس کچی عمر کی کلی نے گھونگھٹ الٹنے دیا۔

گوری چٹی سی' موٹی موٹی آنکھوں پہ جھکی لرزتی پلکیں' خوف اور گھبراہٹ سے زرد پڑتی رنگت۔

غلام وزیر دم سادھے تکتا رہ گیا۔ پہلے اسکول سے چوتھی جماعت سے پھٹہ کھانے والے غلام وزیر کو بھی ابھی معلوم پڑا تھا کہ دل نام کی شے بھی بازو کی نبض کی طرح دھڑکتی ہے۔ کم عمر اور خوب صورت عورت بڑے بڑے سورما کے کس بل نکال دیتی ہے یہ تو پھر سیدھا سادا سا پینڈو غلام وزیر تھا۔

دوسری طرف گاماں کا دل انگوٹھی لے کر ٹوٹ سا گیا۔

"آپ بھی کچھ بولو' میں کلا (اکیلا) ہی کہتا جا رہا ہوں۔" اس نے بڑی محبت سے بیوی سے پہلی فرمائش کی۔

"وہ..... وہ..... وہ توسی (آپ) ونگاں نئیں لائے۔" وہ بولی بھی تو وہی پھانس نکالی۔ جو اس کے کلیجے میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس چھٹانک بھر کی لڑکی نے پہلی بولی میں ہی گلہ کر دیا تھا۔

"کیا اماں نے وعدہ کیا تھا؟" اس نے اپنا شک ظاہر کیا اسے خیال آیا تھا شاید اماں نے آس دلائی ہو۔

"نئیں..... نئیں تو' پر چوڑیوں کے بغیر بھی بھلا عورت سہاگن لگتی اے' میری ماں نے وی ڈنڈیاں (بالیاں) ڈالی ہیں۔" وہ رو دینے کو تھی۔ بات اس کے پلے پڑ گئی تھی۔ اس لیے اسے بہلانے کو بولا۔

"تو کچ (کانچ) کی چاڑ لیتی۔"

گاماں کی خالی کلائیوں پر اس کی نگاہ پڑ گئی تھی۔ حقیقتاً" اسے دلہن کی خالی بانہوں نے تکلیف دی۔ اس نے ماں سے ضد باندھ کر کانچ کی چوڑیاں بھی نہیں پہنی تھیں۔

"دیکھ تو غم نہ کر' ہوں تو میں غریب آدمی' سونا میرے بس کی گل تو نئیں ہے پر میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھے اک چوڑی بنا دوں گا۔" وہ بہت جلد آپ سے تو تک پہنچ گیا تھا۔ یہ مرد کی خالصتاً" فطرت ہے کہ وہ عورت کے قرب میں جب مدہوش ہو تو بڑے بڑے دعوے اور عہد و پیماں باندھ لیتا ہے' صرف زبان کی حد

تک۔ یہ سارے وعدے بستر سے پاؤں اتارنے تک کے ہی ہوتے ہیں۔

"دیکھو جی۔" اس نے دونوں بازو آگے کر دیے۔

"ونگوں کے بغیر وینڈی ایسے لگتی ہے کہ جیسے..... جیسے بغیر بچوں کے ویڑہ۔" روہانسی گاماں مثال بھی کیا خوب ڈھونڈ کر لائی تھی۔

"چل چھوڑ بھی' اب وعدہ کر تو لیا ہے۔" اس نے جذباتی پن سے کہتے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"پر پورا کب کرے گا؟" اس کی سوچ ابھی بھی وہیں پہ تھی۔

"جب..... جب۔" اس نے ذہن پہ زور دے کر مناسب وقت سوچا۔

ابھی شادی پہ اتنا خرچا اٹھ گیا تھا کہ اس کی باقی کی جمع پونجی بہت تھوڑی سی رہ گئی تھی۔

"ہاں۔" وہ مسکراتے اس کے مزید قریب کھسکا۔

"جب تو مجھے خوشی کی خبر دے گی تب۔"

غلام وزیر کی بات پہ شرم سے دوہری ہوتی گاماں کو بالآخر یاد آ ہی گیا تھا کہ وہ سہاگ کی سیج پہ ہے۔ گاؤں کی لڑکیاں اچھی طرح جانتی ہیں کہ مرد کے لیے خوشی کی خبر کیا ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆

زندگی معمول پر رواں دواں ہو گئی تھی۔ غلام وزیر منہ اندھیرے کا زمینوں پہ نکلتا دوپہر کو روٹی کھانے آتا دو گھڑی آرام کر کے پھر چلا جاتا اور اس کی واپسی عصر کے بعد ہی ہوتی۔ گاماں بھی بڑی خوش تھی۔ گھر میں صرف بوڑھی ماں تھی نہ کوئی روک ٹوک نہ بہت زیادہ کام۔

شوہر تھا میٹھی نگاہوں سے دیکھنے اور پولا پولا پیار کرنے والا۔ کھانے پینے کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ڈھلتی سردیوں کے دن گرمیوں کے لمبے دنوں میں بدلتے جا رہے تھے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی دھوپ چڑھتی شام کو جب عورتیں ہانڈی چولہے سے فارغ بھی ہو لیتیں تو دھوپ ابھی بھی کوٹھوں اور منڈیروں پہ سائے

کی طرح لرز رہی ہوتی۔

گاماں کی شادی کو تین ماہ بیت گئے تھے۔ اس کی سیانی ساس اب چپکے سے ایک آدھ نظر اس کی چال ڈھال پہ بھی ڈال لیتی۔ تبھی ایک دوپہر جب گاماں بھینس کو ونڈا کر رہی تھی۔ وہیں کھرلی کے پاس سینے پہ ہاتھ دھر کے الٹیاں کرنے لگی۔ اس کی ساس اللہ کا شکر ادا کرتی دائی کو لینے چل دی۔

شام کو جب غلام وزیر لوٹا تو اسے گاماں کی بجائے اماں نے روٹی دی۔ اس نے تھوڑی حیرت سے لکڑیوں کو چولہے میں جھونکتی بیوی کی پشت کو دیکھا۔ مگر جب اماں نے اسے دوپہر کا قصہ سنانا شروع کیا تو اس کی روٹی حلق میں ہی اٹک گئی۔ ماں سے شرماتے وہ بہت زیادہ خوشی کا اظہار نہ کر سکا اور بلاوجہ ہی کمرے میں جا کے لیٹ گیا۔

شام کے ملگجے سے اندھیرے میں گاماں اندر شکر کا مرتبان اٹھانے آئی تو اس نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

"کی اے' یوہتے نخرے نہ کر' جب سے لوٹا ہوں تیرا موہنہ (منہ) نئیں ویکھا۔" اس کی خوشی پہ ہلکی سی خفگی غالب آگئی۔ کب سے وہ اس کا انتظار کر رہا تھا؟

"وہ..... اماں مجھے اڈیک رہی ہے۔" شرم سے لال پیلی ہوتے اس نے بہانے سے جان چھڑانی چاہی۔

"اے گاماں' میرے پلے پہلے ہی ککھ نئیں بچیا تھا' یہ خوشی دے کے تو نے پوری طرح غلامی میں لے لیا۔" اس کے گال پہ ہاتھ پھیرتے وہ بڑی محبت سے بولا۔

"سن غلام وزیر..... مجھے تیری غلامی نئیں' وہ چوڑی چاہیے جس کا تو نے اس خبر پر دینے کا وعدہ کیا تھا۔" اس کے ذہن میں یکدم ہی جھماکا سا ہوا تھا۔ نہ ہی اسے قرب کی نرمی یاد رہی تھی نہ بولنے کا دھیان۔ وہ حیران رہ گیا۔ اس کے دماغ سے یہ بات بالکل نکل گئی تھی۔

"بنا دوں گا' میں ناں تھوڑی کہتا (کی) اے۔" گاماں کی یادداشت دل میں سراہتے وہ مسکرا کے بولا۔

"دم بھی تو بڑا ویلا ہے۔" اندھیرے میں اس کے

کندھے کو ٹٹولتے اس نے دھیمے پن سے کہا۔
"چل ہٹ پرے' ویلا ہووے گا تیرے کول' میرے کو نئیں' اماں بلا رہی اے۔" اسے زبردستی پرے دھکیلتے اس نے باہر دوڑ لگا دی۔
جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی تکرار بھی بڑھتی گئی۔ وہ کبھی اس پیار سے سمجھا دیتا اور کبھی چڑ جاتا۔
بالآخر اس نے ایک بار پھر وعدہ کر لیا "اگر بیٹا ہوا تو چوڑی بنا دوں گا۔"

☼ ☼ ☼

سبزی والے کی ہانک پہ وہ باہر آئی تھی کہ ٹھیلے کے پاس سامنے والے چوہدری جی کی بیوی بھی کھڑی حساب کتاب کر رہی تھی سونے سے پیلی زیور۔ گاماں کتنی دیر نظر جھپکا نہ پائی۔ انہی کی زمینوں پہ غلام وزیر مزارعہ تھا۔
چوہدری کی بیوی سبزی لے کر چلی گئی اور نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ سبزی خریدنا بھول کر اچھی طرح چادر اوڑھے کونے سے منہ چھپا کے ان کے گھر چلی آئی۔
کھلا سا سارا صحن خالی تھا۔ چونا رنگے برآمدے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں کھڑی رہی۔ اسے کون سا کوئی کام تھا؟ تبھی رسوئی (کچن) سے چودھرائن سرخ مرچوں کا ٹوکرا اٹھائے نکلی۔
"کون اے تو؟" اس نے تیکھے تیوروں سے استفسار کیا۔
"وہ.... وہ میں سامنڑے (سامنے) والے کار (گھر) ....." چودھرانی سے زیادہ اس کے زیورات کے رعب سے اس کی زبان ہکلا کے رہ گئی۔
"اچھا..... اچھا تو وزیرے کی تینوی (بیوی) ہے۔" انہوں نے اسے پہچان لیا تھا۔
"آ..... اور (ادھر) بیہ جا۔" اس نے ٹوکرا نیچے دھر دیا۔
"نن..... نئیں فیر کدی سہی' ہون تے میں ستو لین آئی تھی' اوہیں تھوڑے سے۔" اس نے گھبراہٹ میں بلاوجہ ہی ستو مانگ لیے۔
"دے دیتی ہوں پر بیہ تے جا۔"
اسے اچھا نئیں لگ رہا تھا کہ وہ پہلی دفعہ اس کے گھر سے لسی پانی پیے بغیر چل دے۔
"مہربانی چودھرانی جی' اماں زمینوں پہ روٹی دینے گئی اے اور کار کھلا ہے۔" اس نے شکل پہ بے چارگی سی طاری کر لی۔
"تو کھڑی ہو' میں ہونڑ لے آتی ہوں۔" وہ رسوئی میں سے تھوڑی دیر بعد لفافے میں ستو لے آئی۔
"اے پھڑ (پکڑ) تیرا جب جی کرے آو نجا کر' (آجایا کر)۔" چودھرانی نے اسے لفافہ پکڑاتے بڑی خوش دلی سے کہا۔
"جی ضرور۔" وہ صرف مسکرا کے رہ گئی۔
وہ پھرتی سے بیرونی تین چار سیڑھیاں اترتے ہی' یکدم کسی سے ٹکرا گئی۔ چادر کا کونا اس کے منہ سے سرک گیا تھا۔ اس نے غصے سے ٹکرانے والے کو دیکھا جو بگھی سے اترا تھا وہ چودھری تھا۔ سفید لٹھے کے کلف لگے کرتے کے ساتھ چار کونوں والی رنگین تہبند اور سر پر شملے والی پگڑی۔ کوئی اور ہوتا تو وہ شاید دو چار گالیاں دے کے ایک آدھ ہاتھ بھی جڑ دیتی۔ وہ کپکپاتے ہاتھوں سے چادر درست کرتی پرے سے ہو کر نکل گئی۔ چودھری کی نظر نے دروازے کے پار تک اس کا پیچھا کیا۔

☼ ☼ ☼

بس اسی روز سے گاماں کی بربادی کے دن گنے جانے لگے جب اس نے ساس سے چوری' شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم دھرا۔ بظاہر کچھ نہیں ہوا مگر بیتے وقت نے اپنے نشان' بہت بے ثباتی اور گہرائی سے چھوڑے۔
اس کی بوڑھی ساس نے بہت سی ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں۔ وہ اسے صرف اوپری اوپری کام دیتی۔ شوہر ہر پل اس کا دھیان رکھتا' خود وہ ہر نماز کے بعد بیٹے کی دعا مانگتی کیونکہ اس بیٹے سے اس کی ذاتی

خوشی بھی وابستہ تھی۔
دوسری طرف غلام وزیر گھر اور زمینوں کے چکر میں گھن چکر بنا اپنا وعدہ پھر سے بھول گیا تھا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا گاماں نے اس کی اوقات سے بڑھ کر مانگا تھا۔ اس نے سوچا اگر بیٹا ہو بھی گیا تو وہ پیار و محبت سے اسے منا لے گا۔ بھلا بیٹے سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ پھر اس کی اپنی بیوی سے محبت' کیا چوڑی کی اہمیت اس پیار اور رشتے سے بڑھ کر ہے۔ یہ تو صرف غلام وزیر کی سوچ تھی۔
گاماں کی دعائیں رنگ لائیں اور اس نے ایک خوب صورت سے صحت مند بیٹے کو جنم دیا۔ غلام وزیر نے نہال ہوتے اپنی حیثیت کے مطابق دھوم دھڑکا کیا لڈو کا ٹوکرا سارے رشتے داروں اور محلے میں تقسیم ہوا دس کلو دودھ کی کھیر پکا کر بانٹی گئی اور سات دن میں بچے کا عقیقہ بھی ہوا' کھسرے ناچے خود اس نے بھی جھوم ڈالا۔
گاماں کی ماں اسے ساتھ لینے آئی تو انہوں نے اسے بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس دور کے رواج کے مطابق گاماں کو تب تک اپنی ماں کے گھر رہنا تھا جب تک اس کا بیٹا اپنے پیروں پہ نہ چلنے لگتا۔ یہ رسم کے ساتھ ساتھ وقفے کی احتیاطی تدابیر بھی تھی۔
جبکہ اس کا بندوبست اس کی ساس نے گھر پر ہی کر لیا اس نے گاماں کی چارپائی اپنے ساتھ کمرے میں بچھالی۔
غلام وزیر اس صورت حال سے خاصا پریشان تھا ایک گاماں اس سے دور تھی اور ناراض بھی تھی۔ اس سے گریز کرتی اور رخ موڑے رکھتی۔
پانچ ماہ اسی طرح گزر گئے تب اسے چودھری کی سیالکوٹ والی زمینوں پہ فصل کی کٹائی کے لیے جانا پڑ گیا۔ وہاں اسے کم از کم دو تین ماہ لگ جانے تھے۔ چودھری چاہ رہا تھا کہ اس دفعہ فصل کی کٹائی تک وہ وہیں رکے۔ صبح تڑکے اسے نکل جانا تھا۔ وہ شام کا نکلا رات کو لوٹا تو گاماں آج اسی کے کمرے میں صوفے پہ بازو رکھ کے لیٹی اس کا انتظار کر رہی تھی۔
اسے خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ کیونکہ ابھی تک وہ اماں کے پاس ہی سوتی تھی۔
"جاگ رہی ہے۔" اس نے لالٹین کی روشنی بڑھاتے آہستگی سے پوچھا مبادا کہیں بیٹا نہ اٹھ جائے۔
"کوئی کم ہے تجھے۔" وہ کافی رکھائی سے بولی۔
"ہاں کم ہے تجھ سے' اٹھ کے بہہ' بلکہ اینج کر اور میرے کول آجا۔" وہ اپنی چارپائی پہ بیٹھ گیا تھا۔ وہ بادل ناخواستہ اس سے ذرا فاصلے پہ جا ٹکی۔
"میں سویرے ساجرے سیالکوٹ کے واسطے نکل جاؤں گا۔"
"پتا ہے مینوں (مجھے) میں نے تیرے لیٹروں (کپڑوں) کی گٹھری باندھ دی ہے۔" اس نے رخ پھیر جواب دیا۔
"میں دو' تیرا مینوں (مہینے) بعد پھیرا پاؤں گا' اپنا' اماں اور میرے پتر کا طیان (دھیان) رکھی۔" غلام وزیر بڑا فکر مند ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سب سن رہی تھی۔
"تو ناراض اے۔" اس نے اس کے گھٹنے پہ ہاتھ دھر کے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔
"چھڈ دی (چھوڑ دو بھی) میں بلا (بھلا) کیوں ناراض ہون لگی۔" اس نے اپنا چہرہ بھی چھڑا لیا اور اس کا ہاتھ بھی پرے کر دیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ناراضی کس بات پہ ہے وہ اسے مناتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔
"دیکھ گاماں' سونے کی چوڑی میری اوقات نئیں' فیر وی شکر ہے کہ ویلا ٹپ (گزر) را (رہا) ہے۔ میں نے تیرے واسطے تھوڑے پیسے جوڑے تھے پر کاکے پہ لگ گئے' اب پتر کے چاہ سے ود (بڑھ) کے ہور کوئی شے تے نئیں ہو سکتی نا۔" اس نے ہر ممکن صورت حال اسے سمجھائی۔
وہ ابھی بھی خاموش رہی تو وہ بے بس سا ہو گیا۔
"چل ٹھیک ہے' میں واڈیاں (کٹائی) کر کے سیالکوٹ سے ہو آوں تے فیر تیرا حساب چکتا کر دوں گا' اب ہونڑ مہلت تو دے' بس آخری واری۔" اس نے ایک بار پھر اسے امید بندھائی۔

"مجھے فیر سے لارا نہ دے' میں چنگی طریو (طرح) پہچان گئی آں اے تجھے' بس تو دور رہ میری کول۔" اس نے کافی سختی سے اسے ٹوک دیا۔

"گاماں میں جا رہا ہوں' تن مہینے بعد مڑوں گا۔" اس نے بے چارگی سے اپنی حالت بتائی۔

"تے جاوی' میں نے کون سا تجھے ڈکا لگانا ہے (روکنا ہے)۔" اس نے بے پروائی کی حد کر دی تھی۔

"ایسے تجھ سے روس کے۔"

"مجھے نیندر آ رہی ہے۔" بے اعتنائی سے کہتی وہ اس کے پاس سے ہی اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

غلام وزیر کے جانے کے چند دن بعد ہی اس کی ماں کو بخار آنے لگا۔ محلے کی عورت کے ساتھ وہ حکیم کے پاس بھی گئی مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ رات تک وہ بھٹی کی طرح تپ رہی ہوتی اور صبح ٹھنڈی ٹھار ہو جاتی' بدن تھکن سے چور اور درد سے بھرا رہتا۔ گاماں نے عورتوں کے مشورے سے بڑے دیسی ٹوٹکے بھی آزمائے۔ اس نے ماں سے کہا بھی کہ غلام وزیر کو کسی کے ہاتھ چٹھی بھجوا دیتے ہیں مگر وہ نہ مانی۔

"پردیسی پتر کو کیا دکھڑا (دکھ) دینا' ابھی بوہت ویلا ہے میرے کول۔"

ساس کے بیمار رہنے سے گاماں کو بہت دشواری ہو رہی تھی۔ وہ جب سے بیاہی آئی تھی۔ کبھی باہر نہیں گئی تھی۔ اب چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اسے گلی میں کھیلتے بچوں کو آوازیں دینا پڑتیں۔ ورنہ باہر کے سارے کام اس کی ساس سرانجام دے لیتی تھی۔ اس مجبوری کے وقت میں اس کی ساس نے اسے اجازت دے دی کہ وہ نکڑ والی دوکان سے سبزی وغیرہ لے سکتی ہے۔ وہ ساس کو نہلا دھلا کر اس کے بالوں کی چٹیا بنا کے اس کا پلنگ چھاؤں میں گھسیٹ کے اسے دوا پلا رہی تھی کہ ایک چھوٹا سا بچہ چلا آیا۔

"چاچی سامنڑے والے چودھری جی کا سدا (بلاوا) ہے' غلامے نے پیسے بھیجے ہیں' وہ لے جا۔"

اس پیغام پہ اثبات میں سر ہلاتی ساس سے پوچھ کر وہ چودھری کی طرف آ گئی غلام وزیر نے پہلی تنخواہ بھیجی تھی۔ جو وہ خرچا دے کے گیا تھا وہ بھی اب تھوڑا سا بچ گیا تھا۔ وہ دوسری بار اس گھر میں آئی تھی اور آج بھی سارے میں ہو کا عالم تھا۔ کوئی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ چادر سے آدھا منہ چھپائے وہ جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اندر سے چودھری نکل آیا۔ اسی شان سے' جیسی پہلی ملاقات میں تھی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار ہی چادر کو مزید درست کرنے لگا۔

"ہوں' تے تو غلامے کی ننیوی ہے۔" اس نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔

"آ..... آہو جی۔"

"تو تیری ساس آئی ہوتی۔" اس نے نظریں چرا کے کہا۔

"جی وہ بیمار ہے..... ہور کوئی کار میں ہے نہیں۔" اس کا سانس خشک ہو رہا تھا۔

"یہ غلاما بھی بڑا ہی لاپروا ہے' بیمار بڈھی ماں' نکا سا کاکا اور تو خوبصورت' جوان جہان کلی۔"

"جی۔" گاماں نے بہت بے یقینی سے اس کی گفتگو سنی اور اسے دیکھا۔

"او کہا تھا میں نے اسے کہ نہ جا' پر نئیں' کہنڑ لگا (کہنے) لوڑ (ضرورت) ہے میںوں روپوں کی۔" وہ رعب دار لہجے میں بولتا جا رہا تھا۔ گاماں کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ اتنا غصہ کیوں ہو رہا ہے۔

"تجھے ڈر ور تے نئیں لگتا۔" اس نے اپنے دامن کی قمیص جھٹکتے لاپروا سا ہو کر کہا۔

"نئیں جی۔" وہ منمنائی۔

"ہاں میرے ہوندے (ہوتے) ڈرنے کی لوڑ وی نئیں اور کسی شے کی لوڑ ہے تے دس بتا۔" وہ دو چار قدم آگے بڑھا۔

"سب شکر ہے جی' چودھرانی جی کتھے (کہاں) ہیں۔" اس نے گھبراتے ہوئے پیچھے دیکھ کر پوچھا۔

"وہ پیکے (میکے) گئی اے' میں کلاں ہوں۔"

"ج..... جی۔" اب گاماں کی ڈر سے جان ہی نکل گئی چودھری گھر پر اکیلا تھا وہ کب سے اس کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ اگر کوئی آ جاتا تو۔

"بچہ کہہ رہا تھا کہ غلام وزیر نے رقم بھیجی ہے۔" وہ جلدی سے مطلب پہ آ گئی۔

"آہو..... آہو..... لے پھڑ۔" اس نے دھوتی کی جیب سے باندھے پیسے کھول کے گن کر اس کی طرف بڑھائے۔

اس نے پیسوں کے لیے ہاتھ آگے کیا تو چودھری نے پیسوں کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چ..... چ..... چودھری جی' م..... میرا ہاتھ چھوڑو۔" چودھری کی اس حرکت پہ اس کی آواز حلق میں ہی پھنس کے رہ گئی وہ بڑی ہمت مجتمع کر کے بولی۔

"میں تے تیری سونی وینڈی دیکھ رہا ہوں' ونگا نئیں اے تیرے کول۔" ہاتھ چھوڑنے کی بجائے وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

گاماں ساری شرم و حیا بھول کر اسے ٹکر ٹکر تکنے لگی۔ جیسے اس کی خالی کلائیوں کی فکر ہوئی تھی۔ اب اسے اپنا ہاتھ چھڑانا بھی یاد نہیں رہا تھا۔

"وہ غلام وزیر اک چوڑی لا دے گا۔" اس نے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے کہا۔

"ہوں' لا دے گا۔" اس نے نفی میں ہنکارا بھرتے سر ہلایا۔

"ڈوڑھ (ڈیڑھ) سال میں تو لا نئیں سکا' تیری یہ خالی وینڈی دل میں کھب سی گئی اے' میں لے دوں اک چوڑی' آخر غلام وزیر مارا مزارعہ ہے' فیر اس کے ویاہ پہ' نہ ہی کاکے واری کوئی توفہ (تحفہ) ہی نئیں دیا تھا۔" ہاتھ چھوڑ کر آنکھوں میں جھانکتے اس نے پیشکش کی۔

"تو سی جی۔" گاماں کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

وہ بالکل بھول گئی تھی کہ چودھرائن گھر پہ نہیں اور وہ ایک غیر مرد کے ہمراہ اکیلی ہے۔

"آہو' اسی جی' کوئی تراض (اعتراض) اے۔" وہ ڈش نما تے مسکراتے ذرا سا جھکا۔

"نئیں پر..... غلام وزیر سے پوچھ....."

"چھڈ وی غلامے کو' اسے میں کہہ دوں گا' بولتا نئیں میرے اگے' تو..... ایوے کر کل آ جائی' اپنڑا توفہ لینے۔" اس کی بات کاٹ کر وہ تیزی سے بولا۔

"اچھا ٹھیک اے' ہون فیر رب راکھا۔" وہ پیسے پکڑ کر شادمان سی واپس لوٹ آئی۔

☼ ☼ ☼

غلام وزیر نے ہی چودھری کو بتایا تھا کہ میری بیوی کو سونے کی چوڑی کی بڑی چاہ ہے۔ جب سے وہ بیاہ کر آئی ہے اس کی یہی رٹ ہے۔ عیاش چودھری جو اس کی کم عمر' خوب صورت بیوی کی ایک جھلک دیکھ چکا تھا اس کی رال گاماں پہ ٹپکنے لگی۔ وہ سیالکوٹ میں تھا۔ خود اس کی بیوی میکے گئی ہوئی تھی۔ اس کا رستہ صاف تھا اگر گاماں مان جاتی تو' اسی لیے اس نے پیسوں کا بہانہ کر کے اسے اس وقت بلوایا جب وہ اکیلا گھر پر تھا۔ سونے کی چوڑی اس عورت کی کمزوری تھی اسی لیے اس نے بات بھی وہیں سے شروع کی۔ گاماں نے مزید اس کی حوصلہ افزائی کی یہ جانتے ہوئے بھی کہ چودھرائن گھر پر نہیں ہے وہ کافی دیر اس سے باتیں کرتی رہی تھی اور پھر کل آنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔

اصولاً اسے اپنی ساس سے اس ساری گفتگو کا تذکرہ کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ چودھری نے کہا تھا کہ وہ اسے شادی کا تحفہ دے گا۔ مگر وہ اپنی ساس سے سب چھپا گئی تھی۔ شاید اس کے دل میں چور تھا۔ اگلے روز کاموں سے فارغ ہو کر' کاکے کو دودھ پلا کے وہ نہائی۔ اپنی بری کا خوب صورت سا جوڑا پہنا اور بیمار ساس کو بہانہ گھڑ دیا۔

"اماں میں پچھلی گلی میں سولاں ولی جاری آں' کہندی سی اک دوائی ہے جسے کھانڑے سے تیری ساس بھلی چنگی ہو جاوے گی' کاکے کو سلا دیا ہے' ویلا ہویا تے فکر نہ کری۔" نیم غنودگی میں اس کی ساس نے ذرا سی آنکھیں وا کر کے اسے دیکھا اور نا سمجھی سے ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

یہ آخری دفعہ وہ دن کی روشنی میں چودھری کے گھر گئی۔ اس کے بعد وہ رات کے اندھیرے کا سہارا لینے لگی۔ جب تک چودھرائن نہیں لوٹی وہ گھر جاتی پھر اس کے ڈیرے تک جانے لگی۔ یہ سب کرتے اسے ایک بار بھی غلام وزیر کا خیال نہ آیا۔

"حلال سے زیادہ سواد حرام میں ہوتا ہے۔"

اسے بھی حرام لگ گیا تھا۔ بڈھی ساس کو دھوکا دینا مشکل نہیں تھا۔ غلام وزیر کی یاد کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس نے گاؤں کے آدمی کے ہاتھ چٹھی بھیجی۔ جسے اس نے انگیٹھی پہ دھر دیا۔ اسے منشی سے پڑھوانے کی نوبت چار روز بعد آئی۔ صرف ایک چوڑی کے لیے اس نے عزت کی بولی لگادی تھی۔ اس پر اسے ذرا برابر بھی افسوس نہیں تھا۔ چوہدری نے اپنا وعدہ پورا کردیا تھا۔ مگر اس نے پھر چوڑی اس کے پاس ہی بطور امانت رکھوادی کہ کہیں کوئی چوراچکا نہ آجائے۔

غلام وزیر کی خودداری سے وہ اچھی طرح آگاہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے چودھری سے چوڑی نہیں لینے دے گا' پھر چھپا کے رکھنے کا فائدہ جب وہ اسے کلائی میں ڈال کے اپنا شوق نہ پورا کر سکے۔ اس نے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے جو راہ چنی وہ درست تھی۔

اس کی اس بے حیائی اور لاپروائی کا انجام دو مہینے بعد ہی نکل آیا۔ جب گاؤں کی دائی نے اسے دوسری بار ماں بننے کی خبر دی۔ اس کی بے خبر ساس نے اس کا نہال ہوتے صدقہ دیا۔ جبکہ گاماں کو لگا اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہے نہ ہی سر پر آسمان سلامت رہا ہے۔ کتنی ہی دیر وہ سکتے کی کیفیت میں جکڑی رہی۔ جبکہ چودھری یہ سنتے ہی اپنی اصلیت پہ اتر آیا۔

"نہ گاماں نہ' تو کسی ہور کا گناہ میرے سر پہ نہ تھوپ' تیرے جیسی عورتیں جانے کدر کدر منہ کالا کرتی ہیں' بوجھ سارے میرے پہ۔" وہ بڑی کراہیت سے بولا۔

"تو اچھی طرح جانے ہے کہ یہ بچہ تیرا ہی ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"تو ہر رات میرے کول نئیں آتی' جس رات نئیں آتی پہلے اس کا حساب دے — میں منوں گا تیری گل۔"

"دانج نہ کر چودھری' میں نے کبھی تجھ سے کچ نئیں منگا۔" وہ رونے لگی۔

"لے منگا کیوں نئیں' ہونڑ یے دس داواں (ابھی بتاتا ہوں)۔" وہ اندر رکھی صندوقچی سے چوڑی نکال لایا۔

"لے پھڑ' اے ہو تیری اوقات اے' اس سے بوہتی نئیں' ہونڑ فیر کدی ادر کا رخ کیا تو بوٹیاں کر کے گلی کے کتوں کو ڈال دوں گا' کہیں منہ دکھانے جوگی نہیں رہے گی۔" وہ روتی ہوئی پلٹ آئی۔ گناہ کی بازی الٹ گئی تھی۔ اس کے حصے میں پچھتاوا' بدنامی اور ایک سونے کی چوڑی آئی تھی۔

اس ڈھلتی دوپہر میں غلام وزیر لوٹ آیا۔ کتنی ہی دیر ماں کے پیروں میں بیٹھا سوگوار سا رہا۔ گاماں کو اس نے بڑی حسرت اور محبت سے تکا' بیٹے کا منہ کئی بار چوما۔ اسے دکھ تھا کہ وہ پہلی دفعہ گھر بار چھوڑ کے پردیس گیا پیچھے اس کی ماں بیمار پڑ گئی۔ وہ اب تک کبھی ایک دن بھی ماں سے دور نہیں رہا تھا۔

روٹی پانی کھائی کے جب وہ گڑ والی چائے کا پیالہ سڑک سڑک کے پی رہا تھا۔ اس کی ماں نے آہستہ آہستہ اپنے تئیں اسے دوسری بار باپ بننے کی خوشخبری دی۔ اس کے ہاتھ کپکپائے اور چائے کناروں سے باہر چھلک گئی۔

"نئیں ماں....." وہ کافی دقت سے اتنا ہی کہہ پایا۔

"لے پادیں اپنی جور (بیوی) سے پوچھ لے۔" اس نے گاماں کا حوالہ دیا۔

گاماں سے تو اس نے پوچھنا ہی تھا۔ یہ بچہ اس کا نہیں تھا۔ یہ وہ جانتا تھا تو پھر کس کا تھا۔ اس کا جواب صرف وہی دے سکتی تھی۔

غلام وزیر نے بھی رات کے اندھیرے میں اس کی سونی وٹنری مروڑ کر بچے کے باپ کا نام و پتہ پوچھا تھا۔ وہ بھلا کیسے مکر سکتی تھی۔

غلام وزیر حقیقتاً سیدھا سادا دیہاتی اور غیرت مند ہی نہیں ایک شریف النفس انسان بھی تھا۔ جس نے کھیتوں کی بھی کبھی زہریلی سنڈی کو نہیں مارا تھا بلکہ اسے اٹھا کر فصل سے باہر پھینک دیتا۔ گاماں تو پھر اک جیتی جاگتی انسان تھی' جس کی کوکھ میں ایک نئی جان بھی تھی۔ اس نے اپنی ابلتی غیرت کا جوش ٹھنڈا کر کے اس زہریلی سنڈی کو اپنی زندگی سے اٹھا کر باہر پھینکنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس عزت دار شخص نے اس عورت کو جو اس کی بیوی' عزت تھی' اس کی غیرت اور عزت کے چیتھڑے کر چکی تھی اس کی التجا پر اس بچے کے جنم تک اپنے گھر میں رہنے کی مہلت دے دی۔ اس نے چوہدری کی زمینوں پہ کام چھوڑ دیا۔ اور نمبردار کے پاس اس کا چھوٹا موٹا حساب کتاب کرنے لگا۔ اس نے گاماں کی طرف دیکھنا تک چھوڑ دیا تھا۔ گھر ہوتا تو اس کی ساری توجہ ماں اور اپنے بیٹے پہ ہوتی۔ وہ زیادہ تر اپنے بیٹے کے ساتھ لگا رہتا۔ وہ آنے والے حالات کا بطور تجزیہ کر کے بیٹے کو اپنا عادی بنا رہا تھا۔ تاکہ بعد میں اسے کوئی دشواری نہ پیش آئے۔

اس کی ماں کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ دیسی ٹوٹکوں اور حکیم کے دوا دارو سے مایوس ہو کر وہ ماں کو شہر ڈسپنسری بھی لے گیا۔ مگر اس کی بوڑھی ہڈیاں چارپائی سے اٹھ نہ سکیں اور اس کی چارپائی ہی اٹھ گئی۔ ماں کیا رخصت ہوئی' غلام وزیر اپنی ذات میں اکیلا رہ گیا' کملا ہوا سا پھرتا جیسے کوئی انمول شے کھو گئی ہو اور اس کی تلاش میں بھٹک رہا ہو۔

☼ ☼ ☼

"توسوئی نئیں حلے (ابھی) تک۔"

وہ کچی رسوئی سے ٹیک لگائے بے جان سی بیٹھی تھی کہ غلام وزیر بھی وہیں آگیا۔

"جب آنکھوں سے نیندر روس جائے نا غلام وزیر فیر لکھ منت چڑھاؤ' مرادیں منگو یہ نمانی مڑ پھیرا نئیں پاتی۔" اس نے رسوئی کی دیوار کے ساتھ سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ چند لمحے کھڑا اسے خاموشی سے دیکھتا پھر لمبا سا سانس بھرتا چوکڑی مار کے خود بھی نیچے بیٹھ گیا۔ گاماں نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ آج وہ کتنے عرصہ بعد اس کے قریب یوں بیٹھا تھا۔ وہ صحن میں لگے نیم کے درخت کو خالی خالی نگاہوں سے تکنے لگی۔

شاید وہ دونوں کچھ کہنا چاہتے تھے مگر ہر لفظ' جملہ بہت بے معنی سا تھا۔

"میرے پیار میں کوئی بوہت وڈی تھوڑ تو نئیں تھی۔" اس نے گاماں کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"تھوڑ تجھ میں نئیں غلام وزیر' اس جند (دل) نمانی میں تھی کچی عمر کے چاہ بڑے ڈاڈے (سخت) ہوتے ہیں' ان کا پورا ہونا وی چنگا اور نہ پورا ہونا وی چنگا نئیں ہوندا۔" اس کے تھکے ہوئے لہجے میں کرب کی نمی گھل رہی تھی۔

"برے کچی عمراں کے چاہ نئیں' اس چاہ کے کرنے والے ہوتے ہیں۔" اس نے نگاہیں چراتے کہا۔

"اب تو نے کیا سوچا ہے؟" اس نے جھجکتے ہوئے سوکھے لبوں پر زبان پھیری۔

"تیرے میرے وچ (بیچ) جو دیوار کھڑی ہو گئی ہے' وہ ہم چاہ کے وی ڈھے نئیں سکتے' عورت..... عورت اپنے مرد کے لیے بڑی جھلی ہوتی ہے یا فیر مجبور' اس کی وڈی سے وڈی غلطی پر وی صبر کا گھوٹ (گھونٹ) پی جاتی ہے' پر ہم خصم بڑے خنزیر ہوتے ہیں زنانی کا ذرا جیا (سا) وی معاف نئیں کردے' تو نے تو گناہ کیا ہے گناہ....."

"ایک واری انزاجی صاف کر کے....."

"اوہ نا گاماں۔" اس نے بے بسی ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

"گل او کر جو میرے وس میں ہو' پر تو نے تو ہمیشہ میرے حوصلوں سے بوہتا منگا اے' اتنی ڈاڈی (سخت) ہمت نئیں مجھ میں۔" اس نے نفی میں سر پھیرتے صاف انکار کر دیا۔

"گل ہمت کی نئیں غلام وزیر تیری مردانگی کی ہے۔" وہ ابھی بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ جانے اسے کیوں خوش فہمی ہو رہی تھی۔

"اوہ نئیں ہے میرے وچ مردانگی نہ غیرت' بے غیرت بنا دیا ہے تو نے مجھے' اوہ جو مرد ہوتے ہیں ان کی رنے (بیویاں) دوجے مردوں کے ساتھ منہ کالا نئیں کرتیں۔"

وہ بہت غصے سے تیز بولا تھا۔ اسے گاماں کا یہ جملہ طعنہ لگا تھا۔ اس نے اب تک اس سے سختی سے اس متعلق استفسار نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ ایک تھپڑ تک بھی نہیں مارا تھا۔ اب وہ اس کی نرمی اور برداشت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا سوچ رہی تھی۔

"قصور تیرا وی نئیں' تو نے ہمیشہ میری اوقات سے بوہتا منگا ہے' رب بھی انہرے بندے پہ بوجھ اس کی طاقت جتنا ڈالتا ہے۔" دیر تک وہ اپنی سوچوں میں مقید سر جھکائے رہے۔ دونوں کی سوچ میں ایک نقطہ مشترکہ تھا وہ تھا مستقبل کی فکر' ہونی کا ڈر جو ہو کر ہی رہنی تھی۔

"میں اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ تیرے اس بوجھ کو ونڈ (بانٹ) لوں۔" کافی توقف کے بعد اس کی آواز اندھیرے میں ابھری۔

"کی مطلب اے۔" وہ نا سمجھ تھی۔

"ویلا آئے گا تو دس دوں گا' فیر جینوے تیری مرضی کر لیں گے' چل اٹھ جا رات گوڑی (گہری) ہے۔" جانے کون سا حساب کتاب کر کے اس نے ارادہ باندھ لیا تھا۔

"تو جا' میں پہلی بانگ (اذان) پہ اٹھ جاؤں گی۔" اس نے دوبارہ رسوئی سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

ٹھیک پندرہ دن بعد گاماں نے ایک بچی کو جنم دیا اور کتنی ہی دیر اس بد نصیب کو سینے سے بھینچے روتی رہی اس بد نصیب گناہ گار کو جو ابھی صرف چند منٹ کی تھی۔ غلام وزیر کیا کہتا خاموش کھڑا رہا۔

جس دن گاماں نے چھلہ نہایا اس رات وہ اس کے پاس آیا۔ ملگجے سے کپڑے' جو اس نے تین دیہاڑے (دن) پہلے کے چڑھا رکھے تھے اور اس کی پائنتی کے پاس سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔

"میں جا رہا ہوں۔" بہت آہستگی سے اس نے انکشاف کیا۔

"پر کدر (کدھر)۔" وہ اٹھ بیٹھی۔

"یہ تو پتہ نئیں' پر تیری جند (زندگی) سے بوہت دور۔" وہ سچ کہہ رہا تھا۔

"غلام وزیر اک واری فیر سوچ لے۔" اس نے گھبرائے ہوئے التجا کی۔

"جو خود تو نے نئیں کیا' اس کا سبق مجھے بھی نہ پڑا (پڑھا)۔"

"مم..... میں لوگوں کو کی منہ دکھاؤں گی۔" اسے اندیشوں نے گھیرا۔

"اس واسطے تو اندھیرے میں سب چھڈ (چھوڑ) رہا ہوں۔" اس کے پیروں میں کپڑوں کی گٹھڑی تھی۔

"بار ٹانگہ کھڑا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ گٹھڑی اٹھا کر رکنے چلا گیا۔

وہ چارپائی سے اٹھ گئی۔ وہ رو رہی تھی اس کا سارا جسم کپکپا رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے وہ اسے جانے سے روک لے۔

وہ واپس آیا تو اسے یوں کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر نظریں چرا کے قریب سے گزرتا کمرے کے کونے میں رکھے صندوق کو کھولنے لگا۔ سرخ رنگ کے کپڑے میں لپٹی کوئی چیز اس نے نکال کر صندوق بند کر دیا۔ اپنی چارپائی پہ سوئے پتر کو اٹھا کر کندھے پہ ڈال لیا۔

"میں نے تجھے اس کار سے جانڑے کو کہا' پر فیر مجھوں مت (عقل) آئی کہ جانڑا توں نئیں میں وے' جے (اگر) توں گئی تے لوک تھو تھو کراں گے۔"

"پر غلام و....."

"جاندوں (جانے والے) کا رو ڈکا (روکا) نئیں تے فیر میں تیرا لے کے کی جاریا واں۔" (پھر میں تیرا لے کے کیا جارہا ہوں۔)"

"اے لے اک ترا قرض سہی میرے تے' انوں (اسے) چکانے میں دیر ہوئی' معاف کر دی۔" اس نے سرخ کپڑا اس کے کانپتے لرزتے ہاتھوں میں دے دیا اور اس کی چارپائی پہ سوئی بچی کو ایک ہاتھ اور بازو سے احتیاط سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"اے کی.....؟" (یہ کیا) اس نے بوکھلا کر بچی کو اس کے سینے سے لگا دیکھا۔

"غلام وزیر نے صرف انہڑی عزت نئیں وچانی' تیری وی رکھنی ہے' اس جاہل تے غریب کول یہی اکوں راہ ہے' رب راکھا۔"

وہ باہر بڑھ رہا تھا وہ اسے آواز دے کر روکنا چاہتی تھی مگر ایسا نہ کر پائی' دروازے کی چوکھٹ تھامے گھسٹتی ہوئی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ روتے ہوئے اس نے سرخ رومال کی گرہ کھولی جس میں موجود چیز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"نئیں..... نئیں غلام وزیر نئیں۔" وہ دروازے سے سر ٹیکے چیخ چیخ کر کرب اور شدت سے رو رہی تھی۔

سرخ رومال سے نکلی سونے کی چوڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور لڑھک گئی۔

☼ ☼

ضوباریہ ساحر

اسیرِ موسمِ صحراں

مکمل ناول

بھاگتے ہوئے قدم یک دم رک گئے' اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا' سیاہ گھور تاریکی کا عفریت چاروں اور اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھا۔ لیکن اسے اس اندھیرے میں سفر کرتے کچھ دیر ہو چکی تھی۔ اس لیے یہ اندھیرا' یہ تاریکی اس کی نگاہوں کے لیے نامانوس ہرگز نہیں تھی۔

پھولی ہوئی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پاؤں آگے بڑھا دیے۔ حلق خشک لکڑی کی مانند کھنچ رہا تھا۔ ہر بن موسے پسینہ کسی سیل آب کی مانند رواں تھا۔ اس کے پرانے بوسیدہ لباس کو پسینہ تر کر چکا تھا۔ لیکن وہ بھاگ رہی تھی۔ اسے بھاگنا تھا' جانے کون سی منزل اس کی منتظر تھی؟ کہاں اس کا پڑاؤ ہونا تھا؟ کون سی جگہ ایسی تھی جہاں پہنچ کر اس کی سانس نے دم توڑنا تھا؟ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ جو وہ چھوڑ آئی تھی نہیں سوچنا چاہتی تھی' لیکن بار بار سوچیں اس کے ذہن میں کیکٹس کے خار بن کر اتر جاتی تھیں۔

وہ نڈھال تھی' پیاس سے بے حال تھی۔ لیکن پھر بھی جس قدر جلدی ہو سکتا تھا وہ یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہتی تھی۔ جہاں اس کے ماضی کا اندھیرا اس کا تعاقب نہ کر سکے۔ وہ سڑک سے ابھی قدرے فاصلے پر تھی۔ جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ لے کر بھاگ رہی تھی کہ یک دم کہیں دور روشنی کی ایک باریک سی لکیر نے اس کی اندھیرا شناس آنکھوں کو جھنجوڑ دیا۔ وہ سہم گئی۔
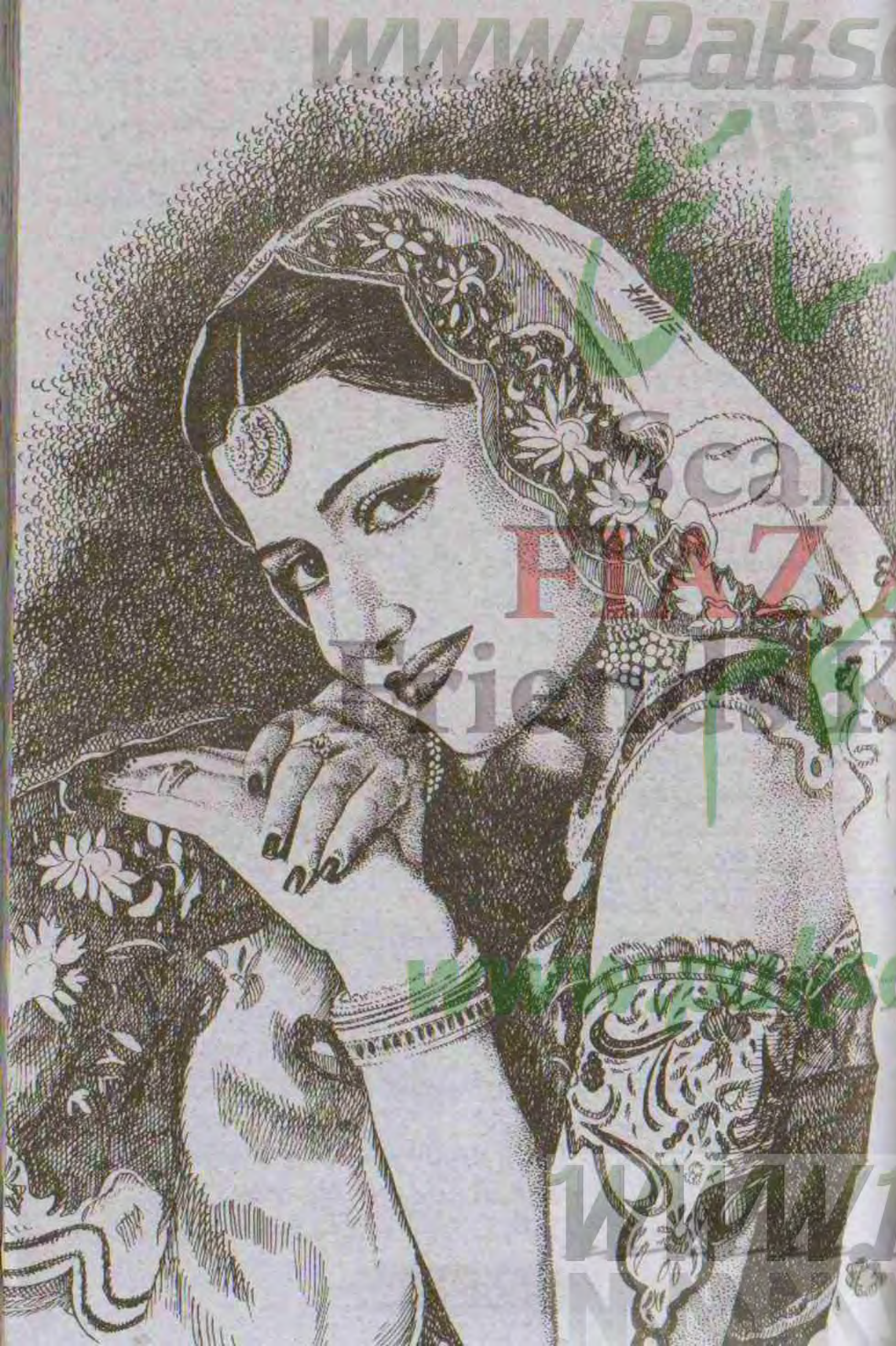
انسان نما درندوں کے چنگل سے نکلنے کی خاطر اس نے مسافت کا راستہ چنا تھا' لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دنیا میں قدم قدم پر اسے ایسے ہی انسانوں سے واسطہ پڑے گا۔ وہ سڑک کے کنارے نئی تعمیر شدہ دیوار کے ساتھ رکھے اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئی۔ اس کی رگ رگ میں خون کی جگہ خوف دوڑ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن یوں تھی جیسے اس کی رفتار کا کوئی تعین ہی نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا ابھی دل سینے کی ہڈی توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہلکی ہلکی روشنی اب قدرے تیز ہو گئی تھی' ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی ابھرتی معدوم ہوتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنا آپ مزید سمیٹ لیا۔ تیز ہوتے تنفس کو قابو میں کرنے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر سختی سے دبایا۔ اور سر کو قدرے اونچا کر کے آہٹوں کی سمت دیکھا۔

وہ کوئی چوکیدار تھا جو سامنے سے آ رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد جب قدموں کی چاپ بالکل مدھم پڑ گئی تو اس نے ایک بار پھر اینٹوں کے ڈھیر کے عقب سے جھانکا۔ تاریکی میں چوکیدار کا بس ہیولا سا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ڈھیر کے پیچھے سے نکلی اور ایک بار پھر اندھادھند بھاگنے لگی۔

وہ جلد سے جلد کسی محفوظ پناہ گاہ پر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ سڑک کے کنارے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر اس نے سڑک پار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اچانک اسی اثنا میں ایک تیز رفتار گاڑی اس کے بے حد قریب پہنچ گئی۔ اس کی خوف زدہ آنکھیں جیسے ساکت

ہو گئی تھیں۔ اسے اتنا ہی محسوس ہوا تھا جیسے گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے۔ اور پھر جیسے اس کے وجود کو ایک زوردار دھکا لگا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ باہر کی پھیلی ہوئی تاریکی اور سناٹے اس کے وجود کے اندر اتر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج خلافِ معمول انہیں کلینک سے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اور دیر کا موجب وہ ایمرجنسی کیس تھا جو شام سات بجے ان کے کلینک پر لایا گیا تھا۔ ایک چھ سالہ بچے کو ایک تیز رفتار بس نے کچل دیا تھا۔ بچہ بالکل جاں بلب تھا' جب ان کے پاس لایا گیا' انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح اس معصوم کو بچالیں' لیکن شاید مشیت ایزدی نے اس کی زندگی کی اتنی ہی بہاریں لکھی تھیں۔ اس بچے نے ڈاکٹر فواد کے ہاتھوں میں ہی دم توڑا تھا۔ اور اس وقت سے اب تک جبکہ رات کے گیارہ بجے کا عمل ہو گا۔ ان کی طبیعت کا بوجھل پن دور نہیں ہو پایا تھا۔ مسلسل ڈھائی گھنٹوں کی محنت ضائع ہو گئی تھی۔ ذہن پر جیسے اداسی کی کہر سی جم گئی تھی۔ سوچوں پر جمود طاری تھا۔ نگاہوں کے سامنے جیسے ایک ہی منظر ٹھہر سا گیا تھا۔ نادانستگی میں ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ سوچوں میں گم ہونے کے باعث انہیں روڈ کراس کرتا ہوا وہ نسوانی وجود نظر نہیں آیا تھا۔

وہ چونکے تب تھے جب وہ عین ان کی گاڑی کے سامنے آگئی۔ عجلت میں بریک پر پاؤں رکھنے کے باعث گاڑی کے ٹائر بری طرح چرچرائے تھے۔ لیکن دیر ہو چکی تھی۔ وہ وجود ان کی گاڑی کی زد میں آچکا تھا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر نکلے ہلکے سرمئی رنگ کے پلین کاٹن کے سوٹ میں ملبوس وہ اس سیاہ تاریک رات کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی۔ وہ سڑک پر اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ ریشمی سیاہ بالوں نے اس کے چہرے کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ جو غالباً" سڑک پر گرنے کے باعث لگنے والی چوٹ کی وجہ سے تھا۔ بظاہر پورے وجود پر کوئی زیادہ نمایاں چوٹ یا زخم نظر نہیں آرہا تھا' ممکن ہے وہ خوف و دہشت کی زیادتی سے بے ہوش ہو گئی ہو۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اچانک کوئی غیر متوقع حادثہ ہمارے حواس سلب کرلیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی شاید یہ ہی ہوا ہو گا۔ ڈاکٹر فواد نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا وجود احاطۂ بصارت میں نہیں آیا تھا۔

"تو کیا یہ لڑکی اتنی رات گئے اکیلی ہی کہیں سے آرہی تھی۔ کیا مسئلہ ہو گا اس کے ساتھ۔" انہوں نے اس کی پیشانی سے بھل بھل بہتے خون کو دیکھا۔ ایک ہاتھ سے اس کی پیشانی کے زخم کو زور سے دباتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا' ہر گزرتا لمحہ اس اجنبی لڑکی کو زندگی کی رنگینیوں سے دور لے جا رہا تھا۔ انہوں نے پریشانی سے اس لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر جیسے یک دم ہی فیصلہ ہو گیا۔ انہوں نے اسے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ اور خود تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

تیزی سے گاڑی دوڑاتے' وہ پانچ' چھ منٹ میں ہی پندرہ منٹ کا راستہ طے کرکے گھر پہنچ گئے تھے۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور وہ گاڑی اندر لے گئے۔ گاڑی کو پورچ میں کھڑا کرکے باہر نکلے۔ وسیع و عریض کوٹھی کے بے شمار کمروں کی لائٹیں آف ہو چکی تھیں۔ لیکن ایک کمرہ جو کوٹھی کے بالکل کونے پر تھا۔ اس کے باہر جلنے والی لائٹ دیکھ کر ڈاکٹر فواد نے طمانیت بھرا سانس لیا۔ بیک ڈور کھول کر انہوں نے اس زخمی لڑکی کو باہر نکالا اور کندھے پر ڈال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر انہوں نے اندر جھانکا۔ پھوپھو شہنا حسبِ معمول تخت پوش پر بیٹھی ہاتھ میں تسبیح لیے اپنا ورد دہرا رہی تھیں۔ ان کی خوب صورت آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر نرمی اور روشنی کا جو ملا جلا تاثر تھا ان کی شخصیت کو ایک عجیب سا تقدس بخشتا تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں ان کا صبیح چہرہ اپنے اندر جیسے پوری کائنات کا حسن سمیٹے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر فواد نے آگے بڑھ کر دھیرے سے ان کو پکارا۔

"پھوپھو شہنا۔" انہوں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا' آنکھوں میں تعجب کی پرچھائیں سی لہرائی۔

"فہدی تم اس وقت اور۔۔۔ اور۔۔۔ یہ۔" ان کا جملہ ڈاکٹر فواد کے کندھے پر جھولتی بے ہوش لڑکی کو دیکھ کر ادھورا رہ گیا۔ ڈاکٹر فواد نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کو بیڈ پر لٹایا۔

"میری گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے' نہ جانے کون ہے' کہاں سے آرہی تھی' کہاں جانا تھا۔ کچھ علم نہیں' جب سے ایکسیڈنٹ ہوا ہے بے ہوش ہے۔ پھوپھو ذرا اسے دیکھیے گا' میں اپنا فرسٹ ایڈ باکس لے آؤں۔" ڈاکٹر فواد کمرے سے نکل گئے۔ پھوپھو شہنا نے جائے نماز کا کونا موڑا اور اٹھ کر بیڈ کی طرف گئیں۔ بیڈ پر بے ترتیبی سے بکھرے وجود کو قدرے سمیٹ کر چادر اوڑھائی' اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ مانوس سے نقوش تھے۔ لیکن پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس کی غلافی آنکھیں' پنکھڑیوں جیسے ہونٹ' ستواں ناک' چاند کی طرح روشن پیشانی اور پیشانی کے گرد کالے بالوں کا ہالہ۔ شہنا پھوپھو کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت ہلکورے لینے لگی۔ دل میں ایک نرم سا احساس چٹکیاں لینے لگا۔ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ڈاکٹر فواد اندر آگئے تھے۔ انہوں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر باکس رکھا۔ روئی بھگو کر اس کی پیشانی کا زخم صاف کیا اور پھر اس کی بینڈیج کرنے لگے۔ پھوپھو بھی قریب بیٹھی بغور ان کو دیکھے جا رہی تھیں۔ بینڈیج سے فارغ ہو کر وہ کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں جا کر ہاتھ دھو کر آئے اور پھر پھوپھو کے پیروں کے پاس نیچے قالین پر ہی بیٹھ گئے۔

"فہدی کوئی اور مسئلہ تو نہیں۔"

"اوہو پھوپھو کیوں پریشان ہو رہی ہیں' کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔ آپ تو جانتی ہیں اچھی طرح میں ای سے پھر بھی جھوٹ بول سکتا ہوں' لیکن آپ سے۔۔۔ ناممکن۔"

"فہدی میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں' میں پریشان نہیں ہوں۔ بس یوں ہی لڑکی ذات ہے نا سب گھر والے کیا کہیں گے یہ سوچ پریشان کر رہی ہے۔ خیر اب پٹی تو تم نے کردی ہے اب اس کو ہوش میں لانے کی بھی کوئی تدبیر کرو۔" پھوپھو شہنا کے کہنے پر انہوں نے خود بھی سوچا کہ ایک گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ حادثہ اتنا شدید بھی نہیں تھا کہ بے ہوشی اتنی طویل ہوتی۔ ابھی وہ اسے ہوش میں لانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ کمرے میں کسی نے جھانکا' یہ تائی مقسوم تھیں۔ گھر بھر میں پھوپھو شہنا کے بعد ڈاکٹر فواد اگر کسی پر اعتبار کرتے تھے تو وہ تائی مقسوم تھیں۔ اللہ کی طرف سے ان کی گود خالی تھی' لیکن دل غنی تھا' اللہ نے ان کے دل میں تمنا کے خزانے بھر دیے تھے۔

"شہنا کیا بات ہے' فہدی یہاں کیا کر رہا ہے'

تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" تائی کے لہجے پر بھی پریشانی تھی۔

پھوپھو شینا کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل کر معدوم ہو گئی۔

"بھابھی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ اندر تو آیئے۔" تائی مقسوم نے بیڈ پر لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ قدرے حیران سی وہ کبھی پھوپھو کی طرف دیکھ رہی تھیں اور کبھی ڈاکٹر فواد کی طرف۔

"یہ... یہ... کون ہے؟"

"تائی امی میری گاڑی سے ٹکر ہو گئی تھی۔" ڈاکٹر فواد نے مختصر سا جواب دیا۔

"اوہ اللہ کے بندے تو اس کو گھر کی بجائے اسپتال لے کر جانا چاہیے تھا۔ اللہ جانے کتنی زخمی ہو۔" تائی کے لہجے میں تردد تھا۔

"اوہو تائی امی، کچھ زیادہ چوٹ نہیں ہے، دہشت کے زیر اثر بے ہوش ہے، ابھی ہوش میں آجائے گی۔"

"تو بھلا کوئی پوچھے تو سہی یہ رات کے اس پہر سڑک پر کیوں دندناتی پھر رہی تھی۔ ایک تو آج کل کی لڑکیاں بھی شتر بے مہار کی طرح جدھر منہ اٹھا چل پڑیں۔ اب اللہ معلوم کس کی بہن بیٹی ہے۔ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔" تائی مقسوم ہمدرد تو تھیں، لیکن حقیقت پسند بھی تھیں، اس بارے میں تو ڈاکٹر فواد نے بھی نہیں سوچا تھا۔ پھوپھو شینا کی دو ہی بیٹیاں تھیں، روبیہ اور انیقہ، وہ دونوں بھی باتوں کی آواز سن کر پھوپھو کے کمرے میں آگئیں۔ وہ دونوں انتہائی اشتیاق سے اس خوابیدہ وجود کو دیکھ رہی تھیں۔

"مما... یہ کون ہیں؟" انیقہ کا لہجہ بھی اشتیاق سے لبریز تھا۔

"پتا نہیں بیٹا... زخمی ہے، ہوش میں آئے گی تو پتا چلے گا۔" پھوپھو شینا اسے جواب دینے کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ جواب دھیرے دھیرے کسمسا رہی تھی۔ اس کے بند ہونٹ وا ہوئے اور ان میں سے ایک سسکاری بلند ہوئی اور پھر جیسے رفتہ رفتہ وہ ہوش میں آنے لگی تھی۔ نیم وا ہونٹوں سے ٹھہر ٹھہر کر کراہ نکل رہی تھیں۔ کمرے میں موجود افراد نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اور پھر سب ہی اس کے اردگرد بیٹھ گئے۔ سب کی نظروں نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اور پھر سب نے دیکھا کہ اس نے دھیرے دھیرے اپنی غلافی آنکھوں پر سے پردہ اٹھا لیا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کتنی دیر تک تاریکیوں کی ہم سفر رہی تھی۔ جانے کتنے لمحے، کتنے گھنٹے، کتنے دن بیت چکے تھے۔ اس کے حواسوں پر سیاہ کہر نے تسلط جما رکھا تھا۔ پھر جیسے اس کہر کی چادر میں ننھے ننھے شگاف پڑنے لگے۔ اندھیرے پر روشنی غالب آنے لگی۔

روشنی جو زندگی ہے، روشنی جو سانسوں کی ضمانت ہے۔ وہ ہی روشنی اس کے کانوں کو سماعت، اس کے ہونٹوں کو گویائی اور آنکھوں کو بصارت دینے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے وجود کے ریشے ریشے میں درد سانسیں لے رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں آپس میں یوں پیوست تھیں گویا کبھی نہ کھلنے کی قسم کھالی ہو۔ اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے ہوش کی وادی میں قدم رکھا۔ تو سماعت اردگرد کے ماحول سے کچھ آوازوں سے آشنا ہوئی۔ شاید اس کے اردگرد کچھ لوگ جمع تھے۔ جو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہاں تھی؟ اور کب سے تھی؟ یہ نہیں جانتی تھی۔ بس ذہن کے ایوانوں میں ایک سوچ جاگ رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں تیز روشنی کا جھماکا ہوا تھا اور اس کے وجود کو ایک زوردار جھٹکا لگا تھا۔ پھر اندھیروں نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ جانے کون کون سی ظلمتوں کی مسافت طے کی تھی اس نے اور اب روشنیوں کے سفیر جانے کہاں لے کر آئے تھے اسے۔ اس کے ہونٹوں سے درد بھری سسکاری بلند ہوئی اور پھر وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگی۔

"فہدی دیکھو اسے ہوش آرہا ہے۔" ایک نسوانی آواز کہیں بہت دور سے آئی تھی۔ اور اس کی نیم وا آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اس کے اردگرد کئی افراد جمع تھے۔ نکھرے نکھرے خوب صورت چہروں والے افراد جن کے چہروں پر اسے ہوش میں آتے دیکھ کر عجیب سا سکون پھیل گیا تھا۔ اس نسوانی آواز کے جواب میں ایک شخص تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ شاید وہ ڈاکٹر تھا، کیونکہ اس کے ہاتھ میں طبی آلات تھے۔ اس نے اسٹیتھی اسکوپ سے اس کی ہارٹ بیٹ چیک کی۔

"اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" قدرے فربہی مائل صبیح چہرے والی خاتون جو اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔ آسودہ سے انداز میں بولیں۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے اردگرد بکھرے ہوئے یہ مہربان چہرے کون تھے؟ وہ یہاں کس طرح پہنچی؟

"کیا محسوس کر رہی ہو بیٹا؟" تیکھے تیکھے نقوش والی وہ خاتون چہرے پر محبت سجائے اس سے پوچھ رہی تھیں۔ یک دم اس کی آنکھیں گرم پانیوں سے بھر گئیں۔

"ارے ارے ماما یہ تو رونے لگیں۔" ایک معصوم سی سترہ، اٹھارہ سالہ لڑکی آگے بڑھ کر فربہ اندام خاتون سے مخاطب ہوئی۔

"نہیں بیٹا روؤ نہیں۔ تمہیں چوٹ لگی ہوئی ہے، آرام کرو۔ ہاں یہ بتادو کہ اس وقت کچھ کھانا پینا پسند کرو گی؟"

"پھوپھو شینا اس کو دودھ گرم کر کے پلائیں۔" بھاری پروقار آواز پر اس نے پلکوں کی چلمن اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے ہی تو بیٹھے تھے۔ ان کی آواز پر روبیہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ پھوپھو شینا کی طرح ان کی دونوں بیٹیاں بھی ہر دلعزیز اور ہمدرد طبیعت کی مالک تھیں۔ انیقہ میں تو معصومیت تھی، لیکن روبیہ کی طبیعت میں ٹھہراؤ اور بردباری تھی۔

"بیٹا اگر تمہاری طبیعت قدرے بہتر ہو تو کیا تم بتا سکتی ہو کہ تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں رہتی ہو؟" پھوپھو شینا نے نرمی سے کہا، لیکن ان کے سوال کے جواب میں جو ردعمل ظاہر ہوا وہاں موجود سب ہی افراد کو کھلا

گئے۔ وہ جو خاموش آنسو بہا رہی تھی ان سوالوں پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"دیکھیے... دیکھیے پلیز خاموش ہو جائیے۔ آپ کی پیشانی پر کافی گہرا زخم ہے۔ اس طرح تو وہ مزید کھل جائے گا اور بلیڈنگ شروع ہو جائے گی۔ پلیز خاموش ہو جائیے۔ تائی امی پلیز انہیں خاموش کروائیں۔" ڈاکٹر فواد اس کی ظاہری حالت کے پیش نظر قدرے پریشان نظر آ رہے تھے۔

"دیکھیں آپی... آپ ہماری بہن ہیں، خود کو اکیلا مت سمجھیں۔" انیقہ آگے بڑھ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کا مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر سہلاتے ہوئے بولی۔ وہ ان نرم رویوں کی کہانی میں الجھی ہوئی تھی۔ اوپر والے نے اس کی زندگی کی ڈور کو یوں الجھا دیا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود سلجھا نہیں پا رہی تھی۔ جن پتھروں میں وہ محبوس تھی اور ان کا حبس زدہ حصار توڑ کر آئی تھی وہ تو اب بھی اس کے وجود میں گڑے ہوئے تھے۔ وہ کس طرح ان سے پیچھا چھڑا سکتی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے اردگرد پھولوں سے نرم، چاندنی جیسے ٹھنڈے ٹھار رویے۔ خوشبودار لہجے تھے۔ اور وہ ان لہجوں کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو بولنے پر آمادہ کیا۔

"میرا نام آریان ہے... مم... میرا دنیا میں کوئی نہیں۔" وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔

"ارے... بس خاموش بھی ہو جاؤ۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا اللہ ہوتا ہے۔ تم اپنے آپ کو یہاں محفوظ سمجھو۔ ہم سب کو اپنا سمجھو، اکیلی تھیں تم، اب نہیں ہو، سمجھیں۔" تائی مقسوم اپنے ازلی پیار بھرے لہجے میں نہایت اپنائیت سے گویا تھیں۔

"لو روبیہ بھی آ گئی... اٹھو شاباش ہمت کرو، ایک گلاس دودھ پی لو، پھر سونے کی کوشش کرنا۔" پھوپھو شہنا نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور روبیہ نے دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے چند ایک گھونٹ لے کر باقی کا دودھ گلاس میں ہی چھوڑ دیا۔

"او ہو بھئی... پی بھی لو اب۔" روبیہ نے گلاس دوبارہ اس کے ہونٹوں سے لگایا تو دو گھونٹ لے کر اس نے منہ موڑ لیا۔

"بس دل نہیں چاہ رہا۔"

"چلو پھر سونے کی کوشش کرو، فہدی کوئی دوائی کھانے کی بھی دی۔" تائی مقسوم نے ڈاکٹر فواد سے پوچھا۔

"نہیں کچھ خاص ضروری تو نہیں، اگر یہ اپنی طبیعت بہتر نہ سمجھیں تو بتا دیں، میں کوئی پین کلر دے دیتا ہوں۔" تائی سے بات کرتے کرتے انہوں نے اپنا رخ آریان کی جانب کر دیا۔

"نہیں میں اب ٹھیک ہوں شکریہ۔" وہ کچھ کترائے سے انداز میں بولی۔

"چلو پھر سب اپنے اپنے کمرے میں چلو، آرام کرنے دو اسے۔" تائی مقسوم حتمی انداز میں کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں تو ان کی تقلید میں روبیہ، انیقہ اور ڈاکٹر فواد بھی کمرے سے نکل گئے۔ البتہ شہنا پھوپھو اسے آرام کرنے کی تلقین کرتی ہوئی خود دوبارہ سے جائے نماز پر بیٹھ گئی تھیں۔ آریان کی نگاہیں ان کے چہرے کو بار بار گرفت میں لے رہی تھیں، ایسا نورانی اور مقدس چہرہ اتنی مہربان طبیعت۔

کیا دنیا میں نیکی اب بھی قائم ہے، کیا یہ ہی وہ لوگ ہیں جن کے باعث آسمان ہمارے سروں پر چھاتا تانے کھڑا ہے، اور زمین نے کسی ماں کی طرح اپنا سینہ فراخ کر کے ہمارے قدموں کو جا بخشی ہوئی ہے۔ ہاں ایسے لوگ ہی درحقیقت سراپا رحمت ہوتے ہیں۔ جن کے وجود سے مترشح ہونے والا نور چاند اور سورج کے قائم رہنے کی دلیل ہے، اس کے ذہن میں بہت کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ لیکن آنکھیں تکان کے باعث بند ہونے لگی تھیں۔ سو اس نے خود کو نیند کی دیوی کی آغوش کے سپرد کر دیا۔

پھوپھو شہنا جب اپنا ورد مکمل کر کے اٹھیں تو وہ نہایت گہری نیند میں تھی۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر آئی پریشان لٹوں کو نرم انگلیوں سے پیچھے کیا اور اس پر کمبل درست کر کے نائٹ بلب جلا کر خود اپنے کمرے سے ملحقہ گیسٹ روم میں جا کر لیٹ گئیں۔ اس لڑکی کے وجود سے اٹھتی مانوس سی خوشبو انہیں بہت کچھ یاد دلا رہی تھی۔ لیکن یہ سب ان کا واہمہ ہی ہو سکتا تھا۔ بھلا ایسا کب ممکن تھا جیسا وہ سوچ رہی تھیں۔ نیند تو ان کی ویسے بھی کم تھی، زیادہ تر وقت ذکر و عبادت میں ہی گزرتا تھا۔ لیکن اس وقت جو خیال سوئی کی طرح ان کے ذہن میں چبھ گیا تھا وہ چاہنے کے باوجود اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھیں۔

مؤذن کی پہلی آواز کے ساتھ ہی انہوں نے بستر چھوڑ دیا۔ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے گزر گئی تھی۔ نیند کی ایک جھپکی بھی نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔ آریان بہت گہری نیند میں تھی۔ انہوں نے ایک لحظہ کو ٹھہر کر اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو بغور دیکھا۔ ہر نقش ان کے خیال پر مہر تصدیق ثبت کر رہا تھا۔ پھر جیسے وہ یک دم حال کی دنیا میں واپس آ گئیں اور وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے میں مشغول ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر فواد کا گھرانہ اچھے خاصے افراد پر مشتمل تھا۔ ان کی فیملی سمیت پانچ خاندان ایک ہی وسیع و عریض کوٹھی میں سمائے ہوئے تھے۔ سب سے بڑے شفقت تایا اور تائی مقسوم اولاد کی نعمت سے محروم ہونے کے باوجود ہر ایک کے لیے اپنے دل میں بے حد پیار رکھتے تھے۔ ان سے چھوٹے عارب تایا اور شہنا پھوپھو جنہیں کبھی بچوں نے تائی کہہ کر نہیں پکارا تھا، کیونکہ انہیں پھوپھو کہلوانا زیادہ پسند تھا۔ ان کی دو بیٹیاں روبیہ اور انیقہ۔

ان سے چھوٹے بابر چچا اور زاہدہ چچی ڈاکٹر فواد مہوش اور شاذان جن کے بچے تھے۔ اظہر چچا اور فیضی چچی جن کے تین بچے تھے۔ اظاہر، اطہر اور حسنین سب سے چھوٹے چچا شاکر اور ان کی بیگم حدیقہ تھیں، ان کے دو بچے تھے۔ انا اور یاصر۔ سب گھر والے الگ الگ پورشنز میں رہتے تھے۔ لیکن کھانا ایک ہی جگہ پکایا اور کھایا جاتا تھا۔ چھوٹی چچی حدیقہ اپنے مزاج اور طبیعت کے باعث فیملی میں کچھ زیادہ ہر دلعزیز نہیں تھیں۔ نہ ہی انہیں کچھ خاص پروا تھی۔ البتہ چچاؤں میں آپس میں گاڑھی چھنتی تھی، یہ ہی وجہ تھی جو سب مختلف النوع مزاج رکھنے کے باوجود ایک ہی گھر کے مکین تھے۔ اس گھر کو جوڑ کر رکھنے میں دو شخصیات کا ہاتھ زیادہ تھا۔ تائی مقسوم اور پھوپھو شہنا کا۔ تائی مقسوم تو دور پرے کی رشتہ دار تھیں۔ جبکہ پھوپھو شہنا، تایا عارب کی سگی چچا زاد بھی تھیں۔ سو اس لحاظ سے وہ دگنی اہمیت کی حامل تھیں۔ لیکن انہیں تایا عارب نے وہ مقام نہیں دیا تھا جس کی وہ اہل تھیں، اگرچہ سسرال میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔

☼ ☼ ☼

مسرت جہاں اسم بامسمی تھیں، شوخ، چنچل، کھلنڈری، دوشیزگی کی مکمل تصویر، حسن ایسا کہ بہار بھی آئے تو پل بھر کو رک کر دیکھے اور دل میں حسد لے کر روانہ ہو جائے۔ لمبے لمبے سیاہ گیسو بادلوں کو شرماتے ہوئے، بڑی بڑی سیاہ گھور آنکھیں جن میں رات کی ساری سیاہی سمٹ آئی تھی۔ دودھیا رنگت جیسے سورج کی پہلی انمول، ان چھوئی کرن نے صبح کا ماتھا چوما ہو۔ پانچ بھائیوں کی لاڈلی بہن۔ بچپن سے ہی اماں بی نے ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ آنچل سے ڈھکا سر، سینے کی اٹھانوں پر حیا کا پلہ، چال میں نزاکت اور بولنے میں حلیمی، اماں بی جانتی تھیں کہ نجیب الطرفین سادات گھرانے کی بیٹیوں میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے کبھی مسرت جہاں پر ضرورت سے زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ گھر بھر میں ان کے چنچل قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ بھابھیاں ان سے بہت پیار کرتی تھیں، بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ بھابھیوں نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔

شبیر حسین بہت بڑے ٹرانسپورٹر تھے۔ شہر میں ان کی کئی گاڑیاں چلتی تھیں۔ مسرت جہاں ان کی بھی

بے حد لاڈلی تھیں۔ شام گئے وہ جب گھر آتے تھے تو مسرت جہاں ان کے گلے میں بازو ڈالے فرمائشیں کرتے نہ تھکتی تھیں۔ اور انہوں نے کبھی نہ نہیں کہا تھا۔ دولت کی ریل پیل ہونے کے باوجود اخلاقی برائیاں اس گھر سے کوسوں دور تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ یہ گھرانہ خالصتاً "اسلامی گھرانہ تھا۔ نماز، روزے کی پابندی، صدقہ و خیرات کی روایت اس خاندان میں شروع سے چلی آرہی تھی۔ شبیر ماہ رمضان میں کتنے ہی غریب گھرانوں کو پورے مہینے کا راشن ڈلوا دیتے۔ ان کی گاڑیوں پر کئی ایسے بچے کام کرتے تھے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا، لیکن انہوں نے کبھی ان کا حق مارنے کی کوشش نہیں کی۔ اچھا کھلایا، اچھا پہنایا، وقت پر مزدوری دی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اللہ نے انہیں سعادت مند اولاد دی تھی۔ وہ اپنے بچوں سے پیار بھی بہت کرتے تھے۔ لیکن جہاں اصول کی بات آتی تھی وہاں ان کا رویہ اور برتاؤ بے لچک ہو جاتا تھا۔

بیوی ان کی مزاج آشنا تھیں۔ عاجز اور منکسر المزاج ہونے کے باعث ان دونوں کی بہت اچھی نبھ رہی تھی۔ بلکہ شبیر حسین اپنی بیوی کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان دنوں ساون کی آمد آمد تھی۔ گھنگھور گھٹائیں آسمان کو اپنی سرمئی آغوش میں سمیٹتی، ادھر سے ادھر چکراتی رہتی تھیں۔ لیکن ابھی ساون کی پہلی بارش نہیں ہوئی تھی۔ مسرت جہاں نے ہار سنگھار کے درخت کے ساتھ جھولا باندھ لیا۔ ساری ساری شام ان کی جھولا جھولتے گزر جاتی۔ اماں بی بھی اپنی چارپائی درختوں کے نیچے لا بچھاتیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نم آلود ہوا نے گرمی کا زور توڑ دیا تھا۔ جلتے جھلتے در و دیوار کو بھی ٹھنڈک میسر آگئی۔ مسرت جہاں شام کے وقت وسیع دالان میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیتی تھیں۔ پھر تو گویا زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو ایک خمار کی طرح فضا پر طاری ہو جاتی تھی۔ یوں جیسے زمین اپنے بار آور ہونے کے خواب دیکھنے لگتی۔ اس کی نادیدہ آنکھوں میں بہار کے پینگے ہلکورے لینے لگتے۔ آسمان کی روشنیاں اس کی گود بھرنے کو بے چین اور وہ بارش کی بوندوں کو ماں کی طرح آغوش میں لینے کو بے تاب۔

اس دن مسرت جہاں جھولا جھولنے کے لیے ہار سنگھار کے درخت کی پناہوں میں جانے لگیں تو یک دم جیسے فلک راجہ کو ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ انہوں نے جھٹ سے سر اٹھایا۔ گھور گھٹائیں بڑے مدھ بھرے انداز میں انہیں تک رہی تھیں۔ یوں لگا وہ برآمدے تک نہ پہنچ پائیں گی اور بادل ان کا راستہ روک لیں گے۔ انہوں نے بھاگ کر درخت کے نیچے سے چارپائی اٹھائی اور تیز تیز قدموں سے چلتی برآمدے تک پہنچیں۔ چارپائی بچھا کر انہوں نے کچن میں جھانکا، بڑی بھابھی رات کے کھانے کے لیے سالن بنانے میں مصروف تھیں۔ شینا بھابھی برتن دھو رہی تھیں۔

"بھابھو! بادل آگئے۔" جملہ کسی چہکار کی صورت ان کے حلق سے نکلا تھا۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔

"دیوانی۔۔۔" بڑی بھابھی بھی مسکرا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

"ارے یہ کوئی چھوٹی موٹی خبر ہے کیا۔ باہر نکل کر تو دیکھیں کیا منظر ہے اف۔۔۔ جی چاہتا ہے کسی پرندے کی طرح اڑ کر بادلوں تک جاؤں، انہیں چھو کر آؤں اور پھر آکر آپ کو بتاؤں کہ بادل کیسے ہوتے ہیں؟" وہ آنکھیں میچے خود ہی اپنے کسی لفظوں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

"ارے پاگل لڑکی! بادل صرف دھواں ہوتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ان کا سارا لطف اس پانی میں ہے، جو ان سے برستا ہے، بادل تو بس یہاں سے دیکھنے میں ہی اچھے لگتے ہیں۔" شینا بھابھی ان کی باتوں پر مسکراتے ہوئے گویا انہیں سمجھا رہی تھیں۔

"جانتی ہوں! لیکن حسن کو محسوس کرنے میں بھلا حرج بھی کیا ہے۔" انہوں نے مصنوعی ناراضی سے شینا بھابھی کی طرف دیکھا۔

"حرج ہے! کیوں نہیں ہے؟ حسن اگر موجود ہو تو اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سراب تک پہنچنے کا خواب ہمیشہ تعبیر کو روتا ہے۔ پگلی! تم ابھی بچی ہو۔ زمانے کے سرد و گرم سے ناآشنا تم کیا جانو! جو چیزیں دور سے دیکھنے میں بھلی لگتی ہیں، جب ہاتھوں میں آجاتی ہیں تو ان کا اصل کتنا بے رنگ، کتنا پھیکا ہوتا ہے۔" شینا بھابھی کے لہجے میں ہلکا سا ملال گھل گیا۔

بھابھی مقسوم نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا، ان کی نگاہوں میں شینا بھابھی کے لیے محبت اور شاید سمجھوتے کا پیغام تھا۔ اور یہ پیغام تو وہ پچھلے دو سال سے سمجھ رہی تھیں۔ وہ یہاں سمجھوتا ہی تو کر رہی تھیں۔ ان کے والد بلال حسین کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے تایا شبیر حسین نے انہیں اپنے بڑے سے چھوٹے بیٹے عارب کے لیے مانگ لیا تھا۔

سب جانتے تھے کہ عارب بھائیوں میں مزاجاً "تو سب سے اچھا ہے، لیکن شینا بھابھی پچھلے دو سال سے نباہ کر رہی تھیں اور حقیقت حال کا سوائے بھابھی مقسوم کے کسی کو علم نہیں تھا۔ اس وقت بھی بھابھی شینا نے فوراً" اپنے محسوسات کو کنٹرول کیا اور موضوع بدل دیا۔

"مسرتی! بارش تو برسنے بھی لگی۔" کچن کی کھڑکی سے باہر کا سماں چند ہی لمحوں میں جل تھل ہو گیا تھا۔

"بھابھی ماں! ایسے موسم میں بھلا کیا کیا جاتا ہے؟" ان کے لہجے پر فرمائش کا عناصر غالب تھا۔ بھابھی مقسوم نے مصنوعی انداز میں انہیں گھورا۔

"چٹوری کہیں کی! چل کر اماں بی کے ہاں بیٹھو۔ میں ابھی پکوڑے بنا کر لاتی ہوں۔" اور مسرت جہاں تو جیسے من کی مراد بن کہے پوری ہو جانے پر نہال سی ہو گئیں۔ چھاجوں برستا مینہ، درختوں کے مکھ دھو دھو کر زمین کو سیراب کر رہا تھا۔ پرندے کچھ دیر لطف اٹھانے کے بعد اب شاید اپنے گھونسلوں میں دبک گئے تھے کہ آسمان پر سوائے گھٹاؤں کے اور کچھ نہ تھا۔ ہاں دھرتی کے رنگ نکھر کر اپنی نیرنگیاں بکھیرنے لگے تھے۔

"اماں بی! بارش میں نہانے کو جی چاہ رہا ہے۔" مسرت جہاں اٹھلا کر بولیں۔

"بیٹا! ساون کی پہلی بارش ہے۔ اگلی بار خوب دل بھر کے نہانا۔ یہ بارش تو سو بیماریاں لاتی ہے۔" اماں بی کے سمجھانے پر یہ مان گئیں۔

"اماں بی! رات کے کھانے میں میٹھا کیا بنایا جائے؟" بھابھی مقسوم اماں بی کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

"ارے بیٹا! جو دل چاہے بنا لو، میرے شاکر اور اظہر تو کھیر پسند کرتے ہیں۔ باقی سب سے بھی پوچھ لو۔"

"اماں بی! کھیر ہی ٹھیک ہے، سب ہی شوق سے کھا لیں گے۔" شینا بھابھی ہاتھ میں پکوڑوں کی پلیٹ تھامے آگئی تھیں۔

"چلو! پھر تیاری کرتے ہیں۔" بڑی بھابھی اٹھ گئیں۔ اماں بی بھی مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لیکن مسرت جہاں وہیں کرسی پر بیٹھی بارش سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ بارش انہیں یوں ہی لگتی تھی۔ جیسے آسمان کوئی سخی تھا جو بنا مانگے اپنے دامن کے موتی لٹاتا پھرتا تھا۔

وہ برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئیں اور ہاتھ کا دامن پھیلا کر وہ موتی سمیٹنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اسی پل بلیک لینڈ کروزر گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ پورچ میں آکر رکی اور اس میں سے شبیر حسین اپنے شاہانہ طمطراق کے ساتھ باہر نکلے۔

"بیٹا رانی! آپ یہاں بارش میں کیا کر رہی ہیں۔" یہ ان کا مخصوص انداز تھا۔

"وہ ابا میاں! موسم بہت اچھا تھا، اس لیے یہاں کھڑے ہو کر بارش دیکھنے کو دل چاہا۔" انہوں نے جواب دیا تو وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گئے۔ مسرت جہاں بھی پھر وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں، اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شاید وہ موسم کی ٹھنڈک اپنے وجود میں اتار چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ کسی کھٹکے سے کھلی تھی۔ چند ثانیوں کو تو اسے احساس ہی نہ ہوا کہ وہ کہاں ہے۔ اجنبی اور ناموس جگہ، وسیع و عریض بیڈ پر کمبل اوڑھے اس کا وجود ایک پل کو اسے خود بھی بیگانہ سا لگا۔ ماحول میں کچھ ہلچل تھی۔ کوئی چہل پہل تھی۔ چند نسوانی

آوازیں تھیں۔ جو غالباً" ساتھ والے کمرے سے آرہی تھیں کیونکہ جس کمرے میں وہ تھی اس کے علاوہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

"ماما۔۔۔ آپ روبی کو سمجھالیں اس نے پھر میرا پین نکال لیا۔" ایک آواز آئی قدرے جھنجلائی ہوئی۔

"اوہو بیٹا! اس میں لڑنے والی تو کوئی بات نہیں، الماری میں دیکھو' شاید کوئی پین رکھا ہو۔" بہت بردباری سے جواب دیا گیا۔

"ماما جھگڑے کی بات نہیں۔ بات اصول کی ہے۔ جب وہ خود اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تو میری چیزیں کیوں ادھر ادھر کرتی ہے۔" وہ آواز ہنوز غصے کا اظہار بنی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے! اب بند کرو صبح صبح اس طرح لڑنا۔ سمجھادوں گی اسے میں۔ تم آکر ناشتا کرلو۔ کالج سے دیر ہوجائے گی۔" جواب میں قدرے خاموشی چھاگئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ماں کی بات مان لی گئی تھی۔ وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی۔

ابھی تک اس گھر کے مکینوں میں سے کوئی بھی اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس گھر کے لوگ اسے کسی بے جان شے کی طرح اس کمرے میں رکھ کر بھول گئے تھے۔ کس قسم کے لوگ تھے؟ وہ ٹھیک طرح جان نہیں پائی تھی۔ اتنا اسے یاد تھا کہ ان سب کے رویوں میں اس کے لیے سختی اور اجنبیت نہیں تھی۔ ملائمت اور اپنائیت تھی اور یہ ہی احساس اس کے اندر سکون' وقتی سکون بن کر اترا تھا۔ اور طویل مسافت کے بعد جس نے اس کے جسم سے زیادہ اس کی روح کو تھکایا تھا۔ اسے نیند آگئی تھی۔ کل کیا ہونا تھا؟ کل کیا ہوسکتا تھا؟ سب کچھ وقتی طور پر بھلا کر وہ مطمئن سی ہوگئی تھی۔

"ارے! تم کب سے جاگ رہی ہو؟" قریب ہی مائل خوب صورت سی خاتون اس کے قریب چلی آئیں۔ شاید یہ ان ہی کا کمرہ تھا جہاں وہ براجمان تھی۔

"نہیں۔۔۔ میں تو کافی دیر سے جاگ رہی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"اوہو! سوری بیٹا۔ دراصل صبح صبح میری بیٹیاں گھر کو میدان کارزار بنائے ہوئے ہوتی ہیں۔ سب کچھ بھول جاتا ہے کیا کرنا ہے' کیا نہیں کرنا' ایک منٹ' باتیں بعد میں' مجھے یقین ہے تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ وہ سامنے واش روم ہے تم فریش ہوجاؤ میں اتنی دیر میں ناشتا لے آتی ہوں۔" وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ آریان کمبل ایک طرف پھینک کر اٹھ گئی۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو مکینوں کی امارت اور خوش ذوقی سے مرعوب سی ہوگئی۔

اس نے واش بیسن کے ساتھ لگے بڑے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ گلابی رنگت صرف ایک دن اور رات میں ہی مرجھا کر سرسوں کے پھول سی ہوگئی تھی۔ سیاہ بالوں کی الجھی ہوئی لٹیں' چہرے کے گرد بے ترتیبی سے جھول رہی تھیں۔ پیشانی پر دائیں طرف بھنوؤں سے تھوڑا اوپر زخم کی بینڈیج تھی۔ اس نے ہلکے ہلکے دو' چار چھپکے سے مارے بال سمیٹ کر یوں ہی جوڑا سا باندھ لیا اور تولیے سے منہ خشک کرتی باتھ روم سے باہر آگئی۔ سامنے ہی وہ خاتون ناشتے کی ٹرے بیڈ پر سجائے اسے محو انتظار ملیں۔

"آؤ! بیٹھو اور تکلف بر طرف رکھ کر ڈٹ کر ناشتا کرو' فہدی ابھی تھوڑی دیر میں آئے گا' تمہیں چیک کرنے کے لیے' ویسے وہ رات بھی کہہ رہا تھا کہ کوئی ایسی میجر انجری نہیں ہے۔ جلدی امپروو کرلوگی تم۔" یہ بولتے بولتے یک دم رک گئیں' پھر کچھ سوچ کر دوبارہ گویا ہوئیں۔

"میرا خیال ہے کہ جب سے تم جاگی ہو اس وقت سے مسلسل میں ہی بولے جارہی ہوں' تم نے کیا نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔" وہ اب مسکرا رہی تھیں۔

"آنٹی! میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ کیا کہوں' یوں بھی آپ بولتی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔" اس نے ان کی جانب مسکرا کر دیکھا تھا۔ جانے کیوں ان کی موجودگی اور ان کی باتوں کی وجہ سے وہ خود کو کسی حد تک ہلکا پھلکا محسوس کررہی تھی۔

"ہوں؟ تو باتیں کرنے کا گر جانتی ہو۔ ویسے میری

روبیہ تمہاری طرح ہے۔ خاموش' سلجھی' سلجھی بلکہ کبھی کبھی کچھ الجھی' الجھی سی۔ لیکن اس سے چھوٹی انیقہ تو ایسی ہے جیسے کسی باتیں کرنے والے کھلونے کو چابی دے کر چھوڑ دیا جائے۔" وہ بہت محبت بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ آریان کی پلکوں پر نمی سی آکر دم توڑ گئی۔

"ماں تم۔۔۔ تم بھی تو یوں پیار کرتی تھیں مجھ سے۔۔۔ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھلانے سے لے کر تعلیم کے ہر میدان تک میرے ہم قدم رہیں' پھر۔۔۔ پھر آخر۔۔۔ اب کیوں دوریاں حائل ہوگئیں ہمارے درمیان۔۔۔ کیوں تمہاری محبت بھری آنکھیں مجھے نظر نہیں آتیں۔۔۔ تمہاری مامتا بھری آغوش کیوں دور ہوگئی مجھ سے۔" نوالہ جیسے اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ اسے لگا کہ بس اس کی آخری سانسیں ہیں' شینا پھوپھو کی نظریں اس کے چہرے پر پڑیں۔

"ارے۔۔۔ ارے تمہیں کیا ہوا؟" تیزی سے سرخ پڑتی رنگت اور آنکھوں سے بہتے پانی نے انہیں بوکھلا دیا۔ ان کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا گلاس پانی کا بھر کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ ایک' دو گھونٹ پی کر اس نے آنسوؤں کے گولے کو حلق سے نیچے کیا۔ لیکن چہرے کے تاثرات بدستور ویسے ہی تھے۔

"دیکھو بیٹا! تمہیں جو پریشانی ہے ہم سے کہو' یقین کرو ہم تمہاری پوری مدد کریں گے۔ لیکن تم تنہا اس طرح پریشان ہوتی رہوگی تو بھلا کیا حاصل؟" شینا پھوپھو جیسے اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولیں۔ لیکن اس کی کہانی ایسی ہی تھی جو اس کے دریدہ دل ہی نہاں رہتی تو اچھا تھا۔ وہ ڈوب رہی تھی' اس لیے تنکے کا آسرا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا دماغ مسلسل ادھیڑ بنت میں لگا ہوا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ یہاں مستقل تو رہنے نہیں آئی تھی۔ اسے سوچنا تھا کہ آگے کیا قدم اٹھایا جائے کہ وہ حوادث زمانہ سے محفوظ ہوجائے۔ فی الحال تو یہ پناہ گاہ ہی اس کے لیے غنیمت تھی۔

"نہیں آنٹی۔۔۔ کوئی پریشانی نہیں۔" وہ جبراً مسکرائی۔

"دراصل آپ کی باتیں سن کر مجھے اپنی امی کی یاد آگئی تھیں۔"

اس کی بات پر انہیں یقین نہیں آیا تھا۔ وہ مہربان آنکھوں والی عورت ساری رمزیں جانتی تھی۔ ضرور اس لڑکی کے بیک گراؤنڈ میں کوئی ایسی بات تھی جو یہ اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ لیکن وہ اصرار کرکے اس کے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتی تھیں۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" انہوں نے آواز کی سمت دیکھا' ڈاکٹر فواد اپنی سحر انگیز شخصیت کے ساتھ دروازے میں موجود تھے۔

"ارے فہدی! میرے کمرے میں آنے کے لیے تمہیں اجازت کی ضرورت کب سے پڑنے لگی۔"

"پھوپھو! اب یہ صرف آپ کا کمرہ نہیں ہے نا۔" انہوں نے کن انکھیوں سے آریان کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

"دیکھو بھئی! میرے کمرے میں کوئی اجنبی نہیں ہے۔ آریان کو بھی روبیہ' انیقہ کی تیسری بہن ہے' سمجھے۔" انہوں نے محبت سے کہا۔ آریان کا سر جھکا ہوا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس پل شینا پھوپھو کے چہرے پر خوب صورت تاثر سمٹا ہوا ہوگا۔

"ذرا اپنی نبض چیک کروایئے۔" جھکے ہوئے سر کے سامنے بھاری مردانہ ہاتھ نظر آیا' اس نے خاموشی سے دایاں ہاتھ آگے کردیا۔ ان کی انگلیاں اس کی کلائی متحرک ہوئیں تو ایک لمحے کو وہ حیا آمیز جھجک کا شکار ہوگئی۔ ان کی نظریں گھڑی کی سوئیوں پر تھیں۔

"شی از پرفیکٹ لی آل رائٹ پھپھو۔" پھپھو کے کہنے پر انہوں نے آگے بڑھ کر بینڈیج کھول دی۔ خون میں تر روئی کو نہایت احتیاط اور نرمی سے زخم سے الگ کیا پیشانی پر ایک انچ لمبا اور تقریباً" دو سینٹی میٹر گہرا زخم کا نشان تھا خون رسنا بند ہوچکا تھا۔ انہوں نے ٹیوب نکال کر زخم پر دوا لگائی۔

"پٹی کی اب ضرورت نہیں ہے۔ یہ ٹیوب رکھ لیں

دن میں تین چار بار لگائیں گی۔ تو ایک آدھ دن میں کافی بہتر ہو جائے گا۔ اچھا پھپھو میں کلینک چلوں۔ دیر ہو رہی ہے۔" وہ پہلے آریان سے پھر پھپھو سے بات کر کے باہر نکل گئے۔ آریان اس سارے عرصے میں خاموش رہی تھی۔ پھپھو شہنا بھی اسے لیٹنے کی تلقین کرتی ہوئی برتن اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ کمرے میں اب وہ تھی یا پھر بگولوں کی طرح چکراتا اس کا ماضی، عفریت کی طرح منہ کھولے سامنے کھڑا حال اور بے اماں مستقبل۔

☆ ☆ ☆

آج "سادات نگر" میں جیسے رنگ ہی رنگ اترے ہوئے تھے۔ مسرت جہاں نے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لی تھی میٹرک میں، اماں بی کے تو فخر کے مارے پیر ہی زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ ان کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اپنی ہونہار بیٹی کی کامیابی پر، بھائی الگ بے حد خوش تھے۔ سوئے اتفاق سب ہی گھر پر موجود تھے۔ شام کی چائے کے انتظار میں سب درختوں کے نیچے کرسیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ جب کرمو نے کوئی رجسٹری لا کر مسرت جہاں کے ہاتھ میں تھمائی۔

"چھوٹی بی بی! باہر ڈاکیا یہ کاغذ دیا ہے اس پر دستخط کر دیں۔" مسرت جہاں نے دستخط کر کے وہ کاغذ اسے تھمایا اور ابھی لفافہ کھولنے ہی لگی تھیں کہ شاکر نے اچک لیا لفافہ کھول کر مارکس شیٹ پر نظر دوڑائی۔

"چچ... چچ... پانچ بھائیوں کی لاڈلی بہن، اور اس بری طرح فیل افسوس صد افسوس... ہماری تو ناک کٹوا دی تم نے۔" سنجیدہ صورت لیے مسرت جہاں سے کلام تھا۔

"کیا مطلب...؟ اتنے اچھے پیپر ہوئے تھے میرے، مجھے دکھائیں مارکس شیٹ۔" وہ روہانسی ہو کر بولیں اچک اچک کر خود سے دو فٹ لمبے شاکر حسین سے مارکس شیٹ چھیننے کی کوشش کرنے لگیں۔

"ارے کیوں ہماری بٹیا رانی کو ستاتے ہو۔ بتا دو کیا نتیجہ نکلا؟" ابا میاں کی مداخلت نے شاکر حسین کو مزید شرارت سے باز رکھا اور انہوں نے مصنوعی رنجیدہ صورت بنا کر سند مسرت جہاں کے ہاتھ میں دے دی۔ مارکس شیٹ پر نگاہ ڈالنے کے بعد پہلے تو مسرت جہاں کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ پھر ایک فلک شگاف چیخ ان کے شنگرفی ہونٹوں سے بلند ہوئی۔ کاغذ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور پھر جو انہوں نے ——

—— رونا شروع کیا تو مانو اماں بی اور بھابیوں کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔

"ارے بچی، رہنے دو کوئی بات نہیں۔ پھر امتحان دے دینا یوں رونے سے بھلا اب کیا حاصل!" اماں بی اس کا سر سینے سے لگائے تسلی آمیز انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"ارے اماں بی! کیوں دل چھوٹا کرتی ہیں۔ ہم نے تو پہلے ہی عرض کی تھی کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ آپ ہی کو شوق چرایا تھا۔" اظہر بھائی نے چھیڑا تو مسرت جہاں نے شاکی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور ننگ کر بولیں۔

"یہ آنسو غم کے نہیں خوشی کے ہیں۔ دشمن جلتے رہیں۔ اماں بی ہم پاس ہو گئے ہیں۔" وہ اظہر بھائی کو زبان دکھا کر چڑا رہی تھیں۔ اماں بی تو خوشی سے نہال ہو گئیں جھٹ سے بڑھ کر ان کی پیشانی چوم لی۔ ابا میاں نے اسی وقت جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر ان کے ہاتھ پر دھرا۔ شفقت بھائی اور عارب بھائی دونوں زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ بابر بھائی نے کہا کہ جو ان کی لاڈلی بہن فرمائش کرے گی وہ پوری کریں گے۔

"تو ٹھیک ہے بابر بھائی۔ مجھے کالج میں ایڈمیشن دلا دیں۔" مسرت جہاں دلار سے بولیں تو بابر بھائی ایک لحظہ کو خاموش ہو کر ابا میاں کی صورت دیکھنے لگے جن کے چہرے پر مسرت جہاں کی فرمائش سن کر سنجیدگی سی طاری ہو گئی تھی۔ گھر بھر میں میٹرک سے آگے صرف اظہر بھائی اور شاکر ہی گئے تھے۔ اب مسرت جہاں بھی اس میدان کارزار میں اترنا چاہتی تھیں۔ اماں بی بھی کچھ خاموش نگاہوں سے مسرت جہاں کو دیکھنے لگیں۔

"کیا ہوا؟...... ابا میاں... کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا۔ ابا میاں اتنے اچھے مارکس آئے ہیں میرے، کسی بھی اچھے کالج میں آسانی سے ایڈمیشن مل جائے گا۔"

"بات یہ نہیں ہے بیٹا جی! ہم جانتے ہیں کہ آپ کا ذہن بہت اچھا ہے۔ تعلیمی ریکارڈ بھی قابل تعریف ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کو آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔" ابا میاں کے حتمی انداز نے پل بھر کو ماحول پر سکوت طاری کر دیا۔ مسرت جہاں کو جیسے سانپ سونگھ گیا شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ ابا میاں یہ فیصلہ صادر کریں گے۔

"لیکن کیوں ابا میاں۔" بہت دھیمی آواز میں انہوں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

"اس لیے کہ بیٹیاں گھر کی چار دیواری کے اندر اچھی لگتی ہیں۔" ابا میاں یہ کہہ اٹھ گئے تھے اور اپنے ساتھ ساتھ خوشیوں کے سارے رنگ بھی سمیٹ کر لے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ کرسیاں خالی ہونے لگیں معصوم بھابھی اور شہنا بھابھی اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔ اظہر بھائی کسی دوست سے ملنے نکل کھڑے ہوئے اور اپنے کمرے کو چل دیا۔ اب وہاں صرف اماں بی تھیں یا پھر بابر بھائی۔ مسرت جہاں نے عجیب سے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"اماں بی! ابا میاں کیا سمجھتے ہیں مجھے... کیا ان کا یہ خیال ہے کہ پڑھ لکھ کر میں اس خاندان کی ذلت کا باعث بنوں گی اماں بی... کیا میں نہیں جانتی کہ کن حدود کا تعین کیا گیا ہے۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کے لیے۔" وہ بولتی ہوئی ان کے قریب نیچے بیٹھ گئیں ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"اماں مجھے اجازت لے دیجیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کبھی ان حدود کو پار نہیں کروں گی جو میرے لیے مقرر کی جائیں گی۔ پلیز اماں بی! ابا میاں کو منا لیں۔" ان کے لہجے اور آنکھوں میں التجا تھی۔

"بیٹا! تم اچھی طرح جانتی ہو تمہارے ابا میاں ایک بار جو فیصلہ کر لیں کبھی اس سے ہٹتے نہیں ہیں۔ انہوں نے کچھ سوچ کر ہی ایسا کہا ہوگا۔ وگرنہ وہ تمہارا دل کبھی نہیں دکھا سکتے۔" انہوں نے مسرت جہاں کو سمجھانا چاہا۔

"اماں بی! صرف ایک بار کوشش کر کے دیکھیں۔ ممکن ہے آپ کی بات مان جائیں۔" مسرت جہاں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ایک بار بات کر کے دیکھ لیتے ہیں۔" بابر بھائی بھی مسرت جہاں کے ہمنوا بن گئے۔ اماں بی خاموشی سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ لیکن ان کا ذہن کہہ رہا تھا کہ لفظ رائیگاں جائیں گے وہ ان کے شریک حیات تھے۔

زندگی کی بتیس بہاریں ان کے سنگ دیکھی تھیں۔ انہوں نے، ان سے زیادہ بہتر بھلا کون جان سکتا تھا کہ شبیر حسین جس قدر نرم دکھتے تھے اندر سے چٹان کی طرح سخت اور مضبوط تھے۔ ان کے فیصلے شروع سے ہی مقدم جانے جاتے تھے کسی میں جرات نہیں تھی کہ کوئی فیصلے میں ترمیم کی خواہش کرتا یا ان کی ماننے میں کوئی عذر لنگ کرتا۔ خود اماں بی نے کبھی ان کے جلال کو آواز دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جو کچھ انہوں نے کہا فوراً" تسلیم کر لیا۔ شاید اسی لیے ان کی اچھی نبھی تھی۔ لیکن اب مسرت جہاں کی فرمائش سن کر وہ مخمصے میں پڑ گئی تھیں۔

اتنا تو وہ جان گئی تھیں کہ جو فیصلہ انہوں نے کر لیا ہے وہ بدلے گا نہیں۔ لیکن بیٹی کا دل رکھنے کی خاطر انہوں نے ابا میاں سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب سب اپنے اپنے کمروں کو سدھار گئے اور ابا میاں حسب معمول کچھ دیر کے لیے اسٹڈی روم میں جا بیٹھے تو اماں بھی ان کے پیچھے اسٹڈی روم میں چلی آئیں۔

"کیا بات ہے زہرہ خاتون؟ آپ کچھ پریشان ہیں۔" ابا میاں نے خاموش بیٹھی اماں بی سے پوچھا۔ ان کے اس طرح آ کر بیٹھ جانے اور بات نہ کرنے سے ابا میاں یہ تو سمجھ گئے تھے کہ انہوں نے کوئی بہت اہم بات کرنی ہے۔ لیکن ان کی ناراضی یا خفگی کے ڈر سے کہہ نہیں رہیں۔

"آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟" انہوں نے جیسے حوصلہ افزائی کی۔

"شاہ جی! ساری زندگی آپ نے جو کہا۔ میں نے تسلیم کیا۔ کبھی آپ کی کسی بات، کسی حکم سے سرتابی کی جرات نہیں کی۔"

"تو آپ کو تجدید کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔" ابا میاں نے مسکرا کران کی طرف دیکھا۔

"اس لیے کہ آپ پہلی بار آپ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔ سوچتی ہوں ایسا نہ ہو کہ دستِ سوال دراز کرنے کے بعد خالی لوٹ آنے کا پچھتاوا مل جائے۔"

"کیا مطلب؟ کیا آپ ہم سے کوئی ایسی چیز مانگنا چاہتی ہیں۔ جس کی قدرت ہم نہیں رکھتے۔" ابا میاں سیدھے ہو بیٹھے تھے۔ کتاب جو ان کے ہاتھ میں تھی انہوں نے بند کر کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی اور پوری طرح اماں بی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"نہیں قدرت تو رکھتے ہیں۔ لیکن شاید وہ چیز آپ دینا نہ چاہیں۔" اماں بی کا انداز انہیں الجھائے جا رہا تھا۔

"زہرہ خاتون! یہ آج آپ کس انداز میں بات کر رہی ہیں۔ جو بھی کہنا ہے کہ دیجیے یقین جانئے اگر اس چیز پر ہمارا اختیار ہوا۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی جرات ہم میں ہوئی تو بخدا انکار نہیں کریں گے۔"

"میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مسرت جہاں زمانے کے اونچ نیچ اپنا اچھا برا سمجھتی ہے۔ عزت' ذلت کا خیال رکھ سکتی ہے۔ اس کی آرزو ہے کہ اسے آگے پڑھنے دیا جائے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس میں ایسی قباحت بھی نہیں۔ آخر لوگوں کی بیٹیاں اسکولوں' کالجوں میں پڑھ ہی رہی ہیں۔"

"ان لوگوں میں اور ہم میں بہت فرق ہے زہرہ خاتون! ہم سادات میں سے ہیں۔ ہم کس طرح مسرت جہاں کو کھلے منہ کالج آنے جانے کی اجازت دیں۔ ہم ان کی ایسی بے پردگی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے پڑھنا ہے تو ہم انہیں کتابیں منگوا دیں گے۔ گھر بیٹھ کر پڑھیں اور پیپر دے دیں۔"

"شاہ جی! کالج میں جا کر پڑھنے اور خود تیاری کرنے میں بہت فرق ہے۔ پھر وہ جو مضامین لینا چاہتی ہے وہ ایسے گھر بیٹھے نہیں پڑھے جا سکتے۔"

"زہرہ خاتون! زندگی کے اتنے سال گزار کر بھی آپ سمجھ نہیں پائیں کہ ہمارا مزاج کیا ہے؟ ہم کیا چاہتے ہیں۔ افسوس صد افسوس ہم اور اب کیا کہہ سکتے ہیں جب زندگی کا ساتھی ہی سمجھ نہ پائے۔"

انہوں نے میز پر سے کتاب اٹھالی تھی۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا وہ اب اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتے اماں بی تو پہلے ہی جانتی تھیں کہ وہ اپنا فیصلہ کسی طور نہیں بدلیں گے وہ خاموشی سے ان کے پاس سے اٹھ گئیں۔ کچھ ملول سی تھیں کہ صبح مسرت جہاں کے پوچھنے پر کیا کہیں گی؟

اپنے کمرے میں آتے ہوئے انہوں نے مسرت جہاں کے کمرے کی بتی جلتے دیکھی تھی۔ وہ ان کے دل کی بے چینی کو جان گئیں۔ مسرت محنتی لائق تھیں اور پڑھائی کی شوقین بھی خود اماں بی واجبی سا پڑھی لکھی تھیں لیکن تعلیم کے حصول کو برا نہیں سمجھتی تھیں۔ پھر اب تو زمانہ ہی بدل گیا تھا۔ بیٹا اور بیٹی دونوں کو مساوی حقوق دیئے جا رہے تھے۔ پھر ان کے گھر میں بیٹی کے لیے الگ سے قوانین کیوں وضع کیے جا رہے تھے۔ رات ایسی ہی سوچوں میں گزر رہی تھی۔ جانے کس گھڑی پلک سے پلک لگی۔ اذانوں سے کچھ بعد میں آنکھ کھلی۔ وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ تسبیح کر رہی تھیں۔ جب دروازے سے مسرت جہاں داخل ہوئیں۔

سفید قمیص شلوار پر بڑا سا ململ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اجلی نکھری صبح کا ہی حصہ لگ رہی تھیں۔ بالوں کی لٹیں دوپٹے کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں۔

جانے کیوں اماں بی کو ان کے چہرے پر پھیلے رنگ کچھ پھیکے اور ملال میں ڈوبے ہوئے لگے۔ ایک ہی شب جانے کون سی سوچوں کے تانوں بانوں میں الجھ کر ان کے معصوم چہرے نے سنجیدگی کی دبیز چادر اوڑھ لی تھی۔ شرارت سے چمکتی آنکھیں کچھ بجھی بجھی سی

لگیں۔

"بیٹا رانی! وہاں دروازے کے پاس کھڑی کیا کر رہی ہو؟ یہاں آؤ میرے پاس۔" انہوں نے بہت پیار سے کہا تو مسرت جہاں نے ایک پل کو سر اٹھا کر ان کی سمت دیکھا۔ اور پھر سج سج کر قدم اٹھاتی ان کے قریب آ گئیں۔ جیسے وہ کانچ کی بنی ہوں اور پتھریلی زمین پر چلنا پڑ گیا ہو۔

"یہاں بیٹھو میرے پاس۔" اماں بی نے جانماز سمیٹ کر وہیں اپنے قریب ہی تخت پوش پر ان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ وہ خاموشی سے اماں بی کے پاس بیٹھ گئیں۔

"بیٹا۔ کیا ناراض ہو گئیں مجھ سے۔"

"نہیں اماں بی! ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ نے ایسا کیوں سوچا۔" مسرت جہاں نے ان کے خیال کی تردید کی۔

"بیٹا! میں نے تو پوری کوشش کی لیکن تمہارے ابا میاں جب ایک بار کچھ کہہ دیتے ہیں تو پھر اس پر سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ ان کا اقرار 'اقرار' ہوتا ہے اور انکار کا مطلب انکار۔"

"اماں بی! آپ مجھے وہ بات کیوں سمجھا رہی ہیں۔ جو پہلے سے میرے علم میں ہے میں جانتی ہوں کہ وہ نہیں مانیں گے۔"

"تو پھر بیٹا! یوں دل چھوٹا نہ کرو۔ ہنسو بولو۔ جیسے پہلے خوش رہتی تھیں اسی طرح۔" اماں بی کے کہنے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر کر معدوم ہو گئی۔

"اماں بی! میرا ایک خواب تھا میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ اور خواب ہی تو زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ مجھے کم سے کم اپنے خوابوں کے ٹوٹنے پر اداس تو ہونے دیں۔" ان کی بات سن کر اماں بی افسردہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"بیٹا! میرے اختیار میں ہوتا تو تمہارے خواب ٹوٹنے نہ دیتی۔ تمہارے ابا میاں کی سوچ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ وہ باہر کا ماحول دیکھتے پرکھتے ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسی لیے مستقبل کی پریشانی سے بچنے کی پیش بندی کرتے ہیں۔ تم بھی یہ سوچ لو کہ ان کا یہ فیصلہ شاید تمہارے حق میں اچھا ہو۔" وہ بے دلی سے اماں بی کی باتیں سن کر وہاں سے اٹھ گئیں۔ پھر آنے والے چھ سات بوجھل دن جیسے گھسٹ گھسٹ کر گزرے تھے۔

مسرت جہاں کی خوش نوائیوں پر تو جیسے خزاں نے سیاہ پنجے گاڑ دیے تھے۔ گھر میں سناٹے سے گونجنے لگے۔ جس بلبل کی چہکار سے ہر دم رونق رہتی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اور اس کی یہ خاموشی گھر بھر کو تشویش میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ مسرت جہاں نے نہ تو ضد کی نہ رونا دھونا مچایا بس غیر ضروری باتیں ختم کر دیں۔ ان کی اس نمایاں تبدیلی نے اماں بی اور ابا میاں کو بھی پریشان کیا۔

"زہرہ خاتون! مسرت جہاں آج کل کیوں چپ چپ سی رہنے لگی ہیں۔؟" ابا میاں کے سوال پر انہوں نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ آپ سے زیادہ بہتر اس کا سبب کون جانتا ہے۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں ہماری طرف؟ کیا ہم قصور وار ہیں اس بات کے؟" ان کے دوبارہ سوال کرنے پر بھی اماں بی کچھ نہیں بولیں۔ خاموشی سے بیٹھی ساگ بناتی رہیں۔

"ٹھیک ہے آپ جواب نہیں دینا چاہتیں۔ تو ہم مسرت جہاں کو بلا کر خود پوچھ لیتے ہیں۔" اور پھر انہوں نے واقعی اسی وقت مسرت جہاں کو بلوا لیا۔

"بیٹھیے بیٹا!" مسرت جہاں ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"کیا ہم آپ کی خاموشی اور اداسی کا سبب جان سکتے ہیں۔؟" وہ عمیق نظری سے مسرت جہاں کے کھلے کتاب جیسے چہرے کا مطالعہ کرنے لگے ابھی وہ اتنی سمجھدار نہیں ہوئی تھیں کہ جذبوں اور تاثرات کو چھپا سکیں۔ ہر جذبہ آنکھوں کے آئینے پر آ کر اپنی اصل صورت دکھا دیتا تھا۔

"جی..... ابا میاں!" انہیں توقع نہیں تھی کہ ابا میاں یوں اس طرح خاص طور پر انہیں بٹھا کر ان کی خاموشی کا سبب جاننا چاہیں گے۔

"ہم کہہ رہے ہیں کیا آپ ہمیں اپنی اس خاموشی کی وجہ بتائیں گی۔؟"

"کوئی نہیں، ابا میاں! ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ کچھ نروس سی ہو گئی تھیں۔ شاید اس لیے کہ آج تک انہوں نے ابا میاں سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

"بیٹا! اولاد کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جائے کتنی ہی خود مختار ہو جائے۔ ماں باپ کی نظروں میں اس کا بچپن ہی رہتا ہے۔ آپ اس وقت جھوٹ بول رہی ہیں۔ ہم بھی اچھی طرح جان رہے ہیں۔ آپ نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی ہم ان باپوں میں سے نہیں جو اولاد پر بے جا سختی کریں۔" ان کے لہجے میں ہلکا سا تاسف تھا۔

"ابا میاں... آپ ناراض مت ہوں۔ اصل میں میرا ایک خواب تھا۔ ڈاکٹر بننے کا خواب۔ لیکن میں آپ کے فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھاؤں گی۔ بس وقتی طور پر کچھ دکھ ہوا۔" مسرت جہاں سادگی سے کہتی ہوئی شہر گیں کو اتنی پیاری لگیں کہ انہوں نے جھٹ سے گوہر مقصود ان کی گود میں ڈال دیا۔

"اور اگر ہم اس دکھ کا 'اس رنج کا مداوا کر دیں۔" وہ مسکراتی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"ہم کل ہی میڈیکل کالج سے آپ کے لیے فارم منگوائیں گے۔ اب تو خوش ہیں نا۔" ان کی بات سن کر مسرت جہاں کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ گویا ایک مژدہ جانفزا تھا جس کا حرف 'حرف ان کے اندر روح بن کر اتر گیا تھا۔

"لیکن ایک بات 'اسے ہماری پہلی اور آخری نصیحت' تنبیہہ یا پھر حکم سمجھ لیں کہ اپنے خوابوں کی تکمیل میں ہماری عزت و حرمت کا خون مت شامل کیجیے گا۔ جس بے داغ پوشاک میں ملبوس ہیں آپ اس پر ہم ذلت کا کوئی چھینٹا نہیں برداشت کر پائیں گے۔" ابا میاں کے جملوں میں جانے کیا تھا کہ ایک پل کو مسرت جہاں جیسے لرز کر رہ گئیں۔ لیکن ان احساسات پر بہت جلدی خوشی کا احساس غالب آ گیا۔ گھر بھر کو خبر ہو گئی تھی کہ مسرت جہاں کو ابا میاں نے کالج میں ایڈمیشن لینے کی اجازت دے دی۔ بھا بھیوں نے مبارکباد دی۔ سوائے عارب بھیا کے 'ابا میاں کے اس فیصلے کو سبھی نے سراہا تھا۔

☼ ☼ ☼

طبلے پر تھاپ پڑی اور گھنگھرو جھنجھنا اٹھے۔ سرخ قالین کے وسط میں دو گورے گورے پاؤں موسیقی پر جذب کے عالم میں متحرک ہو گئے۔ سفید چاندنی پر گاؤ تکیے لگائے بیٹھے امارت کا رعب ڈالنے والے۔ دن کو اجلے لباسوں میں گھومنے والے اور راتوں کی سیاہی میں گناہوں سے آلودہ نفس والے تماش بین پوری طرح متوجہ ہو گئے۔ اس بازار میں جہاں عورت جنس کی طرح بکتی ہے اسے خریدنے ایسے ہی شریف ابن شریف آتے ہیں۔ عورت بے بس بھی ہے۔ خود مختار بھی 'ظالم بھی ہے' مظلوم بھی 'حاکم بھی ہے' محکوم بھی' لیکن اس بازار میں جہاں دن سوتے 'راتیں جاگتی ہیں عورت محض ایک کھلونا ہے۔ بگڑے ہوئے بچوں کے ہاتھوں میں تھمایا گیا ایسا کھلونا کہ جس کے نصیب میں صرف ٹوٹنا اور بار بار ٹوٹنا ہی لکھ دیا گیا ہے۔

ابھی کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا' بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی' ترکِ مدارات کا وقت
ترکِ دنیا کا سماں' ختمِ ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے؟

مغنیہ کی آواز میں درد تھا' سوز تھا۔ اس کے لبوں سے تلخ حقیقت نرم نرم لفظوں کی صورت میں

ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہی تھی۔ سارے ماحول پر فسوں طاری تھا۔ وہ منچلے جو آنکھوں میں شوق و ہوس کا ایک جہاں آباد کیے رقاصہ کی ایک ایک جنبش کو نظروں ہی نظروں سے دل میں اتار رہے تھے۔ گانے والی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ کالے بارڈر کی کریم کلر کی ساڑھی میں لمبے سیاہ بال پشت پر دھرے' بالکل سادہ چہرے والی یہ عورت اس ماحول کا حصہ تو ہرگز نہیں لگ رہی تھی۔

اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں' رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں' رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس طور کے پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے؟
اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشتر صبح
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بے دار کرے
اور ہر کشتہ واماندگی آخر شب
بھول کر ساعت درماندگی آخر شب
جان پہچان' ملاقات پہ اصرار کرے

لفظ ختم ہو چکے تھے یا شاید گویائی سے محروم ہو گئے تھے۔ رقص کرتے قدم بھی تھم گئے۔ طبلہ نواز' سارنگی نواز گونگے ہو گئے۔ لیکن اس سراپا نازنین کے الفاظ نے ماحول پر جو فسوں طاری کر دیا تھا وہ اسی طرح قائم تھا۔ وہ جا چکی تھی اور اس کے جاتے ہی روشنیوں کے باوجود اندھیرا سا پھیل گیا۔ جھروکے سے لگ کر کھڑی چھ سات سال کی بچی یہ سب بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس اجنبی ماحول میں اگر اس کی شناسائی کسی کے ساتھ تھی تو وہ صرف اور صرف اسی ساحرہ سے تھی جو ابھی ابھی محفل کو منور کر کے جا چکی تھی۔ پھر اس چھ سات سال کی بچی کو کسی نے نرم نرم آغوش میں لیا تھا۔ مانوس سی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔

"ماں۔" اس کے لبوں نے بڑے پیار سے یہ لفظ کہا تھا۔ اور پھر پلٹ کر وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

"ماں...... ماں۔" اس کی روح اسی لفظ کی تکرار کر رہی تھی۔ جب کسی نے اسے جھنجوڑا اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

"تو...... تو...... کیا وہ سب خواب تھا یا میرے تحت الشعور میں چھپا ماضی عکس بن کر آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ پھر ماں کا لمس' اس کی خوشبو کیسے اتنی شدت سے اس کے حواسوں پر حاوی تھی۔ اسے لگا سچ مچ اس کی ماں آ گئی۔ ماں جو محبت کا سمندر ہے۔ ماں جو آفاقی سچ ہے۔ جس کی ممتا کے آگے بڑے سے بڑا طوفان بھی پل بھر کو ٹھہر نہیں سکتا۔ وہی ماں' جس کی ممتا کے چھتنار شجر کے نیچے سے اٹھ کر وہ امتحانوں کی کڑی تمازتوں میں آ بیٹھی تھی۔ جانے کتنی آزمائشیں تھیں۔ کتنے چکر تھے اس کے پاؤں میں۔" اس کے ہونٹ خشک تھے۔ نمی سے بالکل نا آشنا' آنکھیں بھی پرائی پرائی سی لگ رہی تھیں۔ اس نے زبان لبوں پر پھیر کر انہیں تر کرنا چاہا۔ لیکن اسے لگا اس کے منہ کے اندر زبان نہیں خشک لکڑی کا چٹخا ہوا ایک ٹکڑا رکھا ہے۔ وہ اس کا حلق اس چٹختے ہوئے ٹکڑے کو حرکت دینے سے معذور تھا۔

"طبلہ' گھنگھرو' رقص کرتے ہوئے سفید کبوتر سے پاؤں' سوز میں ڈوبی درد بھری آواز' لمبے گھنیرے بالوں والی پیکر حیا صورت ماں۔

کیا وہ سب خواب تھا؟ نہیں...... وہ خواب ہی تو نہیں تھا وہ لمس اس کے لیے نیا تھا نہ ہی انوکھا ہاں حیات آفرین ضرور تھا۔" بوجھل بوجھل پلکوں تلے ایک ہی مہربان صورت کی شبیہ لہرا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی پلکوں پر کوئی نادیدہ بوجھ آن ٹکا تھا۔ خود بخود اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اور اب...... اب اسے نیند سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ شاید اس کی آنکھیں خوابوں سے کترانے لگی تھیں۔ ان خوابوں میں رنگ بھی تو نہیں تھے نہ ہی امیدوں کی روشنی تھی۔ بس ماضی کے سیاہ دھبے تھے جو ان کی روشن اسکرین پر جابجا بد صورتی کا نشان بن کر چپکے ہوئے تھے۔ وہ ان سیاہ دھبوں سے چھپا چھڑانا بھی چاہتی تو ناممکن تھا۔ بس اس کی روح کسی زخمی پرندے کی طرح اس کے جسم کے قید خانے میں پھڑپھڑاتی رہتی تھی۔ اور شاید یہی اس کا مقدر تھا۔

☼ ☼ ☼

"آریان' کیا بات ہے بیٹا؟ کیا سوچ رہی ہو؟" شینا پھپھو ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری اور چھری لیے کمرے میں داخل ہوئیں تو سامنے اسے بیڈ پر سر جھکائے خاموش بیٹھا دیکھ کر اس کے قریب چلی آئیں۔

"کچھ نہیں آنٹی۔ میں نے کیا سوچنا ہے؟ بس یونہی۔" عجیب سناٹا لیے والا انداز تھا اس کا۔

"آریان! تم نے بتایا تھا کہ تمہارا کوئی نہیں۔ امی نہ ابو بہن بھائی وغیرہ۔ اب تک تم کس کے پاس رہتی تھیں۔" شینا پھپھو کے پوچھنے پر آریان نے جھکا ہوا سر اٹھایا یہ وہ سوال تھا جس کا کبھی نہ کبھی اسے جواب دینا ہی تھا۔ اپنی ذات کو قابل اعتبار ٹھہرانے کے لیے معاشرے میں اپنے مقام کا یقین کرنا تھا وہ سنبھل گئی۔ شاید اس لیے کہ اپنے بقاء کی جنگ اسے تنہا لڑنی تھی۔

"آنٹی...... بچپن سے ہی ایک رشتے کی خالہ کے ہاں رہتی تھی۔ چند دن پہلے وہ فوت ہو گئیں ان کے دوسرے رشتے دار گھر پر قبضہ جمانے کی خاطر مجھے جان سے مار دینے کے درپے ہو گئے کیونکہ وہ اپنا گھر میرے نام کر گئی تھیں۔ سو ان لوگوں سے اپنی جان بچانے کی خاطر مجھے وہ جگہ چھوڑنی پڑی۔" شینا پھپھو کو اس پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ کیا اس کا کومل وجود حالات کی ٹھوکروں کا متحمل ہو سکتا تھا؟ لیکن پروردگار بھی جانے کیا سوچ کر اپنے بندوں پر نت نئی آزمائشوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس سے وہ انہیں روبیہ اور الیقہ کی ہی طرح لگی۔

"آریان! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم ہمیشہ کے لیے یہاں رک جاؤ میرے پاس میری بیٹی بن کر۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی بے طرح یاد آ جاتا ہے۔ شاید اسی طرح اس کی یاد کا دکھ کم ہو جائے۔" شینا پھپھو کی آنکھیں خلا میں جیسے کسی نکتے پر مرکوز تھیں۔ ذہن میں کچھ دھندلے دھندلے عکس واضح ہو رہے تھے۔

"آنٹی' کون ہے۔ کون یاد آ جاتا ہے؟" آریان کے پوچھنے پر ابھی انہوں نے جواب نہ دیا تھا کہ تائی مقسوم نے کمرے میں جھانکا۔

"ارے شینا' تم یہاں اطمینان سے بیٹھی ہو اور ادھر زاہدہ اور حدیقہ کی لڑائی ہو رہی ہے۔" انہوں نے عجلت میں کہا اور واپسی کو مڑیں۔ شینا پھپھو نے سبزی کی ٹوکری' چھری وہیں قریب ہی تپائی پر رکھ دی اور اٹھ کر ان کے پیچھے چل دیں۔

"مگر بھابھی!" انہوں نے آگے جاتی تائی مقسوم کو آواز دے کر روکا۔ وہ رک گئیں اور پلٹ کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"بھابھی! کیا ہوا؟ کیوں جھگڑ پڑیں دونوں؟" شینا پھپھو متفکر سی ہو گئی تھیں۔

"ارے شینا! جانتی تو ہو ایک سیر ہے تو دوسری سوا سیر۔ جب سے حدیقہ بیاہ کر آئی ہے۔ دونوں میں بنی نہیں۔ حدیقہ کی عادت کا بھی تمہیں پتا ہے کیسے مرچ مسالے لگا کر بات کرتی ہے بس اس نے زاہدہ پر طنز کیے اور وہ کھول اٹھی۔" تائی مقسوم نے بتایا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی بڑی اماں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگیں۔

"لیکن بھابھی! جھگڑے کا سبب کیا ہے؟"

"یہی تمہارے کمرے میں جو لڑکی ہے۔ یہی جھگڑے کا موجب ہے۔ اصل میں زاہدہ کچھ دیر پہلے باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی کہ حدیقہ پہنچ گئی۔ چھوٹتے ہی اس نے یہ بات کہی کہ بھابھی فواد میاں تو جوان ہو گئے۔ خیر سے لڑکی بھگا کر لائے ہیں۔ بس یہ بات بری لگ گئی زاہدہ کو۔ اس لیے کہ میں اور فہدی صبح اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر چکے تھے۔ جانتی ہو نا زاہدہ فہدی کے معاملے میں کتنی حساس ہے۔ اپنے بیٹے کے بارے میں ایسے کلمات کہاں برداشت کر سکتی تھی۔ اس نے جواب میں حدیقہ کے بھائی شرافت کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ اور اب دونوں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر خاندانی حملے کر رہی ہیں۔"

وہ دونوں چلتے چلتے بڑی اماں کے کمرے تک پہنچیں۔ اندر سے آتی تیز آوازوں سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ

معاملہ عدالت عالیہ تک پہنچ چکا ہے۔ لیکن جج اس وقت خاموش تھا۔ البتہ متحارب گروپ ،جی جان سے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھال رہے تھے۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئیں حدیقہ چچی اور زاہدہ چچی دونوں ہی شدید غیض و غضب کے عالم میں ایک دوسرے کو گھور رہی تھیں کہ اگر اجازت ہوتی تو ایک دوسرے کی تکہ بوٹی کر دیتیں۔ بھابھی مقسوم نے آگے بڑھ کر زاہدہ چچی کو کندھے سے تھاما۔

"زاہدہ تم بڑی ہو۔ درگزر سے کام لو۔ چھوٹے اکثر ایسا کر جاتے ہیں بڑوں کا کام ہے صبرو تحمل سے پیش آئیں۔"

"بالکل بڑوں کا کام ہے صبرو تحمل سے پیش آئیں تاکہ چھوٹے سر پر چڑھ کر ناچیں۔ ارے بھابھی گز بھر کی زبان ہے اس کی۔ لحاظ نہ مروت۔ اللہ جانے ماں نے کیسی تربیت کی ہے چھوٹے کا پتا نہ بڑے کی خبر۔ اپنی انہی عادتوں کی وجہ سے سارے خاندان سے کٹ گئی ہے۔ شاکر جیسے اچھے لڑکے کو بھی خاندان بھر میں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ اب بھی کلیجے میں ٹھنڈ نہ پڑی۔" زاہدہ چچی نے شکایت کی۔

"بس بس۔۔۔ اچھی طرح جانتی ہوں میں اس گھر کے بڑوں کو۔ خرابی اپنی اولاد میں ہوتی ہے۔ اور دوسروں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ بیٹی تو آپ کی بھی ہے۔ کیا تربیت کر رہی ہیں اس کی۔ چائے تو بنانی نہیں آئی اسے۔" حدیقہ چچی نے جواباً" حملہ کیا۔

"دیکھو حدیقہ! بات بڑھانے کا کوئی فائدہ ہے۔ تم مان کیوں نہیں جاتی ہو کہ تمہاری غلطی ہے بغیر تحقیق و تصدیق کے تم نے بات کیوں کی۔ فہدی سے تم اچھی طرح واقف ہو کس مزاج کا لڑکا ہے۔ وہ کوئی کھلنڈرا ٹین ایجر نہیں۔ ایک سلجھا ہوا پڑھا لکھا' پروفیشنل آدمی ہے۔ کلینک چلا رہا ہے ذمہ دار ڈاکٹر ہے ایسی چیپ اور غیر ذمہ دارانہ حرکت کر سکتا ہے وہ؟ پھر تم نے اس کی ماں سے اس کے متعلق اس طرح بات کی۔ تو اس کا بھڑکنا تو بنتا ہی تھا۔" شہنا پھپھو نے سمجھانے کی کوشش کی۔ حدیقہ چچی بدلحاظی سے کچھ دیر سب کی

طرف دیکھتی رہیں پھر تن فن کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ یعنی سمجھانے کے باوجود انہوں نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔

"اماں بی! آپ کچھ کہتی کیوں نہیں اسے۔ آپ نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ہوتے نا آج ابا میاں! پھر میں دیکھتی کہ یہ کس طرح بڑوں کے منہ لگتی ہے۔" زاہدہ چچی کا پارہ نیچے آ ہی نہ رہا تھا۔ اس لیے کہ حدیقہ چچی غلطی کر کے ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔ وہ غلطی کر کے شیر کی طرح سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ کہ کر لو جو کرنا ہے۔ اور ان کی یہی عادت گھر والوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انہوں نے آتے ہی الگ گھر کا مطالبہ کر دیا تو اماں جی نے فوراً" شاکر حسین کو گھر بنوا دیا۔ اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے کو آموجود ہوتیں۔

"زاہدہ! میں عزت سے ڈرتی ہوں۔ تم چاروں نے کبھی میرے سامنے زبان نہیں کھولی۔ ہمیشہ میرا احترام کیا۔ لیکن اس عورت کی زبان کے آگے خندق ہے یہ بولتے سے سوچتی نہیں اس لیے میں اس سے زیادہ کلام ہی نہیں کرتی۔" بڑی اماں رسان سے بولیں۔ زاہدہ چچی خاموش ہو گئیں۔ لیکن اندر ہی اندر کھول رہی تھیں۔ بھابھی مقسوم اور شہنا پھپھو کے سمجھانے پر کسی حد تک وہ مان گئیں۔ لیکن ان کے چہرے سے ناراضی کے تاثرات بدستور عیاں تھے۔

"شہنا! کیا وہ بچی یہاں آسکتی ہے؟ میں ملنا چاہتی ہوں اس سے۔" بڑی اماں نے کہا۔

"پتا تو چلے کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ فہدی اسے کیوں' لے کر آیا۔"

"کیوں نہیں بڑی اماں' آ کیوں نہیں سکتی۔ اصل میں مسئلہ یہ تھا کہ فہدی اس لڑکی کے متعلق جانتا کچھ نہیں تھا کہ یہ کون ہے کہاں سے آئی ہے؟ آدھی رات کو سنسان سڑک پر کس لیے کھڑی تھی۔ چوٹ تو کچھ زیادہ نہیں آئی تھی۔ دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ فہدی کہہ رہا تھا کہ میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں اسے یوں تنہا سڑک پر بے ہوش پڑا چھوڑ

آجاتا۔ پھر خیر سے ہرا بھرا گھر ہے اس کی باآسانی عیادت اور دیکھ بھال کی جاسکتی تھی۔"

"لیکن وہ اسے ہسپتال بھی تو لے جاسکتا تھا وہاں اس کی زیادہ بہتر دیکھ بھال ہو سکتی تھی۔" بڑی اماں نے کہا۔

"اس نے یہ بھی کہا کہ لے جانے کو تو میں اسے کلینک میں بھی لے جاسکتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ کسی اور کا نہ ہونا اس کو مشکوک بنا دیتا اور مجھے بھی۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ گھر لے چلوں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے تم اس لڑکی کو یہیں لے آؤ۔" شہنا پھپھو' بڑی اماں کی بات سن کر کمرے سے نکل گئیں۔ کمرے میں گمبھیر خاموشی چھا گئی۔ ہر نفس اپنی اپنی جگہ سوچوں کے گرداب پھنسا ہوا تھا۔ چند ثانیوں پر محیط یہ خاموشی اس وقت ختم ہوئی جب شہنا پھپھو کے ہمراہ وہ کومل سی لڑکی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں موجود تینوں خواتین نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی انہی کی جانب متوجہ تھی۔ سو انہیں یوں اپنی طرف دیکھتا پاکر وہ قدرے نروس ہو گئی۔

"اماں بی! یہ آریان ہے اور آریان یہ ہماری اماں بی' یہ بھابھی مقسوم ان سے تو کسی حد تک تمہارا تعارف ہو ہی چکا ہو گا اور یہ زاہدہ' فہدی کی امی۔" آریان نے تینوں خواتین کو بغور دیکھا۔ اور پھر اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔

☆ ☆ ☆

آج اسے اس گھر میں تیسرا دن تھا۔ روبیہ اور انیقہ تو اس سے ایسی فرینک ہو گئی تھیں جیسے وہ شروع سے ہی ان کے ساتھ رہتی آرہی ہو۔ روبیہ اور وہ تقریباً" ہم عمر ہی تھیں جبکہ انیقہ چھوٹی تھی۔

اس وقت وہ تینوں لان کے گھاس پر براجمان تھیں۔ موسم نے یکدم ہی بے وفا محبوب کی طرح رنگ بدلا تھا۔ صبح سے کڑکتی دھوپ کی تمازت سے جھلتے دیوار و در

اب آسمان کی عنایت پر کچھ پر سکون دکھائی دے رہے تھے۔ یہ تینوں پھولوں کے کنج کے قریب بیٹھی تھیں ان سے قدرے فاصلے پر بچھی لان چیئرز پر گھر کی دیگر خواتین چائے اور خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

"ویسے آریان آپی! آپ نے اب تک ہمارے گھر کے افراد کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔" انیقہ نے شریر ہوا سے ماتھے پر جھول آنے والی لٹ کو انگلی سے پیچھے کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ اس کے سوال پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آریان کے لبوں پر در آئی۔

"کیا بہت ضروری ہے؟" سوال کے جواب میں اس نے الٹا سوال کر دیا۔

"بالکل! جب ہم کسی خاص ماحول میں' یا چند افراد کے درمیان میں رہتے ہیں تو آٹومیٹکلی ہمارا ذہن وہاں کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتا ہے مثبت یا منفی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ کے ذہن میں بھی رائے محفوظ ہے اس وقت۔" انیقہ فلسفیانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"خدارا! اپنا فلسفہ بول کر بلاوجہ دماغ پلپلا کرنے کی کوشش مت کرو۔ اچھا خاصا موسم ہے اور بہت ہی اچھا موڈ بھی۔ دونوں غارت ہو جائیں گے۔" روبیہ اس کی باتوں سے اکتا کر بولی۔

"آریان آپی! ازل سے ہی بے چارے فلسفیوں کے ساتھ ایسا ہوتا آیا ہے خواہ وہ جبران ہو یا سقراط۔ دکھ کا زہر پلاتے ہیں اسے یہ زمانے والے۔ کوئی قدر ہی نہیں باصلاحیت لوگوں کی یہاں۔" مصنوعی سرد آہ بھر کے انیقہ نے کہا تو آریان مسکرانے لگی۔

"دیکھو بھئی' سیدھی سی بات ہے نہ تو ہم فلسفی کی بکریاں ہیں کہ تمہاری باتیں سن سن کر دماغ کا خانہ خالی کر لیں اور نہ ہی تم کوئی اتنی بلند پایہ فلسفی ہو جس کا کہا ہوا اتنا قیمتی ہو کہ ہم اپنا وقت ضائع کرتے پھریں۔" روبیہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے! ٹاپک چینج کیے لیتے ہیں۔ آریان آپی نے تو اپنی رائے نہیں دی۔ البتہ ہماری خواہش ہے کہ

ہم اپنی رائے سے اس پیاری سی لڑکی کو جواب ہماری آپی بھی ہیں ضرور شیئر کریں۔"

"کیا مطلب؟...... کون سی رائے کس کی رائے؟" روبیہ نے حیرت سے انیقہ کی طرف دیکھا۔

"ارے یہی جو رشتوں کی فوج ظفر موج ہے ہمارے اردگرد انہی کے بارے میں اور کیا۔" انیقہ نے جیسے روبیہ کی کم عقلی پر ماتم کرنے والے انداز میں کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔؟"

"ارے روبیہ! کیوں بے چاری کو بار بار ٹوک دیتی ہو؟ کہنے دو۔ ہاں انیقہ بولو۔ کیا کہنا چاہتی ہو تم۔" آریان نے پہلے روبیہ پھر انیقہ کو مخاطب کیا۔ تو انیقہ نے چڑانے والے انداز میں روبیہ کی طرف دیکھا اور گویا ہوئی۔

"ہاں جی ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ہر انسان کی اپنے ماحول اور اردگرد بسنے والوں کے بارے میں اپنی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ باقی سب کیا سوچتے ہیں اس کا تو ہمیں علم نہیں البتہ ہماری رائے سادات نگر کے باسیوں کے بارے میں کچھ یوں ہے۔ ارے...... ارے ایک منٹ۔" انیقہ یوں خاموش ہوئی جیسے اسے کچھ بھول گیا ہو اور وہ یاد کرنے کی کوشش کررہی ہو۔

"ہوں...... تو جناب سفید کرتے شلوار اور دوپٹے میں لپٹی لپٹائی سی یہ ہمارے گھر کی سب سے بزرگ ہستی ہیں۔ ان کے سفید بالوں اور پروقار شخصیت کی طرح ان کا دل بھی اسی قدر قابل تعظیم و تکریم ہے۔ اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس گھر میں سے ہماری سب سے زیادہ دوستی ان ہی سے ہے۔ عرف عام میں انہیں بڑی اماں کہتے ہیں اور خاص یعنی ہم انہیں دادو کہتے ہیں۔ سادات نگر انہی کی راجدھانی ہے۔

اب آتے ہیں گھر کے باقی افراد کے پاس تو جناب سب سے پہلے ہم یہ وضاحت کرتے ہیں کہ اس رائے سے مرد حضرات مستثنیٰ ہیں ہم ان کے بارے میں رائے محفوظ رکھتے ہیں۔" انیقہ کی آخری بات پر روبیہ اور آریان کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"کیوں مرد حضرات کے بارے میں رائے نہیں دی جاسکتی؟"

"دی جاسکتی ہے لیکن اس سے نقص امن کا خدشہ ہے۔ ہاں تو جناب گھر کی سب سے بزرگ خاتون کا تعارف تو ہوچکا۔ اب آتے ہیں اس گھر کی بڑی بہو یعنی تائی جی کی طرف تائی جی ایک معصوم اور بھولی بھالی خاتون ہیں۔ گھر بھر میں کسی کو کوئی تکلیف ہو سب سے زیادہ دکھ تائی جی کو ہوتا ہے۔ اور وہ اس تکلیف کو رفع کرنے کی کوشش میں لگ جاتی ہیں شاعر نے انہی کے بارے میں کہا ہے کہ۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔

کیوں روبی، ہم نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟" انیقہ ایک شان بے نیازی سے بولی۔

"نہیں بھئی ہم میں اتنی جرات کہاں کہ آپ کی کسی بات کو غلط کہہ سکیں۔" روبیہ نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ آریان کو یہ دونوں بہنیں انتہائی پیاری لگی تھیں۔

"نکی...... تم خاموش کیوں ہوگئیں۔" آریان نے انیقہ کو کچھ سوچتے پاکر کہا تو اس نے آریان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے کچھ دیر پہلے کی شوخی ختم ہوگئی تھی۔ چہرے پر ایک سنجیدہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"دراصل جس ہستی کا میں اب ذکر کرنے جارہی ہوں لوگوں کے لیے تو شاید وہ اتنی اہم نہ ہوں۔ لیکن آپی ان کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ہماری سانسوں کا تانا بانا انہی کے مرہون منت ہے۔ آپ کے چہرے کی مسکراہٹ بتارہی ہے کہ آپ جان گئی ہیں وہ کون ہیں جی ہاں آپ نے ٹھیک سمجھا باقی سب کی شہنا پھپھو اور ہماری ماما۔

یہ ایسی شخصیت ہیں جس کے بارے میں ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی کہ اگر کسی نے جنت کو مجسم و متحرک دیکھنا ہو تو وہ ہماری ماما کو دیکھ لے۔" محبت عقیدت احترام جانے کتنے ہی جذبے اس کے لہجے میں سمٹ آئے تھے ایک ماں کی ذات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے۔ لیکن شاید دنیا میں ایسے لفظ ہی نہیں کہ جنہیں گل ہائے عقیدت کی صورت ماں کے قدموں پر نچھاور کرکے ہم یہ سمجھ لیں کہ ہمارا فرض پورا ہوا۔ ہم نے اپنی محبت کا ثبوت دے دیا۔

آریان کی گھنیری پلکوں تلے ماں کی پاکیزہ شبیہہ لہرا گئی۔ کتنا سکون، کتنی طمانیت تھی اس آغوش میں، کتنا پیار تھا ان آنکھوں میں، وہ سکون، وہ طمانیت، وہ ممتا، وہ محبت، سب ہی کچھ اس کی میراث، اس کی جاگیر تھا۔ لیکن آج وہ راستوں کی مٹی تھی۔ گرد سفر کی طرح قافلے کے پیچھے رہ گئی تھی۔ ڈار سے بچھڑی ایک ایسی کرلاتی کونج تھی جس کی سسکیاں، جس کی چیخیں اور مچلنا صرف اس کی ذات کے اندر تک محدود تھا۔ کوئی نہیں تھا جو اس کے اندر جھانک کر وحشت بے اماں میں اس کی خواہشوں کی بے کفن لاشیں ڈھونڈ سکتا۔ پھر کسی کو کیا پڑی تھی بے اثر دعاؤں کے مستجاب ہونے کے منتظر رہنے کی۔ سو پوری دنیا اپنی رنگینیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ "آریان آپی! آپ کیا سوچ رہی ہیں؟" انیقہ نے پوچھا تو وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ سوچ نہیں رہی ہیں بور ہورہی ہیں۔ تمہارے اس طویل و عریض تعارف سے۔ جس کا نہ سر ہے، نہ پیر جس کے ختم ہونے کے کوئی چانس نظر نہیں آرہے۔ اگر تم اسی طرح تعارف پیش کرتی رہیں تو یقیناً" یہ سال یہیں لان میں بیٹھے بیٹھے گزر جائے گا۔" روبیہ کی آواز سن کر انیقہ نے برا سا منہ بنایا۔

"دیکھ لیا آریان آپی! ایسے لوگ ہوتے ہیں شخصی آزادی کو سلب کرنے والے، غیر جمہوری ڈکٹیٹر۔"

"ارے نہیں بھئی! میں ہرگز بور نہیں ہورہی، جس کے پاس تم جیسی اچھی اور مخلص دوستوں کا ساتھ ہو بھلا وہ بور یا دکھی ہوسکتا ہے، اصل میں مجھے اپنی امی یاد آگئی تھیں۔" آریان دھیمے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"آہم...... ہم بھی کافی دیر سے یہ ہی سوچ رہے تھے کہ آج تک ہماری کمپنی سوائے روبی کے بھی کسی کو ناگوار نہیں گزری، پھر آپ کی نفیس طبع ہمیں کیوں نہ برداشت کرپائی، خیر مس روبیہ کے کانوں تک یہ خبر یقیناً" پہنچ چکی ہوگی کہ آریان آپی ہرگز بور نہیں ہورہیں، بلکہ گہری دلچسپی سے ہماری گفتگو سے مستفید ہورہی ہیں۔ لہٰذا امید ہے کہ اب وہ اپنی چونچ بند رکھیں گی۔" انیقہ شرارتی نظروں سے روبیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو اس نے ہونہہ کہہ کر رخ دوسری طرف کرلیا۔

"یہ ہماری بہن کا مخصوص انداز ہے، اس طرح رخ پھیر کر یہ ہمیں باور کرانا چاہتی ہیں کہ اب ان کی ناراضی کا دور شروع ہوگیا ہے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں، یہ رخ پھیر کر اس لیے بیٹھی ہیں تاکہ ہماری باتوں پر جو تاثرات ان کے خوب صورت چہرے پر آئیں وہ ہماری نگاہوں کی دسترس سے محفوظ رہ سکیں۔" انیقہ کی بات سن کر آریان مسکرا دی، جبکہ روبیہ کھسیانی سی ہوکر سیدھی ہو بیٹھی۔

"کیا مصیبت ہے؟ تم باز نہیں آسکتیں۔"

"یہ ہوئی نا بات، ہاں تو نامکمل تعارف کی طرف آتے ہیں۔ اوہو کچن میں اٹھا پٹخ ہورہی ہے۔ یہ...... پلیٹ ٹوٹنے کی آواز ہے، گھبرائیے مت، ہمارے گھر کی ان خاتون کی کچن میں موجودگی کا ثبوت ہی یہ ہی ہے۔ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھیں، یہ ہیں زاہدہ چچی ہمارے خاندان کے اکلوتے ڈاکٹر جناب فواد حسین کی والدہ ماجدہ۔ خاندان بھر میں نیم حکیم کے نام سے مشہور ہیں۔ کسی کو کوئی بیماری ہو، ایسے ایسے دیسی نسخہ جات سے بہرہ مند کرتی ہیں کہ مریض کی زندگی محض ایک معجزہ ہی رہ جاتی ہے۔ ابھی تک فیملی کے افراد ٹھیک ٹھاک ہیں، کیونکہ ان کے بتائے ہوئے نسخہ جات پر عمل نہیں کرتے۔ پورا خاندان حیران ہے کہ زاہدہ چچی کے ہاں اتنے ذہین و فطین بیٹے نے جنم کیسے لے لیا۔ غالباً" وہ ان کی قربت و محبت سے زیادہ فیض یاب نہیں ہوپائے ہوں گے۔" انیقہ کی بات سن کر آریان کے ذہن کے پردے پر ایک ہیولا سا سرسرایا اور پھر عکس بن کر آنکھ کی پتلی پر سمٹ آیا۔

ان تین دنوں میں اس نے محض دوبار ڈاکٹر فواد کو دیکھا تھا۔ انہوں نے سرسری سا اس کا حال چال پوچھا تھا اور بس۔ یوں جیسے وہ اسے یہاں لاکر بھول گئے ہوں یا شاید وہ کوئی بے جان بے وقعت سی چیز تھی جس کا خیال انہیں پھر دوبارہ آیا نہیں۔

"فیضی چچی نہ ہم کسی کے نہ ہمارا کوئی، مکمل تفسیر ہیں، نہ کسی کے معاملات میں ٹانگ اڑاتی ہیں، نہ اپنے معاملوں میں دخل اندازی پسند کرتی ہیں۔ انہیں صرف اپنے میاں اور اپنے بچوں کی ہمہ وقت پروا رہتی ہے۔ لہٰذا یہ سارا دن ہی آپ کو کسی نہ کسی کام میں جتی ہوئی نظر آئیں گی۔ اظہر چچا انہیں کولہو کا بیل کہتے ہیں اور غالباً "غلط بھی نہیں کہتے۔" انیقہ نے فریہ سی فیضی چچی کو ہدف بنایا۔ روبیہ اور انیقہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"نکی... کتنا بولتی ہو تم... تھکتی ہی نہیں؟" روبیہ نے کہا۔

"ارے دنیا میں آزادی رائے کا حق ہر ایک کے پاس ہے۔ ماما اور تم دونوں ہی مجھے بولنے نہیں دیتیں۔ آریان آپی کوئی غیر تو نہیں۔ کم سے کم ان کے سامنے بولنے سے تو مت روکو۔"

"میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ آریان کوئی غیر ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے، بچوں کا تعارف پھر کسی دن پر اٹھا رکھیں گے۔ فیملی کی سب سے ہر دلعزیز شخصیت کا تعارف تو ہونا چاہیے نا۔" انیقہ کی آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ نے کروٹ لی۔

"کون؟" روبیہ نے پوچھا۔

"میری... تمہاری خاندان بھر کی آئیڈیل... حدیقہ چچی۔"

"کیا؟" روبیہ تو جیسے مارے صدمے کے بے ہوش ہونے کو تھی۔

"آئیڈیل... حدیقہ چچی؟"

"ہاں بھئی... اس میں غلط کیا ہے، آئیڈیل بہو کی تمام تر خوبیاں ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آریان آپی! روایات کا حسین ترین نمونہ ہیں ہماری یہ چچی، آئیڈیل بیوی، آئیڈیل بہو، آئیڈیل چچی اور آئیڈیل بھابھی۔" آریان نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ انیقہ کے لہجے میں اسے طنز کا شائبہ سا ہوا۔

"تیس سال سے جڑا ہوا خاندان محض ان کی تن تنہا جدوجہد سے بکھر گیا۔ آئے روز گھر میں ہونے والے جھگڑوں میں بڑی جانفشانی سے کام لیتی ہیں۔ اکثر گھریلو نوک جھوک ان ہی کی تگ و دو کی مرہون منت ہے۔ بڑی اماں کا غرور، چچا، چاچیوں کا محبت بھرا ساتھ اور احساس کا رشتہ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے اور جان لڑا کر توڑا۔ کیا ایک خاتون میں آپ کو یہ سب خوبیاں مل سکتی ہیں۔"

"نکی... بس کرو... چچی نے سن لیا تو فساد کھڑا کردیں گی۔" روبیہ نے لان میں بچھی کرسیوں کی طرف دیکھا جہاں ابھی تک تمام خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ آریان نے سب کی طرف دیکھا۔ جانے کیا بات تھی، بڑی اماں کی طرف اس کا دل کھنچتا تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بڑی اماں کے پاس بیٹھے، ان سے باتیں کرے، لیکن پھر یہ سوچ کر رک جاتی کہ جانے وہ کیا محسوس کریں۔

اس کی پرسوچ نگاہیں بڑی اماں پر جمی تھیں اور ذہن جانے کن بھول بھلیوں میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ شاید انیقہ نے موضوع بدل دیا تھا۔ ماحول اب بھی خوشگوار تھا۔ سب کے چہروں پر اب بھی ویسی ہی مسکراہٹیں بہار دکھا رہی تھیں، لیکن آریان اس ماحول سے یک دم کٹ گئی تھی۔ یوں ہی جیسے بھری بہار میں جب ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہوں، کوئی نوخیز کلی اچانک شاخ سے ٹوٹ کر نیچے آگرے۔

✡ ✡ ✡

سفید براق یونیفارم میں لمبے سیاہ بالوں کی چوٹی گوندھے سادہ سے چہرے کے ساتھ اس وقت وہ ابا میاں کی عدالت میں کھڑی تھیں۔

"مسرت جہاں! آج سے آپ کا کالج آنا جانا شروع ہو رہا ہے۔ آپ کو پک اور ڈراپ کرنے کی ذمہ داری ہم نے شاکر حسین کے ذمے لگا دی ہے۔ یہ بتانے کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ اسکول اور کالج میں انسان پڑھائی کے حصول کے لیے جاتا ہے۔ اس لیے دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں مشغول ہونے کو ہم اچھا نہیں سمجھتے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا، ہم کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

شبیر حسین عمیق نگاہی سے مسرت جہاں کے چہرے کو جانچ رہے تھے۔ شاید وہ نظروں ہی نظروں میں ان کے اعتماد کو ٹٹول رہے تھے کہ کیا ان کے گھر کی یہ حوادث زمانہ سے انجان کلی اتنی مضبوط ہے کہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل سکے۔

"اجلے کپڑے پہننا مشکل نہیں ہوا کرتا بٹیا رانی! ان کے اجلے پن کو برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ گھر سے باہر ضرور جارہی ہیں، لیکن ہر دم اس گھر کی روایات کو اپنے ساتھ رکھیے گا۔ ہم مزید کچھ نہیں کہیں گے، تھوڑے کو ہی بہت جانیے۔" ابا میاں نے بات ختم کرکے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھام لی۔ اماں بی نے ان کے ہاتھ میں پچاس کا نوٹ تھمایا اور وہ دونوں کو اللہ حافظ کہتی ہوئی باہر نکل آئیں۔ باہر آتے ہی فضا میں یوں گہرا سانس لیا جیسے بڑی دیر سے سانس روکے کھڑی ہوں۔ اپنے کمرے میں آکر انہوں نے یونیفارم پر اوڑھنے والا میرون دوپٹہ تہ کرکے فائل میں رکھا اور برقعہ جسے وہ خیمہ کہا کرتی تھیں۔ اوڑھ کر باہر آگئیں۔ شاکر حسین اپنی بائیک چمکانے میں مصروف تھا۔

"آگئی چڑیل! تم بھی میری آزادی سلب کرنے کی کوششوں میں لگی رہا کرو، آؤ بیٹھو۔" مسرت جہاں کو اس کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا، مگر ضبط کر گئیں کہ اگر کچھ کہہ دیتیں تو شاکر حسین نے یہیں سب کچھ بھول بھال جھگڑا شروع کردینا تھا۔ اور ابا میاں کی طلالت کی وجہ سے پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکی تھیں۔ سو بارو ناچار خلاف عادت خاموشی سے بائیک پر بیٹھ گئیں۔ شاکر حسین بائیک اسٹارٹ کرکے گھر سے باہر لے آیا۔ مسرت جہاں پہلے بھی اسکول جاتی رہی تھیں، لیکن آج جانے کیا بات تھی۔ سیاہ نقاب کے پیچھے سے بھی انہیں دنیا نکھری نکھری، اجلی اجلی، نئی نئی سی لگ رہی تھی۔ یوں جیسے کائنات ساری کی ساری بدل کر ان کے سامنے آگئی ہو۔ انہوں نے نئی کتابوں سے بھرا بیگ یوں دبوچ کر سینے سے لگا رکھا تھا جیسے اس میں ہفت اقلیم کی دولت سنبھال رکھی ہو، جس کے کھو جانے کا خدشہ لاحق ہو۔ ان کی آنکھوں کے آگے خوابوں کی سنہری چادر تنی ہوئی تھی۔ جانے ذہن کن سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھا کہ کالج پہنچنے کی انہیں خبر تک نہ ہوئی۔

"ہائے! اب اترنا بھی ہے یا چھٹی تک یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے۔" شاکر حسین کی آواز انہیں حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔ منزل آچکی تھی یا شاید یہ وہ راستہ تھا جو انہیں ان کی من پسند منزل پر لے جاسکتا تھا، وہ بائیک سے اتر آئیں۔

"ایک بجے آجاؤں گا لینے۔ اس درخت کے نیچے میرا انتظار کرنا سمجھیں۔" گیٹ کے بائیں طرف لگے بڑے سے پیپل کے درخت کی طرف اشارہ کرکے انہیں سمجھانے کے بعد شاکر حسین نے بائیک کو گھوڑے کی طرح ایڑ لگائی اور پلک جھپکتے میں یہ جا وہ جا۔

مسرت جہاں تو جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔ کالج کی لڑکیاں ابھی آرہی تھیں۔ وہ بھی ان میں شامل ہو کر کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئیں۔ کہاں گورنمنٹ کا ایک سادہ سا مختصر سی عمارت پر مشتمل سیکنڈری اسکول اور کہاں پوسٹ گریجویٹ کالج۔ جس بات نے مسرت جہاں کو پریشان کیا وہ یہ تھی کہ کالج میں کو ایجوکیشن سسٹم تھا۔ جگہ جگہ لڑکے لڑکیاں ٹولے بنائے کھڑے اور بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پریشان سی وزیٹرز لائی میں کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ غالباً اپنے ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں عدم معلومات نے انہیں کچھ حواس باختہ کردیا تھا۔ بمشکل برقعہ اتار کر تہ کرکے انہوں نے بڑا سا میرون دوپٹہ اچھی طرح اوڑھ لیا۔ عجیب گاؤدی قسم کے لوگ تھے۔ جنہیں بے چاری مسرت جہاں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

ایکسکیوزمی مس! کیا میں آپ کی کچھ مدد کرسکتا ہوں؟" بھاری مردانہ آواز مسرت جہاں کو کچھ پریشان کرگئی' انہوں نے بوکھلا کر اپنے سامنے موجود شخصیت کو دیکھا تھا۔

مہذب لب ولہجہ اور سلجھی ہوئی شخصیت' مسرت جہاں کے بوکھلانے پر وہ بھی قدرے پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ غالباً" اپنی بات کا یہ ردعمل اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

"وہ... سائنس ڈیپارٹمنٹ کس طرف ہے؟" وہ کچھ ہکلا کر اپنا مدعا بیان کرگئیں۔ کسی نہ کسی سے تو انہیں پوچھنا ہی تھا۔ اب اس نے اپنی خدمات پیش کیں تو انہوں نے بھی جھٹ سے اپنا مسئلہ بیان کردیا۔

"آیئے میرے ساتھ۔" وہ آہستہ روی سے ان کے آگے آگے چل پڑا۔ مسرت جہاں کی مثال ایسے اندھے کی طرح تھی۔ جسے بالکل انجان جگہ پر لا کر تنہا چھوڑ دیا جائے اور اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔

"آپ غالباً" نیو ایڈمیشن ہیں؟" وہ جیسے برسبیل تذکرہ پوچھ رہا تھا۔

"جی ہاں!" مسرت جہاں کے حلق سے مری مری سی آواز برآمد ہوئی۔ انہیں تو اپنا پہلا دن ہی بہت کٹھن لگ رہا تھا اور ابھی تو کئی سال پڑے تھے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

"میں یہاں انگلش ڈیپارٹمنٹ میں فورتھ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ فرجاد علی نام ہے میرا۔" وہ اسی طرح ان کے آگے آگے چلتے ہوئے اپنا تعارف بیان کررہا تھا۔ مسرت جہاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہیں اس بات سے بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی تھی کہ وہ کون ہے' کیا کرتا ہے؟ البتہ اس مہربانی پر وہ اس کی شکر گزار تھیں کہ اس کی وجہ سے وہ بھٹکتے رہنے سے بچ گئی تھیں۔

"لیجیے مس! آپ کا ڈیپارٹمنٹ آگیا۔" وہ جیسے کسی بہت بڑی فتح یا کامیابی کا اعلان کررہا تھا۔ مسرت جہاں کے چہرے پر اطمینان اور سکون کا رنگ پھیل گیا۔ شاید انہیں خدشہ تھا کہ وہ کہیں ان کی غلط رہنمائی نہ کررہا ہو۔ لیکن وہ ان کے ارادے کے برخلاف کافی اچھا شخص ثابت ہوا تھا۔

"بہت بہت شکریہ!" منزل پر پہنچتے ہی ان کے حواس اور اعتماد بحال ہوگیا۔

"اٹس اوکے' ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ جانے لگا' پھر جاتے جاتے جانے کیا یاد آیا کہ پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور وہ جو آگے بڑھنے لگی تھیں اسے رک کر اپنی جانب دیکھتا پا کر رک گئیں۔

"میں نے یہ کہنا تھا کہ آپ کے ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ ہی میرا ڈیپارٹمنٹ ہے۔ کسی بھی پریشانی میں آپ بلا جھجک مجھ سے رابطہ کرسکتی ہیں۔" وہ یہ کہہ کر رکا نہیں' آگے بڑھ گیا' مسرت جہاں بھی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئیں۔

باقی کا دن کافی سکون سے گزرا۔ تین' چار پیریڈز لگے تھے باقی دن فری گزر گیا۔ مسرت جہاں کے لیے یہ دنیا انوکھی سی تھی' رنگین اور شاید کسی حد تک پراسرار بھی۔ وہ اپنی فطری سادگی اور معصومیت کے باعث کسی سے زیادہ کھلی ملی تو نہیں تھیں' لیکن انہیں یہ ماحول کچھ عجیب سا ضرور محسوس ہوا تھا۔ کہاں ان کا گھرانہ' پردہ پوش خواتین جو بازار جانے کو بھی گناہ تصور کرتی تھیں اور کہاں یہ فیشن زدہ مغربیت کی دلدادہ لڑکیاں جو لڑکوں جیسے ڈریسز زیب تن کیے بالوں کو آزادی کے نام پر کٹوا کر عجیب و غریب ہیئت بنائے ہوئے تھیں۔ آزادانہ لڑکوں سے میل جول اور دوستیاں گانٹھ رکھی تھیں۔

"شاید اسی لیے ابا میاں مجھے اجازت نہیں دے رہے تھے۔ وہ تو مرد ہیں نا' باہر کی دنیا سے اچھی طرح واقف' شاید انہیں یہ خدشہ ہو کہ میں بھی ان لڑکیوں جیسی ہوجاؤں گی۔" اپنی اس سوچ پر وہ خود ہی ہنس پڑیں۔

"اب ایسی بھی گئی گزری نہیں ہوں میں جو یوں اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگوں۔ ابا میاں کا خدشہ بے بنیاد تھا میں یہ ضرور ثابت کروں گی۔" انہوں نے گویا دل میں مصمم ارادہ کرلیا کالج آف ہوچکا تھا۔ انہیں درخت کے نیچے کھڑے ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ لیکن شاکر حسین کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔ فرجاد بائیک پر سوار ان کے پاس رک کر انہیں آفر دینے کے بعد جاچکا تھا۔ کالج بھی تقریباً" خالی ہوچکا تھا پہلا ہی دن اور ایسی عجیب و غریب سچویشن کا سامنا انہیں شاکر حسین پر غصہ آنے لگا تھا۔

"آجائیں ایک دفعہ' میں کسی طرح گھر پہنچ جاؤں پھر دیکھنا اماں بی سے دس جوتے نہ پڑوائے تو..." سڑک تقریباً" سنسان ہوچکی تھی اور اب مارے خوف کے ان کی جان آدھی ہو رہی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین بوس ہوتیں' سامنے سے آتے شاکر حسین کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آگئی۔ شاکر حسین نے ان کے بالکل سامنے بائیک روکی۔

"آیئے! فوت تو نہیں ہوگئیں ڈر کے مارے۔" انہیں خاموش کھڑے دیکھ کر شاکر حسین ان کا کندھا ہلا کر بولا۔ جواب میں انہوں نے ڈبڈبائی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے ارے' تم تو رونے لگیں۔ سوری بہنا' وقت کا صحیح پتا نہیں تھا میں تو دیکھو ٹھیک ایک بجے پہنچ آیا ہوں اب مجھے کیا پتا کہ کالج ساڑھے بارہ بجے آف ہوجائے گا۔ اگر کالج جلدی آف ہوجایا کرے تو ویٹرز لابی میں میرا انتظار کیا کرنا یہاں نہیں۔" انہیں بہلا پھسلا کر بائیک پر بٹھا کر شاکر حسین گھر لے آیا۔ لیکن ان کا موڈ کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ سو منہ سر لپیٹ کر پڑ گئیں۔ اماں بی کے بلانے پر دن کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ ناسازی طبیعت کا بہانہ کیے پڑی رہیں۔ شاید انہیں اس بات کا غصہ تھا کہ پہلا ہی دن گزرا تھا کالج کا اور پریشانیوں میں گھری رہی تھیں نہ جانے مستقبل میں کیا ہونا تھا۔ شام کو سو کر اٹھنے پر البتہ طبیعت بحال ہی ہوگئی۔

نہا دھو کر فریش ہو کر باہر صحن میں آگئیں جہاں گھر کی خواتین بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ موضوع گفتگو زاہدہ بھابھی تھیں جو چند روز سے اپنے میکے میں مقیم تھیں۔ بابر بھائی جتنے متحمل اور بردبار تھے زاہدہ بھابھی اسی قدر تیز مزاج تھیں۔ اماں بی اور ابا میاں کے ساتھ تو انہوں نے کبھی جھگڑا نہیں کیا تھا۔ نہ ہی گھر کے دیگر افراد کو ان سے کوئی شکایت تھی۔ لے دے کے بچے تھے بابر بھائی تو ان کے پاس شکوے شکایات کے دفتر کھلے تھے۔ جانے کیا بات تھی دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود ایک دوسرے کی بات سمجھ نہ پاتے تھے۔ زاہدہ بھابھی چھوٹی سی بات پر بھڑک اٹھتی تھیں۔ جھگڑا ہمیشہ ان کی وجہ سے طول پکڑتا تھا۔ پھر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد بیچ بچاؤ کرا دیتا تھا۔ لیکن اس بار شاید معاملہ کچھ سنگین نوعیت کا تھا جو وہ فواد اور مہوش کو بھی اپنے ہمراہ لے گئی تھیں۔ اور بابر بھائی میں اس بار کچھ زیادہ ہی خاموش اور بے پروا سے بنے پھر رہے تھے۔

"اماں بی..." مسرت جہاں صحن میں آکر اماں بی کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے؟ زاہدہ بھابھی کہاں ہیں؟ کیا پھر روٹھ کر گئی ہوئی ہیں؟"

"ارے بیٹا! جانتی تو ہو مزاج کی تیز ہے' دل کی بری نہیں' پر یہ بات بابر کو کون سمجھائے۔ روٹھ کر میکے جا بیٹھی ہے' لاکھ کہا بیٹا جا کر لے آؤ۔ اسی مان میں گئی ہوگی کہ میاں منا کر واپس لے آئے گا۔ مگر یہ بھی رٹ لگائے بیٹھا ہے کہ جیسے گئی ہے اسی طرح واپس آجائے' میں لینے نہیں جاؤں گا۔ اور میرا فہدی کے بغیر دل نہیں لگ رہا ہے۔" اماں بی افسردہ سی تھیں۔

"تو اماں بی! آپ خود جا کر لے آئیں۔"

"ہاں شاید اب مجھے ہی جانا پڑے' پتا نہیں زاہدہ میرے ساتھ آتی بھی ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں جاؤں اور وہاں سے خالی ہاتھ بھیج دی جاؤں۔ یہ بے عزتی مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔"

"ارے نہیں اماں بی! زاہدہ کم سے کم آپ کے ساتھ ایسا رویہ نہیں رکھے گی' مجھے یقین ہے۔" شہنا بھابھی عصر کی نماز سے فارغ ہو کر یہیں آبیٹھی تھیں'

ان کی بات سن کر اماں بی نے پرسوچ انداز میں سر ہلا دیا۔ مسرت جہاں جو شاکر حسین کی شکایت کرنے آئی تھیں گھریلو پریشانی میں بھول بھال گئیں۔

☼ ☼ ☼

"ویسے بھابھی فیضی... آپ نے دیکھی ہے وہ لڑکی جو دو تین دنوں سے یہاں آئی ہوئی ہے یا شاید لائی گئی ہے۔" حدیقہ کا انداز تمسخرانہ سا تھا۔ فیضی چچی اظہر چچا کے لیے ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھیں۔

"ارے حدیقہ! ہمیں کیا کوئی کچھ کرتا پھرے... ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے" پھر بڑی اماں نے اسے قبول کرلیا۔ بھابھی شبینا الگ اس کی طرف دار ہیں۔ بھابھی مقسوم کی بھی ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ پھر دیکھنے میں وہ کسی اچھے خاندان کی لڑکی لگتی ہے سلجھی ہوئی باوقار سی۔" فیضی چچی نے گویا بات ختم کرنی چاہی۔

"ارے کیوں کوئی کچھ کرتا پھرے بھرے پرے گھر میں ایسے غلط اقدام کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ پتا ہے کیا نکل سکتا ہے گھر میں بچیاں بھی ہیں کل کو ان کے ذہنوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ لگتا ہے اس گھر کے مکینوں کے لیے پہلا جھٹکا ناکافی تھا۔ ماضی میں پیش آنے والے سانحے سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا ان لوگوں نے۔" حدیقہ کی زبان زہر اگل رہی تھی۔ ان کی کچن کے دروازے کی جانب پشت تھی۔ سو وہ جان نہ سکیں کہ ان کی باتیں سن کر اندر آتی اماں بی کا چہرہ کیسے دھواں دھواں ہوگیا تھا۔ وہ لرزتے قدموں سے واپس پلٹیں دیوار کا سہارا لیا حوادث زمانہ نے ان کے وجود کو ریت کی دیوار سے بھی زیادہ کمزور کردیا تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ اپنے کمرے میں آگئیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

"الہی! عمر کی نقدی ختم ہونے میں کیوں نہیں آتی۔ شبیر حسین آپ مجھ سے زیادہ ٹھیک تھے۔ پرہیزگار متقی تھے۔ سو اوپر والے نے ذلت کی زندگی سے عزت کی موت دی بہتر جانی سانس حلق میں نیزے کی انی کی طرح چبھی ہے۔ زخم زخم وجود لیے کب تک جیوں گی میں۔" وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ کیا ایسا اسم اعظم تھا جو انہیں اس اذیت سے نجات دلا دیتا۔ ماضی کے دھندلکے ان کی آنکھوں کی پتلیوں پر کانچ کے باریک ذروں کی مانند چبھ رہے تھے۔ اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتی وہ اپنے بستر پر نیم جان سی ڈھیر ہوگئیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی مسافر خارزار راستوں پر آبلہ پا چلتا ہوا اذیت کا بحر بیکراں عبور کرکے جب منزل پر پہنچے تو اسے پتا چلے کہ اس کی تو ساری مسافت رائیگاں گئی۔ یہ منزل اس کے لیے تو نہیں تھی۔ اماں بی کی حالت بھی اس وقت ایسے ہی لٹے ہوئے مسافر جیسی تھی۔ اپنے لخت لخت دل کو سنبھالے زبان پر خاموشی کا قفل لگائے آنکھیں بند کیے وہ ماضی کی راکھ تخیل کے ہاتھوں سے ٹٹولنے لگیں۔ یقیناً کوئی چنگاری تھی جس کی حدت وہ اپنی سوچوں میں محسوس کرتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی سورج کی نارنجی شعاعوں پر بادل اپنے وجود کی سیاہی طاری کیے جیسے اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔ پھول پودے نکھر گئے تھے۔ لان کی گھاس تروتازہ ہو کر پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ گھر میں آریان انیقہ روبیہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ زاہدہ چچی کی خالہ جو ایک طویل عرصے سے علیل تھیں۔ ان کے فوت ہوجانے کی اطلاع پر گھر کے تمام افراد ان کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ وہ پشاور کے قریبی شہر نوشہرہ میں سکونت پذیر تھیں۔ اس لیے روبیہ کا خیال تھا کہ سب کی واپسی کل شام سے پہلے نہیں ہوسکتی۔ البتہ ڈاکٹر فواد ایک ضروری کیس کے سلسلے میں کلینک چھوڑنے پر تیار نہ تھے سو وہ گھر پر ہی رہ گئے۔ یوں بھی کسی نہ کسی مرد کا گھر پر رہنا ضروری تھا۔ روبیہ اپنی جاب سے چھٹی نہیں کرسکتی تھی اور انیقہ کے لیے اب یوں سال کے آخر میں کالج سے فرار نقصان دہ تھا۔

"آریان آپی! ایسا کرتے ہیں آج ماما کی راجدھانی میں تخریب کاری کرتے ہیں۔" انیقہ بڑے پرجوش انداز میں بولی۔ وہ تینوں اس وقت روبیہ انیقہ کے مشترکہ کمرے میں براجمان تھیں۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ ڈاکٹر فواد کلینک جاچکے تھے۔ وہ تینوں اب اطمینان سے بیٹھی کاجوؤں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"کیا مطلب؟" آریان نے سوال کیا۔ روبیہ نے بھی بھنویں اچکا کر انیقہ کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ اس قدر بور دن یوں بیٹھے بیٹھے گزرے گا نہیں کتابیں پڑھنے کا ابھی وقت نہیں ہوا۔ سو کچن میں جاکر کوئی نیا نویلا انوکھا اچھوتا سا کام کیا جائے۔ کوئی اسٹائلش سی ڈش تیار کی جائے۔ لنچ کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا اور وقت بھی گزر جائے گا۔" انیقہ نے گویا ایک قیمتی اور مفت مشورہ شیئر کیا۔

"پہلی بات تو یہ ڈیئر سسٹر کہ پڑھنے کا کوئی خاص وقت نہیں ہوتا۔ اور جس قسم کی اسٹائلش ڈش آپ بنائیں گے۔ اگر لنچ میں اس سے استفادہ کیا گیا تو نتائج کی ہولناکی کا تصور ہی لرزا دینے کے لیے کافی ہے اور آخری بات یہ کہ ماما کہہ گئی ہیں۔ فریزر میں چکن مسالا لگا کر رکھے ہوئے ہیں دل چاہے تو وہ تیار کرلینا یا پھر کباب تل لینا۔ روٹی وہ صبح جاتے ہوئے بنا گئی ہیں۔" روبیہ بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولی گویا انیقہ کے کوکنگ کے پلان پر پانی پھیر دیا۔

"کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ گھر ترقی کرجائے۔ جس گھر میں مس روبیہ جیسے ڈکٹیٹر ہوں وہاں جمہوریت بے چاری کی کیا مجال جو دم بھی مار سکے۔" انیقہ کوفت بھرے لہجے میں بولی۔ آریان اب تک خاموش بیٹھی ان کی باہمی گفتگو پر محض مسکرانے پر اکتفا کررہی تھی۔ لیکن لگ رہا تھا جیسے حسب معمول امن عامہ کے متاثر ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔

"روبیہ کیا حرج ہے؟ کوشش کرنے دو۔ کرے گی تو سیکھ سکے گی نا۔" آریان نے انیقہ کی طرف داری کی تو روبیہ خاموش ہوگئی۔ غالباً آریان کی سلجھی ہوئی طبیعت کے باعث اس نے اس سے اختلاف کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

"ٹھیک ہے رینی تم کہتی ہو تو مان لیتے ہیں لیکن ان موصوفہ سے یہ ضرور کہہ دو کہ کچن کا کباڑا نہیں ہونا چاہیے۔ جو چیز جہاں سے اٹھائے استعمال کے بعد وہیں رکھ دے کیونکہ کام والی ماسی جاچکی ہے اور کاٹھ کباڑ پھیلا کر سمیٹنے کی عادت نہیں ہے ان محترمہ میں۔"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ آریان آپی میرے ساتھ ہی تو ہوں گی کچن میں میں پھیلاتی جاؤں گی یہ سمیٹتی جائیں گی کیوں آپی؟" انیقہ شرارت بھرے لہجے میں آریان سے مخاطب ہوئی تو وہ مسکرادی۔ وہ تینوں ہی کچن میں آگئیں۔

انیقہ نے کچن کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ سارے کیبنٹ کھنگال ڈالے اور طے پایا کہ چکن جنجر انیقہ تیار کرے گی۔ سلاد اور جیلی بنانے کی ذمہ داری روبیہ کی ٹھہری اور سویٹ ڈش آریان نے اپنے ذمے لے لی۔ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد جب انہوں نے ڈائننگ ٹیبل پر اپنی اپنی تیار کی ہوئی ڈشیں رکھیں تو تینوں ہی کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ تینوں میز کے گرد بیٹھ گئیں۔

"کتنا اچھا ہو جو فواد بھائی بھی آجائیں۔" انیقہ پلیٹ اپنے آگے رکھتے ہوئے بولی۔

"تھنک آف دا ڈیول اینڈ دا ڈیول از ہیئر۔" ڈائننگ روم کے دروازے سے ڈاکٹر فواد نے اندر جھانکا۔ وہ شاید ابھی ابھی آئے تھے۔ اور گھر میں اپنی فیملی کی عدم موجودگی کے باعث شبینا پھپھو کے پورشن کی طرف آگئے تھے۔

"آیئے بھائی۔" انیقہ کے بلانے پر وہ اندر آگئے اور آگے بڑھ کر انیقہ کے دائیں طرف رکھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"لگتا ہے آج کچن کو کسی اناڑی کے ہاتھ لگے ہیں۔" خوب صورتی سے سجی سجائی ٹیبل کو دیکھ کر انہوں نے ستائش اور شرارت کا ملا جلا انداز اپنایا۔

"بھائی! یہ فاؤل ہے ابھی آپ نے کوئی ایک ڈش

بھی نہیں چکھی۔ رائے کھانے سے پہلے نہیں بعد میں دی جاتی ہے، ویسے آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ صرف ایک ہاتھ کا کمال ہے۔" انیقہ بولی۔

"نہیں خیر ہمارے گھر میں ابھی کوئی اس قدر پریکٹیکل بھی نہیں ہوا کہ اتنا کام تنہا ہی نبٹا لے۔ ویسے اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ اس ٹیبل پر موجود سب سے مشکل ڈش تم ہی نے بنائی ہوگی۔" فواد ہنوز اسی انداز میں گویا ہوئے۔

"کون سی؟" انیقہ کا تجسس اور اشتیاق دیدنی تھا۔

"یہ ہی... جیلی۔" فواد نے جیلی کے باؤل کی طرف اشارہ کیا۔ انیقہ نے ناراضی سے ان کی طرف دیکھا۔

"کاش بھائی! آپ مجھ سے چند دن چھوٹے ہوتے۔" وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔

"ہوں... تاکہ ڈرائنگ روم میں رکھے سارے کشن میرے سر مبارک کی مزاج پرسی کر رہے ہوتے۔" انہوں نے چکن جنجر پلیٹ میں نکالتے ہوئے شوخ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"روبیہ... آپ دونوں نے کیا چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے؟" فواد اب روبیہ اور آریان سے مخاطب تھے۔ ان کی بات سن کر آریان نے قدرے سٹپٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی مخاطب تو روبیہ کو ہی کیا تھا، لیکن ان کی شرارت بھری آنکھیں آریان کے صبیح رخساروں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ نوالہ جیسے اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔ اس نے سامنے پڑا پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔

"روبیہ! تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے؟" فواد، آریان کو مزید بوکھلانے کی بجائے روبیہ سے بات چیت کرنے لگے۔

"ایک دم فرسٹ کلاس..." اس نے جواب دیا۔

وہ روبیہ اور انیقہ کے ساتھ خوش گپیوں کے درمیان کھانا کھاتے رہے۔ آریان کو انہوں نے مخاطب نہیں کیا۔ اس نے بھی چند نوالوں کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اور سر جھکائے بظاہر اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ لیکن اس کی توجہ ان ہی کی باتوں کی طرف تھی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر بعد ڈاکٹر فواد تو کلینک چلے گئے۔ جبکہ انیقہ اپنی بیالوجی کی بک اٹھا کر اسٹڈی روم سدھار گئی۔ روبیہ اور آریان نے مل کر کچن صاف کیا اور کمرے میں آگئیں۔

"رینی! تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" روبیہ اور وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ روبیہ کے پوچھنے پر آریان کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ معدوم ہوگئی جانے کتنے جتنوں سے تو وہ اس مصنوعی مسکراہٹ کو ہونٹوں پر سجائے خود کو جبراً" خوش ظاہر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

"اس دن اماں بی کو بتایا تو تھا اب اور کیا بتاؤں اپنے بارے میں، بہت سادہ سی کہانی ہے۔ ماں، باپ کو دیکھا نہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی رشتے کی ایک خالہ کے گھر میں خود کو پایا۔ خالہ نے سگی ماں سے بڑھ کر پیار کیا اور آج سے چند دن پہلے محبت اور خلوص کا وہ واحد سہارا بھی مجھ سے چھن گیا۔ اس بے اماں دنیا میں اپنی زندگی کی چند سانسیں بچانے کی تگ و دو کر رہی ہوں اور بس... اتنی سی داستان ہے میری۔"

"تو کیا خالہ کا اور کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا؟"

"کیوں نہیں تھے، بہت سے رشتہ داری کے دعوے دار پیدا ہوگئے تھے۔ ان کے مرجانے کے بعد، اس لیے کہ خالہ کی ساری زندگی کی کمائی تین کمروں کا وہ گھر ہے۔ جو مرتے مرتے میرے نام کر گئیں۔ وہ لوگ اس گھر کی خاطر کسی بھی انتہا تک جاسکتے تھے۔ یہاں تک کہ میری جان تک لے سکتے تھے۔" آریان کی بات سن کر روبیہ نے حیرت سے دیکھا۔

"کیا مطلب؟ کیا انسانی جان اتنی بے وقعت ہوتی ہے۔"

"اس سے بھی کہیں زیادہ... ہم انسان مہذب دنیا کے باسی، اپنے اندر کے حیوان کو سلائے، شرافت کا لبادہ پہنے خود کو پارسا بنانے اور ظاہر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن جب بھی اندر کا سویا ہوا حیوان جاگ جائے تو یہ مہذب دنیا جنگل کے قانون اور تہذیب سے بھی بے بہرہ لگنے لگتی ہے۔ ایک طرف کسی مرتے ہوئے کو خون دے کر بچایا جاتا ہے تو دوسری طرف چند سو روپوں کی خاطر، تھوڑی سی زمین کی خاطر کسی کا خون بہایا جاتا ہے۔" آریان کے لہجے میں تلخیوں کا زہر گھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہم عمر تھیں، لیکن تجربے میں آریان، اس سے کہیں آگے تھی۔ اس نے ٹھوکریں کھائی تھیں۔ تلخ حالات کے تھپیڑے برداشت کیے تھے۔ جذبات و احساسات کا خون ہوتے دیکھا تھا، جبکہ روبیہ جو ماں کی نرم گرم آغوش میں دبکی ہوئی تھی۔ وہ دنیا کی تلخ حقیقتوں کا مشاہدہ کیسے کر سکتی تھی، اس کی سوچ اس گھر، اس گھر کے مکینوں، اپنے اسکول اور اپنی جاب سے آگے ہی نہیں جا پائی تھی۔ سو وہ حیرت کا بت بنی آریان کی باتیں سن رہی تھی۔

"رینی! پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ اب کیا کرنا ہے؟"

"یہ ہی سوچا ہے کہ کسی خواتین کی فلاح و بہبود کے ادارے سے رابطہ کروں، کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرلوں کہ زندگی کسی نہ کسی طرح تو گزارنی ہی ہے۔" آریان کے افسردہ لہجے میں محرومیاں چیخ رہی تھیں۔

"پاگل ہوگئی ہو کیا؟ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔" بڑی اماں، ماما ہم دونوں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے۔ اس گھر میں جہاں پہلے سے اتنے افراد بس رہے ہیں کیا تمہارے لیے جگہ نہیں نکل پائے گی۔" روبیہ جذباتی انداز میں بولی۔ تو آریان پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

"روبی! میں کسی کے لیے بوجھ بننا گوارا نہیں کر سکتی۔ یقین کرو تم سب لوگ بے حد اچھے اور مخلص ہو لیکن میں کیا کروں، میرا دل نہیں مانتا کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف ہو۔"

"رینی! تم نے کیا تکلیف دی ہے ہمیں، رہی بات بوجھ بننے کی تو اگر تم زیادہ محسوس کرتی ہو تو میرے ساتھ اسکول میں جاب کرلو۔ اچھی سیلری ملے گی۔ گزارا بہت اچھا گزارا ہوسکے گا۔ لیکن پلیز آئندہ یہ گھر چھوڑنے کی بات مت کرنا۔" روبیہ کے خلوص پر آریان کی پلکیں نم ہوگئیں۔ اسے لگا جیسے اوپر والے نے اس کی خاطر کہیں پڑاؤ کا مقام چن لیا ہے۔ اس کی آبلہ زدہ روح کو قیام کا اذن مل گیا ہے۔

"ٹھیک ہے روبی! میں سوچوں گی۔" وہ کسی گہری سوچ کے زیر اثر بولی۔

وقت نے اسے کتنا بے اماں کردیا تھا۔ کتنا بے وقعت کردیا تھا۔ اس کی ذات تو اب اس کی نظروں میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے زرد خشک پتے سے بھی کہیں زیادہ بے مول ہوگئی تھی۔ زندگی ایک بوجھ کی صورت اس کی دھڑکنوں پر مسلط تھی، اور اسے یہ بوجھ اٹھانا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

اُمِ طیفور

گولڈن بلونڈ شیڈڈ بال، نقلی پلکیں، بہترین ہیراسٹائل، فل میک اپ، جدید تراش خراش کا خوبصورت لباس، عمر لگ بھگ ساٹھ سال یا اس سے زائد۔ چہرے اور گردن کی بے شمار جھریوں کے علاوہ وہ کوکنگ ایکسپرٹ آنٹی اپنے جسم کے کسی زاویے سے بھی اپنی عمر کی چغلی نہیں کھاتی تھیں۔ بڑے اسٹائلش انداز میں نو آموز بچیوں اور عورتوں کو ٹی وی چینل کے ایک پروگرام میں کھانا پکانے کے اسرار و رموز سکھا رہی تھیں۔

عابیہ چینل سرچنگ میں مصروف تھی۔ آج کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا پکایا جائے۔ امی کو رات سے بخار تھا اور اس وقت بھی دوا لے کے سوئی ہوئی تھیں۔ لہٰذا مشورہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ صبح دونوں چھوٹے بھائیوں اور بہن کو اسکول، کالج روانہ کرنے کے وقت سے لے کر ابھی تک بے شمار آئٹمز ذہن میں لا چکی تھی۔ مگر اس کا یہ روز مرہ کی سبزیاں اور دالیں کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لہٰذا ایک کوکنگ چینل پہ ان محترمہ کو چولہے کے پاس کھڑا دیکھ کے سوچا کہ شاید کچھ ہٹ کے پکانے کو سوجھ جائے۔ پروگرام ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ وہ "لڑکی" نما آنٹی ہاتھ پہ ہاتھ رکھے فرما رہی تھیں کہ۔

"آج ہم اللہ تعالیٰ کا جو نام، جو صفت ڈسکس کریں گے وہ ہے "یا مجید" اس نام کا ورد کیا کیجیے۔ اس کی بے شمار برکتیں ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا کہ ہم اللہ کے لیے کیا کرتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ دنیا میں ہم جس بندے سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی پسند ناپسند کے مطابق خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ جو اس کو پسند وہی ہمیں بھی۔ اور جو اس کو برا لگتا ہے وہ ہمیں بھی برا لگتا ہے اگر ہم دنیا کے لوگوں کے لیے اتنے لونگ اور کیئرنگ ہو سکتے ہیں تو جو اللہ کی ذات ہے اس کے لیے کیوں نہیں۔ وہ جو ہمیں اتنی نعمتیں دیتا ہے کیا وہ ہم سے یہ نہیں چاہتا کہ بدلے میں ہم بھی ویسے بن جائیں جیسا وہ چاہتا ہے۔ جن باتوں سے ہمیں منع فرماتا ہے ہم وہ نہ کریں اور اپنی زندگی کو سادہ سے سادہ بنائیں۔ سادگی کو اپنا شعار بنائیں تاکہ ہمارا اللہ پاک ہم سے خوش ہو۔"

"اُف!" عابیہ نے انتہائی کوفت سے چینل بدل کے ریموٹ پٹخا۔ کیسی کھلی منافقت تھی۔ ظاہر اور باطن کا اتنا تضاد۔ جس عورت کا اپنا نخرہ اور فیشن جوان بچیوں کو مات کر رہا ہو، جس کی کیوٹکس کا شیڈ روز بدلتا ہو وہ کس منہ سے یہ کہتی ہے کہ اللہ کو خوش کریں۔ جیسا وہ چاہتا ہے ویسے بن جائیں، عابیہ نے صوفے پہ دراز ہوتے ہوئے سوچا۔

"پھر تو بی بی، تمہیں تو ہر وقت تسبیح لے کر اللہ اللہ کرنا چاہیے۔ تھوڑا پردے کا بھی اہتمام کر لو تو کیا مضائقہ ہے؟ اونہہ صرف باتیں! اس طرح کی باتیں بھی تو آج کل فیشن میں ہیں۔" عابیہ غصے سے مسلسل جھنجلا رہی تھی۔ اسے سخت نفرت تھی۔ ایسی دوہری شخصیتوں سے، بے زار ہو کر وہ دال چاول بنانے کے لیے کھڑی ہو گئی کہ وہ بھی ہر دوسرے فرد کی طرح معاشرتی رویوں سے شاکی تھی، پر کسی کو بدل نہیں سکتی تھی۔

"خود کو بھی نہیں۔"

☆ ☆ ☆

"امی جی! میں نے ہنڈیا بنا دی ہے۔ سالن کا ڈونگا ڈائننگ ٹیبل پر پڑا ہے۔ روٹیاں ہاٹ پاٹ میں اور سب برتن بھی ٹیبل پہ سیٹ کر دیے ہیں۔ ابو جی کے کپڑے واش روم میں ٹنگے ہیں۔ ماثیہ، خرم اور عمر کپڑے تبدیل کر کے آرہے ہیں بس۔ آپ بھی آجائیں، تھوڑا کھانا کھالیں پھر دوا بھی لینی ہے۔ میں ذرا سامنے ماموں کی طرف جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر تک آجاؤں گی کتنے دن سے در شہوار مجھے بلا رہی ہے۔ اور ہاں برتن ماثیہ سے اٹھوا لیجیے گا میں آکر دھو دوں گی۔"

"عابیہ! اللہ کا واسطہ ہے چھوٹی بات کیا کرو۔ میں ڈائننگ روم میں جاتی تو مجھے سب نظر آجاتا کہ تم نے کیا کیا ہے اور کیا نہیں۔" امی نے پیار سے عابیہ کو ٹوکا

جو ان کی نہایت تابعدار اور سگھڑ بیٹی تھی۔ بس اس کے لمبی تمہیدیں باندھنے سے عاجز تھیں۔

"اچھا سوری! آئندہ دھیان رکھوں گی۔ میں جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گی۔" عابیہ کہتے ہی جلدی سے باہر نکل آئی۔ پیچھے سے امی کی آواز سنائی دی جنہیں یکدم یاد آگیا کہ وہ کھانا کھائے بغیر جا رہی ہے مگر وہ سنی ان سنی کرتی نکل گئی۔

عابیہ گیٹ سے باہر نکلی تو اس نے اپنے چہرے اور جسم کو اچھی طرح چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔ ویسے بھی وہ حجاب اوڑھتی تھی۔ اس وقت چونکہ سامنے ہی جانا تھا، سو چادر پر اکتفا کر لیا تھا۔

عابیہ کے چھوٹے ماموں سامنے ہی رہتے تھے درمیان میں صرف ایک چوڑی سڑک تھی۔ اس وقت باہر ہو کا عالم تھا۔ اس تپتی دوپہر میں گھر سے باہر نکلتا بھی کون؟ عابیہ نے ابھی سڑک کراس نہیں کی تھی کہ ماموں کے ہمسائے میں رہنے والی آنٹی حمیرا کی خوبصورت بیٹی انتہائی شاندار لان کے دیدہ زیب پرنٹ میں ملبوس باہر آئی۔ عابیہ نے بغور اس کے خوبصورت کپڑوں کا جائزہ لیا اور سڑک کراس کرنے کے بعد روحا کے پاس آگئی۔ وہ بھی عابیہ کو دیکھ کر ٹھہر گئی تھی۔ حالانکہ اس وقت اسے جلدی تھی۔ اس کی اکیڈمی کا ٹائم ہو رہا تھا اور آٹو والا باہر گیٹ پہ ہی کھڑا تھا۔

"واہ بھئی! ماشاء اللہ بہت خوبصورت پرنٹ ہے اور اچھا بھی لگ رہا ہے۔" عابیہ نے روحا کے سوٹ کا دوپٹہ ایک کونے سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"تھینکس! آج ہی پہنا ہے پہلی دفعہ، مون مارکیٹ سے لیا ہے۔ اف عالی بڑے خوبصورت پرنٹس آئے ہوئے ہیں۔ میں نے خود پانچ سوٹ اکٹھے خریدے ہیں۔" جوش سے بتاتے ہوئے روحا بھول گئی تھی کہ وہ لیٹ ہو رہی ہے۔

"تو نمائش کیا ضروری ہے بی بی! تھوڑا سا خود کو ڈھک بھی لیا کرو۔ اتنے لمبے چاک، ہاف سلیوز اور کھلا گلا کیوں شرعاً ناجائز لباس پہنتی ہو۔" عابیہ نے کھرے کھرے لتاڑ کر رکھ دیا تھا اور اب روحا کے چہرے پہ خجالت اور بے زاری صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سو جان چھڑانے کو جلدی سے بولی۔

"اب ہر کوئی تمہاری طرح تو نہیں ہے نا! مجھ سے اس چلچلاتی گرمی میں دوپٹہ نہیں لیا جاتا، تم حجاب کی بات کرتی ہو۔" روحا اور عابیہ جب بھی ملتی تھیں اس موضوع پہ تکرار ضرور ہوتی تھی۔

"اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے، پھر ملیں گے، ویسے عالی تم کوئی اسلامک سینٹر جوائن کیوں نہیں کر لیتیں تمہاری بھڑاس نکلتی رہے گی۔" روحا نے پٹ سے کہا اور فٹ سے رکشا میں سوار روانہ ہو گئی۔

"اونہہ، بدتمیز ننگی لڑکیاں۔" وہ قہر برساتی نظروں سے رکشا کو دیکھتے ہوئے ماموں کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"آخاہ، عابیہ میڈم اور وہ بھی ہماری طرف۔" اس کے ماموں کی بیٹی در شہوار باہر برآمدے میں بیٹھی کیوٹکس کے شیڈز چیک کر رہی تھی عابیہ کو اندر آتے دیکھا تو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"یہ کیا کھٹ راگ ہے؟ بازار گئی تھیں۔" عابیہ نے کم از کم بھی چھ بڑے بڑے شاپنگ بیگز پہ نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! شادی کی کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ تمہیں تو پتا ہے کس قدر کم وقت رہ گیا ہے۔ کچھ کپڑے اور کاسمیٹکس کا سامان لائی ہوں۔ لو تم بھی دیکھو! میں کولڈ ڈرنک لاتی ہوں ساتھ میں صنویا کو بھی بلا لاؤں رات سے آئی ہوئی ہے۔" در شہوار نے اپنی خالہ کی بیٹی کا ذکر کیا۔

"اچھا! وہ کیوں آئی ہے، خیریت؟ کیا اسی کے ساتھ بازار گئی تھیں؟"

"ہاں، یار! تم سے کہا تھا تو تم نے گرمی کا بہانہ بنا دیا، پھر ان چیزوں میں تمہارا انٹرسٹ نہ ہونے کی وجہ سے ذوق بھی بس ایویں سا ہے۔ تو اب کسی کو تو ساتھ جانا تھا نا۔" در شہوار تفصیل سے جواب دیتی اندر چلی گئی۔

عابیہ نے جلدی جلدی بیگز دیکھے اور پھر کاسمیٹکس کا سامان غور سے دیکھنے لگی۔ ان کے برانڈز چیک کر کے واپس شاپر میں ڈالا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اتنے میں در شہوار اور صنویا کولڈ ڈرنکس لے کر آگئیں۔

"ہاں جناب اب بولو کیسا ہے سب کچھ؟" شہوار نے ٹرے کے لیے جگہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں۔ میں کیا جانوں۔ یو نو ان چیزوں میں میرا ٹیسٹ بالکل بلینک ہے۔" پھر ٹرے سے گلاس اٹھاتے ہوئے سرسری سا پوچھ ڈالا۔

"ویسے کس شاپ سے لی ہیں میک اپ کی چیزیں۔"

"مون مارکیٹ میں ہی ایک شاپ ہے۔ بڑی ورائٹی ہے ادھر خیر چھوڑو۔ پھپھو سے پتا چلا ہے کہ چھ ماہ تک تمہاری دیکھیں بھی کھڑکانے کا ارادہ ہے ان کا، اتنی دفعہ آئی ہو، کبھی ایک دفعہ بھی منہ سے نہیں پھوٹا۔" عابیہ کی منگنی ہوئے چار ماہ ہو چکے تھے اور عنقریب اس کی امی آصفہ بیگم کا ارادہ اس کی شادی کر دینے کا تھا۔

"ایسا نہیں ہے بے وقوف، مجھے مناسب نہیں لگا کہ خود سے شور کرتی پھروں۔ مجھے لڑکیوں کا اپنی شادی کے مسئلے مسائل میں بڑھ چڑھ کے بولنا قطعاً" پسند نہیں۔" عابیہ کا دھیان مسلسل صنویا پر تھا۔

"صنویا تم بھی کچھ بولو بھئی جب سے بیٹھی ہو مسلسل موبائل سے ہی چپکی ہوئی ہو۔" آخر رہا نہ گیا تو صنویا کو ٹوک ہی بیٹھی۔ صنویا کی بھی عنقریب شادی ہونے والی تھی۔ در شہوار اور صنویا کی شادی کی تاریخیں آگے پیچھے ہی تھیں۔ صنویا کی سفیان سے پہلی دفعہ رانگ نمبر پہ ہی بات ہوئی تھی جو ہوتے ہوتے نوبت شادی تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ سفیان کے ساتھ میسجنگ میں اتنی منہمک تھی کہ عابیہ کے ٹوکنے پہ یکدم بوکھلا گئی۔ موبائل بھی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

"نہیں، نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہ بس میں۔" صنویا کو جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ آخر بولی۔

"وہ میری نند کا میسج تھا۔ برائیڈل ڈریس کے لیے کلر پوچھ رہی تھی۔" صنویا کا جواب بے ربط تھا۔ وہ ویسے بھی عابیہ کے صاف گو اور منہ پھٹ انداز سے خائف رہتی تھی۔

"دیکھو صنویا، تمہیں در شہوار کی کزن ہونے کے ناتے ایک مشورہ دوں گی اگر برا نہ مانو تو۔" عابیہ کے نرم لہجے سے متاثر ہوتے ہوئے صنویا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھو میری جان۔" عابیہ نے ٹانگ پہ ٹانگ جماتے ہوئے توقف کیا پھر بولی۔

"اب اپنے اور سفیان کے درمیان تھوڑا فاصلہ پیدا کرو نہیں تو خود تمہارے لیے مشکل ہو جائے گی۔ ایک کام تو تم نے غلط کیا سو کیا۔ سفیان کو فون پہ پھنسا کے، مزید اس سے دن رات کا رابطہ قائم کر کے اپنے سسرال کی نظروں میں خود کو ہلکا مت کرو۔ تھوڑا فاصلہ رکھو۔ آخر شادی تو ہونی ہے نا تھوڑا صبر پیدا کرو اپنے اندر۔" عابیہ نے بڑے ناصحانہ انداز میں صنویا کو بھگو کے جوتا مارا تھا۔ اور اب صنویا کا چہرہ شرمندگی اور خفت سے سرخ پڑ گیا تھا۔ اس سے پہلے اسے کسی نے ایسا احساس نہیں دلایا تھا کہ وہ کچھ غلط کر رہی ہے۔ اس کی دونوں بڑی بہنوں کی بھی اپنے منگیتروں کے ساتھ خاصی گپ شپ رہتی تھی، کبھی کسی نے منع ہی نہیں کیا تھا۔

"عابیہ میں تو سفیان کو بہت ٹوکتی ہوں مگر۔" صنویا نے پہلو بدلتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

"سچ اکثر تو مجھے بھی کہیں بیٹھے ہوئے شرمندہ کروا دیتا ہے اب تم ہی بتاؤ کتنا منع کروں۔" اس کے ساتھ ہی موبائل کا سوئچ آف کر دیا مبادا اسی وقت اس کا فون یا میسج نہ آجائے۔

"ہاں تو ہونے دو ناراض۔ اسے پتا چلنا چاہیے کہ وہ۔" عابیہ کہتے کہتے یکدم رک گئی پھر بھنویں اچکا کے بولی۔

"سوری! تم دونوں غلط کر رہے ہو۔ خیر میرا کیا جاتا

ہے۔ کل کو تمہیں اگر اس نے کوئی طعنہ مار دیا تو شکوہ مت کرنا۔" عابیہ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا جیسے صنوبا اسی کے پاس آئے گی شکوہ کرنے۔

"اوہو۔ کیا ہے بھئی کون مارے گا طعنہ ایسی بھی کوئی آفت نہیں ڈھا بیٹھے یہ دونوں۔" در شہوار نے اکتا کے موضوع بدلنے کی غرض سے کہا۔

"یہ کیا کم غضب ہو گا اگر وہ شادی کے بعد اسے "کھلی ڈلی" ہونے کا طعنہ مار دے۔" عابیہ نے اتنی بڑی بات اتنے آرام سے کہہ دی کہ حیرت سے صنوبا کا منہ اور دیدے پھٹنے کے قریب ہو گئے۔ وہ غصے میں تن فن کرتی میز کو ٹھوکر مارتی اٹھی اور اندر چلی گئی۔ لیکن اندر کمرے میں پہنچ کے اس نے سب سے پہلے سفیان سے رابطہ کر کے اسے شادی تک کے لیے فون اور میسج کرنے سے منع کر دیا۔ کہ عابیہ کی باتوں پہ لاکھ غصہ سہی، اس کا رویہ لاکھ تحقیرانہ سہی مگر اس کی تمام باتیں دل کو لگی تھیں اور نئی فکر میں مبتلا کر گئی تھیں۔ صنوبا نے دیوار گیر الماری میں نصب آئینے میں اپنے سراپے پہ نظر ڈالی اور بے اختیار اس کے دماغ میں لفظ "کھلی ڈلی" چکرانے لگا۔ بے اختیار اس نے جھرجھری لی۔ اس سے پہلے اسے کبھی اس مسئلے کی سنگینی کا احساس نہیں ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عابیہ بیٹا! آج جلدی تیار ہو جانا۔ تمہاری چچی نے خاص جلدی آنے کی تاکید کی تھی۔ تم بھی وہ میرون سوٹ پہن لینا جس کے ساتھ ٹراوزر بنوایا ہے۔ تمہاری ساس بھی آئی ہوں گی۔ دھیان سے تمام کام نبٹا لینا۔" امی عجلت میں اسٹور روم میں داخل ہوتے ہوئے بولیں جہاں عابیہ دھلے ہوئے کپڑوں کو فٹافٹ تہ کر رہی تھی۔ یہیں سائیڈ پہ آئرن اسٹینڈ پڑا تھا۔ صبح فجر کے بعد اسے اس تمام ڈھیر کو استری کرنا تھا۔

"ہزار بار کہا ہے نازیہ کو ساتھ لگایا کر۔ پر تجھ پہ تو کام کا بھوت سوار ہوتا ہے۔ کوئی مفت میں تو نہیں رکھا تنخواہ دیتی ہوں کام چور کو۔"

"امی پلیز، آپ کو پتا ہے نا میں فارغ نہیں بیٹھ سکتی۔ نازیہ کو کوئی اور کام بتا دیجیے۔ میں بھی بس فارغ ہو کے نہانے ہی جا رہی ہوں۔" اس نے آخری دوپٹے کو تہ لگا کر آئرن اسٹینڈ پہ رکھا۔

"ہاں جاؤ جلدی، ابھی تمہارے بالوں کو سوکھنے میں شام ہو جائے گی۔ سنبھالے جاتے نہیں بس بڑھائے چلی جا رہی ہے یہ لڑکی۔" امی بڑبڑاتے ہوئے باہر چلی گئیں۔

"ارے میری پیاری اماں بس ایک دفعہ میری شادی ہو لینے دیں۔ پھر دیکھیں آپ عابیہ کو پہچانیں گی بھی نہیں۔ میں کب اس حجاب اور مشرقی حسن کے عذاب میں پڑنا چاہتی ہوں۔ لیکن کیا کروں انہیں چیزوں نے تو....."

عابیہ کی سوچوں کا تسلسل کا نازیہ کی آواز سے ٹوٹا جو اسٹور روم میں فالتو کرسیاں رکھنے آئی تھی۔

"اے نازیہ! یہ پکڑ لگے ہاتھوں ذرا کپڑوں پہ استری مار۔" تمام تہ ہوئے کپڑے عابیہ نے نازیہ کو دکھاتے ہو کہا۔

"میری واپسی تک کمروں کی بیڈ شیٹس چینج کر دینا اور استری کا کام بھی ختم کر لینا آج رات ادھر ہی رک جاؤ۔ ہو سکتا ہے رات کا کھانا ہاشم کی ماما ادھر ہی کھائیں ظاہر ہے مجھے گھر تک چھوڑنے آئیں گی نا۔" عابیہ کے ذہن میں ہاشم کی پراڈو گھوم گئی۔ جو عنقریب اس کی بھی ہونے والی تھی۔

"عابیہ بی بی! کوشش کرنا جلدی کرنے کی۔" نازیہ عابیہ کی رات رکنے کی فرمائش پہ پریشان ہو گئی تھی۔ پھر بولی۔

"چھوٹا بچہ بیمار ہے میرے بغیر رات کو نہیں سوئے گا اگر آپ کوشش...." نازیہ کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ باہر فون کی بیل سنائی دی اور عابیہ عجلت میں نازیہ کو نظر انداز کرتی باہر نکل گئی۔ اسے ویسے بھی نازیہ اور اس کے بچے میں کوئی انٹرسٹ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

چچا چچی کی طرف خاصی گہما گہمی تھی۔ چچا کا سب سے بڑا بیٹا صیام چار سال بعد آسٹریلیا سے لوٹا تھا۔ یہاں سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے صیام بھائی باہر روانہ ہوئے اور آج چار سال بعد ان کی واپسی نے چچا چچی کو خوشی سے ہم کنار کر دیا تھا۔ کیونکہ ہر ماں باپ کی طرح انہیں بھی بیٹے کے مستقبل کی جانب سے واضح خدشات تھے کہ بیٹا کہیں باہر ہی کا نہ ہو کر رہ جائے۔ لیکن صیام نے ان کا مان رکھا تھا۔ اور آج یہ رونق اسی سلسلے میں تھی۔ عابیہ چونکہ کوکنگ میں ماہر تھی۔ اور مہمان بھگتانا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ لہٰذا اس کا بلاوا اسی سلسلے میں تھا ویسے بھی چچی اس کو پسند کرتی تھیں ان کا ارادہ تو صیام کے لیے تھا مگر یہ کوہ نور ہاشم لے اڑا تھا۔

ہاشم اور صیام بچپن کے دوست تھے۔ ایک ہی ایریے میں رہتے تھے۔ ہاشم جب میٹرک میں تھا تو اس کے والدین نے مکان تبدیل کر لیا تھا۔ مگر ایم بی اے تک دونوں کا ساتھ اور دوستی برقرار رہی تھی۔ صیام کے گھر ہی ہاشم نے عابیہ کو دیکھ کے اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور صرف ایک چچی ہی کیا، خاندان کی اکثر عورتیں عابیہ کو پسند کرتی تھیں اس کی بڑی وجہ عابیہ کا باحجاب سراپا اور رکھ رکھاؤ بھی تھا۔ صورت شکل بھی لاکھوں میں ایک تھی۔ آج بھی پوری محفل پہ چھائی ہوئی تھی۔ سر پہ دوپٹہ ٹکائے جھٹ پٹ چچی کے ساتھ مہمانوں کو بھگتا رہی تھی۔ ہاشم کی ماما بھی اس محفل کا حصہ تھیں اور عابیہ کی کارکردگی کو سراہ رہی تھیں۔ انہیں اس کے چار گز کے دوپٹے اور کہیں آنے جانے کے لیے عابیہ جو حجاب اوڑھتی تھی اس پہ دل ہی دل میں اعتراض ضرور تھا مگر اس کی مخالفت میں وہ کسی کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں۔ آخر کو شرعی مسئلہ تھا۔ انہوں نے دل میں تہیہ کیا تھا کہ شادی کے بعد عابیہ کے گیٹ اپ میں تبدیلی ضرور لائیں گی۔

کھانے سے فراغت کے بعد عابیہ سب کی فرمائش پہ چائے اور کافی بنا رہی تھی۔ جب قریب ہی کھڑی دھلے برتن ترتیب سے رکھتی چچی سے ان کی ملازمہ نے جانے کی اجازت مانگی اور ساتھ ہی کچھ پیسے بھی۔ عین اسی وقت ہاشم کی ماما کچن میں پانی پینے کی غرض سے داخل ہوئیں اور عابیہ جو پہلے کوفت اور بے زاری سے شہناز کی منمناہٹ اور چچی کی پس و پیش سن رہی تھی، "فوراً" الرٹ ہو گئی۔ اس نے محسوس یہی کروایا جیسے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ چچی ابھی بھی بحث میں مشغول تھیں۔

"اونہہ! اتنا سا کام کیا کرا لیا فٹافٹ اضافی پیسے کھرے کرانے کی پڑ گئی تجھے۔"

"بیگم صاحب آپ تنخواہ سے کاٹ لیجیے گا۔ ابھی ضرورت ہے۔" وہ تھوڑا اور گھگھیائی۔

"دیکھ شہنازیہ ہر مہینے کے اضافی ڈیڑھ، دو سو وارا نہیں کھاتے۔"

"اوہو چچی جان کیا ہو گیا ہے آپ کو غریب عورت ہے۔ بے چاری صبح سے کچن میں کھپ رہی ہے اب کچھ ہمارا بھی تو فرض بنتا ہے کہ نہیں۔ یہ دعائیں دے گی تو اللہ بھی خوش ہو گا اور پھر آج صیام بھائی واپسی کا صدقہ کچھ بھی دیجیے، آپ کو بھاری ہے کیا؟" عابیہ نے رسان سے بات مکمل کی اور کھولتے پانی میں پتی ڈال کے ڈھکن لگا دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے عابی بیٹا پر۔" چچی کا دماغ ابھی تک فراخی دکھانے کو راضی نہ تھا۔

"چھوڑیے بھی۔" کارنر میں پڑے چچی کے پرس میں سے دو سو کے نوٹ نکالے۔

"یہ لو شہنازیہ پیسے بھی پکڑو اور میں تمہیں کھانے پینے کا سامان بھی ہمراہ باندھ دیتی ہوں۔"

"عابیہ بچے تم بھی نا بس۔" چچی نے پیار سے عابیہ کا ماتھا چوما۔

"اپنے نام کی ایک ہی ہو، کیوں مسز زبیر؟" چچی خوشدلی سے ہنستے ہوئے ہاشم کی ماما سے مخاطب ہوئیں۔ جو کب سے ایک جانب رکھے اسٹول پہ بیٹھی

یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ شہناز لاؤنج میں جا چکی تھی۔
"میں تو اپنے اللہ کی مشکور ہوں۔" عابیہ کی ساس اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔
"عابیہ جیسی بچی میرے بیٹے کی قسمت میں تھی۔ شکر ہے اس پاک ذات کا۔" (ایڈیٹ، بے وقوف بھلا نوکر بھی سر چڑھائے جاتے ہیں۔ اسے اس بات کی عقل بھی دینی ہو گی۔) مسز زبیر نے دل ہی دل میں سوچا اور اطمینان سے قہوے میں دودھ انڈیلتی عابیہ کو دیکھ کر مستقبل کی پلاننگ کے لیے ایک اور گرہ لگائی۔

☼ ☼ ☼

"اچھا بیٹا فی امان اللہ۔ اچھا بہن جی پھر ملاقات ہو گی۔ ان شاء اللہ۔" مسز زبیر نے امی اور عابیہ کو گیٹ پہ ڈراپ کیا ساتھ ہی ڈرائیور کو سامان اتارنے کا کہا جو چچی نے ہمراہ کیا تھا عابیہ پراڈو سے اترنے کے باوجود ابھی تک اس کا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔
"ارے ایسے کیسے اندر چلیے، ایک کپ چائے تو چلے گی نا۔"
"نہیں نہیں گیارہ بج رہے ہیں۔ پھر کبھی سہی۔ ہاشم کے بابا انتظار کر رہے ہوں گے چلو ڈرائیور۔"
گاڑی جھٹکے سے اسٹارٹ ہوئی اور عابیہ جو اس آس میں گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑی تھی کہ شاید آس پڑوس سے کوئی جھانک کے دیکھے کہ وہ کس شاندار سواری میں آئی ہے۔ مگر لگتا تھا آج سب کے سب افیم کھا بیٹھے تھے۔ مجبوراً اسے جلدی سے دروازہ بند کرنا پڑا اور مرے مرے قدموں سے اپنا گیٹ کراس کر گئی۔

☼ ☼ ☼

"اچھا عابیہ بی بی میں اب چلتی ہوں تمام کام نبٹا لیا ہے میں نے، گھر چلوں اب، کل کی ادھر ہوں۔ چھوٹے کا بخار مجھ سے دور رہنے کی وجہ سے اور تیز نہ ہو گیا ہو۔" نازیہ ہاتھ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے بولی۔
"وہ بی بی دو سو روپے ملیں گے۔ تنخواہ سے کاٹ لینا۔ بچے کی دوا لانی ہے۔" عابیہ جو اپنی وارڈروب میں سر گھسیڑے پرانے کپڑوں کی چھان پھٹک میں مصروف تھی، نہایت ناگواری سے پٹ زور سے بند کرتے ہوئے مڑی۔
"کون سے پیسے، کہاں کے پیسے، ذرا مجھے بھی وہ درخت تو دکھاؤ جو ہمارے ہاں لگا ہے مگر مجھے خبر ہی نہیں اس کی۔ جب دیکھو سو دو سو کی رٹ۔"
"پر بی بی بڑی ضرورت ہے، بچہ بیمار..."
"او بی بی!" عابیہ نے تلملا کے نازیہ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
"یہ دیکھو اس وقت کوئی پیسہ نہیں ہے، سر نہ کھاؤ۔ اپنے بچے کو رات کا فاقہ کرنا خود ہی طبیعت بحال ہو جائے گی۔"
"ہائے اللہ عابیہ بی بی! وہ معصوم تین سال کا بچہ کھاتا ہی کیا ہے جو فاقہ کرا دوں۔ پیسے مانگے ہیں تنخواہ سے کاٹ لینا، بھیک نہیں مانگی۔" نازیہ کو اپنے بچے کی بابت ایسا مشورہ سننا ناگوار گزرا تھا۔
"او نازیہ چپ کر کے جا، میرا سر مت کھا، چل نکل شاباش۔" انتہائی جاہلانہ انداز تھا۔ نازیہ نے تاسف سے اس چہرے دار اور ہمدرد لڑکی کو دیکھا اور آنکھوں کی نمی رگڑتی چلی گئی۔ امی نہانے واش روم سے نکلیں تو نازیہ کی بابت عابیہ نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ جلدی میں تھی گھر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم پھپھو! کیسی ہیں؟" در شہوار نے آصفہ بیگم کے گلے میں پیچھے سے بانہیں ڈالتے ہوئے سلام کیا اور جھٹ سے منہ بھی چوم ڈالا۔ عابیہ کی امی، آصفہ بیگم، بھی بھتیجی کو دیکھ کے کھل اٹھی تھیں، کیونکہ آج بڑے دن بعد در شہوار نے ادھر کا رخ کیا تھا۔
"میری بیٹی آئی ہے، آج پھپھو کی یاد کیسے آگئی باپ کے گھر بیٹھی ہو تو یہ حال ہے کہ مہینوں شکل نہیں دکھاتیں سسرال چلی جاؤ گی تو ہماری شکلیں بھول جاؤ گی۔" انہوں نے بھتیجی کی پیشانی چومتے ہوئے گلہ کیا۔

"نہیں تو پھپھو! بس آج کل بازاروں کے چکروں سے ہی فرصت نہیں۔" در شہوار نے آصفہ بیگم کے ہاتھ سے کڑھائی والا فریم لیتے ہوئے صفائی دی۔
"اور آپ نے بھی تو غیروں کو پیچھے چھوڑ دیا ایک دفعہ نہیں آئیں میری جہیز کی چیزیں دیکھنے۔"
"بس بیٹا یہ گھر کے کام دھندے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ آج آؤں گی عالی کے ساتھ اور براہ مہربانی یہ فریم مجھے واپس کرو ٹانکا الجھا دو گی۔" انہیں اپنے دوپٹے کی فکر لاحق ہوئی جو فریم میں لگا تھا۔
"ہائے پھپھو مجھے بھی بڑا شوق ہے کڑھائی کرنے کا۔" در شہوار حسرت سے فریم واپس کرتے ہوئے بولی۔
"تو بیٹا کبھی فرصت سے آؤ میں تمہیں کچھ ٹانکے سکھا دوں گی۔" انہوں نے چیزیں سمیٹ کے چھوٹی سی ٹوکری میں ڈالیں اور در شہوار سے کہا۔
"عالی کے کمرے میں چلو میں چائے بھجواتی ہوں۔"
"پھپھو ساتھ میں فرائز بھی۔" در شہوار فرمائش کرتی عابیہ کے کمرے کی طرف چلی گئی۔
"اف اللہ! اب کون مصیبت بن کے نازل ہو گیا۔" عابیہ نے جھنجلا کے دروازے کو دیکھا جو زور دار طریقے سے بجایا جا رہا تھا۔ ابھی تو اس نے نائٹی پہن کے صحیح سے خود کو دیکھا بھی نہ تھا کل مانیہ کے ساتھ جا کے مون مارکیٹ سے نیٹ کی سلیولیس نائٹی لے کے آئی تھی اور موقع ڈھونڈ رہی تھی پہن کے دیکھنے کا، ابھی شوق بھی پورا نہ ہوا تھا کہ دروازے پہ رنگ میں بھنگ ڈالنے والا آ موجود ہوا تھا۔
"کھول رہی ہوں بابا! چھری تلے دم تو لو۔" فوراً کپڑے بدل کر دروازہ کھولا گیا تو باہر در شہوار کو کھڑے دیکھ کر سخت تاؤ آیا۔
"او جی آؤ آپ کیسے رستہ بھول لیں میڈم۔" تھوڑا خوش اخلاقی کا مظاہرہ تو کرنا ہی تھا۔
"بس دیکھ لو۔ سوچا آج فارغ ہوں تو تھوڑا تمہارے ساتھ ٹائم ہی kill کر لوں۔" شرارت سے کھلکھلاتی در شہوار عابیہ کو سخت زہر لگی۔
"کمبخت مجھے فالتو سمجھ رکھا ہے، جو ٹائم کل کرنے چلی آئی۔ ادھر میرا نائٹی چیک کرنے کا شوق ہی کل کر دیا۔ ایڈیٹ نے۔"
"اے ہیلو! کیا سوچنے لگیں؟" اس نے مستقل ٹکٹکی باندھے ڈریسنگ ٹیبل کو گھورتی عابیہ سے پوچھا۔
"آں! کچھ نہیں تم سناؤ اور کچھ نئی تازی۔"
"کچھ خاص نہیں۔ ارے ہاں۔" بے ساختہ سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے در شہوار بولی۔
"صنوبا کی شادی کا بتانے آئی تھی۔ باتوں میں لگ کے بھول ہی گئی۔ ایک ہفتے تک مہندی کی رسم ہے۔ شام کو امی کارڈ دینے آئیں گی۔ میں نے سوچا تم سے تیاری ہی ڈسکس کر لوں۔" در شہوار نے ایکسائیٹڈ ہوتے ہوئے تفصیلاً جواب دیا۔
"اچھا واقعی، پھر تو صنوبا کی سہیلیاں خوب تھرک رہی ہوں گی اس خوشی میں۔"
"کس خوشی میں...؟" در شہوار نے ڈریسنگ میں اپنے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔ ویسے بھی اسے عادت تھی آئینہ دیکھتے رہنے کی جہاں دکھ جاتا اس کی نظر بھٹکتی رہتی تھی۔
"ناظرہ ختم کرنے کی خوشی میں۔" عابیہ نے کلس کر جواب دیا۔
"کیا؟" در شہوار نے مصنوعی پن سے چیخ ماری۔
"صنوبا نے ابھی تک ناظرہ ہی ختم نہیں کیا اور مجھے خبر تک نہیں۔"
عابیہ کا دل اس بے نیازی پہ اپنا سر پیٹ لینے کو چاہ رہا تھا۔
"ایڈیٹ، ڈفر شادی، شادی کی خوشی میں۔ اب سمجھ آیا۔ اور ویسے بھی چوبیس گھنٹے فون سے چپکے رہنے سے جان چھوٹنے کی خوشی کیا کم ہے۔" در شہوار نے فوراً سنجیدگی اختیار کی تھی۔
"عابیہ! ایسی بھی بات نہیں تھی اب۔" اسے عابیہ کا یوں کہنا اچھا نہیں لگا تھا۔
"اس دن اتفاق سے تمہارے سامنے کچھ زیادہ ان

ٹیچ ہوگئے تھے دونوں لیکن ایسا ہر وقت نہیں تھا۔ اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے۔ جس دن کی تم سے چار باتیں سن کے گئی ہیں۔ میڈم اسی دن سے موبائل بند کر کے رکھ دیا تھا اس نے۔ ان فیکٹ وہ تو تمہاری شکر گزار بھی ہے کہ تم نے اسے ایک نئے احساس سے متعارف کروایا ہے۔ وہ کہتی ہے۔ جو مزا انجان رہنے میں ہے وہ جان جانے میں بالکل نہیں اسے افسوس ہے کہ کاش وہ مزید کچھ عرصہ اس طرح گزار سکتی۔ جس طرح یہ دو ماہ گزرے ہیں۔" در شہوار اپنی بولی میں مگن تھی اور عابیہ کے دل میں صنوبا کے لیے ایک عجیب سے جلن اور حسد نے جنم لیا تھا جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ شاید صنوبا کے صحیح راستے کا انتخاب کرنا اسے نہیں بھایا تھا۔ آخر عابیہ نے کب چاہا تھا کہ اس سے پرفیکٹ بھی کوئی ہو۔

"السلام علیکم دری آپی! کیسی ہیں آپ؟" مانیہ چائے کی ٹرے لے کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ پکوڑوں کی گرم گرم مہک نے کمرہ مہکا دیا تھا۔

"ٹھیک ہوں گڑیا، تم سناؤ؟ اکیڈمی سے کب آئیں؟" در شہوار نے مانیہ کو گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی ابھی امی نے بتایا کہ آپ آئی ہیں تو سوچا کچھ گپ شپ ہی ہو جائے۔" مانیہ بہت معصوم سی تھی۔ تیزی طراری نہیں تھی سیدھی سیدھی بات کرتی دل کو بہت بھاتی تھی۔

"اچھا کیا۔ میں بھی صرف تم سے ملنے تو آئی تھی۔" در شہوار نے پیار سے اس کا گال کھینچتے ہوئے دل رکھا۔

"اور سناؤ اکیڈمی کیسی جا رہی ہے؟"

"فرسٹ کلاس، آج کل تو بہت مصروفیت ہے، ایگزام ہونے والے ہیں نا۔" ساتھ ہی پلیٹ سے ایک پکوڑا اٹھا لیا۔

"ارے ہاں عالی آپی آج کل روحا باجی میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہوئی ہے۔" مانیہ نے سسپنس پھیلانے والے انداز میں دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" در شہوار نے پکوڑوں کی پلیٹ اپنے آگے کرتے ہوئے کہا۔ جب کہ عابیہ بھنویں اچکاتے ہوئے تنفر سے بولی۔

"کہیں ماڈلنگ تو نہیں شروع کر دیا محترمہ نے۔ ہیں بھی اسی قبیلے کی۔"

"اللہ نہ کرے۔" مانیہ نے دہل کے کہا۔

"بلکہ روحا باجی پردہ کرنے لگی ہیں۔ روزانہ عبایا میں آتی ہیں۔ اور نقاب بھی ڈال رکھا ہوتا ہے۔ سچ بہت بڑی تبدیلی ہے کہاں تو اتنی ماڈرن روحا باجی اور کہاں پردہ... زبردست۔" چائے کا سپ لیتی مانیہ کے لہجے میں روحا کے لیے بے حد ستائش تھی۔

"ارے واقعی! ہمیں تو پتا نہیں چلا، اصل میں کافی دن سے نظر بھی نہیں آئی وہ۔ زبردست بھئی، اللہ جسے چاہے ہدایت دے۔ ویری انسپائرنگ۔" در شہوار چائے کا مگ ہاتھ میں لیے پکوڑے کھانا بھول گئی تھی خبر ہی ایسی تھی۔

"ونہہ ڈرامے بازی۔" یہ آواز عابیہ کی تھی۔

"دو دن کی بات ہے سارے شوق نکل جائیں گے۔ ان محترمہ نے عبایا کو بھی کہیں فیشن ایبل ڈیزائن پہ دیکھ لیا ہو گا۔ ایسی بے باک لڑکیاں زیادہ دن پردے میں نہیں رہ سکتیں۔" عابیہ نے تنفر سے چائے کا مگ ٹرے میں پٹختے ہوئے زہر اگلا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو عالی۔ اللہ اس کو استقامت دے تمہارا دل تو نہیں بھرا عبایا اور نقاب سے۔ آخر تم بھی تو ہم سب لڑکیوں میں واحد ہی تھیں جس نے پردہ شروع کیا تھا۔"

"او ہیلو! اس ہیروئین سے براہ مہربانی مجھے مت ملاؤ۔ مجھے وقتی بخار نہیں چڑھا تھا۔ جب کہ روحا جیسی لڑکیاں جذباتی ہو کے ایسے چولے استعمال کرتی ہیں۔"

"میں چلتی ہوں۔" در شہوار ٹرے میں چائے کا مگ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"عابیہ غرور کا ایک ذرہ بھی اگر ہمارے دل میں ہو گا۔ تو جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ تم تو بہت مذہبی ہو جانتی ہی ہو گی چلتی ہوں، اللہ حافظ۔"

در شہوار تاسف سے عابیہ کو دیکھتی باہر نکل گئی اور اس کے پیچھے ہی مانیہ بھی نہیں تو عابیہ کے عتاب کا نشانہ بنتی۔

"ذلیل، کمینی، مجھے حدیثیں سناتی ہے۔ ارے تم جیسی گندی لڑکیاں میری جیسی پارسائی کے درجے تک پہنچ ہی نہیں سکتیں۔" زور سے دروازہ بند کر کے وہ بڑبڑاتی ہوئی وارڈ روب کی طرف بڑھی۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک دفعہ پھر وہی نائٹی تھی، جسے اکیلے میں اسے چیک کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہاشم کی ماما اور بہنیں آ کے تاریخ طے کر گئے تھے۔ دو ماہ بعد شادی تھی۔ عابیہ کے تو مانو قدم زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کی منزل اس کے بے حد قریب تھی جب وہ اپنی من پسند زندگی جیتی۔ ہاشم لوگوں کی طرف سے بے شمار مٹھائیاں اور پھل ساتھ آئے تھے جن کے اس وقت امی حصے کر رہی تھیں محلے داروں اور رشتہ داروں میں بھجوانے کے لیے جب کہ عابیہ ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس منڈلاتے ہوئے مسلسل اپنے ولیمے کے ڈریس کے کلر سوچ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہاشم کی ماما کا فون آنا تھا۔ انہوں نے رات ہی عابیہ سے فائنل کلر ڈیسائیڈ کرنے کو کہہ دیا تھا اور کہا کہ صبح بازار جانے سے پہلے فون پہ وہ اس کی پسند کا رنگ پوچھ لیں گی۔ ہاشم کی مما نے بتایا تھا کہ ولیمہ کے ڈریس کا بلاؤز سلیولیس ہو گا تاکہ بازو کا زیور نمایاں ہو سکے۔

جس وقت یہ بات ہوئی تھی۔ آصفہ بیگم بھی پوری طرح متوجہ تھیں۔ مگر انہوں نے ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے۔ جن کو بیٹی دی اب جوان کی مرضی سو کریں۔ لیکن مانیہ کو اعتراض تھا کہ آخر ولیمہ والے دن عابیہ آپی اس قسم کے لباس میں اپنے باپ، بھائیوں کو کیسے فیس کریں گی جو کہ عام زندگی میں ایسا لباس بنوانے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اس کا خیال تھا کہ عابیہ جھٹ منع کر دے گی مگر امی کے نظر انداز کرنے اور عابیہ کے نظر چرانے پہ وہ خاصی جز بز ہوئی تھی۔ اور اب جس وقت عابیہ نے اپنا پسندیدہ رنگ اور اسٹائل ڈسکس کر کے فون بند کیا تو کچن کے دروازے کے ساتھ لگی۔ اپنے چائے کے مگ میں چمچہ چلاتی مانیہ عجب بے یقینی کی کیفیت کا شکار تھی۔ یہ تو مانیہ اچھی طرح جانتی تھی کہ عابیہ جو دکھتی ہے وہ اس کا اصل نہیں اور جو اصل ہے اس نے کبھی دکھایا نہیں لیکن یہ باتیں وہ کبھی بھی عابیہ کے منہ پہ نہیں جتا سکی کہ اول تو وہ اس سے چھوٹی تھی اور دوسرے دونوں میں کبھی بھی بے تکلفی نہیں رہی تھی۔ لیکن عمر چھوٹی ہونے کے باوجود مانیہ نے اپنی بہن کا پورا نفسیاتی تجزیہ کر رکھا تھا۔

اس کے نزدیک عابیہ احساس برتری کا شکار ایک ایسی لڑکی ہے جس کا احساس برتری دھیرے دھیرے احساس کمتری میں تحلیل ہو تا گیا۔ جس طبقے سے اس کا

مہر النساء

خواب سراب

تعلق تھا وہاں خوب سیرت، جھینپو، سگھڑ، پھرتیلی لڑکیوں کو پسند کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس نے باشعور ہوتے ہی خود کو سب میں منفرد ثابت کرنے کے لیے وہ تمام خصوصیات اپنائیں اور سونے پہ سہاگہ پردے کا انتظام بھی کیا۔ جس نے اسے خاندان کی خواتین میں ہردلعزیز بنایا لیکن یہ اس کی منزل نہیں تھی۔ اس کی منزل ہاشم اور اس کا اسٹیٹس تھا جسے وہ عنقریب حاصل کرنے والی تھی، اپنی انہیں خصوصیات کی بدولت جن کی بنا پر وہ ہاشم کی نظروں میں آئی تھی۔ عابیہ اپنے احساس برتری کے سبب دوسروں میں اپنی نیکی کا پرچار کرتی رہی۔ اور طعنوں کی صورت لوگوں کے ضمیر جگاتی رہی۔

جس کے نتیجے میں در شہوار، صنویا اور روحا جیسی صاف دل کی لڑکیاں وہ بنتی گئیں، جو کہ عابیہ کا ظاہر تھا۔ ایسے میں عابیہ کی مثال ایک ایسے ڈاکٹر کی سی دی جاسکتی ہے جو دوسروں کی مسیحائی تو کرتا ہے مگر خود اپنا علاج کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اور مانیہ کا خود سے عہد تھا کہ وہ عابیہ کی طرح احساس برتری کا شکار نہیں ہوگی، اور نہ ہی خود کو احساس کمتری کی مار مارے گی۔ حجاب وہ بھی کرتی تھی، بے لباسی اسے بھی ناپسند تھی مگر اس کا زیادہ فوکس صرف اور صرف اپنی اصلاح تھا، دوسروں کے لیے طنز کی پٹاری کھولے رکھنا اسے کبھی پسند نہ تھا۔

مانیہ نے ایک جھرجھری لے کر اپنی سوچوں سے باہر نکلتے ہوئے چائے کا خالی مگ کاؤنٹر پہ رکھا۔ دل بہت بے کل تھا، سوچا لان میں تھوڑی دیر چہل قدمی کرے، تاکہ دماغ کو تراوٹ حاصل ہو کہ اتنے میں عابیہ دبے پاؤں اسٹور روم سے نکلی اس نے دوپٹے کے نیچے ایک پیکٹ دبا رکھا تھا۔ یہ پیکٹ رات اس کی چھوٹی نند نے چپکے سے واپسی کے وقت اسے پکڑایا تھا۔ مانیہ نے انتہائی تاسف اور دکھ سے عابیہ کو دیکھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس پیکٹ میں کیا ہے۔ عابیہ اسی طرح دبے پاؤں چلتی کمرے میں داخل ہوئی اور اب دروازہ بند ہوچکا تھا۔

☆ ☆ ☆

بیڈ پہ بیٹھتے ہی عابیہ نے جلدی سے اس پیکٹ کو کھولا تھا۔ اس میں سے ایک انتہائی قیمتی اور خوبصورت موبائل سیٹ نکال کر ہاتھ میں تھاما، جو کہ ہاشم نے اس کے لیے اپنی بہن کے ہاتھ بھجوایا تھا۔

"واؤ زبردست! یہ تو پچھلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔" خود سے کہتے ہوئے عابیہ نے جھک کے بیڈ کے نیچے سے ایک جوتوں کا خالی ڈبہ نکالا اور اس کو کھول کے ایک پرانا موبائل سیٹ برآمد کیا۔ جو کہ اب اس کے لیے بالکل بے کار تھا۔ مگر اسے بے حد عزیز بھی تھا۔

آخر یہ وہی سیٹ تھا جو ہاشم نے اسے چچا کے گھر پچھلی سائیڈ والے لان میں انتہائی عجلت میں تھمایا تھا۔ اور اتنی ہی سرعت سے عابیہ نے اس سیٹ کو اپنی چادر میں چھپالیا تھا۔ یہ سیٹ یادگار تھا ان کی محبت کی۔ اس پہ پہلی بار ہاشم نے اس سے بات کی تھی۔ اسی پہ وہ دونوں ساری ساری رات میسجنگ کرتے اور دن چڑھنے کا پتا بھی نہ چلتا۔ اور ابھی رات ہی کو تو اس موبائل سیٹ پہ ہاشم سے بات ہوئی تھی اور دونوں نے مل کر اپنے ہنی مون ٹرپ کو پلان کیا تھا۔ یہاں تک کہ دونوں میں ہر طرح کا "موضوع" ڈسکس ہوا تھا۔

"اوہ! کیوٹو میں تمہیں سنبھال کے رکھوں گی، کیا ہوا جو تم پرانے ہو مگر مجھے عزیز ہو کہ تم ہی تو مجھے اور ہاشم کو قریب سے قریب تر لانے کا سبب ہو۔"

اتنا کہتے عابیہ نے پرانے سیل سے سم نکالی اور نئے میں ڈال کر ہاشم کا نمبر ڈائل کردیا۔ آج اسے اپنے بیڈ روم ڈیکور کے بارے میں فائنل ہدایات دینی تھیں کلر اسکیم، پردے، کارپٹ، اُف کتنا کچھ باقی ہے ابھی، ظاہر ہے اسے اپنے معیار پہ تو سمجھوتا نہیں کرنا چاہیے نا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

☆ ☆

کالج کا پہلا دن تھا اور نونو بے حد پرجوش، صبح اٹھ کر اس نے سب کے لیے ناشتا بنایا افشاں بیگم کو چائے کا کپ ان کے بیڈ پر ہی دے آئی۔ خود ناشتا کرنے کے بعد اچھی طرح تیار ہو گئی۔ اس کالونی سے کالج وین جاتی تھی۔ جو اسی کے لیے آتی تھی۔

وہ باہر والے برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ افشاں بیگم باہر آئیں۔ اک نظر بیٹی کو دیکھا۔ سفید یونیفارم میرون دوپٹے میں کھلا کھلا شاداب چہرہ ان کی نظروں سے نونو پزل سی ہو گئی۔

"بہت خیال سے آنا جانا۔ اوٹ پٹانگ سہیلیاں بنانے کی ضرورت نہیں ہے اور اس لڑکی سے تو بالکل دور رہنا۔ اگر مجھے پتا چل گیا کہ تمہاری اس سے دوستی ہے تو بہت بری طرح سے پیش آؤں گی۔ ایسی لڑکیاں دوسروں کو پھنسا کر خود پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ بچی نہیں ہو تم اچھے برے کی تمیز ہونا چاہیے' میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ تم کالج میں ایڈمیشن لو...... امتحان پرائیویٹ بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن تمہاری ضد کی وجہ سے مجبور ہو گئی۔" افشاں بیگم اس پر نظریں جمائے کہہ رہی تھیں۔ نونو نے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ اس کی نظروں کا سوال بہت واضح تھا۔

"میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی۔" افشاں بیگم اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر بولیں۔

"اب تو جو بھی تمہارے ساتھ نہیں اس لیے بہت احتیاط کے ساتھ بہت سنبھل کر قدم اٹھانا۔ تم وہاں صرف پڑھنے جا رہی ہو یہ یاد رکھنا۔"

افشاں بیگم کی بات ختم ہونے سے قبل ہی وین گیٹ کے سامنے رک کر ہارن دینے لگی تھی۔

"جاؤ۔" وہ اللہ حافظ بھی نہ کہہ سکی۔ بس بوجھل قدموں سے جا کر وین میں بیٹھ گئی۔

اس نے بھاگتی سڑک پر نگاہ جما کر سوچا۔

"تو پھر یہ سب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے رابعہ طارق۔" اندر سے کوئی جواب نہ پا کر وہ رخ بدل کر وین میں موجود لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔

کالج میں نئی کلاسز کے پرجوش اور پر رونق چہروں کی بہار تھی۔ وہ خاموشی سے گیٹ کے پاس گراؤنڈ میں فوارے کے پاس جا بیٹھی، سائنس ڈیپارٹمنٹ دوسری طرف تھا اور اسے وہاں نہیں جانا تھا۔ اس کے سامنے سے بہت سے جانے پہچانے چہرے گزرتے چلے گئے۔ وہ ایک طرف بیٹھی رہی اسے اپنی پرانی کلاس فیلوز کے سوالوں کے جواب نہیں دینے تھے۔

کتنے نمبر آئے...... کون سے سبجیکٹ لیے سائنس کیوں نہیں لی وغیرہ وغیرہ۔

"نونو۔" جانی پہچانی آواز پر وہ مڑی۔ اس کے سامنے مازا اپنے مخصوص حلیے میں کھڑی تھی۔ صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ اس کے بے حد گھنگھریالے بال بڑھ کر کندھوں تک آ گئے تھے۔ جسے اس نے دو چوٹیوں کی شکل میں گوندھ کر رنگ برنگے بینڈ سے جکڑ رکھا تھا۔

"مازا...... تم یہاں؟" اسے حیرت ہوئی تھی مازا کو دیکھ کر۔

"جہاں تم وہاں ہم......" وہ دھپ سے اس کے قریب بیٹھی۔

"تو کیا تمہارے بھی نمبر۔"

"شکر کرو...... کالج والوں نے کالج میں داخل ہونے دیا۔" مازا نے آنکھ دبا کر کہا اس کی بات پر دونوں ہنس دیں۔

مازا نے اپنے بڑے سے تکونے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک چاکلیٹ نکالا...... کھول کر ایک حصہ اس کی طرف بڑھایا۔ نونو نے ذرا سوچا...... پھر چاکلیٹ لے کر اپنے منہ میں ڈال لیا۔ دونوں پھر سے ایک ساتھ ہنس دیں۔

"پریڈ لینا ہے؟" پانچ منٹ کلاس روم کی کھڑکی سے باہر جھانکنے کے بعد مازا نے بے زاری سے جمائی لیتے ہوئے پوچھا تو نونو نے جھٹ سے گردن نفی میں ہلا دی میڈم ابھی تک نہیں آئی تھیں اور کلاس میں شور و ہنگامہ بپا تھا۔ سب اسٹوڈنٹس اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھیں۔

"اٹھو پھر۔" دونوں کلاس روم سے باہر نکل آئیں۔ کوریڈور کے آخری سرے پر میڈم کا چہرہ دیکھتے ہی دونوں نے دوسری سمت میں دوڑ لگا دی اور کینٹین میں جا کر سکون کی سانس لی۔ جہاں سموسوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا لو گی؟" مازا نے کاؤنٹر پر اپنی مخروطی انگلیاں بجاتے ہوئے شاہانہ انداز میں پوچھا اور غالباً" یہ پہلی بار تھا کہ اس نے خود سے آفر کی۔ ورنہ تو ہمیشہ نونو کی جیب خالی کراتی تھی۔

"سموسے......" نونو نے خوش ہو کر بتایا۔

"دو سموسے۔" مازا نے آرڈر پاس کیا۔

"دو؟" نونو نے حیرت سے مازا کا چہرہ دیکھا۔ اس نے بردباری سے کندھے اچکائے۔

"میں تو خاصا ہیوی ناشتا کر کے آئی ہوں۔ تم نے نہیں کیا۔"

"ہاں کیا تھا؟" نونو نے کہا اور ساتھ ہی پیپسی کے لیے کہہ دیا۔ پیپسی ایک ہی لی۔ ایک ایک سموسہ اور آدھی آدھی پیپسی مازا کی مزید باتوں میں ختم ہوئے۔

"لائبریری چلتے ہیں۔" نونو نے بیگ اٹھاتے ہوئے کہا مازا کا منہ بن گیا۔

"اف! اس بور جگہ پر تمہیں جانے کیا ملتا ہے۔"

"چلو نا...... مجھے کالج آنے کی آدھی خوشی تو یہی سوچ کر ہوئی تھی کہ اب میں اپنی پسند کی کتابیں پڑھ سکوں گی۔" نونو نے اصرار کیا تو ناچار مازا کو اٹھنا پڑا۔

نونو نے "اندلس میں اجنبی" ایشو کروائی اور سب سے کونے والی ٹیبل سنبھال لی۔ کالج آ کر اس نے واحد کام جو بہت شوق سے کیا تھا' وہ لائبریری کارڈ بنوانے کا تھا اب بھی کوئی پریڈ فری ہو یا نہ ہو۔ وہ دو پریڈ لائبریری میں ضرور گزارتی۔ مازا کچھ دیر اخبار پڑھتی رہی بلکہ تصویریں دیکھتی رہی۔ بھرپور بور ہو کر اخبار پٹخ دیا۔

"کالج میں کچھ فیشن میگزین بھی ہونے چاہئیں۔" اس نے اکتا کر کہا۔

"پرنسپل کو مشورہ دو...... وہ تمہیں بتائیں گی۔" نونو ہنس دی۔

"سوچ رہی ہوں۔ ایک عدد موبائل خرید لوں۔"

مازا نے بیگ سے آئی لائنر اور چھوٹا شیشہ نکالا۔ نونو کا دھیان اپنے بیگ کے ایک کونے میں جا اٹکا۔

"خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ عامر سے کہو تمہیں لے دے گا۔" نونو نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ لڑکیاں اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔ کالج میں موبائل لانے کی اجازت نہ تھی۔

"وہ تو کئی بار کہہ چکا ہے۔ میں نے ہی منع کر دیا تھا۔" وہ دل جمعی سے لائنر سے لکیر کھینچ رہی تھی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے لپ اسٹک کو ٹھیک کیا اچھی خاصی لگی ہوئی لپ اسٹک کو ٹشو سے صاف کر کے نئے شیڈ کو لگا کر چیک کرنے لگی۔

"تمہارے پاس ایک عدد موبائل تھا تو۔" نونو کا ہاتھ سائیڈ پر رکھے بیگ میں رینگ گیا۔

"ہوں تھا تو خراب ہو گیا۔" مازا نے مختصراً" کہا اور شیشے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں لائنر سے سج کر کچھ اور خوب صورت لگنے لگی تھیں۔ گلابی ہونٹوں کی چمک لپ اسٹک لگانے سے اور بڑھ گئی تھی۔ نونو کی انگلیاں اپنے موبائل کو چھونے لگیں۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے موبائل نکالا اور ٹیبل پر رکھ دیا۔

یہ سیل فون بیلنس کے بغیر بے کار ہی تھا۔ مازا نے حیرت سے دیکھا۔

"کس کا ہے؟"

"میرا۔" اس نے مختصراً" جواب دیا۔

"بوائے فرینڈ......؟"

"نہیں نہیں...... وہ۔" خریدا ہے کہتے کہتے رک گئی۔

"واؤ۔" مازا نے موبائل الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر کچھ نمبر پریس کر کے کان سے لگایا۔

"کسی لڑکی نے دیکھ لیا تو پرنسپل سے شکایت کر دے گی۔" نونو نے گھبرا کر کہا۔

"اوں ہوں...... نو بیلنس۔" مازا نے منہ بنایا۔

"بیلنس کہاں سے ڈلواؤں ممی تو اسے رکھنے کے بھی خلاف ہیں۔ ان سے چھپا کر رکھا ہے۔"

"اوہ..." مازا نے ہونٹ سکوڑے۔
"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کارڈ تو میں بھی منگوا سکتی ہوں۔ بلکہ کالج کے پاس جو فوٹو اسٹیٹ کی دکان ہے۔ وہاں ہر قسم کے کارڈ مل جاتے ہیں۔"
"تم مجھے لا دو گی مازا؟" نونو نے جلدی سے کہا۔
"ہاں کیوں نہیں... لیکن ایک شرط ہے۔"
"کیسی شرط...؟"
"کچھ دنوں کے لیے یہ موبائل مجھے دے دو۔"
"ہاں ہاں رکھ لو... میرے پاس تو یوں ہی بے کار پڑا ہے۔"
نونو نے آرام سے اجازت دے دی۔ مازا نے آرام سے موبائل بھی بیگ میں ڈالا اور کھڑی ہو گئی۔
"تھینکس... تم بہت اچھی دوست ہو اب چلیں۔"
نونو کھل کر مسکرائی۔

☼ ☼ ☼

وسیع سرسبز گراؤنڈ میں جگہ جگہ لڑکیاں گروپ کی صورت خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ نوٹس بناتے بناتے نونو کی توجہ مازا کے قصے نے کھینچ لی۔
"میں نے بہت دیر تک دیکھا۔ وہ موٹر سائیکل پر مسلسل ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ سنسان سڑک پر کئی بار تیز رفتاری کے ساتھ ہمارے پاس سے گزرے کبھی سیٹیاں، قہقہے تو کبھی آوازیں کس رہے ہیں ان کے حلیے بھی ایسے ہی تھے اوباشوں جیسے، صبا کے تو پسینے چھوٹ گئے مجھے تاؤ آ گیا۔ دیر سے برداشت کر رہی تھی اب کے جیسے ہی پاس آئے... میں نے گھما کر اپنا بیگ اس کے منہ پر دے مارا۔ موٹر سائیکل الٹا دونوں اس کے نیچے ہم نے دوڑ لگائی اور پوائنٹ پکڑ لیا۔"
لڑکیاں جو حیران سی بیٹھی مازا کا کارنامہ سن رہی تھیں اس کی اس بہادری پر تالیاں بجا کر داد دینے لگیں۔ مازا بے نیازی سے چیونگم چباتی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ نونو نے اس کو بڑی رشک بھری نظروں سے دیکھا۔ ایسی بہادری کا وہ خود تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ مازا کی جگہ ہوتی تو شاید رونے بیٹھ جاتی۔ تب ہی مازا بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔
"مجھے کچھ کام ہے۔" کہہ کر وہ تیزی سے اٹھی اور ایک منٹ میں وہ باڑھ پھلانگ گئی۔ نونو ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ مازا کی وجہ سے اس کی کوئی اور سہیلی بھی نہ بنی تھی۔ مگر وہ اکثر اسے یونہی نظر انداز کر کے چلی جاتی تھی۔ اس کی حرکتیں ایسی ہی تھیں عجیب و غریب...
نونو نے غصے سے کتاب بند کی اور پھیلی ہوئی کتابیں سمیٹنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"میرا موبائل..." اس نے مازا کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ بیس دن ہونے کو تھے۔ مازا نے ابھی تک اسے موبائل واپس نہیں کیا تھا۔ نونو نے پوچھا تو خفا ہونے لگی۔
"یار بیچ کر نہیں کھا گئی ہوں۔ کر دوں گی ایک دو دن میں واپس۔" اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی تھی کسی کی باتوں پر وہ ایک دو دن بیس دنوں پر محیط ہو گئے تھے۔
اب بھی وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔
"پتا نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے۔ جب لڑکیاں دعوت نظارہ دیتی پھریں گی تو لڑکے تو سیٹیاں ہی ماریں گے۔ کل اس کا حلیہ دیکھا تھا۔" ساتھ والے گروپ سے ایک لڑکی بڑے تنفر سے کہہ رہی تھی۔ اپنی چیزیں سمیٹتی نونو ٹھٹک گئی۔ موضوع یقیناً "مازا کی ذات تھی۔
کل مازا خاصا تیار شیار ہو کر آئی تھی۔ تھی تو یونیفارم میں ہی لیکن بالوں کو خصوصی اسٹائل دے رکھا تھا شاید نئی کٹنگ کروائی تھی۔ چہرہ بھی چمک رہا تھا
"کالج کے بعد کسی دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں جانا ہے۔" اس کے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر دور جاتی مازا کو دیکھا۔ وہ لڑکی ابھی تک مازا اور مازا جیسی لڑکیوں کے خلاف بول رہی تھی۔ وہ بوجھل دل لیے کلاس میں آ گئی۔ وہ جانتی تھی لڑکیاں مازا کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتیں پھر بھی

اسے برا لگتا تھا اگلے دو پیریڈ مسلسل تھے۔ دونوں میں مازا غائب تھی۔ فری پیریڈ نونو نے اکیلے کینٹین میں گزارا۔ اکنامکس کا پیریڈ بھی گزر گیا۔ وہ کچھ بددل سی ہو کر لائبریری میں آ گئی۔ وہاں مریم اپنے گروپ کے ساتھ بیٹھی تھی اسے تنہا دیکھ کر مریم نے سوال کیا۔
"کیسی ہو نونو؟"
"ٹھیک ہوں... تم سناؤ؟"
"تم نے سائنس کیوں چھوڑ دی؟"
"آرٹس کیسی لگ رہی ہے؟"
"جوجو کہاں ہے؟"
جوجو کے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کا سن کر سب کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ ایسی ہی تھی۔ بے حد ایمبیشس۔
"مجھے یقین تھا اس کا ایڈمیشن ضرور ہو گا۔" فریحہ ستائشی انداز میں کہہ رہی تھی۔ لائبریرین کی ڈانٹ اور شرمندگی کی وجہ سے نونو فوراً "کتابوں کے ریک کی طرف مڑ گئی۔
"تم اب تک مازا کے ساتھ ہو؟" مریم کی آواز پر وہ چونک کر پلٹی۔ وہ بھی قریب کھڑی کتابیں دیکھ رہی تھی۔
"ہوں۔"
"میں نے آج تک اس لڑکی کے ہاتھوں کسی کو فیض پاتے نہیں دیکھا۔"
"تم شروع سے اس کے خلاف ہو۔" نونو نے کہا۔
"کیونکہ وہ شروع سے ہمارے محلے میں رہتی ہے۔" مریم نے برجستہ بتایا۔
"محلے کا سب سے پسماندہ اور غریب گھرانا..." نونو کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری جسے مریم نے سہولت سے نظر انداز کر دیا۔
"اس کی بہنوں کا کردار بھی سب کے سامنے ہے۔ کن لوگوں کا ان کے گھر آنا جانا ہے یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں محلے میں کوئی بھی انہیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔"
"تمہیں شرم آنی چاہیے دوسروں پر الزام تراشی کرتے ہوئے۔" نونو کو برداشت نہیں ہوا ایک لڑکی کے منہ سے دوسری لڑکی کی کردار تراشی۔
"اور وہ خود... خود کیا کرتی پھر رہی ہے؟" مریم پر اس کی بات کا مطلق اثر نہیں ہوا۔
"وہ کالج سے باہر کیا کرتی پھرتی ہے۔ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ کالج میں وہ میری مخلص دوست ہے بس۔" نونو نے قطعی انداز میں ناگواری سے کہا۔
"اپنے غلط مقاصد میں دوسروں کو استعمال کرنا اخلاص ہے؟" مریم نے سوال کیا پھر نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔
"تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ باعزت گھرانے سے تعلق ہے۔ اس لیے نصیحت سے باز نہیں رہ سکتی کاش جوجو جیسی تھوڑی سی سمجھ داری تمہارے اندر بھی ہوتی۔ تم اس وقت جذباتی ہو کر اس کے بارے میں سوچ رہی ہو ٹھنڈے دل سے سوچنا وہ کیا کرتی رہتی ہے اور کیا وہ سب مناسب ہے؟"
"نصیحت کا شکریہ۔" نونو نے قدم موڑے۔
"مازا کی تلاش میں جا رہی ہو۔ وہ کالج میں نہیں ہے۔"
"کہاں ہے؟" نونو نے بے اختیار پوچھا۔
مریم کے لبوں پر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ ابھری۔
نونو نے وہاں سے چلے جانا ہی مناسب سمجھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔" نونو نے مازا کو پہلا پیریڈ لینے سے روک دیا۔
"کیا بات؟" مازا نے بھنویں اچکائیں۔
"چلو۔" دونوں کلاسز کی پچھلی طرف نکل آئیں۔ چھوٹا سا باغیچہ خالی تھا۔
"تم کل کہاں تھیں؟" مازا بینچ پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئی۔ نونو نے دیکھا اس کے پیروں میں نئے جوگرز تھے۔ مازا نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے بیگ سے چیونگم نکالی اور ریپر اتارنے لگی۔ نونو

نے اس کے ہاتھ سے چیونگم چھین کر دور پھینک دی۔

"میرے سوال کا جواب دو۔ تم کل کالج سے کہاں گئی تھیں؟"

"عامر سے ملنے۔" اس نے اطمینان اور قدرے ڈھٹائی سے بتایا۔

"تم ..... تم جانتی ہو یہ غلط ہے ..... لڑکیاں کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ تمہارے بارے میں، تمہارے گھر کے بارے میں۔"

"کیا ....؟" پاؤں کو ہولے ہولے جھلاتے ہوئے مازا نے سوال کیا تو نونو گڑبڑا سی گئی۔

"وہ کہتے ہیں کہ تم لوگ ....."

"میری طرف سے سب جہنم میں جائیں۔ میں کیا کرتی ہوں کیا نہیں یہ میرا پرسنل معاملہ ہے۔" مازا ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

"تمہیں یا ان لڑکیوں کو تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔"

"مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ کیوں کہ تم میری سہیلی ہو۔ تمہاری وجہ سے وہ مجھ پر بھی انگلیاں اٹھائیں گی۔ میں کس کس سے تمہارے لیے لڑوں۔ وہ بھی اک ایسی بات کے لیے جو سراسر غلط ہے۔"

"تمہیں ضرورت کیا ہے میرے لیے لڑنے کی۔ میں اکیلی ہی کافی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" نونو نے دونوں ہاتھ اٹھا کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اگر تمہاری یہی روش رہی تو میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" مازا نے قدم آگے بڑھا دیے۔ اس کی اس درجہ لاپروائی و بے نیازی نے نونو کو ایک پل کے لیے گنگ سا کر دیا۔ دوسرے پل وہ بھاگتی ہوئی گئی اور اسے بازو سے پکڑ کر روکا۔

"اب کیا ہے؟"

"میرا موبائل واپس کرو۔"

مازا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ پھر بیگ میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا اور نونو کی ہتھیلی پر پٹخ دیا۔ نونو نے پہلے موبائل کو دیکھا۔ پھر دور جاتی مازا کو اور دل گرفتی سے بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ جذباتی بلیک میلنگ سے کام لے کر مازا کو روک لے گی۔ مگر مازا ایک پل میں سارے تعلق ختم کر کے چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم اندازہ ہی نہیں کر سکتیں اس گھر کے مسائل کا جس کے گھر میں نو بیٹیاں پیدا ہوں اور بیٹا کوئی بھی نہیں مہنگائی، بے روزگاری سارے سکون کو کھا جاتی ہے۔ مگر تم کیا جانو تمہارے گھر باہر سے آمدنی آ رہی ہے۔ تم کیا جانو ان والدین کے دکھ، جن کی نو بیٹیاں بیاہنے والی ہوں۔ میری ماں خاندان کے کسی فنکشن میں چلی جاتی تو بیٹوں کی مائیں رخ بدل لیتیں ان کے سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہ کرتیں۔"

مازا دھیرے دھیرے بول رہی تھی اور نونو ہمہ تن گوش تھی۔ دونوں فوارے کے کنارے بیٹھی تھیں۔ فوارہ بند تھا اور اس میں سبز کائی جم رہی تھی۔ بہت دن کی ناراضی کے بعد مازا نے آج خود ہی اسے پکڑ لیا اور نونو تو جیسے بہت دنوں سے منتظر تھی۔

"آج کے دور میں کون آتا انہیں بغیر جہیز کے بیاہنے، تو کیا حرج تھا اگر میری بہنوں نے ماں باپ کی دہلیز پر اپنی زندگی کو روگ لگانے کے بجائے اپنے لیے راہیں متعین کر لیں انہوں نے اپنے لیے اچھے رشتے ڈھونڈے۔ محنت تو اس میں بھی کرنا پڑتی ہے۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ انہوں نے اپنی نیک نامی کھوئی اور اچھی زندگی پالی۔ والدین کے گھر کنواری بوڑھی ہو جاتیں تو سب ان کے گن گاتے۔ اب وہ خوش حال ہیں تو زمانے کو دورے پڑ رہے ہیں۔ بھاڑ میں جائے سارا زمانہ اپنے اس فرسودہ خیالات کے ساتھ کیوں، ہم اس کی نام نہاد روایات کی دیوار کے پیچھے گلتے سڑتے رہیں۔ ہمارے پاس دماغ ہے خوب صورتی اور جوانی ہم اپنا راستہ خود ڈھونڈ سکتی ہیں۔ کیوں نونو! کیا یہ غلط ہے؟"

مازا نے اچانک ہی سوال کیا۔ نونو مخمصے میں پھنس گئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ صحیح کام غلط طریقے سے کیا جائے تو نتیجہ بھی غلط ہی سامنے آئے گا۔ مگر سامنے مازا اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"زندگی میں روپے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، تم خود بتاؤ سسک سسک کر زندگی گزاری جا سکتی ہے؟ اور پھر لائف پارٹنر کے پاس سب کچھ ہو تو کتنا اچھا لگتا ہے لو میرج کا تو اپنا ہی چارم ہے۔" اس کے بعد مازا نے لو میرج کے فوائد پر روشنی ڈالی۔

"یہ محبت ہر کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔ کبھی کبھی یوں ہی خواری ہی مقدر ہوتی ہے۔" اس نے یاسیت سے کہا تو مازا نے زور سے نفی میں سر جھٹکا اور بولی۔

"عقل ہونی چاہیے سویٹ ہارٹ عقل ..... پھر سب مل جاتا ہے۔"

"لیکن نصیب ....."

"سب بے کار لوگوں کی باتیں ہیں نصیب، مقدر ..... جب کچھ نہیں بن پڑتا تو نصیب کو رونے لگتے ہیں۔" مازا نے نخوت سے کہا۔

"اچھا تو تم اپنی عقل سے کوئی اچھا بر کیوں نہیں پا لیتیں۔ عمر کس لیے عامر وغیرہ کے پیچھے خوار ہو رہی ہو؟" نونو نے تاک کر نشانہ باندھا۔

"نہیں یار! یہ سب اپنی منزل نہیں۔" مازا نے لاپروائی سے کہا۔

"کیا؟" نونو اچھل ہی پڑی۔

"دفع ہو مازا میں نہ جانے کیا سمجھتی رہی۔"

"یہ تمہارا قصور ہے۔"

"سنو! اب تو تم مجھ سے خفا نہیں ہو؟"

"میں تم سے خفا نہیں ہوں مازا! لیکن اب بھی میں یہی کہوں گی یہ کالج چھوڑ کر جانا بالکل ٹھیک نہیں۔"

"او کے ..... او کے اب اس ٹاپک کو بند کرو اور اپنا موبائل دو مجھے۔"

"وہ تو میں گھر میں ہی رکھ کر آتی ہوں۔"

"تاکہ تمہاری ممی دیکھ لیں۔"

"جی نہیں ..... چھپا کر آتی ہوں۔" دونوں پھر سے شیر و شکر ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

گھر میں بھی موڈ خاصا موشگوار رہا۔ نونو نے افشاں بیگم کے ساتھ کچن سمیٹا۔ برتن دھوئے اور پھر اپنے کمرے میں آ کر آرام سے بستر پر دراز ہو کر تسلی کے ساتھ ساتھ موبائل کھول لیا۔ تین میسج آئے تھے۔ جس دن سے مازا سے موبائل واپس ملا تھا۔ ایسے ایس ایم ایس ملتے ہی تھے۔ نونو نے حسب معمول وہ ایس ایم ایس پڑھ کر ڈیلیٹ کرنے شروع کیے۔ لیکن تیسرے ایس ایم ایس پر وہ بری طرح اچھل پڑی۔ اسے اس کے پورے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

"تم کون ہو .....؟" بہت سوچ کر نونو نے جھجکتے ہوئے ایس ایم ایس کیا۔ پھر پیغامات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فارورڈ میسجز تھے۔ بے ہودہ لطائف اشعار اور اقتباسات۔

"تم کون ہو؟" نونو نے پھر سوال کیا۔

"کیا کرتے ہو۔"

"تم سے پیار۔" ایسے بے باک جواب پر وہ دھک سے رہ گئی۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں۔" فوراً جواب ملا۔

"میرے بارے میں کیا جانتے ہو۔" اس نے پیغام بھیجا اور انتظار کرنے لگی۔

اس بار جواب آنے میں ایک دو لمحوں کی دیر ہوئی۔ یہ ایک دن کی بات نہ تھی۔ جس دن سے موبائل مازا کے پاس سے ہو کر آیا تھا۔ مسلسل میسج آ رہے تھے۔ ایسے میسج کہ جن کے سحر سے وہ سارا دن نہ نکل سکتی۔ خوب صورت شاعری، مسحور کن الفاظ اس کا بہت بار دل چاہا کہ مازا سے ان کا ذکر کرے۔ مگر پھر جھجک سی آڑے آ جاتی۔ بہر حال جو کوئی بھی تھا مازا کا واقف ہی تھا۔

ایس ایم ایس آ گیا تھا۔

"رابعہ طارق، فرسٹ ایئر، آنکھوں اور بالوں کا رنگ

ڈارک براؤن' رنگ فیئر' گھر جس میں بہت سے املتاس کے درخت ہیں 'کتابیں پڑھتی ہو۔ نرم مزاج ہو ایک بہن ہے جو میڈیکل میں ہے ابا باہر ہیں بھائی اچھی جاب کرتا ہے ...... جی بلاک میں رہتی ہو کہو تو کل آجاؤں ملنے؟"

نونو نے گھبرا کر موبائل آف کر دیا۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"کون ہے یہ؟" میرے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتا ہے۔

"اتنا کچھ نہیں سب کچھ...... سب کچھ جو...... جو مازا جانتی ہے۔" اس کے ذہن نے ایک دم کلک کیا۔ "مازا کی بچی۔" اسے بے طرح غصہ آیا۔

"کس کس کو میرے بارے میں بتاتی رہتی ہے۔ یا اللہ اور اگر جو کل وہ آ گیا تو......؟" نونو نے گھبرا کر موبائل آن کیا دو میسج فوراً" آ گئے۔ نونو نے پہلا میسج کھولا۔ تب ہی دروازہ کھلا اور کوئی تیزی سے اندر آیا۔ اتنی تیزی سے کہ وہ موبائل چھپانا بھول گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا وہ ساکت نظروں سے ششدر سی آنے والی کو دیکھ رہی تھی۔ مگر امی اس کی سمت دیکھے بغیر ہی الماری کی طرف بڑھ گئیں۔

"نونو میرا شناختی کارڈ تمہاری الماری میں رکھا تھا۔" نونو نے اپنا موبائل اپنی ٹانگ کے نیچے دبا لیا تھا۔

"وہ ممی الماری میں ہی ہو گا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ تب ہی نونو اچھل پڑی۔ اس کی ٹانگ کے نیچے موبائل وائبریٹ ہو رہا تھا۔ اس نے چور نظروں سے امی کو دیکھا۔ شناختی کارڈ لے کر ہی امی وہاں سے چلی گئی تھیں۔ نونو نے ایک طویل سانس خارج کی' جھٹ سے موبائل نکالا اس سے قبل وہ دروازہ لاک کرنا نہ بھولی تھی۔

"کیا ہوا ڈر گئیں؟" اسمائل کرتے آئی کون کے ساتھ میسج آیا۔

"میں کیوں ڈروں گی۔" نونو نے جواباً" میسج سینڈ کیا۔

"ایسی معلومات تو کوئی بھی دے سکتا ہے۔ لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے۔"

"لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے؟" اس کا میسج سوالیہ نشان کے ساتھ دوبارہ آیا۔

"تم مجھے فلرٹ سمجھ رہی ہو؟"

"کیا یہ فلرٹ نہیں ہے؟"

"بے وقوف لڑکی اسے محبت کہتے ہیں۔"

"محبت......" نونو نے زیر لب دہرایا۔ دل میں عجیب سی اتھل پتھل ہونے لگی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی اسی دوران کال آنے لگی تو نونو نے کال ریجیکٹ کر دی پھر فوراً" ہی میسج آیا۔

"میری کال ریسیو کرو۔"

"نہیں۔" نونو نے گھبرا کر موبائل ہی آف کر دیا۔ دل الگ دھڑک دھڑک کر پاگل ہو رہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار کسی نے یوں اس سے اپنی محبت کا اعتراف کر کے تو خیر جذبوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ اس نے تیار زمین پر چپکے سے بیج بو دیا تھا۔ ضرب ہمیشہ وہیں پڑتی ہے۔ جہاں کمزوری دکھائی دے۔ اور اس کا دل تو ویسے بھی کمزور تھا۔

اس نے ہاتھ نکال کر سرہانے پڑا موبائل اٹھا کر آن کیا۔ مگر ابھی آن ہی کیا تھا کہ اس کی کال آنے لگی۔ نونو نے پھر سے آف کر دیا۔ وہ ابھی اس سے بات کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھی۔

وہ ساری رات اس کی سوتے جاگتے گزری تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں کچھ دکھانا ہے۔" وہ اسے کھینچ کر درختوں کے پیچھے لے گئی۔ اک گھنے درخت کی اوٹ میں دونوں چھپ کر بیٹھ گئیں۔

"جس دن سے میں نے موبائل تم سے واپس لیا ہے۔ طرح طرح کے نمبروں سے کالز آئی ہیں۔ یہ بندہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔" نونو نے ناراضی دکھانے کی کوشش کی۔

"تم جواب دیتی ہو' اسی لیے پیچھے پڑا ہے۔" مازا نے آرام سے کہا۔ نونو خجل سی ہو گئی واقعی وہ اس شخص کو نظر انداز کر دیتی تو وہ کیوں اتنا آگے بڑھتا۔

"میں نے تو بس یونہی۔"

"ہاں تو وہ بھی بس یونہی۔" مازا ہنس دی۔

"تمہیں ضرورت کیا تھی۔ میرا نمبر کسی کو دینے کی۔"

"سم بدلوا دو۔" نونو چپ چاپ لب چبانے لگی۔ مازا نے غور سے اسے دیکھا پھر مسکرائی۔

"اب مسئلہ کیا ہے؟"

"وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔" نونو نے آہستگی سے بتایا۔

"تو کر لو۔"

"واہ! میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں۔" نونو بولی۔

"ایسی ویسی لڑکی کیا ہوتا ہے۔ تم کیا اس کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہی ہو۔ بات کر لو اچھا نہیں لگا تو صاف منع کر دینا زیادہ تنگ کیا تو سم بدل لینا۔"

"لیکن...... وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے میرے گھر کا ایڈریس تک' مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"آج کل کیا مشکل ہے۔ کسی کا ایڈریس حاصل کرنا...... دنیا بہت مختصر ہو گئی ہے پریشان نہ ہو۔" اس نے موبائل پر نمبر ملا کر کان سے لگا لیا۔

"زہے نصیب کہاں تو کال ریسیو کرنے سے کترا رہی تھیں۔ کہاں خود سے نمبر ملا بیٹھیں۔ اسے بھول سمجھوں یا اپنی خوش نصیبی۔" دوسری طرف سے چھوٹتے ہی پوچھا گیا۔ مازا لاؤڈ اسپیکر آن کر چکی تھی۔ نونو بری طرح اچھلی اس نے مازا سے موبائل چھیننے کی کوشش کی۔ مگر اس نے ہاتھ روک لیا۔

"جو مرضی سمجھیں صرف اتنا بتا دیں۔ آپ میری دوست کو تنگ کس خوشی میں کر رہے ہیں۔"

"اوہ تو...... آپ رابعہ نہیں ہیں؟" اس نے ایک مایوس سی سانس بھری۔

"جی...... میں رابعہ نہیں آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

"اس کا جواب اپنی بھولی بھالی دوست سے کو میں ٹیک کر رہا ہوں یا وہ......"

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ میری دوست نے ایسا کیا کر دیا۔" مازا نے نونو کو آنکھ ماری۔

"میری راتوں کی نیندیں' میرا سکون چین' سب سے بڑھ کر میرا دل......" اس نے آہ بھری۔

"باتیں اچھی بنا لیتے ہیں۔"

"ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے...... خیر میں تمہیں کیوں سناؤں' اسے فون دو جو تمہارے پاس بیٹھی ہے۔"

"ہاں بالکل پاس۔"

"اس سے میری بات کروا دو۔" وہ ملتجی ہو گیا تھا۔

"مفت میں......" مازا ہنسی نونو نے اشارہ سے منع کیا۔

"اف...... ایک تو محبوبہ کی سکھیاں بلیک میل بہت کرتی ہیں۔" اس نے ترنگ میں کہا۔

"اوہ کتنی محبوباؤں کا تجربہ ہے؟"

"صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ محبت صرف ایک سے ہوتی ہے۔"

"اچھا......!" مازا نے نونو کی طرف معنی خیزی سے دیکھا نونو نے مازا کو مارا تو مازا کی چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" وہ گھبرا گیا۔ اس نے نونو کے کان سے موبائل لگا دیا۔ وہ جو تیزی سے پیچھے ہٹ رہی تھی۔ ایک دم ساکت ہو کر دوسری طرف سے ابھرتی آواز سننے لگی...... آواز کیا تھی ایک سحر تھا جو پھونکا جا رہا تھا اور وہ مسحور سی اس آواز میں گم تھی دلکش لہجے میں وہ بول رہا تھا۔

"چپ کیوں ہو' میری آواز سن رہی ہو تو اپنی بھی سنا دو۔ میں تو ترس گیا ہوں تمہیں سننے کے لیے۔" ربیعہ دھیرے سے ہنس دی۔

"یوں مت ہنسا کرو۔ من کرتا ہے اس ڈھکی چھپی ہنسی کے سارے بھید جان لوں۔" وہی الفاظ' وہی لہجہ' جس پر حوا کی بیٹی ہمیشہ سے اپنی کنواری وفائیں لٹاتی آئی ہے۔ یہ جانے بغیر کہ یہ مہکتے لفظ راہوں میں پھول بچھا رہے ہیں یا کانٹے۔

رابعہ سرخ ہو گئی۔

"کیا مجھ سے پہلے تم نے کبھی کسی اور لڑکے سے یوں گھر والوں سے چھپ کر باتیں کی ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔"

"کسی لڑکے کی اس سے بڑھ کر خوش نصیبی کیا ہو گی۔ جو لڑکی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کے ذہن میں کسی اور لڑکے کا سایہ تک نہیں۔" وہ اترا کر بولا۔

"تم نے کس سے کہا کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔" رابعہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"اچھا رات کو میں کال کروں گا بات کرو گی نا؟" اس نے امید سے پوچھا اور رابعہ نے اقرار میں جواب دے کر فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

آج پہلی مرتبہ اس نے رات گئے اس سے باتیں کی تھیں۔ کی کیا تھیں بس سنی تھیں۔

"تم تو کہہ رہی تھیں لڑکوں سے باتیں نہیں کرتیں اب مجھ سے جو کر رہی ہو۔" اس کی بات پر رابعہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے غصے سے موبائل ہی آف کر دیا۔ دو دن بعد جب اس نے موبائل آن کیا تو معذرتی اور رومانٹک ایس ایم ایس کی بھرمار تھی جو گزشتہ دنوں میں موصول ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اگر نونو نے اب بھی بات نہ کی تو وہ دل برداشتہ ہو کر کوئی انتہائی قدم اٹھا لے گا۔

"کیوں بے چارے کو تنگ کر رہی ہو۔ اب بات کر لو۔" مازا نے اس کے میسج پڑھ کر کہا۔

"آج کروں گی۔" نونو نے کہا اتنا سبق ہی کافی تھا۔

"ویسے یہ زین صاحب کرتے کیا ہیں۔" مازا نے پوچھا۔

"پتا نہیں اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں۔"

"تم نے پوچھا بھی نہیں؟" مازا نے کہا۔

"ہاں 'تقریباً' زیادہ تر وہ خود ہی بولتا ہے نا۔"

"احمق لڑکی..... کنگلے بندے سے محبت یا فلرٹ کا کیا مزا' پوچھنا اس سے موٹی آسامی ہوئی تو ٹھیک ہے ورنہ دفع کرو۔"

"تم محبت کو پیسے کے ساتھ کیسٹ کر رہی ہو؟"

"محبت۔" مازا ہنستی چلی گئی۔ نونو نے اس ناگواری سے دیکھا۔

"ایسی بیسیوں محبتیں دیکھی ہیں میں نے' چند دنوں میں نام نشان نہیں ملتا۔ اسے محبت نہیں ٹائم پاس کرنا کہتے ہیں مائی ڈیئر۔"

"مازا میں ٹائم پاس نہیں کر رہی۔"

"تو پھر کیا کر رہی ہو محبت؟" وہ ہنس دی نونو نے اس کو دیکھا پھر آہستگی سے کہا۔

"وہ مجھے اچھا لگنے لگا ہے....."

"جو شخص یوں مرمٹے وہ اچھا ہی لگے گا۔ لیکن اس کو محبت سمجھنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے محبت سمجھنے کی غلطی کبھی مت کرنا۔ کیونکہ یہ تمہاری طرح اس کا پہلا چانس نہیں ہے۔" مازا نے لاپروائی سے کہا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

تجربہ..... مجھے تجربہ ہے ایسے وار باتیں سننے کا۔ اس کے جملوں کا اسٹائل کہتا ہے کہ اسے تم جیسی تتلیاں پکڑنے کا بہت تجربہ ہے۔"

"پتا نہیں کیا کہہ رہی ہو۔" نونو لب چبانے لگی۔

"یار میں بہت اچھی دوست نہیں ہوں۔ لیکن تم تھوڑی بے وقوف ہو۔ اٹس جسٹ ٹائم پاسنگ۔ تھوڑا فائدہ دو۔ تھوڑا فائدہ لو اور پھر اپنی راہ پکڑو۔ مگر تم پہلے ہی قدم پر ہی لڑھک گئیں۔ سو مجھے یقین ہے منہ کے بل گرو گی۔"

"خواہ مخواہ الٹا سیدھا بول رہی ہو۔" نونو تپ کر بولی۔ اسے مازا کی کسی بات پر اعتبار نہ آیا تھا۔

"فضول بکواس کرتی ہے۔ دراصل مجھ سے حسد کرتی ہے۔" اس وقت تو اس نے یہ کہہ کر دل کو بہلا لیا..... مگر دل میں کھٹک سی پیدا ہو گئی تھی۔ موبائل آن کر کے اگلے پچھلے سارے میسجز پڑھے۔ تو دل کو تسلی سی ہوئی۔

"بغیر محبت کے کوئی کیسے اتنے خوب صورت لفظ بن سکتا ہے۔" اس نے حسب معمول دل کی مان لی۔

اسے کیا معلوم تھا کہ مرد نامی چیز کے پاس ایک ہی تو چیز تھی۔ جسے وہ وافر مقدار میں ضائع کر سکتے تھے۔ وہ تھا وقت۔

☼ ☼ ☼

"تم نے..... رابی تم نے مجھے مار ڈالا ہے۔ کوئی اتنا سنگ دل بھی ہو سکتا ہے۔ اتنا ظالم۔"

"کیوں میں نے کیا کیا ہے؟" وہ انجان بنی ابھی اس نے موبائل آن کیا تھا اور اس کی کال آگئی۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں..... قتل کر دوں؟" ربیعہ نے مزا لیا۔

"قتل کرنے والوں میں تم تو ہو۔"

"جان بوجھ کر انجان بننا حسن والوں کی ادا ہے۔"

"الزام تراشی مت کرو۔" رابعہ نے تڑپ کر کہا۔

"تمہیں اندازہ نہیں رابی! میں نے یہ دن کس طرح گزارے ہیں۔ راتوں کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔" اس کا انداز دلگرفتہ تھا۔ رابعہ کو بخوبی اندازہ تھا۔ اس کی بے قراری کا وہ دن میں کئی بار کی جانے والی مسڈ کالز وصول کر چکی تھی۔

"بائی دا وے تم کرتے کیا ہو؟" رابعہ نے آج سوچ لیا تھا اس کے بارے میں بات کرنے کا۔

"چھوٹا موٹا بزنس ہے جو بڑے بھائی اور ابو نے سنبھالا ہوا ہے۔ فی الحال ایم بی اے کر رہا ہوں۔ فکر معاش نہیں سو عشق کرتا ہوں۔" زین نے اپنا تعارف کرایا۔

"رہتے کہاں ہو۔"

"تمہارے دل میں۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"میں مذاق نہیں کر رہی۔" رابعہ نے تپ کر کہا۔

"تمہیں آنا ہے تو پتا لکھوا دوں؟"

"شٹ اپ۔"

"خفا مت ہو جان۔"

"الٹی سیدھی باتیں کرو گے تو فون بند کر دوں گی۔"

"نہیں کروں گا۔" اس نے شرافت سے کہا۔

"رابی۔!" زین نے کچھ لمحے خاموشی کے بعد گمبھیر لہجے میں پکارا۔ رابعہ کا دل دھڑک اٹھا۔

"مجھ سے ناراض مت ہوا کرو۔ میری سانس رکنے لگتی ہے۔ رابی جان آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا مجھے بتاؤ کیا یہ محبت ہے؟" وہ تو کیا جواب دیتی وہ گم سم سی تھی۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ کل کالج کے بعد میرا انتظار کرنا۔" زین نے کہہ کر کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ رہی۔" لال شرٹ والا ایک دم پرجوش ہوا۔

"وہ....." اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ تو اس ٹائپ کی نہیں لگتی۔" اس نے دوبارہ لڑکی کو دیکھا جو سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے ہوئے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ صاف کر رہی تھی۔

"تو بکتا ہے یہ وہ نہیں ہے۔"

"ابھی دیکھو۔" اس نے برا مانے بغیر جیب سے موبائل نکالا لڑکی کو نظروں میں رکھتے ہوئے نمبر ملایا۔ سب نے دیکھا وہ اپنی دوست سے باتیں کرتے ہوئے ایک دم خاموش ہوئی۔ موبائل باہر نکالے بغیر نمبر دیکھا اور موبائل آف کر دیا۔

"دیکھا۔" اس نے تفاخر سے دوستوں کو دیکھا۔

"مان گئے استاد پر اسے کہاں تک لے جاؤ گے۔"

"جہاں تک چاہوں۔" وہ معنی خیز ہنسی ہنسا۔ چاروں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیے۔

"یہ کوئی بڑی کامیابی نہیں۔" ایک نے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں؟" اسے غصہ سا آگیا۔

"مزا تو جب ہے جو یہ بائیک پر تمہارے ساتھ بیٹھے۔"

"یار شریف گھر کی لگتی ہے۔ پتا نہیں تجھ جیسے گھامڑ کی باتوں میں کیسے آگئی ہے۔"

"دیکھنا ایک دن یہاں بھی آئے گی۔" اس نے بائیک پر ہاتھ مارا۔

"بکواس مت کرو۔ ہمارا مقصد صرف انجوائے منٹ ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔
"میں بھی انجوائے منٹ کی بات کر رہا ہوں۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہو تم؟ تم ہر رنگ میں اتنی ہی خوب صورت لگتی ہو یا گلابی رنگ کی خاصیت تھی۔" وہ بے خود تھا۔
"مجھے کیا پتا؟" اس نے محجوب سی ہنسی ہنس کر کہا۔
"تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔" دور سے دیکھنے پر یہ حال ہے قریب سے دیکھوں تو شاید مر ہی جاؤں۔" اس نے وارفتگی سے کہا۔
"میرا جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کی پروا کیے بغیر تمہارا ہاتھ پکڑ کر موٹر سائیکل پر بٹھاؤں اور کہیں دور لے جاؤں۔ جہاں کوئی نہ ہو۔ صرف تم ہو اور میں..... رابی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ اللہ کے لیے مجھ سے ایک بار مل لو۔"
ایک بار تو رابعہ کا دل چاہا کہ ہاں کہہ دے۔ مگر دم توڑتی عقل نے لرزتے ہاتھوں سے اس کا آنچل تھام لیا۔ ہاں کہنا چاہتی تھی۔ مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔
"رابعہ صرف ایک بار صرف دس منٹ کے لیے۔"
"پلیز مجھ سے ایسی فرمائش مت کرو میں تم سے بات کر لیتی ہوں اس میں بھی ڈر لگا رہتا ہے۔ تم میری ماں کو نہیں جانتے۔ وہ بہت سخت ہیں۔" وہ بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔
"اچھا.....؟" وہ کسی سوچ میں ڈوبا۔
"میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ تمہارے کالج کے پاس جو ایک فوٹو اسٹیٹ اور پی سی او کی دکان ہے۔ وہاں تو مل سکتی ہو۔"
"کسی نے دیکھ لیا تو۔"
"وہ میرا دوست ہے۔ ایک چھوٹا سا کیبن ہے۔ سامنے پردہ ہے۔ بس پانچ منٹ بیٹھیں گے۔" نونو کا ذہن اس حد تک جا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ وہ اس کی خوب صورتی کے پیچھے چھپی ہوس تک پہنچ ہی نہ سکی۔
"رابی! تمہیں مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے۔"
"اللہ کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔ خود سے بھی بڑھ کر۔"
"تو پھر اعتبار کا اظہار کرو۔"

فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا۔
اور وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کہیں جا رہی ہو۔" اس کا گھبرایا بوکھلایا انداز دیکھ کر مازا نے پوچھا۔
"نہیں تو....." اس نے جلدی سے کہا۔
"میں جانتی ہوں تم زین سے ملنے جا رہی ہو۔" مازا نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ رابعہ اچھل پڑی۔
"میں بھی جا رہی ہوں۔" مازا نے درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔
"عامر کے ساتھ۔" رابعہ نے پوچھا۔
"ہاں۔" مازا مسکرائی۔
"ہمیشہ کے لیے۔" مازا کے اطمینان میں فرق نہیں آیا۔
"میں اس کے ساتھ کورٹ میرج کر رہی ہوں۔"
نونو چپ کی چپ رہ گئی۔
"تم جاؤ انجوائے کرو پریشان نہ ہو۔" مازا نے اسے تسلی دی دونوں باہر نکل آئیں۔ عامر کی پراڈو مازا کی منتظر تھی۔
"اللہ حافظ۔" وہ مازا کے گلے لگی تو آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ نونو نے دور جاتی پراڈو کو آخری بار دیکھا۔ جی چاہا واپس چلی جائے۔ مگر وہ جانتی تھی زین وہاں منتظر ہو گا۔ وہ مرے مرے قدموں سے دکان تک آئی۔ دکان خالی تھی، تب ہی کوئی دھیرے سے اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔
"آؤ....." وہ کیبن کا پردہ اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ رابعہ کی ہتھیلیاں بھیگ گئیں۔ دل الگ وحشت زدہ ہو رہا تھا۔ اس نے دکان والے لڑکے کو دیکھا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھا مگر لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ماتھے سے عرق ندامت صاف کرتے ہوئے اندر چلی آئی۔
"کاش..... یہ میرا گھر ہوتا تو پھولوں اور رنگوں سے سجاتا۔"
زین نے خوب صورت لہجے میں کہا۔ رابعہ کرسی پر یوں بیٹھی تھی گویا ابھی بھاگ جائے گی زین پردہ برابر کرتا اس کے سامنے آ بیٹھا۔
"مجھے بالکل یقین نہ تھا کہ تم آ جاؤ گی۔"
نونو نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ عام سے خدوخال والا زین اسے بے حد خاص لگا۔ گلے میں سونے کی چین تھی ہاتھ میں سونے کا بریسلیٹ امپورٹڈ پرفیوم کی خوشبو اس کی پلکیں جھک گئیں۔
"کیسا لگا.....؟" زین نے پوچھا۔
"کون.....؟" وہ بے خیالی میں بولی۔
"میں اور کون؟"
"اچھے لوگ اچھے ہی لگتے ہیں۔" نونو نے سنبھلتے ہوئے کہا۔
"شکر ہے۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ مجھ جیسے عام سے لڑکے کو ریجیکٹ نہ کر دو۔" تب ہی پردہ ہٹا۔ رابعہ نے گھبرا کر دیکھا۔ دکان والا دو کوک کی بوتلیں لے کر آیا۔
زین نے بوتل اس کی طرف کی اس نے جلدی سے گھونٹ بھر کر حلق تر کیا۔
"اب میں چلتی ہوں۔ آج جبران بھائی آئیں گے مجھے لینے۔"
"اتنی جلدی..... ابھی تو کوئی بات بھی نہیں کی۔"
زین خفا ہونے لگا۔
"باتیں فون پر ہو جاتی ہیں۔ اب مجھے جانے دو۔"
وہ کھڑی ہو گئی۔
"اچھا رکو..... یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔" اس نے ایک چھوٹا سا گفٹ پیک اس کی طرف بڑھایا۔
"اس کی ضرورت نہیں تھی زین۔"
"ہر بات پر انکار مت کیا کرو۔" زین نے نرمی سے کہا تو رابعہ نے مسکرا کر پیکٹ تھام لیا۔
اس نے جلدی سے موبائل نکال لیا۔
"اپنی اک تصویر ہی دے دو۔"
"نہیں زین۔" رابعہ نے گھبرا کر ہاتھ کھڑا کیا۔
"تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟"
"ہے لیکن پلیز تصویر نہیں۔"
"عجیب اعتبار ہے۔" زین نے مایوسی سے موبائل آف کر کے جیب میں ڈالا۔
"تم ناراض تو نہیں ہو؟"
"تمہیں واقعی میری ناراضی کی پروا ہے؟" زین نے پوچھا تو وہ خاموش ہو گئی۔
"آیئے میڈم؟" زین نے پردہ اٹھایا۔
"فون پر منا لوں گی۔" اس نے سوچ کر باہر قدم بڑھائے۔ مگر باہر کھڑے جبران کو دیکھ کر قدموں تلے زمین نکل گئی۔ وہ تیر کی طرح اندر مڑی تو پیچھے کھڑے زین سے جا ٹکرائی۔ جس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ پردہ برابر ہو گیا تھا۔
"کیا ہوا؟"
"بھائی....." وہ کانپ رہی تھی زین نے اپنے بازوؤں کا حصار مزید تنگ کر لیا اور پھر اس نے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اس کی پیشانی چوم لی اور وہ کچھ نہ کر سکی وہ اس کے گھیرے میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور وہ کچھ نہ کر سکی کیونکہ باہر بھائی تھا۔ تو اندر زین پھر وہ مدھم سرگوشی، جس نے اس کے تھر تھر کانپتے وجود کو سہارا دیا۔
"فکر مت کرو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔"
اس کے وجود کے گرد گھیرا کچھ اور تنگ ہو گیا۔
"چلا گیا ہے۔" پندرہ منٹ پل صراط پر گزرے تب زین نے پردہ اٹھا کر دیکھا۔ اور وہ لرزتی کانپتی کالج کے اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔" زین کی آواز سن کر اسے اطمینان ہوا۔

"السلام علیکم!"

"کون؟" زین کے ارد گرد شور سا تھا۔

"اب نام بتانا پڑے گا۔" اس کا اس طرح پوچھنا اسے برا لگا۔

وہ بری طرح چونکا۔

"سوری یار! میں ذرا مصروف تھا۔ تھوڑی دیر میں تمہیں کال کرتا ہوں۔"

"کہاں مصروف تھے؟"

"کچھ ذاتی مصروفیات تھیں۔"

"مجھ سے شیئر....."

"یہ گھر کا نمبر ہے۔" زین نے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں..... لیکن تم اس نمبر پر فون نہیں کرنا۔" رابعہ نے فوراً "ٹوکا۔

"گھر میں اور کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں امی گئی ہوئی ہیں اسی لیے تمہیں فون کیا ہے۔"

"ملنے آجاؤں؟"

"گھر پر۔" رابعہ گھبرائی۔

"ہاں تو اور کہاں۔" زین نے جل کر کہا۔

وہ اکتا گیا تھا۔ اس پھسپھسی محبت سے محض فون پر باتیں بگھارتے رہو اور حاصل وصول کچھ بھی نہیں۔ جبکہ رابعہ نے اسی دن قسم کھالی تھی کہ آئندہ باہر نہیں ملنا۔

"یار رابی! اب کوئی ملنے کی سبیل نکالو..... بہت دل چاہ رہا ہے تم سے ملنے کو۔"

"تمہاری تسلی فون پر بات کر کے نہیں ہوتی۔" رابعہ کو غصہ آنے لگا تھا۔ زین ایک پل کو خاموش ہوا پھر بولا۔

"رابعہ! تم میرے ساتھ کھیل کھیل رہی ہو۔" اس کے روکھے لہجے پر وہ بھونچکی رہ گئی۔

"کیا میں تم سے محبت نہیں کرتی؟"

"مجھے تو ایسے ہی لگنے لگا ہے۔" زین نے کہا۔

"محبت میں دوری کیا معنی رکھتی ہے۔ اب ختم کرو یہ جان لیوا دوری کا احساس میری بانہیں تمہاری منتظر ہیں۔" زین نے بے باکی سے کہا۔

"زین۔" رابعہ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"اچھی طرح سوچ لو..... تم میرا ساتھ دینا چاہتی ہو یا نہیں..... اگر نہیں تو یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔"

"زین میری بات تو سنو۔" مگر وہ رابطہ منقطع کر چکا تھا۔

زین نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ زین نے اپنے لیے آسانی ڈھونڈی ہے۔ رابعہ انکار کرتی تو وہ آرام سے جان چھڑا لیتا۔ وہ ہاں کرتی، ایسی صورت میں گھر والوں سے بغاوت کرتی تو اس کی ذات سے کس طرح فائدہ اٹھانا تھا، زین نے خوب سوچ لیا تھا۔ رابعہ الجھتی کڑھتی کچن میں چلی آئی۔ اس نے بے توجہی سے کھانا پکانا شروع کیا۔

"امی تو مجھے جان سے مار دیں گی، انہیں کون سمجھائے گا کہ مجھے صرف زین سے شادی کرنا ہے۔ اور زین سمجھتا ہے کہ میں اس کے ساتھ....." اس کے خیالات کی رو نہ جانے اور کہاں کہاں جاتی کہ افشاں بیگم چلی آئیں اور آتے ہی اس کو اپنی خریداری بھی دکھانے لگیں۔

"دیکھو کیسے ہیں؟" انہوں نے زیورات کے ڈبے کھول کر اس کے سامنے کیے۔

"ہوں..... اچھا ہے۔"

"اللہ کرے اب کوئی اچھا سا رشتہ بھی آجائے۔" افشاں بیگم نے روانی میں پہلی بار ایسی کسی خواہش کا اظہار بیٹی کے سامنے کیا تھا رابعہ نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"کیا سوچنے لگیں؟"

"کچھ نہیں امی۔" رابعہ نے کہا اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ زین سے فائنل بات کرے گی۔

"زین اگر میری شادی تم سے نہ ہوئی تو میں اپنی

جان دے دوں گی۔" رات اس کی آواز سن کر وہ بے یالی سے بولی باتیں کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ وہ بظاہر پریشانی سے اسے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

"پہلے رونا بند کرو۔ تم کیا سمجھتی ہو، کیا میں تمہارے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں۔"

"نہیں میں جانتی ہوں تم مجھے، مجھ سے بڑھ کر پیار کرتے ہو لیکن میں سچ کہتی ہوں زین اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔"

لڑکیوں کے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ہر بات کو جذبات کے کفن میں لپیٹ لیتی ہیں۔ بعد میں یہی چیز ان کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہے۔ زین اس کی بات پر زیر لب مسکراتے ہوئے بظاہر رنجیدہ لہجے میں بولا۔

"رابی! تمہیں میرے سوا کوئی چھوئے مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔" اس کی رنجیدگی پر رابعہ کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

"نہیں..... ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ پلیز تم اپنے گھر والوں سے بات کرو میں مر تو سکتی ہوں مگر تمہارے سوا کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی۔" بھل بھل گرتے آنسوؤں کی پروا کیے بغیر اس نے التجا کی تو وہ مزید معصوم بنتے ہوئے بولا۔

"تم کیا سمجھتی ہو، میں نے اپنے گھر والوں سے پہلے بات نہیں کی ابھی کل ہی ڈیڈی سے جھگڑا ہوا ہے میرا۔ چھوڑ آیا ہوں میں ان کا گھر۔ جس گھر میں مری محبت کے لیے کوئی جگہ نہیں وہ گھر میرے کس کام کا میں تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں جان، بتاؤ اور کیا کروں؟"

"کچھ نہیں اب جو کچھ کرنا ہے مجھے کرنا ہے۔ اگر تم میرے لیے اپنا گھر بار ماں باپ سب چھوڑ سکتے ہو۔ تو میں بھی تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ مشکل کے اس وقت میں، میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ میں دنیا کو دکھاؤں گی کہ آج بھی سچے پیار کرنے والوں کا وجود قائم ہے۔ آج بھی محبت زندہ ہے۔"

اور واقعی اس نے دنیا کو دکھا دیا۔ اس رات کی صبح میں سورج کے طلوع ہونے سے قبل وہ اپنی عزت، زیور اور کپڑے لتوں کی گٹھڑی مرمریں بازوؤں میں دبائے اپنے باپ کے گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے گویا اپنی پاک روح کا جنازہ پھلانگ آئی تھی۔

زین اسے ساتھ لے کر سیدھا اس ہوٹل میں پہنچا جو کل رات اس سے بات کرنے کے بعد اس نے آج کے لیے بک کروایا تھا۔ وہ روتے ہوئے فوری نکاح پر زور دے رہی تھی۔ جب وہ پریشانی سے بالوں میں انگلیاں پھنسائے ہوئے ٹہل رہا تھا۔

"تھوڑا صبر کرو یار، اتنا بڑا قدم اٹھا ہی لیا ہے تو پلیز مجھ پر اعتبار کرو۔" اس نے رابعہ کو تسلی دی اور رابعہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے محبت کتنے مشکل دوراہے پر لے آئی تھی۔ کل رات کا ایک ایک پل آنکھوں میں کاٹتے ہوئے وہ یہی سوچتی رہی تھی کہ اسے زندگی کے اس موڑ پر اپنے دل کی قربانی دینی چاہیے یا اپنے والدین کی عزت کی؟ اور کل رات سوچنے کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسے اپنی محبت قربان نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ ایک بار اگر اس نے زین کو کھو دیا تو ساری عمر اسے بھول کر خوش نہیں رہ سکے گی۔ جب کہ والدین کا کیا ہے؟ وہ تو اولاد کی بڑی سے بڑی خطا کو بھی ایک دن معاف کر کے اسے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ اپنی محبت کا ہاتھ تھامنے کے بعد وہ اپنے والدین کو منا لے گی۔ جبکہ زین اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا ایسے بہت سے کھیل وہ پہلے بھی جانے کتنی بار کھیل چکا تھا محبت اور شادی کا لالچ دے کر اسی ہوٹل کے مختلف کمروں میں بنا اپنا نام دیے کتنی ہی عزتوں کو پامال کر چکا تھا اس وقت بھی اسے سکون کی ضرورت تھی اور اسے سکون فراہم کرنے کے لیے ایک عورت نے اپنا آپ اس پر وار دیا تھا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد وہ اس کے سامنے سر جھکائے شرمندہ بیٹھا تھا۔

"یار میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ یہ سب ایسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"زین میں نے اپنا سب کچھ تمہاری محبت پر قربان کردیا ہے پلیز مجھے خود سے جدا مت کرنا پلیز۔"

لڑکیاں واقعی بہت بے وقوف ہوتی ہیں اسے اصل نقصان کا اندازہ ہی نہیں تھا کاغذی محبت کے حصول کے لالچ میں صرف چند لمحوں نے اس پر جنت حرام کردی تھی۔

"تم بہت عظیم لڑکی ہو۔ تم اندازہ نہیں کرسکتیں کہ میں کتنا شرمندہ ہوں۔ میں تم سے چوری سے شادی نہیں کروں گا۔ کوئی تمہیں گھر سے بھاگی ہوئی کہہ کر حقارت سے دیکھے تم سے نفرت کرے میں برداشت نہیں کرسکتا۔

پوری عزت سے تمہاری ڈولی میرے گھر اترے گی۔ اب بھی وقت ہے میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں، ابھی کسی کو شک نہیں ہوگا۔" اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کا ہاتھ لیے اب وہ داؤ بدل رہا تھا۔

"اپنے زین پر اعتبار کرتی ہو نا۔"

"ہاں اعتبار نہ کرتی تو گھر کی دہلیز کیسے پھلانگتی۔ مجھے تم پر اعتبار ہے" اپنی روح کے قاتل کے ہاتھوں مسمار ہو کر بھی وہ اس کی محبت کی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ زین دل ہی دل میں پھر اس کی بے وقوفی پر مسکرا دیا۔

وہ گھر واپس لوٹ آئی۔ افشاں بیگم کل رات سے اپنی ناسازی طبع کے باعث غنودگی میں اپنے کمرے میں ہی بے حال پڑی تھیں۔ جبران دو دن کے لیے حیدر آباد گیا تھا' ورنہ اب تک اس کی محبت کا اچھا خاصا تماشا لگ چکا ہوتا۔ کاغذی محبت کے ہاتھوں میں اپنا آپ سونپ دینے کے بعد ایک عجیب سی بے سکونی نے اس کی ذات کا گھیراؤ کرلیا تھا۔ زین اسے تسلی دے رہا تھا کہ وہ جلد اپنے والدین کو اس کے گھر بھیج رہا ہے۔

پورا ہفتہ وہ اس سے۔ اصرار کرتی رہی کہ وہ اپنے والدین کو جلد بھیجے۔ اور وہ اسے ٹرخاتا رہا۔ وہ اگر سمجھ بھی رہی ہوتی تب بھی کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اب اس کے ہاتھ میں رہا بھی کیا تھا؟ تھوڑے دن پہلے تک دن میں سو سو کالز کرنے والا وہ شخص زیادہ وقت اپنا موبائل آف رکھتا تھا۔

اس شخص کے نا صرف معمولات بدل گئے تھے بلکہ لہجہ بھی اجنبی ہوگیا تھا دو منٹ بھی مشکل سے بات کرتا جب کہ اس کی حالت دن بہ دن غیر ہوتی جارہی تھی۔

اس روز صبح آنکھ کھلی تو اس نے ماں کو جائے نماز پر بیٹھے روتے ہوئے دیکھا۔ وہ کتنی عاجزی سے کہہ رہی تھیں اپنے معبود حقیقی سے۔

"مالک تیرا وعدہ سچا ہے۔ بے شک دنیا تباہی کے دہانے پر آپہنچی ہے مالک ہمارے حال پر رحم فرما ہمیں قوت دے کہ ہم اپنے بچوں کو حرام راستے پر چلنے سے روک سکیں۔ انہیں غلط اور صحیح کی پہچان کرواسکیں۔ جس امت کے واسطے تیرے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی آنسو بہائے۔ اس امت کو دوزخ کا ایندھن بننے سے بچالے مولا تیری رحمت کا دامن وسیع ہے۔ اس ملک پر اپنی رحمت کے بادل برسا اس ملک کو مزید تباہی سے بچالے۔ تو بخشنے والا مہربان ہے۔ تیرے خزانے بھرے ہیں مولا ہم سب پر اپنا رحم فرما..... ہمیں بخش دے۔"

آنسو قطار در قطار ان کی پلکوں سے ٹوٹتے ہوئے چہرے کو بھگو رہے تھے رابعہ کے اندر جیسے آگ سی جل اٹھی۔ اسے اب اپنے نقصان کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ عجیب سی وحشت اور اذیت کے حصار میں جکڑ کر رہ گئی تھی۔ کسی صورت بھی سکون نصیب نہیں ہو رہا تھا۔

ایک دن بڑی مشکل سے زین نے اس کی کال ریسیو کی تھی۔

"ہاں بولو' کیا مسئلہ ہے؟" اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔ رابعہ کو بے حد ہتک محسوس ہوئی۔

"میں بے حد پریشان ہوں اور تمہیں کوئی پروا نہیں یہی محبت تھی تمہاری۔" وہ رو پڑی زین مزید چڑ گیا۔

"میں نے کوئی محبت وحبت نہیں کی تم سے۔"

"جان چھوڑو میری پلیز....." درشت لہجے میں کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔

رابعہ کو لگا اس لمحے وہ سچ مچ زمین بوس ہوگئی ہو۔ اس کے اعصاب شدید شاک کی زد میں آگئے۔ اسے گمان تک نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ اس درجہ بے وفائی کرسکتا ہے اس شخص کا اصل چہرہ کیا تھا؟ جس کی رفاقت کے حصول کے لیے اس نے ہر غلط راستے کی حد پار کرلی تھی۔ غم و غصے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ تبھی کپکپاتی انگلیوں سے اس نے زین کے گھر کے نمبر پر کال کی۔ موبائل نمبر تو اس نے بدل ہی لیا تھا۔

"اب کیا تکلیف ہے؟" وہی اس کا کاٹ کھانے والا انداز تھا۔

"تم میرے ساتھ اتنا بڑا فریب نہیں کرسکتے زین! اگر میری زندگی برباد ہوئی تو میں تمہیں بھی سکون سے جینے نہیں دوں گی۔ تمہارے گھر آکر میں تمہارے کرتوتوں کی فائل کھولوں گی مجھے تر نوالہ سمجھ کر نگلنے کی کوشش مت کرنا۔"

"ٹھیک ہے' آجاؤ گھر میں ثابت کردوں گا کہ تم ایک آوارہ کال گرل ہو جس کا پیشہ ہی شریف لڑکوں پر الزام لگا کر پیسے ہتھیانے کا ہے۔ پھر دیکھوں گا تم اور تمہارے گھر والے کس کو منہ دکھاتے ہیں۔"

محبت کا کوئی رخ اتنا بھیانک بھی ہوسکتا ہے آج سے پہلے اسے اندازہ نہیں تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک عورت ہے۔ جس کے پاس عزت سے بڑھ کر قیمتی سرمایہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ لڑکیاں بے وقوف ہی نہیں جذباتی بھی ہوتی ہیں۔ اسے گمان تک نہیں گزرا تھا کہ محبت کے نام پر کھیلا جانے والا کھیل اسے یوں رسوائی سے ہمکنار کرکے بے موت مار ڈالے گا۔ اب وہ بڑی آسانی سے اپنے ہر قول و قرار سے پھر چکا تھا اور وہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ جو کچھ بھی اس نے خود اپنے ساتھ کیا تھا وہ اس پر شرمندہ بھی تھی مگر اب شرمندگی کا احساس بھی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس روز وہ بہت روئی۔ خدا کے حضور گڑگڑا کر بہت دیر تک معافی بھی مانگتی رہی۔ مگر پھر بھی اسے سکون نہیں ملا۔ زندگی میں اب جینے کا کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس روز شام میں تیز بخار کے باوجود چائے بناتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر اپنا بھاری آنچل آگ کے نارنجی شعلوں کی نذر کردیا۔ صرف چند لمحوں میں اس کا پورا وجود آگ کی لپیٹ میں آگیا۔

افشاں بیگم ابھی عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔ بیٹی کی دل خراش چیخیں سن کر وہ کچن کی طرف بھاگتی ہوئی گئیں مگر تب تک بہت دیر ہوچکی تھی آگ کے بے رحم شعلوں نے ان کی خوب صورت لخت جگر کو دیکھنے کے لائق بھی نہیں چھوڑا تھا۔ پورے دس دن اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے بعد گیارہویں دن کی ڈھلتی شام کے ساتھ ہی رابعہ طارق کی زندگی کی شام کا سورج بھی ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔

سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ لاپروائی میں آگ کے شعلوں کی نذر ہو کر بے رحم موت کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ تاہم یہ راز وہ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی کہ اس غلط راہ پر بھٹک کر' غلط شخص سے اپنی امیدیں اور خواب منسوب کرنے کا تاوان بھرا ہے۔

"صحیح کام غلط طریقے سے کیا جائے تو نتیجہ بھی غلط ہی سامنے آئے گا۔" یہ بات ماڑا سے کہتے ہوئے رابعہ یہ بات بالکل ہی بھول گئی تھی کہ اس کے ساتھ وہی سب کچھ ہوگا۔

☼ ☼

نفیسہ سعید

اس کے چاروں طرف پھیلے آگ کے شعلے اسے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے سانپ اپنی لمبی لمبی زبانیں لیے اس کی جانب لپک رہے ہوں' اس کا خوب صورت جسم ان شعلوں کی زد میں آکر دھڑا دھڑ جل رہا تھا اور چربی کی بو اس کے نتھنوں میں آرہی تھی' چیخ چیخ کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی' تکلیف کی شدت سے بند ہوتی اپنی آنکھوں کو بمشکل کھول کر اس نے آخری بار اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ان افراد کو دیکھا جو اس کی بے بسی اور اذیت ناک موت کا نظارہ ایسی خاموشی سے کر رہے تھے جیسے یہ حقیقت نہ ہو' بلکہ کسی فلم کی شوٹنگ کے لیے فلمایا جانے والا کوئی سین ہو اور وہ سب سیٹ پر کھڑے ہوئے تماشائی۔

ان کی آنکھوں میں نظر آنے والی بے حسی اور سرد مہری نے اس کی آخری امید کو بھی ختم کر دیا اور زمین پر گرتے گرتے اسی آخری پل میں اس نے دوزخ کی آگ کا تصور بھی کیا' جس کی شدت اس آگ سے کئی گنا زیادہ ہوگی' لیکن دنیاوی عیاشی میں مشغول بے خبر انسان اپنی چار روزہ زندگی میں گم ہو کر سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ "واہ رے انسان تیری بے خبری۔"

وہ بے تحاشا تھک چکی تھی' تھکن سے اس کی پنڈلیاں دکھ رہی تھیں' اس نے صوفہ پر بیٹھ کر اپنی ٹانگیں سامنے پڑی ٹیبل پر رکھ لیں اور جھک کر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی پنڈلیاں دبانے لگی' ڈریسنگ روم میں اے سی کی کولنگ بھی معمول سے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی یا شاید اسے ہی ٹھنڈ زیادہ لگ رہی تھی' اس نے یہاں وہاں نظر دوڑائی اور کچھ فاصلے پر رکھا بڑا سا دوپٹہ جو جانے کس کا تھا' اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا' اسی دم زوردار آواز سے دروازہ کھول کر امیر

بھٹی اندر داخل ہوا' ساتھ ہی نصیبو لعل کے تیز گانے کی آواز بھی اندر تک سنائی دی' وہ یک دم ہی کوفت میں مبتلا ہو گئی۔

"اوہو دل ربا جی جلدی آجائیں آپ کا ڈانس ہے۔"

"میرا ڈانس؟" دل ربا نے اس کی جانب سوالیہ انداز سے تکا۔

"ابھی تو میں ڈانس کرکے آئی ہوں بمشکل پانچ منٹ پہلے' اب میرا نہیں انمول کا نمبر ہے۔" اس کا انداز ناگواری لیے ہوئے تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے جی پر تماشائی صرف اور صرف آپ ہی کو دیکھنا چاہتے ہیں' مسلسل آپ کے نام کی آواز گونج رہی ہے ہال میں۔" امیر بھٹی نے اپنے لہجہ کو قدرے خوشامدانہ بناتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

"تو میں کیا تمہیں پاگل نظر آرہی ہوں' ابھی مسلسل ایک گھنٹہ کی پرفارمنس کے بعد آکر بیٹھی ہی ہوں کہ پیچھے ہی تم آگئے ہو۔" وہ تنک کر بولی۔

"مجھے تو جی...." امیر بھٹی کی بات درمیان میں ہی رہ گئی' ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر میڈم روبی اندر داخل ہوئی اور ایک تیز اور کٹیلی نظر امیر بھٹی پر ڈالی۔

"نہ تو میں نے کیا تمہیں یہاں آرام کرنے کے لیے بھیجا تھا؟ دل ربا جانی لوگ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں' بس جلدی سے آجاؤ' پھر ہم شو ختم کریں۔" امیر بھٹی کو لتاڑنے کے ساتھ ساتھ میڈم نے بڑے پیار بھرے انداز سے دل ربا کو مخاطب کیا' جبکہ ان کے لہجہ کا مصنوعی پن دل ربا سے چھپا نہ رہ سکا' اب دل ربا کے لیے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی' وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی' خود پر لیا ہوا دوپٹہ اتار کر پھینکا اور کمرے میں موجود ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا' اسکن کلر کا اسکن ٹائیٹ لباس اس کے خوب صورت سراپے پر کسا ہوا اس کے وجود کے ہر عضو کو نمایاں کر رہا تھا' وہ جانتی تھی کہ اس حالت میں اس کا ہیجان خیز رقص تماشائیوں کا کیا حشر کرتا تھا' یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اس کے بعد کسی اور کو دیکھنے سے انکار کر دیتے تھے اور اس کی اس اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے پچھلے کچھ عرصے سے میڈم کا رویہ بھی اس کے ساتھ کافی تبدیل ہو چکا تھا' اب جب وہ دل ربا سے بات کرتی تو لہجے میں خوامخواہ ہی چاپلوسی کی حد تک شیرینی سمو لیتی تھی' جس سے کبھی کبھی تو دل ربا کو کافی الجھن ہوتی تھی' لیکن زیادہ تر میڈم کا یہ انداز اس کی دلی مسرت کا باعث بنتا۔

"ڈارلنگ ذرا جلدی چلی جاؤ تاکہ شو کو ختم کیا جاسکے' بچی اب تو بہت نیند آرہی ہے۔" میڈم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اپنی جمائی کو روکتے ہوئے کہا اور وہیں صوفہ پر بیٹھ گئی' جبکہ دل ربا تھکے تھکے قدموں کے ساتھ دروازہ کھول کر ڈریسنگ روم سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"بس بھئی اب نہیں' اب میں بہت تھک گئی ہوں۔" دریاب نے اپنی کمر کے گرد لپیٹا دوپٹہ کھولا اور چہرے پر آئے ہوئے پسینے کو صاف کرتی ہوئی دھپ سے کرسی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"پلیز یار ایک ڈانس اور...." سی ڈی پلیئر کے پاس بیٹھی ہوئی رائمہ نے کسی قدر لجاجت سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا' لیکن دریاب نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اپنے پاس کھڑی دسویں جماعت کی شمائل سے باتیں کرنے لگی' ان کے اسکول میں آج عید ملن پارٹی تھی' جس کے لیے لڑکیاں اپنے اپنے گھروں سے ٹیپ ریکارڈر اور سی ڈی پلیئر لے کر آئی تھیں اور اپنی اپنی کلاسز میں خوب انجوائے کر رہی تھیں' لیکن سب سے زیادہ رش دریاب کی کلاس میں تھا' وجہ تھی دریاب کا رقص' جسے دیکھنے کے لیے دوسرے سیکشن اور کلاسز کی لڑکیاں بھی یہاں جمع تھیں۔

"سنا ہے آج دریاب گل نے بڑا خوب صورت ڈانس کیا ہے۔" سندھی کی مس مومل راشدی نے کلاس روم میں داخل ہوتے ہوئے باآواز بلند پوچھا' مس مومل راشدی ابھی اسکول میں نئی اپائنٹ ہوئی تھی' نوجوان سی یہ ٹیچر اسکول کی بچیوں میں خاصی مقبول تھی۔

"چلو دریاب اب ایک ڈانس ہمیں بھی دکھاؤ۔" مس مومل نے کرسی پر بیٹھی ہوئی دریاب کو بڑی بے تکلفی سے مخاطب کیا۔

"نو مس اب نہیں' میں اب بہت تھک گئی ہوں۔" دریاب نے بغیر کسی لحاظ و مروت کے صاف انکار کرتے ہوئے کہا' جبکہ مس مومل' دریاب کے اس جواب سے خاصی شرمندہ ہوئی۔

"چلو کوئی بات نہیں' میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔" مس نے اپنی شرمندگی اور خفت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

دریاب نے مس مومل کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور خاموشی سے شمائل کا ہاتھ تھامے کلاس سے باہر نکل گئی' وہ ایسی ہی تھی اپنے دل کی سننے والی' ہمیشہ وہ کام کرتی جس پر اس کا دل آمادہ ہوتا' ورنہ بنا کسی لحاظ و مروت کے انکار سامنے والے کے منہ پر دے مارتی اور یہ جرأت و بے باکی غالباً" اس کی فطرت کا ایک حصہ بن چکی تھی' جس سے فرار اب کم از کم اس کے لیے ناممکن ہو چکا تھا۔

"بھئی جس جس کو مجھ سے آٹو گراف لینا ہے لے لو' بہت جلد میں ایک بہت بڑی سپر اسٹار بن جاؤں گی' پھر تم سب دیکھ کر کہو گی اوہو یہ تو دریاب ہے' اے کاش ہم نے اس سے ایک آٹو گراف ہی لے لیا ہوتا۔" بریک ٹائم میں وہ گراؤنڈ میں اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی خوب زور زور سے بول رہی تھی۔

"کیوں کیا سپر اسٹار بننے کے بعد تم اپنی دوستوں کو بھی بھول جاؤ گی' تف ہے یار' ہمیں تم سے یہ امید نہ تھا۔" یہ یقیناً" شمائل تھی۔

"یو تو یار ہمارے ملک میں تو فلموں کا کوئی فیوچر نہیں ہے' اس لیے لازمی سی بات ہے مجھے اپنا یہ شوق پورا کرنے کے لیے بالی ووڈ جانا پڑے گا' اب بتاؤ بھلا تم آٹو گراف لینے پڑوسی ملک آؤ گی۔" دریاب کی تیز ہنسی میں اس کی ساری دوستوں نے اس کا ساتھ دیا اور وہ

سب مل کر کوئی گانا گا رہی تھیں' ساتھ ہی تالیوں کی آواز بھی تھی' اس شور شرابے کی بنا پر گراؤنڈ میں موجود ہر لڑکی نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی جانب متوجہ ہونے پر مجبور تھی۔

"یار لگتا نہیں یہ دریاب گل تمہاری کزن ہے۔" کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی سجیعہ نے کوک کا سپ لیتے ہوئے سمرن کے سانولے سلونے سنجیدہ سے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اظہارِ خیال کیا' جبکہ سمرن نے جواب میں صرف ایک نظر ذرا فاصلے پر موجود دریاب پر ڈالی اور خاموشی سے سموسہ کھانے میں مشغول ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نا صرف رہن سہن اور عادات کے حوالے سے بلکہ شکل و صورت کے حوالے سے بھی اس میں اور دریاب میں زمین و آسمان کا فرق تھا' حالانکہ دریاب اس کے سگے چچا کی بیٹی تھی' نا صرف یہ بلکہ وہ ایک ہی گھر میں جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتی تھی' بے شک ان کے پورشنز مختلف تھے' لیکن گھریلو ماحول تو تقریباً" یکساں ہی تھا' اس کے باوجود ان کی کوئی عادت یکساں نہ تھی۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ تمہاری اس کزن کے اتنے بگاڑ میں کس کا ہاتھ ہے۔" سجیعہ نے ہنستے ہوئے ایک نظر دریاب پر ڈالی جو اپنے پاس سے گزرنے والی ہر لڑکی پر آوازیں کسنے میں مشغول تھی' اسی بنا پر لڑکیاں ان کے پاس سے گزرتی ہوئی تھوڑی سی خائف ہو رہی تھیں۔

"میری ماں کا۔" سمرن اتنی آہستہ آواز میں ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائی کہ اس کی آواز صرف وہ خود ہی سن سکی' جبکہ سجیعہ بریک ختم ہونے کی بیل سن کر کلاس کی جانب بڑھ چکی تھی۔

"امی پلیز مجھے کھانا دے دیں' بھوک لگی ہے۔" سمرن نے کوئی چوتھی دفعہ شہر پارا کو پکارا' لیکن سمرن کی اس پکار کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ نہایت انہماک سے کیبل پر آنے والی کوئی انڈین فلم دیکھنے میں مشغول رہی۔

"امی۔۔۔" سمرن سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے شہر پارا کو کندھے سے تھام کر ہلایا۔

"کیا مصیبت ہے' لے لو کچن سے جا کر خود' اب بچی تو نہیں۔" شہر پارا نے اپنے تسلسل میں رخنہ اندازی پر بری طرح جھنجلاتے ہوئے اسے اچھی طرح لتاڑ دیا اور جواباً" سمرن خاموشی سے کھڑی ہو گئی' اس کی آنکھوں میں یک دم ہی آنسو آ گئے اور گلے میں گولہ سا پھنس گیا' اس نے خاموشی سے ایک نظر کارپٹ پر سر کے نیچے فلور کشن رکھ کر لیٹی ہوئی اپنی ماں اور اس کے کندھے سے لگی دریاب پر ڈالی اور کمرے سے نکل کر کچن کی جانب آ گئی۔

بوائل گوشت دیگچی میں ڈھکا رکھا تھا' جبکہ چھلے ہوئے آلو قریبی باؤل میں پڑے سیاہ ہو رہے تھے' اس نے باؤل اٹھا کر سنک کے نیچے رکھا اور اس میں اتنا پانی بھر دیا جس میں آلو ڈوب جائیں' اب باؤل اپنی جگہ پر واپس رکھ کر وہ فریج کی جانب آ گئی' فریج میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے کھا کر وہ اپنا پیٹ بھر سکتی' یہاں تک کہ گندھا ہوا آٹا بھی موجود نہ تھا' اس نے خاموشی سے فریج کا دروازہ بند کر دیا' وہ جانتی تھی کہ اب اس کی ماں شام تک ٹی وی کے آگے سے نہیں اٹھے گی کیونکہ اس کے بابا رات کو دیر سے دکان بند کر کے آتے تھے لہٰذا اب یہ کھانا رات کو ہی مکمل ہونا تھا' وہ چپ چاپ سیڑھیاں چڑھتی اوپر تائی کے پورشن میں آ گئی' جہاں تائی جی اور فاریہ بھابھی کچن میں رکھی ٹیبل پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔

"آ جاؤ سمرن کھانا کھاؤ۔" فاریہ بھابھی نے اسے دیکھتے ہی آواز دی' کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اس وقت نیچے کچھ بھی نہ بنا ہو گا شہر پارا رات کا بچا ہوا سالن اطمینان سے بنا سمرن کا سوچے پراٹھے کے ساتھ کھا چکی ہو گی' جبکہ دریاب دوپہر کا کھانا نیچے اپنی امی کے ساتھ کھاتی تھی' رہ گئی سمرن تو اس کی پروا کسے تھی' سمرن خاموشی سے کرسی پر آ کر بیٹھ گئی اور پلیٹ میں سالن نکال کر کھانا شروع کر دیا۔

"دریاب کہاں ہے؟" تائی نے سرسری سا پوچھا۔

"امی کے پاس غالباً" کوئی فلم دیکھ رہی ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بتانا پڑا۔

"کئی بار ارم کو سمجھایا ہے بچی کو پارو کے پاس اتنا نہ جانے دیا کرے' مگر مجال ہے جو اس کی سمجھ میں کوئی بات آئے' لڑکی ذات ہے' کل کلاں کو کچھ ہو گیا تو دیکھنا' سر پکڑ کر روئے گی۔" تائی جی نے بنا سمرن کا لحاظ کیے غصہ سے کہا اور ان کے کہے گئے الفاظ نے سمرن کے حساس دل کو اپنی ماں کے حوالے سے خاصا دکھایا' لیکن وہ جانتی تھی کہ تائی کے الفاظ بے شک سخت سہی' لیکن کافی حد تک درست بھی ہیں۔

☼ ☼ ☼

آغا رحمان گل کے تین بیٹے تھے سب سے بڑے جہانگیر پھر سرفراز اور عمر گل جبکہ ایک بیٹی فریحہ تھی جو شادی کے بعد اسلام آباد میں رہائش پذیر تھی سب کی شادیاں انہوں نے اپنی مرضی سے کیں ماسوائے سرفراز کے ویسے تو ان کی ساری اولاد ہی بہت فرماں بردار تھی لیکن عادات و اطوار کے حوالے سے تینوں بھائی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔

جہانگیر سب سے بڑا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی ذمہ دار تھا کم عمری سے ہی وہ کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا جبکہ سرفراز نا صرف لاابالی بلکہ قدرے عیاشی فطرت کا حامل نوجوان تھا اور ان دونوں کے برعکس عمر اپنے کام سے سے کام رکھنے والا کم سم سا شخص تھا جس کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف اعلا تعلیم کا حصول تھا اسے اپنے باپ کے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ مقامی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ سرفراز نا صرف شکل و صورت کے اعتبار سے واجبی سی شخصیت کا حامل تھا بلکہ تعلیمی میدان میں بھی کوئی خاص حیثیت نہ رکھتا تھا بڑی مشکل سے گھسیٹ کر اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی اس کے باوجود آغا جی کے ساتھ سپر اسٹور پر جا کر بیٹھنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا ہاں البتہ جب پیسوں کی ضرورت ہوتی تو وہ اسٹور ضرور جاتا اور پھر ضرورت کے مطابق پیسے حاصل کرنے کے بعد پندرہ' بیس دن تک وہ سوائے رات کے گھر میں بھی دکھائی نہ دیتا۔

یہ ہی وجہ تھی کہ آغا صاحب اور سکینہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے عام روایتی ماں باپ کی طرح ان کی بھی سوچ تھی کہ شاید اسی طرح ان کا بیٹا سدھر جائے دوسرے بیٹوں کی طرح انہوں نے اس کا رشتہ بھی خاندان میں ہی طے کر رکھا تھا شازیہ ان کی بڑی بہو سادیہ کی چھوٹی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی سادہ مزاج اور قوت برداشت رکھنے والی لڑکی تھی۔ آغا جی کا خیال تھا کہ سرفراز جیسے اتھرے آدمی کے لیے اس سے بہتر لڑکی کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی سرفراز کی دن بہ دن بگڑتی ہوئی حرکات و سکنات نے انہیں مجبور کیا کہ وہ جلد از جلد شازیہ کو بیاہ کر گھر لے آئیں اور ابھی انہوں نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا سوچا ہی تھا کہ سرفراز نے از خود ہی دھماکہ کر ڈالا۔

☼ ☼ ☼

پچھلے کچھ دنوں سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے ناردرن ایریاز گیا ہوا تھا اس دوران آغا جی کے حکم کے مطابق سادیہ اور سکینہ نے مل کر بالا ہی بالا اس کی شادی کی ہلکی پھلکی تیاریاں شروع کر دی تھیں کہ اچانک ہی ایک دن وہ ایک نہایت حسین و جمیل اور طرحہ دار لڑکی کا ہاتھ تھامے آن موجود ہوا۔

"یہ میری بیوی پارو ہے۔"

الفاظ تھا یا کوئی بم پورا گھر لرز کر رہ گیا پارو کے انداز و اطوار یہ سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ اس کا تعلق کس علاقے سے ہے۔ آغا جی فوری طور پر انہیں گھر سے نکال دینا چاہتے تھے غصہ کی شدت سے ان کی آنکھوں میں لہو اتر آیا تھا۔

"اس گندگی کے ڈھیر کو لے کر نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

بے تحاشا غصہ سے وہ ہولے ہولے کانپ رہے

تھے اور ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا لیکن سرفراز جو شہر پارا کے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوب چکا تھا اس پر باپ کی اس حالت کا کوئی اثر نہ ہوا۔

"کیوں نکل جاؤں میں اس گھر سے" آپ کی وراثت کا پورا پورا حق دار ہوں میں اور مجھے امید ہے کہ آپ جیسا دین دار آدمی اتنی بڑی بے دینی کی بات نہیں کر سکتا اگر آپ نے مجھے نکالا تو جہانگیر اور عمر کو بھی نکالیں۔"

یہ کہہ کر وہ نہایت اطمینان سے پارو کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا اس کی اس جرأت اور بدتمیزی نے آغا جی کو بالکل خاموش کر دیا اس طرح سرفراز کو اس گھر میں رہنے کی اجازت تو مل گئی لیکن اس کا کھانا پینا فی الفور علیحدہ کر کے اسے اوپر والے پورشن میں شفٹ کر دیا گیا کیونکہ اس مسئلے کا فوری اور بہتر حل اس کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

پارو کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ کوئی نہ جانتا تھا لیکن یہ دیکھ کر سب حیران ہوتے تھے کہ پارو جیسی حسین و جمیل لڑکی کو سرفراز جیسے کم رو شخص میں کیا نظر آیا جو نا صرف شکل و صورت بلکہ مالی اعتبار سے بھی کوئی ایسا مستحکم نہ تھا کہ اس کی خاطر پارو جیسی لڑکی سب کچھ تیاگ دے لیکن شاید ان دونوں کا ملن نصیب میں لکھا تھا سو ہو گیا کیسے ہوا؟ یہ شاید کوئی بھی نہ جان پایا اور نہ ہی کبھی کسی نے جاننے کی کوشش کی لیکن یہ سچ تھا کہ پارو میں سوائے شکل و صورت کے کوئی دوسری ایسی خوبی نہ تھی جو گھریلو عورتوں میں پائی جاتی ہو اور اس کا اندازہ جلد ہی سرفراز کو بھی ہو گیا۔

وہ صبح سویرے اٹھنے کی عادی نہ تھی یہ ہی وجہ تھی کہ جب دن چڑھے جاگتی تو بجائے کوئی کام کرنے کے نہا دھو کر خوب نک سک سے تیار ہو جاتی شروع شروع میں تو سرفراز اسے دیکھ دیکھ کر جیتا اور کسی حسین مورتی کی مانند نظر آنے والی پارو کی پوجا کرتا اور چاہتا کہ سامنے بٹھا کر اسے تکا کرے لیکن کب تک؟ حسن و آتشی کا یہ خمار جلد ہی اتر گیا جب روز بازار کا پکا جیب اور پیٹ پر بھاری پڑنے لگا تو سرفراز کے ماتھے پر نمایاں طور سے بل نمودار ہونے لگے اور اس حوالے سے گھر میں ایک نئی تو تکار شروع ہو گئی لیکن وہ پارو بھی کیا جس پر رتی برابر اثر ہو اور ایسے میں سکینہ کو مدد کے لیے آگے آنا پڑا اور پھر ان کے ساتھ ساتھ ساویہ کی پر خلوص کوششوں کے زیر اثر شہر پارا نے تھوڑا بہت پکانا تو سیکھ لیا لیکن کبھی اس نے یہ کام روایتی عورتوں کی طرح دلچسپی سے نہ کیا اس کی دلچسپی گھریلو امور سے زیادہ شاپنگ، سینما اور ہوٹلنگ کے علاوہ سارا دن وی سی آر پر نت نئی انڈین فلموں تک محدود تھی اور اس کی ان حرکتوں کے باعث جلد ہی سرفراز کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا لیکن اب اس احساس کا کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ پارو اس کی بیٹی ثمن کی ماں بن چکی تھی اور اولاد وہ واحد چیز ہے جو مرد و عورت دونوں کو جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے سو سرفراز بھی صبر کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور اپنی اولاد کو دیکھتے ہوئے اسے جلد ہی اس زیادتی کا احساس بھی ہو گیا۔

جو وہ اپنے ماں باپ سے روا رکھتا تھا اور اس زیادتی کے ازالے کے لیے وہ آغا جی کے ساتھ سپر اسٹور جانے لگا لا ابالی سے سرفراز کی جگہ ایک سمجھدار شخص ابھر کر سامنے آیا جسے کاروباری شعور اپنے دونوں بھائی کے مقابلے میں زیادہ تھا اس کی انتھک محنت اور حکمت عملی سے سپر اسٹور نے ایک بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور کی شکل اختیار کر لی سرفراز کی اس محنت اور کوشش کو اس کے گھر کے ہر فرد نے عملی طور پر سراہا اور لاشعوری طور پر کوشش کی جانے لگی کہ سرفراز کی بیوی کو بھی گھر میں وہ ہی مقام دیا جائے جو ساویہ اور عمر کی بیوی ارم کو حاصل ہے لیکن جانے کیوں شہر پارا کو کبھی بھی کسی کے ساتھ مل کر بیٹھنا پسند نہ تھا وہ شروع سے ہی علیحدہ پورشن میں رہنے کی عادی ہو چکی تھی اس کے میکے سے تو کبھی کوئی آیا نہ تھا اور سسرال والوں سے اس کا اتنا ملنا جلنا نہ تھا لہٰذا وہ ہمیشہ اکیلے رہنے کو ترجیح دیتی یہاں تک کہ بازار بھی اکیلی ہی چلی جایا کرتی ہاں البتہ سال میں ایک ہفتے کے لیے وہ لاہور ضرور جاتی اور یہ سفر ہمیشہ سرفراز کے سنگ ہی ہوتا عام خیال تھا کہ شاید

لاہور میں اس کا میکا آباد ہے لیکن تجسس کے باوجود اس بارے میں کبھی کسی نے کریدنے کی کوشش نہ کی وجہ غالباً" شہر پارا کا لیا دیا رویہ تھا۔

ثمن کے دو سال بعد ہی سمرن پیدا ہو گئی یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ دونوں لڑکیاں شکل و صورت اور رنگ و روپ کے اعتبار سے ماں سے قطعی مختلف تھیں ثمن تو بالکل اپنے باپ جیسی تھی البتہ سمرن کے نقش و نگار ماں جیسے جبکہ رنگت تھوڑی سی دبتی ہوئی سرفراز جیسی تھی لیکن حقیقت تھی کہ وہ دونوں شہر پارا کی بیٹیاں تو معلوم ہی نہ ہوتی تھیں اور حسن کی دلدادہ شہر پارا کو کبھی اپنی بیٹیوں سے کوئی دلی لگاؤ محسوس نہ ہوا یہ ہی وجہ تھی کہ دونوں بچیوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش میں زیادہ تر ہاتھ دادی یا پھر تائی ساویہ کا رہا ساویہ کے چونکہ اپنے تینوں بیٹے ہی تھے لہٰذا انہوں نے بیٹی کی تشنہ خواہش ان دونوں بہنوں سے پوری کر لی ثمن اور سمرن کی طبیعت کا رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ ان کی تربیت ساویہ جیسی سلیقہ شعار عورت کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

عمر کی شادی اپنی کزن ارم سے سرفراز کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد ہو گئی تھی ارم کے پہلے دونوں بیٹے پیدائش کے فوراً" بعد ہی فوت ہو چکے تھے سمرن تقریباً" دو سال کی تھی جب ارم نے دو جڑواں بیٹیوں کو جنم دیا۔ دریاب اور نایاب اور تخلیق کے اس عمل کے دوران ارم کو بمشکل بچایا گیا اور اب اس کی اتنی تشویش ناک حالت کے سبب دو بچوں کو سنبھالنا ایک نہایت ہی مشکل امر تھا جبکہ سکینہ اپنی ضعیف العمری اور بیماری کے سبب بچوں کی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر تھیں اور ساویہ پہلے ہی اپنی تینوں بیٹوں کے ساتھ ثمن اور سمرن کو بھی سنبھالے ہوئے تھیں ایسے میں شہر پارا کو جانے کیا ہوا دریاب کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں جسے سن کر ہر کوئی حیران رہ گیا کہاں اپنی بچیاں تو سنبھال نہ سکی کجا دوسرے کی بچی لیکن بہرحال شہر پارا کی یہ پیش کش نا صرف پر خلوص بلکہ بر محل تھی اس لیے کسی کے پاس اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔

دریاب بے انتہا سرخ و سفید اور نہایت ہی خوبصورت بچی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ اسے دیکھتے ہی شہر پارا کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا اور جھٹ پٹ اپنی خدمات پیش کر دیں جبکہ اپنی دونوں بیٹیوں کو تو پیدائش کے وقت دیکھتے ہی وہ ہکا بکا رہ گئی تھی اور یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھی کہ اتنی سانولی سلونی بچیاں اس کی ہو سکتی ہیں ایسے میں دریاب کا سرخ و سفید رنگ و روپ شہر پارا کی توجہ کا مرکز بن گیا کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اہل خانہ کو اعتراض ہوتا کیونکہ اس کی کی جانے والی تربیت سے تو سرفراز ہی مطمئن نہ تھا تو دوسروں کی بات تو پھر بعد کی تھی لیکن وہ جو سیانے کہہ گئے کہ مجبوری کا نام شکریہ تو اس کی عملی تفسیر اس موقع پر دیکھنے میں آئی جب اپنی سگی اولاد کی تربیت کی ذمہ داری ماں اور بھابھی کو سونپنے والے سرفراز نے بھائی کی بیٹی کی تربیت بیوی کے ہاتھوں ہوتے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور وہ جو کہتے ہیں کہ خون سے زیادہ گود اپنا اثر دکھاتی ہے تو اس کا عملی نمونہ بھی جلد ہی سامنے آ گیا۔

☼ ☼ ☼

شہر پارا کی شروع سے عادت تھی صبح سویرے تیار ہو کر گھر سے نکل جاتا یا پھر سارا دن کیبل پر آنے والی نت نئی فلموں سے لطف اندوز ہوتا" گھریلو ذمہ داریاں صرف اس حد تک تھیں کہ رات کو گھر آنے پر میاں کو کھانا مل جائے خواہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو جبکہ دونوں بیٹیاں اکثر و بیشتر اور تایا کے گھر سے ہی کھا لیا کرتی تھیں البتہ دریاب کی ذمہ داری شہر پارا میں تبدیلی لانے کا سبب بنی سدا کی لاپروا اور خود میں مگن رہنے والی شہر پارا ایک دم سے ہی ذمہ دار ماں بن گئی وہ راتوں کو جاگ کر سگی اولاد کی طرح اس کی دیکھ بھال کرتی چونکہ وہ فیڈر پیتی تھی لہٰذا ہمیشہ اس کے فیڈر کی صفائی کا خصوصی اہتمام کیا جاتا اس کے لیے خریدے گئے قیمتی اور رنگ برنگے کھلونوں سے پارو کا کمرہ بھر چکا تھا پھر بھی وہ دریاب کے لیے شاپنگ کرتے نہ تھکتی

تھی یہاں تک کہ اگر دن میں کچھ وقت وہ بچے ارم کے پاس ہوتی تو یہ وقت شہر پارا کے لیے کاٹنا دشوار ترین ہو جاتا جانے یہ خدا کی کون سی مصلحت تھی کہ اپنی بیٹیوں کو منہ نہ لگانے والی پارو میں دریاب کی تو مانوں جان تھی یہ ہی وجہ تھی کہ جیسے جیسے وہ بڑھی ہوتی گئی مکمل طور پر پارو ہی کے رنگ میں رنگتی گئی۔

بچپن میں اس کی ہر وقت ٹی وی اور فلم میں بے تحاشا دلچسپی کسی نے محسوس ہی نہ کی اور ویسے بھی جب تک دادا، دادی زندہ رہے دریاب کی یہ دلچسپی کھل کر کبھی سامنے ہی نہ آئی لیکن ان کے آنکھیں بند ہوتے ہی دریاب کی شکل میں ایک دوسری شہر پارا ابھر کر سامنے آ گئی فیشن کی دلدادہ، رقص کی شوقین، نماز روزے سے غافل ہر وقت فلم کی طرف ہی توجہ مرکوز رکھنے والی دریاب گل جس نے جانے رقص میں کب اور کیسے مہارت حاصل کی پتا ہی نہ چلا،

شروع شروع میں سب سے چھپ کر کیا جانے والا یہ عمل رفتہ رفتہ سب کے سامنے آنے لگا اور دریاب کی اس خوبی کا ادراک سب سے پہلے سمرن پر ہی ہوا تھا کیونکہ سمن کے مقابلے میں اس کی کوشش ہوتی کہ وہ تائی سے زیادہ اپنی ماں کے قریب رہے اور اسی کوشش کے نتیجہ میں اکثر و بیشتر وہ دریاب کا وہ رقص دیکھنے سے مستفید ہو جاتی جو وہ شہر پارا کے کہنے پر اس کے کمرے میں کر رہی ہوتی دریاب کے اس شوق کو ہمیشہ بچی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا لیکن اس شوق کے اتنے بھیانک اور دور رس نتائج نکلیں گے یہ کوئی نہ جانتا تھا ورنہ شاید اس وقت اس کے شوق کی روک تھام کے لیے کوئی ایسا عملی قدم ضرور اٹھایا جاتا جو آگے چل کر دریاب کو اس ذلت بھرے گڑھے میں گرنے سے بچانے کا سبب بن سکتا جو مستقبل میں دریاب کا مقدر بننے والا تھا۔

جہانگیر اور سادیہ کے تین ہی بیٹے تھے بڑا زوہب، پھر شاہ زیب اور سب سے چھوٹا شاہ ویر، زوہب کی شادی اپنی خالہ زاد فاریہ سے ہو چکی تھی اور ان کے ماشاء اللہ سے دو بچے بھی تھے جبکہ شاہ زیب کا رشتہ بچپن میں ہی سکینہ بی بی اور آغا جان کی خواہش کے عین مطابق سمن سے طے تھا اور اس نسبت پر کبھی کسی کو کوئی اعتراض بھی نہ ہوا یہ ہی وجہ تھی کہ جب شاہ زیب نے مزید تعلیم کے حصول کے لیے کینیڈا جانے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا تو جہانگیر صاحب نے اپنی اجازت کو سمن کے ساتھ نکاح سے مشروط قرار دے دیا اور ان کی اس شرط پر شاہ زیب سمیت کسی کو اعتراض نہ تھا لہٰذا جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے تحت فوری طور پر اس شادی کا اہتمام کیا گیا اور شاہ زیب کے ساتھ ہی سمن کے کاغذات بھی جمع کروا دیے گئے ویزا لگتے ہی سمن کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر شاہ زیب کی ہمراہی میں کینیڈا روانہ ہونا پڑا سمن کے جانے کے بعد سمرن بالکل تنہا رہ گئی غیر ارادی طور پر وہ دونوں بہنیں ماں کی نسبت ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھیں۔

دادی کے بعد سمن نے ہمیشہ سمرن کو جذباتی طور پر سہارا دیا وہ اس کی چھوٹی چھوٹی خواہش بن کہے جان جایا کرتی تھی وہ دونوں بہنیں اپنا زیادہ تر وقت تایا ہی کے گھر گزارا کرتی تھیں جبکہ ان کے گھر اور ماں پر دریاب کی حکمرانی تھی۔

دریاب ہمیشہ سمرن سے ضد باندھے رکھتی اس کی کاپی، کتابیں خراب کر دینا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا ہمیشہ سمرن کی کوئی نہ کوئی چیز اسے پسند آ جاتی جو وہ ضد کر کے سمرن سے ہتھیا لیا کرتی حالانکہ شہر پارا نے اپنی بیٹیوں کے مقابلے میں ہمیشہ اسی کو فوقیت دی تھی اس کی پسند، اس کی خواہشات پارو کے لیے زندگی کی علامت تھیں اس نے کبھی بھی کسی چیز کی خواہش یا طلب کے لیے دریاب کو نہ ترسایا تھا اس کے باوجود دریاب ہمیشہ اسی چیز میں زیادہ دلچسپی لیتی جو سمرن کے لیے اس کے بابا، سمن یا کوئی دوسرا شخص لے کر آتا اور سمرن اپنی صلح جو طبیعت کے باعث خاموشی سے ہر چیز دریاب کے حوالے کر دیتی جب تک سمن رہی اس نے ہمیشہ سمرن کا دفاع کیا وہ کبھی بھی کوئی چیز دریاب کو دینے نہ دیتی کیونکہ بقول اس کے سمرن کا یہ عمل دریاب میں خود پسندی کی سطح کو خطرناک حد تک بڑھانے کا سبب بن رہا ہے لیکن سمرن کے خیالات بالکل مختلف تھے وہ دریاب کو ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن ہی سمجھتی تھی حالانکہ دریاب کے طرز عمل نے ہمیشہ اس کی حوصلہ شکنی کی۔ لیکن جانے کیوں اپنی خوبصورت ماں سے بے تحاشا محبت کرنے کے باعث اس سے وابستہ ہر چیز سے محبت اور عقیدت خود بخود سمرن کے دل میں پیدا ہو جاتی تھی جبکہ دریاب تو پھر ایک جیتا جاگتا وجود تھا جو اس کی ماں سے وابستہ تھا نا صرف وابستہ بلکہ اس کی ماں کے چہرے پر مسرت بکھیرنے کا سبب بھی تھا۔

اس کی ماں نے ہمیشہ دریاب کے لیے اعلا سے اعلا چیز خریدی۔ اس عمل نے دریاب کے دماغ کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا، کوئی کم قیمت چیز اس کی نظروں میں جچتی ہی نہ تھی اور یہ سب شہر پارا ہی کی بدولت ممکن ہوا تھا ورنہ اس کی سگی ماں کو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ دریاب کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا اس قدر احساس رکھ سکے یہ بھی شاید قدرت ہی کی کوئی مصلحت تھی کہ دریاب کی جڑواں بہن نایاب کو ایک سال کی عمر میں اتنا شدید بخار ہوا کہ اس کے اترنے تک نایاب کو ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر دیا اس کے مہنگے ترین علاج نے ارم کی کمر ہی توڑ ڈالی تھی لیکن اس کے باوجود بچی مکمل طور پر ٹھیک نہ ہو سکی نایاب کے بعد آرزو اور پھر ولید بھی ارم کی وہ توجہ حاصل نہ کر سکے جو ان کا حق تھی کیونکہ ارم کا زیادہ تر وقت نایاب پر ہی صرف ہو جاتا ایسے میں دریاب کو مکمل طور پر شہر پارا کے سپرد کر کے وہ مطمئن ہو چکی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ دریاب کے ٹھاٹ باٹ نے اس کے فیصلے پر درستگی کی مہر ثبت کر دی تھی۔ دریاب کی رقص میں دلچسپی کا کچھ کچھ اندازہ تو سمرن کو ہو ہی چکا تھا لیکن وہ اس قدر رقص کی دلدادہ ہے یہ سمرن کو پارٹی والے دن پتا چلا جب اسکول میں ہر طرف دریاب کے ڈانس کی دھوم مچی ہوئی تھی اور یقیناً" اس سب کے پس پردہ کردار اس کی اپنی ماں کا تھا سمرن جب بھی اپنی ماں کو بے خیالی میں چلتا پھرتا دیکھتی جانے کیوں اسے کسی اسٹیج ڈانسر کا گمان ہوتا اور اس کی تائی تو کئی دفعہ ڈھکے چھپے الفاظ میں کہہ بھی چکی تھی کہ۔

"شہر پارا کا تعلق ضرور کسی ناچنے گانے والے خاندان سے ہے" حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دونوں بہنوں نے ننھیال کے نام پر کبھی اپنا کوئی رشتہ دار نہ دیکھا تھا صرف ایک بار بچپن میں جب وہ اپنی ماں کے ساتھ لاہور گئی تھی تو ہوٹل ہی کے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر عورت اور برقعہ پوش جوان لڑکی اس کی ماں سے ملنے آئی تھیں وہ دونوں عورتیں اسے دیکھنے میں بھی اچھی نہ لگی تھیں لیکن سمرن سے ان کی والہانہ محبت یہ ضرور بتاتی تھی کہ ان کا سمرن سے ضرور کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ وہ رشتہ کیا تھا آج تک سمرن کو معلوم ہی نہ ہو سکا اور نہ ہی اس نے کبھی جاننے کی کوشش کی ایک دفعہ شہر پارا نے خود بھی ترنگ میں آ کر سمرن کو بتایا تھا کہ اس کی پرورش اس کی خالہ نے کی تھی جب اس کی ماں چھ ماہ کی پارو کو چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی اپنی ماں کے بارے میں بتاتے ہوئے پارو کو کسی بھی قسم کی شرمندگی کا احساس تک نہ تھا جبکہ اپنی نانی کے بارے میں یہ سب جان کر سمرن کا دل اس قدر خراب ہوا کہ پھر اسے مزید کچھ جاننے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

اس دن کے بعد اس نے اپنی ماں سے کبھی بھی کوئی سوال نہ کیا وہ جان چکی تھی کہ اس کی ماں کے ماضی پر پڑا ہوا پردہ ہی ان دونوں بہنوں کے حق میں بہتر ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ جیسے ہی کالج سے گھر آئی کچن سے آنے والی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے اسے پل بھر کو حیران کر ڈالا۔

"یا الٰہی میں کسی غلط گھر میں تو نہیں آ گئی۔" پہلا خیال اس کے ذہن میں یہ ہی آیا اور پھر اپنے خیال پر خود ہی ہنستی ہوئی تیزی سے کچن کی جانب بڑھی جہاں

حیرت کا دوسرا اور شدید ترین جھٹکا اس کا منتظر تھا شہر یارا بیگم دوپہر کے اس سمے نہایت گرمی میں بے حال بڑی تندہی سے کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

"خیریت ہے امی کوئی آرہا ہے۔؟"

سمرن نے حیرت سے دریافت کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اپنے سسرالی عزیزوں کے لیے اس کی ماں نے کبھی بھی ایسا اہتمام کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی ویسے بھی آنے والا ہر مہمان ہمیشہ تائی جی کے گھر ہی ٹھہرتا تھا اور جو کبھی کوئی ملنے کے لیے نیچے آتا تو ہمیشہ بازاری لوازمات سے ہی اس کی خاطر کی جاتی ایسے میں اتنی بھری دوپہر میں شہر یارا کی کچن میں موجودگی واقعی اچنبھے کا سبب تھی۔

"ہاں۔" مختصر سا جواب دے کر شہر یارا ہانڈی میں چمچہ چلانے میں مصروف ہو چکی تھی سمرن نے کچھ دیر تو انتظار کیا کہ شاید آگے بھی کچھ بتایا جائے لیکن پارو کی بے نیازی یہ بتا رہی تھی کہ ابھی وہ مزید بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے سمرن نے آگے بڑھ کر دیگچیوں کے ڈھکن اٹھا کر جھانکا اور چکن بریانی دیکھتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی۔

"واؤ زبردست! آج تو آپ نے میری فیورٹ ڈش بنائی ہے۔" ایک مان بھرے لاڈ سے اس نے ماں کی جانب دیکھا۔

"ہاں دریاب کو بھی چکن بریانی بہت پسند ہے ورنہ میرا ارادہ تو پلاؤ بنانے کا تھا۔"

سنک پر ہاتھ دھوتے ہوئے پارو نے جواب دیا اور تولیہ سے ہاتھ صاف کر کے چولہے کی آگ کو مدھم کر دیا اور باہر کی جانب چل دی جبکہ اس کے اس جواب نے جانے کیوں سمرن کے جوش و خروش کو بالکل ماند کر دیا اس کی بھوک کا احساس ایک دم ہی ٹھنڈا ہو گیا ایسے جیسے کسی نے جلتے ہوئے کوئلوں پر پانی ڈال دیا ہو اس نے خاموشی سے دیگچی کا ڈھکن واپس رکھ دیا یہ جانے بغیر کہ بریانی کے علاوہ اور کیا پکا ہے وہ خاموشی سے کچن سے باہر نکل آئی۔

"کیا تھا جو اماں ایک بار میرا دل رکھنے کے لیے ہی کہہ دیتی کہ آج بریانی میرے لیے ہی بنی ہے۔" اس کا حلق نمکین پانی سے بھر گیا پارو کی دی گئی وضاحت سے اس کا دل اس قدر برا ہوا کہ یہ بھی نہ معلوم کر سکی کہ ان کے گھر آج کون مہمان آرہا تھا؟ خاموشی سے ہاتھ منہ دھو کر یونیفارم تبدیل کر کے سونے کے لیے لیٹ گئی۔

شام میں جب اس کی آنکھ کھلی تو حسب معمول ٹی وی لاؤنج سے تیز میوزک کی آواز آرہی تھی شروع شروع میں سمرن کے جانے کے بعد جب وہ اپنے فلور پر زیادہ رہنے لگی تھی تو اسے ہر دم میوزک کا یہ کھٹ راگ بہت پریشان کرتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ وہ اسی ماحول کی عادی ہوتی جا رہی تھی ابھی بھی خاموشی سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور کچن میں آگئی ٹھنڈی بریانی پلیٹ میں نکالی اور وہیں ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے لگی۔

"تھینک گاڈ یار تم یہاں بیٹھی ہو پلیز ذرا ایک کپ اچھی سی چائے تو بنا دو۔" ایک دم ہی دروازے سے دریاب کی آواز سنائی دی وہ چونک اٹھی۔

"چائے؟ کس کے لیے۔"

کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں اور دریاب شام میں کبھی بھی چائے نہیں پیتیں۔

"ارے کمال ہے تمہیں نہیں پتا زوار آیا ہوا ہے۔"

"زوار۔" سمرن نے حیرت سے زیر لب دہرایا۔

"وہ کب آیا۔؟"

"رات میں آیا تھا آج دوپہر میں مما جی نے نیچے لنچ پر بلایا تھا ابھی بھی نیچے ہی ہے حیرت ہے تمہیں تائی کے گھر میں کسی نے نہیں بتایا کہ زوار آرہا ہے؟ بہرحال ایک کپ چائے بنا کر لے آؤ تمہاری بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

وہ شان بے نیازی سے کہتی ہوئی واپسی کے لیے مڑ چکی تھی۔

"پلیز چائے ضرور بنا دو ورنہ مجھے آنا پڑے گا۔" وہ کوئی جواب نہ دے سکی نوالہ نگلتے ہوئے چاول اس

کے حلق میں ہی کہیں پھنس گئے جسے اس نے پانی کے گھونٹ سے مشکل نیچے اتارا "زوار" نا صرف اس کی پھپھو فریحہ کا بیٹا تھا بلکہ بچپن سے سمرن سے منسوب تھا حالانکہ بہت کم کراچی آتا لیکن جب بھی آتا سمرن اپنے اور اس کے درمیان موجود رشتہ کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتی اور اس دفعہ تو اپنی تعلیمی مصروفیات کی بنا پر وہ تقریباً "دو سال پہلے کراچی آیا تھا جب وہ نویں کلاس میں تھی تب صرف ایک ہفتہ کے لیے زوار اور پھپھو کراچی آئے تھے اس وقت پھپھو اس کے لیے ڈھیروں ڈھیر تحائف لے کر آئی تھیں۔ اسے آج بھی یاد تھا وہ وقت جب زوار دریاب کو دیکھ کر حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔

"ارے مامی آپ کی بیٹی تو دریاب نظر آتی ہے سمن اور سمرن تو بالکل آپ کی بیٹیاں ہی نہیں لگتیں۔"

سترہ، اٹھارہ سالہ زوار کے اس جملے میں جانے ایسا کیا تھا کہ اچانک ہی سمرن کو اپنا آپ ایک دم ہی حقیر سا لگنے لگا اور وہ خود بخود ہی اپنا موازنہ دریاب سے کرنے لگی اور جیسے جیسے وہ موازنہ کرتی اس کا احساس کمتری عروج پا تا گیا اور یہ ہی وجہ تھی کہ اپنی پڑھائی کا بہانہ بنا کر وہ پورا ہفتہ اپنے کمرے میں ہی محدود رہی جبکہ دریاب اور زوار حسن کے قہقہوں سے گھر گونجتا رہتا حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے اس گریز کو سوائے تائی سادیہ اور شاہ ویز کے کسی نے محسوس نہ کیا یہاں تک کہ پھپھو نے بھی نہیں اور یہ ہی بات پھانس کی مانند سمرن کے دل میں گڑ گئی تھی۔

❊ ❊ ❊

"زہے نصیب آج سورج کہاں سے نکلا تھا بی بی سمرن کے بھی دیدار نصیب ہو گئے۔" وہ کچن میں فاریہ بھابھی کے پاس کھڑی کوئی بات کر رہی تھی جب اسے شاہ ویز کی آواز سنائی دی۔

"کہاں ہوتی ہو کزن آج کل اوپر بھی نہیں آتیں۔"

"یہیں ہوتی ہوں بس ذرا کالج میں سمسٹر ہو رہے تھے اسی کی تیاری کر رہی تھی۔"

"چلو اب آہی گئی ہو تو ذرا جلدی سے میرے اور زوار کے لیے اچھی سی چائے تو بنا دو۔" آرڈر دے کر وہ واپس اپنے کمرے کی جانب مڑ چکا تھا۔

اور مجبوراً "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق سمرن نے خاموشی سے چائے بنائی اور ٹرے میں بسکٹ کا جار رکھ کر شاہ ویز کے کمرے کی جانب چل دی دروازہ کھلا ہوا تھا اور پردہ دروازے کے پیچھے ہونے کے باعث سامنے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا سامنے ہی زوار اور شاہ ویز ایک ہی بیڈ پر نیم دراز غالباً "ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

"آجاؤ رک کیوں گئیں؟"

شاہ ویز نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا جب کہ زوار ٹی وی کے چینل سرچ کرنے میں مصروف رہا۔

"السلام علیکم۔" سمرن نے آہستہ آواز میں سلام کیا اور خاموشی سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ٹرے رکھ کر واپسی کے لیے پلٹ گئی۔

"وعلیکم السلام! تم سارا دن کہاں ہوتی ہو نظر نہیں آتیں۔"

بظاہر ریموٹ سے مصروف زوار نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر سوال کیا۔

"آپ کو سوائے دریاب کے نظر ہی کون آتا ہے۔" دل چاہا یہ ہی جواب دے لیکن اپنی عادت کے برخلاف کہہ نہ سکی اور جب بولی تو صرف یہ۔

"یہیں ہوتی ہوں گھر پر۔"

پر جانے کیوں اس کی آواز رندھ گئی اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

"اسے کیا ہوا ہے۔" پیچھے سے زوار کی تحیر آمیز آواز سنائی دی جانے شاہ ویز نے کیا جواب دیا اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے اپنے پورشن میں چلی گئی۔

❊ ❊ ❊

زندگی اپنے مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھی۔ وہ ہی صبح سورج طلوع ہونا اور شام میں غروب ہو جانا دن

کا آغاز اور رات کا آجانا غرض کہ کچھ بھی ایسا نہ تھا جو قابل ذکر ہو وہ بھی روکھے پھیکے دن جو اپنی مخصوص اور روز مرہ کی رفتار سے گزر رہے تھے سمرن نے آنرز کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا جبکہ دریاب ابھی بھی کالج ہی جاتی تھی گزرتے وقت نے جہاں سمرن کو مزید سنجیدہ کردیا تھا وہاں دریاب کی طبیعت کی جولانی بھی کھل کر سامنے آگئی کچھ تو اللہ نے حسن ہی بے تحاشا دیا تھا دوسرا وہ اپنے حسن کی حفاظت بھی باخوبی جانتی تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے حسن کو سنوارنے کا سلیقہ بھی اس میں خوب سے خوب تر بنتا رہا تھا اور یہ گر یقیناً" اس نے شہر پارا سے سیکھا تھا۔

سرفراز صبح سے گئے رات میں گھر آتے تو ایسے میں ہمیشہ انہیں سمرن پڑھتی ہی دکھائی دیتی سنجیدہ اور کم گو سی سمرن اپنے باپ کے آرام اور کھانے پینے کا ہر ممکن خیال رکھتی' جانے کیوں گزرتے وقت نے شہر پارا اور سرفراز صاحب کے درمیان ایک ان دیکھی دیوار سی حائل کردی تھی ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے سے یکسر اجنبی ہوچکے تھے سرفراز صاحب کی گھر میں موجودگی کے دوران یا تو وہ خوب انہماک سے کوئی فلم دیکھ رہی ہوتی یا پھر دریاب کے ساتھ واک کرنے نکل جاتی سرفراز صاحب کو اگر کوئی پریشانی تھی تو وہ دریاب کے حوالے سے تھی جانے کیوں انہیں اب کچھ عرصہ سے یہ احساس ستانے لگا تھا کہ شہر پارا کے ساتھ نے دریاب کی اصل شخصیت کو مسخ کردیا ہے وہ دریاب کو دیکھتے تو سوائے خودنمائی' غرور و تکبر کے انہیں اس میں کوئی خوبی دکھائی نہ دیتی اور اسی حوالے سے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی شہباز کو بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی تھی جسے اس نے درخور اعتناء ہی نہ جانا شہر پارا کے توسط سے دریاب جن لگژری سہولیات کو اپنا لائف اسٹائل بناچکی تھی ان کے تصور نے شہباز اور ارم کی آنکھیں مکمل طور پر بند کر رکھی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ دریاب کی منہ زور خواہشوں کو پورا کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا اس لیے اس مسئلہ کا بہترین حل چشم پوشی تھا جسے انہوں نے مکمل طور پر اختیار کر رکھا تھا جبکہ جہانگیر اور تائی سادیہ سمیت ان کی پوری فیملی بھی سرفراز صاحب کی ہم خیال ہونے کے باوجود محض اس لیے خاموش تھی کہ جب سگے ماں باپ کو کوئی احساس نہیں تو "ہمیں اور تو" کون ہوتے ہیں بات کرنے والے یہ ہی وجہ تھی کہ خاندان کے ہر فرد نے جان بوجھ کر اس سارے معاملے سے پردہ پوشی اختیار کر رکھی تھی اور شہر پارا' دریاب کے حوالے سے مکمل طور پر خود مختار زندگی گزار رہی تھی اور رہی دریاب' تو اپنی زندگی کے اٹھارہ سال شہر پارا کی سرپرستی میں گزارنے کے بعد خاصی آزاد خیال اور بے باک ہوچکی تھی۔ بے انتہا منہ پھٹ دریاب بنا کسی لحاظ سے ہر بات منہ پر دے مارنے کی عادی ہوچکی تھی۔

سچ ہے خون سے زیادہ تربیت شخصیت پر مکمل طور پر اثر انداز ہوتی ہے سمرن شہر پارا کی بیٹی ہونے کے باوجود انتہائی سلیقہ شعار' با اخلاق' سلجھی ہوئی' رکھ رکھاؤ کی حامل شخصیت کی مالک تھی جبکہ اس کے برعکس دریاب بے انتہا بدتمیز' خود غرض' اپنی نفس کی ماری ہوئی شخصیت اختیار کرچکی تھی جہاں سمرن قناعت پسندی کی قائل تھی وہاں دریاب کے نفس کا پیمانہ لالچ اور طمع جیسی بیماریوں کا شکار ہوچکا تھا مزید کی خواہش نے اس میں سے اچھے برے کی تمیز یکسر ختم کردی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ خاندان کے علاوہ بھی جو لوگ دریاب کی شخصیت کے اس تاریک پہلو سے تھوڑا بہت واقف ہوچکے تھے اس سے دور رہنا ہی پسند کرتے تھے لیکن اسے اس کی خود پسندانہ فطرت نے کبھی اس بات کا احساس نہ ہونے دیا۔ اپنی خوبصورتی کے حوالے سے کالج میں لڑکیوں کی ہر وقت کی قصیدہ خوانی نے اس کے فخر و غرور میں بے تحاشا اضافہ کردیا تھا ایسے میں اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کی پروا ہی نہ کی سوائے شہر پارا کے جانے کیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار پاچکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

گھر والوں کے علم میں لائے بغیر دریاب نے ڈانس اکیڈمی جوائن کرلی تھی اور اس عمل میں اسے مکمل طور پر پارو کی پشت پناہی حاصل تھی ڈانس کا شوق دریاب کی زندگی میں جنون کی سی کیفیت اختیار کرچکا تھا درپردہ ڈانس کے ذریعے وہ شوبز کی دنیا میں اوپر تک جانے کا فیصلہ کرچکی تھی اور کسی بھی نتیجہ کی پروا کیے بغیر اس کے ہر فیصلہ میں ہمیشہ شہر پارہ اس کے ساتھ ہی کھڑی نظر آئی اب بھی ایسا ہی ہوا ڈانس اینڈ آرٹ اکیڈمی میں ہفتہ میں دو دن رقص کی کلاس ہوتی دریاب ہمیشہ شہر پارا کے ساتھ ہی اکیڈمی جایا کرتی جہاں دو' دو گھنٹے پارو اس کے انتظار میں باہر لابی میں بیٹھا کرتی اور تقریباً" رات آٹھ بجے کے بعد جب یہ دونوں واپس آتیں تو اول تو کبھی کسی نے ان سے جواب طلبی ہی نہ کی اور جو کبھی اتفاق سے کبھی کسی نے پوچھ بھی لیا تو ایک سو ایک بہانے گھڑے گھڑائے ان کی پٹاری میں موجود ہوتے جن کا بروقت استعمال انہیں ہر طرح کی پریشانی سے محفوظ رکھنے کا موجب بنتا۔

ویسے بھی اپنی زندگی کے تیئس سال اس خاندان میں گزارنے کے بعد پارو کے دل میں کسی کا وہ ڈر و خوف یا لحاظ مروت باقی نہ رہا جو ابتدائی چند سالوں میں اس کی شخصیت کا خاصہ رہا تھا حقیقت یہ تھی کہ آغاجی اور سکینہ بی بی کی موت اور سرفراز صاحب کی بے اعتنائی نے اسے مکمل طور پر باغی کردیا تھا شاید یہ ہی وجہ تھی کہ اپنی محرومی کا بدلہ وہ دریاب کی ذات سے لے رہی تھی اور یہ بات شاید وہ خود بھی نہیں جانتی تھی بہرحال جو بھی تھا سچ یہ تھا کہ ان کا ہر قدم دریاب کو بدترین تباہی کی جانب لے جارہا تھا جس کا احساس کسی کو بھی نہ تھا یہاں تک کہ پارو کو بھی نہیں' وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی بے تحاشا محبت' بے جا لاڈ پیار نے دریاب کو بے راہ روی کے راستوں پر ڈال دیا ہے بہت اوپر جانے کی خواہش میں کچھ بھی کھو دینا دریاب کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا شوبز کی چکا چوند نے بے خبری میں ہی اسے گھیر لیا تھا کچی عمر میں اس کی آنکھوں میں بسنے والا خواب وقت گزرنے کے ساتھ حقیقت کا روپ دھارنے کے لیے بے قرار ہوچکا تھا اور اسی خواب کے حصول نے دریاب کے دل سے اپنی روایات' خاندانی وقار اور جاہ و جلال کو بھی بالکل فراموش کردیا تھا۔

وہ تو بچی تھی بروقت سمجھایا جاتا تو شاید سمجھ جاتی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی کچی آنکھوں کو یہ خواب

بخشنے والی پارو تھی شاید ایک بڑی فلمی اداکارہ بننا کبھی پارو کی خواہش رہا ہو جو وقت نے پوری نہ ہونے دی اور اب اپنی وہ خواہش پوری شدت کے ساتھ وہ درباب کے خون میں اتار چکی تھی۔ لاشعوری طور پر اپنی پہلے دن کی اس گھر میں آمد پارو کبھی نہ بھولی تھی آغا جی کے کہے گئے الفاظ "گندہ خون" آج بھی اس کا بلڈ پریشر بڑھانے کا سبب بن جاتے تھے اور پھر اپنے لیے سب کی آنکھوں میں ہتک آمیز تاثرات کی اذیت بھی اسے آج تک یاد تھی اپنی سگی اولاد کے پرورش دوسروں کے ہاتھوں ہونے والی بات بھی وہ کبھی نہ بھولی تھی اور اس سب کے رد عمل میں اس کے دل میں پیدا ہونے والی نفرت شاید درباب کی محبت سے بھی کم نہ ہو سکی پارو کے زخم وقت نے مندمل ضرور کیے لیکن شاید۔۔۔

☆ ☆ ☆

پچھلے ایک گھنٹہ سے فون کان سے لگائے دریہ جانے کس سے باتیں کر رہی تھی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ کچھ فاصلے پر بیٹھی سمرن کو بھی کچھ سنائی نہ دے رہا تھا شہر پارا صوفہ پر دریہ کے بالکل قریب ہی بیٹھی تھی فون پر مصروف ہونے کے باعث نا صرف ٹی وی کی آواز کم تھی بلکہ دونوں میں سے کوئی بھی ٹی وی کی جانب متوجہ نہ تھی یہ ہی وجہ تھی کہ سمرن کوئی نیوز چینل لگائے بیٹھی تھی ورنہ عام حالات میں تو ان دونوں میں سے کسی ایک کی بھی موجودگی میں نیوز چینل لگایا جانا بذات خود ایک جرم تھا۔

"یہ لو مما جی سے بات کرو۔" دریہ کی بات سن کر سمرن لاشعوری طور پر ان کی جانب متوجہ ہو گئی اور یہ جاننے کا فطری تجسس کہ دوسری سمت کون ہے اس نے غیر ارادی طور پر ٹی وی کی آواز کو قدرے کم کر دیا حالانکہ کسی کی ٹوہ لینا اس کی فطرت نہ تھی لیکن اس وقت وہ اپنے شک کو یقین میں بدلنا چاہ رہی تھی۔

"ہاں بیٹا وعلیکم السلام، تم تو ایسا کراچی سے گئے کہ دوبارہ پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔"

تو سمرن کا شک درست نکلا دوسری طرف یقیناً زوار حسن بھی تھا۔ سمرن کا دل ایک دم ہی ساری دنیا سے اچاٹ ہو گیا اس نے نہایت خاموشی سے ریموٹ صوفے پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی ایک نظر صوفہ پر بے حد مصروف دریہ اور پارو پر ڈالی اور اپنے کمرے کی سمت جانا ہی چاہتی تھی کہ اچانک لاؤنج کا دروازہ کھول کر شاہ ویز بڑی تیزی سے اندر داخل ہوا اور کمرے میں موجود دونوں ہستیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا ہوا سمرن کے عین مقابل آکھڑا ہوا۔

"جلدی سے باہر آؤ مجھے تمہیں کچھ دکھانا ہے۔" خلاف توقع وہ بے حد ایکسائیٹڈ تھا۔

"کیا دکھانا ہے۔" کچھ دیر قبل والی بے زاری اور اپنی شخصیت کو نظر انداز کرنے کا دکھ ابھی بھی اس کی آواز میں جھلک رہا تھا۔

"ایک تو تم سوال جواب بہت کرتی ہو جلدی چلو۔"

سمرن خاموشی سے لاؤنج کا دروازہ کھول کر شاہ ویز کی ہمراہی میں باہر نکل گئی جبکہ خود کو نظر انداز کرنے کا شاہ ویز کا یہ عمل دریہ کو اندر تک جلا کر بھسم کر گیا۔

"تمہیں پتا ہے میرا بی اے کا لاسٹ سمسٹر بہت اچھے نمبروں سے کلیر ہوا ہے۔" وہ سیڑھیوں سے تیز تیز اترتا ہوا بول رہا تھا۔

"مجھے کیسے پتا چلتا جب تم نے بتایا ہی نہیں۔" وہ ذرا سا خفگی سے بولی۔

"دراصل میں کچھ ایسا ہے ڈیئر کزن کہ بھائی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اچھے رزلٹ کے سبب وہ مجھے گاڑی کے لیے پیسے بھیجیں گے اور میں جانتا تھا کہ ان شاءاللہ اپنی محنت کے ذریعے یہ دونوں کامیابیاں میں ضرور حاصل کر لوں گا لہٰذا اچھا رزلٹ اور گاڑی یہ دو سرپرائز تھے جو میں نے تمہیں دینے تھے بس اسی لیے نہیں بتایا۔" وہ سامنے کھڑی سلور مہران کا دروازہ کھولتے ہوئے قدرے وضاحت کرتا ہوا سب کچھ بتاتا گیا۔

"چلو بہت بہت مبارک ہو اب جلدی سے مٹھائی کھلاؤ۔" وہ ایک دم ہی سب کچھ فراموش کرکے خوش و خرم ہو گئی۔

"تم بیٹھو گاڑی میں، میں تمہیں مٹھائی کھلانے ہی لے کر جا رہا ہوں۔"

اس نے فرنٹ ڈور سمرن کے لیے کھول دیا اور دروازہ تھام کر منتظر نگاہوں سے اس کی جانب تکنے لگا جبکہ وہ ایک دم ہی کنفیوز ہو گئی۔

"میں اکیلی۔" وہ گھبرا کر بولی (جانے تائی اور سب کیا سوچیں۔)

"میں امی کو بتا چکا ہوں، بھابھی نے خود جانے سے منع کر دیا ہے کیونکہ فریال (بھابھی کی بیٹی) کو ٹمپریچر ہے اب کوئی اور اعتراض ہو تو وہ بھی جلدی سے بتا دو، ورنہ بیٹھ جاؤ۔"

"وہ دراصل میں نے اسکارف نہیں لیا اور ہاں۔۔۔" جیسے اسے کچھ یاد آیا۔

"ایسا کرو دریہ کو بھی بلا لو جانے وہ کیا سوچے۔"

"اسکارف کے بغیر بھی تم بہت اچھی لگ رہی ہو اور اچھا ہی ہوا جو اسکارف لے کر نہیں آئی ہو، یقین جانو اسکارف میں تم میری کزن کم آنٹی زیادہ لگتی ہو۔"

دریہ کے ذکر کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا ہوا وہ ہنس کر بولا۔

"بری بات شاہ ویز دوبارہ میرے اسکارف کا مذاق مت اڑانا۔" وہ سخت برا مان کر بولی۔

"وہ سوری یار تم جانتی ہو میں مذاق کر رہا تھا ویسے بھی تم نے سر پر دوپٹہ اتنی اچھی طرح اوڑھا ہے کہ اسکارف کی کمی محسوس ہی نہیں ہو رہی۔" وہ ستائش بھری نظروں سے اس کا بھرپور جائزہ لیتا ہوا بولا جبکہ شاہ ویز کے اس طرح دیکھنے سے وہ بری طرح پزل ہو گئی اور شاید پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ شاہ ویز کے ساتھ آگے بیٹھتے ہوئے اس کی خود اعتمادی کو بحال ہونے میں کچھ وقت لگا اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل شاہ ویز کی محبت کی روشنی سے جگمگانے لگا ہے اور اس حقیقت کا ادراک ہوتے ہی وہ شاہ ویز کے ساتھ ساتھ خود سے بھی نظریں چرانے لگی۔

وہ دونوں سی ویو آ گئے جہاں بنا کوئی بات کیے دونوں نے ایک لمبی چہل قدمی کی نہ جانے الفاظ دونوں کے پاس ختم ہو گئے تھے یا دلوں میں تازہ سر اٹھانے والے چور جذبوں نے ان کی زبان بندی کر دی تھی۔ پھر وہاں سے واپسی میں وہ پزاہٹ آ گئے جہاں کے ترو تازہ ماحول میں دونوں آہستہ آہستہ اپنی پرانی جون میں واپس آ گئے پزا کھانے کے بعد سمرن کا دل آئس کریم کھانے کو چاہا جس کا اظہار اس نے برملا شاہ ویز سے کر دیا اور چند ہی لمحوں میں شاہ ویز اس کے لیے آئس کریم کپ پارسل کی صورت میں لے آیا۔

"ایسا کرو تم آئس کریم گاڑی میں بیٹھ کر کھا لو، میں ذرا فاریہ بھابھی کے لیے پزا پیک کروا لوں۔" گاڑی کی چابی سمرن کو دے کر وہ واپس پلٹا۔

"بات سنو شاہ ویز ایک پزا درباب کے لیے بھی پیک کروا لو اسے پزا بہت پسند ہے۔" اس نے اکثر و بیشتر پزا ڈلیوری اپنے گھر ہوتے دیکھی تھی، اسی لیے بول پڑی، جبکہ شاہ ویز بنا کوئی جواب دیے اندر چلا گیا اور جب تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو خالی ہاتھ تھا۔

"بھابھی کھانا کھا چکی ہیں، میں نے فون کر کے پوچھا تھا، انہوں نے منع کر دیا۔" اپنے خالی ہاتھ آنے کی وضاحت اس نے بنا پوچھے ہی کر دی۔

"اور درباب۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی، جانے کیوں درباب کے سامنے شاہ ویز کے ساتھ اس طرح رات کو اکیلے آنا اسے کچھ اچھا محسوس نہ ہو رہا تھا اور اپنے اس گلٹ کو کم کرنے کے لیے وہ چاہتی تھی کہ درباب کے لیے بھی کچھ لے کر ہی گھر جائے۔

"تم ہر وقت درباب، درباب کیوں کرتی رہتی ہو کیا پرابلم ہے تمہارے ساتھ۔" وہ سخت چڑ کر بولا۔

"یاد رکھنا دوبارہ جب بھی میرے ساتھ آؤ تو پلیز اس خود غرض لڑکی کا نام بھی مت لینا، جانتی ہو اتنی بے باک لڑکیاں مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیں، وہ تو کزن ہونے کے ناتے تھوڑی بہت بات کر لیتا ہوں، ورنہ ایسی لڑکیوں کے پاس سے گزرنا بھی میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔"

گاڑی کو تیزی سے ریورس کرتے ہوئے وہ سخت

غصے میں تھا' جبکہ درباب کے حوالے سے اس کے خیالات اور چہرے پر پھیلی ہوئی نفرت نے سمرن کو حیرت زدہ کردیا' وہ حیران تھی کہ درباب جیسی حسین ترین لڑکی سے بھی بھلا نفرت کی جاسکتی ہے' وہ جو یہ سمجھتی تھی کہ درباب جیسی لڑکیاں ہر شخص کے دل پر راج کرنے کا گر جانتی ہیں' اپنے خیال کی پہلے ہی مرحلے پر ناکامی پر حیرت زدہ تھی' لیکن سچ یہ تھا کہ شاہ ویز کے الفاظ نے سمرن کے اندر سکون ہی سکون بھر دیا تھا' اس نے بے حد مطمئن ہو کر گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگالی۔ درباب جو انجانے میں سمرن سے اس کا ہر رشتہ چھینتی آئی تھی۔ شاہ ویز کو اس سے کبھی نہ چھین سکے گی اور شاہ ویز جیسے اچھے اور با اخلاق دوست کا ساتھ سمرن کے لیے نعمت خداوندی تھا جس کے لیے وہ جتنا اپنے رب کا شکر ادا کرتی کم تھا' گاڑی کی خاموشی اور خنک فضا اچانک ہی استاد غلام علی کی خوب صورت آواز سے گونج اٹھی۔

اب میں سمجھا تیرے رخسار پر تل کا مطلب
دولت حسن پر دربان بٹھا رکھا ہے

سمرن نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اپنے گال پر موجود تل تک آگیا۔ اسی پل شاہ ویز نے اس پر ایک نظر ڈالی جانے اس کی نظر میں ایسا کیا تھا سمرن گھبرا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

گاڑی میں مکمل خاموشی تھی اور غلام علی کی آواز ماحول کو مزید پر فسوں بنا رہی تھی۔

وہ جیسے ہی یونیورسٹی سے گھر واپس آئی اپنے گیٹ کے بالکل قریب کھڑی بلیک لینڈ کروزر کو دیکھ کر لمحہ بھر کو حیران رہ گئی' شاید زوہیب بھائی یا شاہ ویز سے ملنے کوئی آیا ہو' ورنہ ان کے گھر تو اس سے قبل اتنی بڑی گاڑی میں کبھی کوئی مہمان نہ آیا تھا' گیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑا موٹی موٹی مونچھوں والا شخص غالباً" اس گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ سمرن کو دیکھتے ہی اس شخص نے گیٹ دانستہ چھوڑ دیا اور قدرے دور جا کر کھڑا ہو گیا' سمرن حیران پریشان جیسے ہی اپنے فلور تک پہنچی لاؤنج سے آنے والی آوازیں سن کر دنگ رہ گئی' اسی دم خوب ننک سک سے تیار پارو اپنے کمرے سے نکل کر تیزی کے ساتھ لاؤنج کے دروازہ کی جانب بڑھ گئی' وہ اس قدر ایکسائیٹڈ تھی کہ سیڑھی کے قریب کھڑی سمرن پر بھی نظر نہ ڈالی' سمرن خواہ مخواہ ہی تجسس میں مبتلا ہو گئی اور بجائے اپنے کمرے کی جانب بڑھنے کے باہر کرسی پر بیگ رکھ کر خود بھی لاؤنج ہی میں آگئی' پردہ اٹھا کر جیسے ہی اندر داخل ہوئی' لاؤنج میں موجود ہر شخص نے حیرت بھری نظر سے اس کی جانب تکا۔

"السلام علیکم۔۔۔" وہ ایک دم ہی گھبرا اٹھی' اتنی گھبراہٹ کے باوجود اس کی پہلی نظر سامنے بیٹھے سوٹڈ بوٹڈ شخص پر پڑی' تقریباً" پینتیس سال کی عمر کا مرد گندمی رنگت درمیانہ قد' گٹھا ہوا جسم' کندھوں تک آتے گھنگھریالے بال' گلے میں قیمتی چین' ہاتھ میں بریسلٹ دریہ کے قریب بالکل ایسے بیٹھا تھا جیسے کوئی بھکاری بارگاہ حسن میں نذرانہ عقیدت پیش کر رہا ہوں یا شاید کوئی دیو پری کو اپنی قید میں کرنے کے لیے روپ بدل کر آیا ہو اور اپنی دوسری تشبیہ سمرن کو بالکل درست اور بروقت معلوم ہوئی' کیونکہ اس وقت سفید شیفون کی فراک میں سجی سنوری دریہ بالکل پری ہی دکھائی دے رہی تھی۔

"وعلیکم السلام' آجاؤ بیٹا' یہیں بیٹھ جاؤ میرے پاس۔" شہر پارا نے بڑی محبت سے سمرن کے لیے اپنے قریب جگہ بناتے ہوئے پکارا' اتنے محبت بھرے انداز کے باوجود سمرن ان کے انداز میں موجود اکتاہٹ محسوس کر چکی تھی' اسی لیے بنا کوئی جواب دیے واپس پلٹ جانے کو ہی بہتر جانا۔

"بھئی دانش صاحب سے تو ملتی جاؤ۔" سمرن اپنے عقب میں آتی شہر پارا کی آواز سن کر تھم گئی اور ذرا سی گردن موڑ کر پیچھے صوفہ پر بیٹھے شخص پر ایک نظر ڈالی۔

"یہ دانش سہگل ہیں معروف فیشن ڈیزائنر۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے' لیکن یہ یہاں ہمارے گھر کس رشتے سے آئے بیٹھے ہیں؟" اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک سمرن نے کبھی کسی غیر مرد کو اپنے گھر اس طرح بیٹھے نہ دیکھا تھا' شہر پارا جیسی بھی تھی اس کے حوالے سے کبھی کوئی اس گھر تک نہ آیا تھا' پھر آج ایسا کیا ہو گیا جو ایک اجنبی مرد اتنے استحقاق سے درباب کے قریب بیٹھا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور اس ماحول میں درباب کی خاص الخاص کی جانے والی تیاری سمرن کو سخت ناگوار گزر رہی تھی اور اس درجہ ناگواری کا احساس ہی تھا جو وہ اپنی ماں سے جواب طلب کر بیٹھی۔

"دراصل تمہیں نہیں پتا درباب آج کل آرٹ اینڈ ڈانس اکیڈمی سے رقص کی کلاسز لے رہی ہے۔" مزید نیا انکشاف ہوا۔

"اور اس اکیڈمی کے مالک بھی دانش صاحب ہی ہیں' پچھلے ہفتہ ہی دریہ کو کلاسیکل رقص کے مقابلے میں پہلا انعام ملا ہے' بس اسی تقریب کے موقع پر میری دانش صاحب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا یہ میرے دور پار کے رشتہ دار نکل آئے۔ دراصل ان کی والدہ میری کزن تھیں۔"

نظریہ ضرورت کے تحت بولا جانے والا جھوٹ ایک ہی پل میں ان کے لہجہ سے عیاں ہو گیا' لیکن سمرن کو ان کے سچ جھوٹ سمیت دانش سہگل سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا بنا کوئی جواب دیے خاموشی سے باہر نکل آئی' اس کی بھوک بھی ایک دم ہی ختم ہو گئی۔ کرسی سے بیگ اٹھا کر اپنے کمرے میں آگئی اور پھر بنا کھانا کھائے ہی سو گئی' عصر کے قریب جب اس کی آنکھ کھلی تو بھوک کی شدت سے پیٹ دکھ رہا تھا۔ وہ کھانا لینے کے لیے کچن میں آگئی' جہاں سنک میں برتنوں کا ڈھیر اس بات کا غماز تھا کہ مہمان کی خاطر داری خوب دل سے کی گئی ہے۔ سلپ پر بنا ڈھکے مختلف لوازمات گواہی دے رہے تھے کہ خاطر تواضع کے لیے سب سامان اسپیشل طور پر بازار سے منگوایا گیا ہے اور پھر سہگل صاحب کی آمد ان کے گھر رفتہ رفتہ بڑھتی چلی گئی۔

اس آمد و رفت پر شاہ ویز شدید طیش میں تھا' لیکن جہانگیر صاحب کی طبیعت کی خرابی کے باعث اسے اتنی فرصت ہی نہیں مل رہی تھی کہ وہ اس سلسلے میں شہر پارا یا درباب سے کچھ باز پرس کرتا اس کے علاوہ سادیہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ اس مسئلہ میں شاہ ویز انوالو ہو۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس کی ہدایت کے عین مطابق جب بھی سہگل آتا سمرن خاموشی سے اوپر تائی کے فلور پر چلی جاتی' اسے اچھا لگتا تھا کہ شاہ ویز اس کے حوالے سے اتنا حساس ہے۔

☼ ☼ ☼

سمرن خاموشی سے باہر برآمدے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی' مغرب کی اذان کی آواز نے اس کے دل کو رقت سے بھر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے سر پر دوپٹہ اوڑھے عقیدت و احترام سے اذان کے کلمات کو اپنی روح میں جذب کر رہی تھی۔ جب اچانک ہی سرفراز صاحب آگئے' وہ کبھی بھی اس وقت گھر نہیں آتے تھے سمرن انہیں دیکھ کر خاصی حیران ہوئی۔

"تمہاری ماں کہاں ہے؟" مزید حیرت کیونکہ پچھلے کئی سالوں سے تو انہوں نے کبھی گھر آکر شہر پارا کا نہ پوچھا تھا' لیکن سمرن کے جواب دینے سے قبل ہی وہ شہر پارا کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر اس جانب بڑھ چکے تھے۔ شہر پارا پچھلے کئی سالوں سے علیحدہ کمرے میں رہ رہی تھی۔

"یہ لینڈ کروزر میں ہمارے گھر کون آتا ہے؟" ان کی بارعب اور غصیلی آواز کمرے سے باہر تک سنائی دی' اس کا مطلب ہے بابا میں ابھی بھی دم خم باقی ہے' ان کی اس جواب طلبی نے سمرن کے اندر سکون ہی سکون بھر دیا۔

شہر پارا بڑے اطمینان سے اپنے ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھی' جبکہ دریہ' سرفراز صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خاموشی سے باہر نکل کر برآمدے میں رکھی کرسی پر نہایت اطمینان سے بیٹھ گئی

تھی، بالکل اس طرح جیسے اسے فراز صاحب کی جواب طلبی سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ سمرن نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس پر نظر ڈالی۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔" انہوں نے اپنی آواز کو حتی الامکان مدھم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، جبکہ شہر یارا ان کی بات کو بنا کوئی اہمیت دیے خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔ پھر نیل پالش کا ڈھکن بند کر کے اپنے ناخنوں پر پھونک مارتے ہوئے بالکل اس طرح کھڑی ہوئی جیسے کمرے میں کوئی دوسرا فرد موجود ہی نہ ہو نیل پالش کی بوتل ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی اور پلٹ کر نہایت اطمینان سے چلتی ہوئی عین ان کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔

"مجھ سے کچھ کہا ہے آپ نے؟" اس کی بے نیازی عروج پر تھی۔

"ہاں تم سے ہی کہہ رہا ہوں، کون ہے یہ شخص جو آج کل ہمارے گھر آ رہا ہے۔"

"میری کزن کا بیٹا، بھانجا لگتا ہے میرا۔" اس کا اطمینان دیدنی تھا۔

"یہ تمہاری ایسی کون سی کزن پیدا ہو گئی، جس کا بیٹا لینڈ کروزر کا مالک ہو۔" سرفراز صاحب کا انداز استہزائیہ تھا۔

"کیوں کیا ہم جیسوں کی کوئی کزن نہیں ہوتی یا ان کا کوئی بیٹا نہیں ہو سکتا، آپ کو اعتراض کس بات پر ہے کزن پر، بیٹے پر یا لینڈ کروزر پر۔"

وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی تھیں، جانے ان کے لہجہ میں ایسا کیا تھا کہ ایک دم ہی سرفراز صاحب گھبرا اٹھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس بڑھاپے میں آ کر تیس سال قبل اٹھایا جانے والا غلط قدم ان کی بدنامی کا باعث بنے۔ انہیں اپنے سے زیادہ اپنی بیٹی کی فکر تھی اور یقیناً" شہر یارا کا ماضی ان کی بیٹی کے مستقبل کو داغ دار کر سکتا تھا۔

"دیکھیں سرفراز صاحب اگر آپ کے بہن بھائی اس گھر میں آ سکتے ہیں آپ سے مل سکتے ہیں تو پھر میرا بھانجا کیوں نہیں، اگر آج تیس سال بعد میرا کوئی رشتہ دار آپ کے گھر آ بھی گیا ہے تو آپ کی غیرت ایک دم جاگ اٹھی۔ اگر میرا بھانجا ایک مرد ہے تو کیا آپ کے بھانجے، بھتیجے مرد نہیں ہیں یا وہ غیرت کے زمرے میں نہیں آتے، آپ کا قانون سب مردوں کو ایک برابر نہیں سمجھتا؟ کیا اس میں میرے رشتہ داروں اور آپ کے خاندان والوں میں کوئی فرق ہے، آپ کا بھانجا آئے تو ٹھیک میرا آئے تو گناہ۔۔۔۔ واہ جی واہ۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن میں تو صرف دریہ کی وجہ سے۔"

"آپ دریہ کی فکر نہ کریں۔" وہ تیزی سے ان کی بات کاٹ کر بولی۔

"اللہ خیر کرے، اس کے ماں، باپ دونوں موجود ہیں، اپنی بیٹی کا بھلا برا سب دیکھنے کے لیے، آپ صرف اپنی بیٹی کا خیال کریں جو آپ کی ذمہ داری ہے۔" اس نے سمرن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اب سرفراز صاحب کے پاس مزید بات کرنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی۔

"شادی کرتے وقت تو دیکھتے نہیں کہ کس خاندان میں کر رہے ہیں، اس وقت عشق کا بخار دماغ پر چڑھ جاتا ہے، بعد میں دنیا دکھاوے کے لیے پارسا بن بیٹھتے ہیں ڈرامہ باز لوگ یاد رکھیے گا، سرفراز صاحب میں جو بھی ہوں جیسی بھی ہوں اللہ کا شکر ہے آپ کے لیے اپنے گھر سے بھاگ کر نہیں آئی، خود بیاہ کر لائے تھے مجھے آپ اور پھر ساری عمر ایک کونے میں ڈال کر اپنے فرض سے آزاد ہو گئے اور میری زندگی گزر گئی آپ کی عزت بچاتے ہوئے اونہہ۔" انہوں نے ایک نخوت بھری نظر سرفراز صاحب پر ڈالی جو ایسے کھڑے تھے جیسے وہاں موجود ہی نہ ہوں ندامت سے گردن جھکائے، اپنے ماضی پہ شرمسار اس غلطی پر نادم جس کے نتیجہ میں شہر یارا ان کی دو بیٹیوں کی ماں بننے کی حق دار ٹھہری کاش یہ سب آج سے تیس سال قبل سوچا ہوتا تو آج اتنی ندامت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔" کاش میں اپنی محبت کے زور پر اس عورت ہی کو بدلنے

کی ایک کوشش کر لیتا، لیکن اب لاحاصل۔ اب وقت میرے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل گیا، نہ میں نے اپنے ماں، باپ کو کوئی خوشی دی اور نہ ہی اس عورت کو وہ بھرپور توجہ دی جو شاید آج اس کے دل میں موجود زہر کو تریاق میں بدل دینے کے کام آتی۔" وہ مرے مرے قدموں سے واپس مڑے۔

"اور ہاں ایک بات اور یاد رکھیے گا میں نے دریاب کو ماں بن کر پالا ہے، سگی ماں سے بڑھ کر اس سے محبت کی ہے۔ راتوں کو اس کے ساتھ جاگی ہوں، اس کی ہر دکھ اور تکلیف کو اپنے دل پر محسوس کیا ہے، میں بھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گی جس سے اسے تکلیف پہنچے۔"

شہر یارا کی نخوت بھری آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی، وہ خاموشی سے باہر نکل آئے۔

جہاں دروازے کے قریب ہی سمرن کھڑی تھی، آنکھوں میں ڈھیروں سوال لیے۔ اس کا دل چاہا آج ضرور اپنے باپ کو روک کر پوچھے کہ اس کی ماں کا تعلق کس خاندان سے ہے؟ کیا جو لوگ کہتے ہیں وہ سچ ہے؟ کیا اس کی ماں کا تعلق ریڈ لائٹ ایریا سے ہے؟ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب نہ دے پائے گا اور وہ جاننا بھی نہیں چاہتی تھی، کیونکہ "شک" اور "یقین" میں کتنا فرق تھا۔ وہ اسے آج صحیح معنوں میں معلوم ہوا اور اس آگہی کی اذیت نے اسے اندر تک چیر دیا، شاہ ویز جو ابھی ابھی باہر سے آیا تھا اندر سے آنے والی تیز و تند گفتگو سن کر پل بھر میں ہی ساری بات جان گیا اور دانش محل سے متعلق شہر یارا سے کسی بھی جواب طلبی پر لعنت بھیج کر خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے فلور کی جانب بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

شام میں جب اس کی آنکھ کھلی تو گھر میں حسب معمول خاموشی کا راج تھا۔ یقیناً" دریہ اور اماں کہیں باہر گئی ہوں گی یہ سوچ کر وہ باہر برآمدے میں آ گئی۔ پہلے چاہا اوپر چلی جائے، لیکن شاہ ویز کی موجودگی کے خیال سے ارادہ بدل دیا اور جانے کیا بات تھی آج کل وہ شاہ ویز کے سامنے زیادہ جانے سے گریز کرتی تھی، وجہ شاہ ویز کی حال دل بیان کرتی آنکھیں تھیں، اس کی بولتی نگاہوں سے وہ گھبرا اٹھتی تھی۔ عورت ہونے کے ناتے وہ بنا کہے ہی شاہ ویز کی دل کی آواز سن چکی تھی اور یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اس سے کترانے لگی تھی، اسی لیے خاموشی سے نیچے ارم چچی کے پاس آ گئی جو اس وقت نایاب کو کھانا کھلا رہی تھیں، اپنی بیماری کی بدولت وہ اٹھارہ، انیس سال کی عمر میں بھی بچوں ہی کی طرح ری ایکٹ کرتی تھی، اسی وجہ سے آرزو اور ولید ہمیشہ اپنی ماں کی عدم توجہی کا شکار رہے۔

"اچھا ہوا آپی آپ آ گئیں اب مجھے میتھ کا یہ والا سوال سمجھا دیں۔" ولید اسے دیکھتے ہی اپنی کاپی لے کر آ گیا، جبکہ ارم، نایاب کا کھانا ختم کرنے کے بعد اس کا منہ ہاتھ گیلے تولیے سے اچھی طرح صاف کر رہی تھی۔

"چلو تم ولید کو ہوم ورک کروا دو، میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔" ارم چچی نے فارغ ہو کر تمام برتن سمیٹے اور کچن کی جانب بڑھتے ہوئے سمرن کو مخاطب کیا۔

"رہنے دیں چچی میں پی کر آئی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں میرے ساتھ ایک دفعہ اور پی لو۔" وہ ولید کو سوال سمجھا رہی تھی، جب شاہ ویز دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

"میں تمہیں سارے گھر میں ڈھونڈ رہا ہوں، تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔" وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"خیر چھپی تو نہیں بیٹھی، ویسے ہی تنہا دل گھبرا رہا تھا، اسی لیے سوچا نیچے چلوں ذرا بچوں میں دل ہی بہل جائے گا۔" وہ اپنے اندر کی کیفیت کو چھپا کر بڑے نارمل انداز میں بولی۔

"چلو خیر تمہاری مرضی، ورنہ دل تو مجھ سے بھی بہل سکتا ہے۔" اس نے سفید دوپٹہ کے ہالے میں موجود

سمرن کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے شوخی سے کہا' اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی ارم آگئیں' ہاتھ میں پکڑی ٹرے سمرن کے سامنے رکھی۔

"مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ شاہ ویز بھی آیا ہوا ہے' چلو اب تم بیٹھو میں ایک کپ چائے اور بنا لاؤں۔" یہ کہہ کر وہ واپس کچن کی جانب مڑ گئیں' جبکہ شاہ ویز کی نظروں کا ارتکاز محسوس کرکے سمرن کچھ کنفیوز سی ہوگئی' اسی لیے منہ نیچے کیے جلدی جلدی ولید کو سوال سمجھانے لگی اور شاہ ویز بڑی دلچسپی سے اس کی حرکات کو نوٹ کرتا رہا۔ گھبراہٹ میں سمرن نے گرم گرم چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ لے لیا اور پھر جلدی سے کپ واپس ٹرے میں رکھ دیا شاہ ویز بے اختیار ہی مسکرا دیا اور جانے کیا سوچ کر سمرن کی چائے کا کپ اٹھالیا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتی شاہ ویز نے بڑے مزے سے اس کی بچی ہوئی چائے کے سپ لینے شروع کردیے' ارم چچی ایک اور کپ لے کر واپس آچکی تھیں اور نایاب کی جانے کون سی بات سننے میں مصروف تھیں۔ دو تین سپ لے کر اس نے کپ واپس ٹرے میں رکھ دیا۔

"یہ باقی چائے تم پی لینا میں اوپر سے پی کر آیا تھا۔" بچی ہوئی چائے کا کپ اس نے سمرن کے سامنے رکھ دیا۔

"اب یہ مت کہہ دینا میں تمہارا جھوٹا نہیں پیوں گی۔" نہایت آہستہ سے کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے تم کہاں جا رہے ہو چائے تو پی لو۔" نایاب میں الجھی ارم چچی نے شاہ ویز کے کھڑے ہوتے ہی اس کی توجہ چائے کی جانب مبذول کروائی۔

"بس چچی مجھے کہیں جانا تھا میں تو ویسے بھی ولید سے ملنے نیچے آگیا تھا۔" اس نے ولید کے بالوں کو آہستہ سے چھو کر سمرن پر ایک نظر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

شہریار کے دو ہی شوق تھے ایک شاپنگ' دوسرا فلم بینی' لیکن جانے آج کل ایسا کون سا قارون کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا کہ جب بھی دونوں گھر سے جاتیں واپسی میں خوب لدی پھندی ہوتیں قیمتی ملبوسات' ہینڈ بیگ' امپورٹیڈ جوتے' پرفیوم اور جیولری سے دونوں کی مشترکہ الماری لدی پڑی تھی' ڈریسنگ ٹیبل پر موجود میک اپ کے قیمتی سامان میں ہونے والے دن بہ دن اضافے نے بھی سمرن کو دنگ کر رکھا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں موجود موبائل ان کے بیش قیمت ہونے کا اعلان کرتے۔ اس سلسلے میں استعمال ہونے والی اضافی رقم کا ذریعہ کیا تھا' شاید یہ سوال سمرن کو مزید کچھ عرصہ پریشان رکھتا' اگر ایک دن یونیورسٹی سے واپسی پر وہ اپنی ماں اور دریہ کو دانش سہگل کے ساتھ نہ دیکھ لیتی۔

"تو قارون یہ شخص ہے جس کے خزانے سے میری ماں اور دریہ فیض یاب ہو رہی ہیں۔" جیولر شاپ سے باہر آتی دریہ پر ایک تاسف بھری نظر ڈال کر اس نے سوچا۔

☼ ☼ ☼

اچانک ہی اس کی نگاہ سفید یونیفارم میں ملبوس اس لڑکی پر پڑی تو واپس پلٹنا بھول گئی۔ "اپسرا" اس لڑکی کو دیکھتے ہی پہلی تشبیہ مہر علی کے دل نے دی جسے دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے ہوئے مہر علی نے مہر تصدیق ثبت کردی۔ یونیفارم پر بڑی بے نیازی سے دوپٹہ گلے میں ڈالے اپنی دوست سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی' وہ مہر علی کی جانب بڑھتی آرہی تھی اور اس کا اٹھتا ہوا ہر قدم مہر علی کو اپنے دل پر پڑتا محسوس ہو رہا تھا' جانے وہ لڑکی واقعی اپنے قیامت خیز حسن کی تجلیوں سے بے خبر تھی یا اپنی بے نیازی کے زور پر دلوں کو تسخیر کرنے کا فن جانتی تھی۔ مہر علی کو یکسر نظر انداز کرتی وہ اس کی گاڑی کے پاس سے ایسے گزری جیسے سبک رفتار ہوا کا جھونکا۔ مہر علی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زمین پر نہیں بلکہ پانی پر چل رہی ہو' نہایت ہی دلکش اور دل کو موہ لینے والی چال چلتی ہوئی جیسے ہی وہ سڑک کا موڑ مڑ

کر مہر علی کی نظروں سے اوجھل ہوئی ایسا محسوس ہوا جیسے ایک دم ہی سارے عالم پر اندھیرا چھا گیا ہو اور پھر مہر علی کا دل وہاں ایک پل بھی نہ لگا۔

وہ اپنے دوست عمر لغاری کے ساتھ مقامی گرلز کالج آیا تھا جہاں عمر کی والدہ پرنسپل تھیں' عمر کو اپنی والدہ سے کوئی کام تھا' اسی لیے وہ زبردستی مہر کو بھی اپنے ساتھ لے آیا' اب پچھلے پندرہ منٹ سے وہ اندر اپنی والدہ کے پاس تھا' جبکہ مہر گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا اس کے انتظار میں سخت بور ہو رہا تھا کہ اچانک ہی اس "اپسرا" کے دیدار نے مہر علی کی بوریت کو اڑن چھو کردیا اور وہ دل کی گہرائیوں سے عمر لغاری کا مشکور ہوا' جس کی بدولت ایسے حسن جہاں سوز کا نظارہ اس کے لیے ممکن ہو سکا۔

☼ ☼ ☼

آج کل اسلام آباد سے پھوپھو اور زوار آئے ہوئے تھے' زوار تو ویسا ہی تھا خوش و خرم اور ہشاش بشاش' لیکن جانے کیا بات تھی اسے پھوپھو پہلے جیسی دکھائی نہ دے رہی تھیں' سمرن نے جب بھی انہیں دیکھا افسردہ اور بجھی بجھی ہی نظر آئیں' نیچے تو خیر وہ ویسے ہی کم آتی تھیں' لیکن جب وہ تائی ساویہ کے پاس اوپر گئی پھوپھو کو کسی گہری سوچ میں غرق ہی پایا' جب تک وہ اوپر رہتی پھوپھو خالی خالی نظروں سے اس کی جانب تکا کرتیں اور پھوپھو کی اس حالت نے اسے حقیقتاً پریشان کردیا۔

"بھابھی یہ پھوپھو واقعی ہی پریشان ہیں یا صرف مجھے محسوس ہو رہا ہے۔" اس سے رہا نہ گیا اور فاریہ بھابھی سے پوچھ ہی بیٹھی۔

"پریشان نہیں بلکہ کافی پریشان ہیں۔" فاریہ بھابھی دھیمے سے جواب دے کر اپنے کام میں مشغول ہوگئیں اور وہ جو ان کی پریشانی جاننا چاہتی تھی منتظر ہی رہی کہ فاریہ بھابھی مزید کچھ بتائیں لیکن بھابھی کی طرف سے طاری ہنوز خاموشی کسی سنجیدہ بات کی سمت اشارہ کر رہی تھی۔

"پریشانی کی وجہ۔" کریدنے کی عادت نہ ہوتے ہوئے بھی وہ پھر سے پوچھ بیٹھی۔

"زوار حسن۔" بھابھی نے پلٹ کر اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کے سوالیہ انداز کو سمجھتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"وہ ایسا ہے سمرن۔" بھابھی کی سمجھ میں نہ آیا بتائیں کہ نہیں۔

"زوار' دریاب سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" آخر کار بھابھی نے بتانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

"تو اس میں اس قدر پریشانی والی کیا بات ہے۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔" وہ حیران ہو کر بولی۔

"دریہ نا صرف ان کے بھائی کی بیٹی ہے بلکہ ان کے بیٹے کی پسند بھی ہے اور اتنی خوبصورت لڑکی کی خواہش تو کوئی بھی شخص کر سکتا ہے اس میں زوار حسن کا کیا قصور ہے بھلا۔"

"ہر شخص تو خیر نہیں ہاں البتہ ہر بے وقوف شخص ضرور کہا جا سکتا ہے۔"

بلاشبہ یہ آواز شاہ ویز کی تھی جو غالباً ابھی ابھی آفس سے آیا تھا۔

"اور میرا خیال ہے کہ زوار کا شمار بھی ان ہی بے وقوف لوگوں میں ہوتا ہے ورنہ کم از کم میرے جیسے پریکٹیکل آدمی کے لیے صورت سے زیادہ سیرت اور مضبوط کردار اہمیت کا حامل ہے اور مجھے آج تک دریہ میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آئی جس کی بنا پر اس کے دائمی ساتھ کی خواہش کی جائے۔"

"تمہاری بات بھی ٹھیک ہے لیکن پھر بھی سب کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے کچھ لوگ صورت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔" بھابھی نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

"لیکن پھوپھو کے نزدیک صورت سے زیادہ سیرت اہم ہے وہ ایک حسین مجسمہ سے زیادہ سگھڑ بہو کی خواہشمند ہیں جبکہ زوار اپنی ضد پر مکمل طور سے اڑا ہوا ہے اب دیکھو اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔"

بھابھی نے ہاتھ دھو کر تولیہ سے صاف کیے اور پلٹ کر سمرن کی جانب دیکھا۔

"ویسے ایک بات بتاؤ سمرن تمہیں کبھی برا نہیں لگا کہ زوار' دریہ میں اتنا انٹرسٹڈ ہے جبکہ وہ تم سے منسوب تھا اور یہ بات تقریباً" سب ہی جانتے تھے۔"

سمرن کے لیے بھابھی کے دل میں موجود فطری محبت تاسف کی صورت میں ان کے لہجہ میں در آئی جبکہ شاہ ویز کی موجودگی میں سمرن کے لیے اس بات کا جواب دینا خاصا وقت طلب تھا اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ جان چکی تھی کہ شاہ ویز بھی اس کا جواب جاننے کے لیے بے قرار ہے۔

"بات دراصل یہ ہے بھابھی میرے نزدیک کبھی بھی وہ شخص عزت اور اہمیت کا حامل نہیں ہو سکتا جس کے نزدیک میری کوئی حیثیت نہ ہو اور یہ تو زیادہ اچھا ہوا کہ زوار نے خود ہی اپنی زندگی کے فیصلے سے سب کو آگاہ کردیا ورنہ دوسری صورت میں مجھے خود اس کے رشتہ سے انکار کرنا پڑتا کیونکہ میں خود بھی ذہنی طور پر خود کو شاید اس رشتہ کے لیے آمادہ نہ پاتی تھی۔"

وہ اطمینان سے جواب دے کر کچن سے باہر نکل گئی اور خاموشی سے سیڑھیاں اتر کر اپنے فلور پر آگئی۔

یہ سچ ہی تھا کہ بھابھی کی دی گئی خبر سے اس کے دل میں دریہ یا زوار کے متعلق کوئی بھی ملال یا منفی خیال نہ آیا تھا زوار حسن اس کے بچپن کی ایک ایسی خواہش تھی جو دوسروں کے احساس دلانے سے اس کے دل میں ابھری ضرور تھی لیکن زوار کے رویہ نے اس خواہش کو سرے سے ختم کرکے اسے حقیقت پسندی کی دنیا میں لا کھڑا کیا تھا اور اب زوار' دریہ سے شادی کرتا یا کسی اور سے اسے کم از کم اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا پھوپھو نے اپنے چھوٹے بھائی شہباز کے سامنے درباب گل کے لیے دست سوال دراز کیا تو تقریباً" ہر وہ شخص حیران رہ گیا جو سمرن اور زوار حسن کے متوقع رشتے سے باخبر تھا اور ایسے موقع پر پھوپھو کو نہایت شرمندگی سے اعتراف کرنا پڑا کہ زوار خود درباب کے ساتھ کا خواہش مند ہے اور پھوپھو کی اس وضاحت نے ہر شخص کو خاموش کردیا جبکہ شہباز اس رشتہ کی قطعی حمایت میں نہ تھے ان کے نزدیک یہ سراسر سمرن کے ساتھ ناانصافی تھی لیکن سرفراز صاحب کے سمجھانے بجھانے پر وہ بھی نیم رضامند ہو ہی گئے سرفراز صاحب کے خیال میں درباب کے بہتر مستقبل کے لیے ضروری تھا کہ اس کی شادی جلد از جلد کردی جائے ان کے نزدیک شادی درباب کو تحفظ فراہم کرنے کا ایک بہترین ذریعہ تھی۔

اس طرح لاشعوری طور پر ان کی کوشش تھی کہ درباب کو شہر پارا سے دور کردیا جائے اور اس کے لیے زوار سے بہتر رشتہ کوئی اور نہیں مل سکتا تھا رسمی کارروائی کے طور پر ارم نے شہر پارا سے درباب کی رضامندی جاننے کے لیے رابطہ کیا کیونکہ وہ سب سے زیادہ شہر پارا کے ہی قریب تھی اور اس کی پسند ناپسند اس سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا درباب اور زوار کے درمیان موجود رابطے کو دیکھتے ہوئے سب کو ہی یقین تھا کہ زوار نے یہ قدم درباب کی مکمل رضامندی کے بعد ہی اٹھایا ہے لہٰذا پھوپھو نے منگنی کی شاپنگ کی غرض سے بازار کا ایک چکر بھی لگالیا تھا خیال تھا کہ ہفتہ تک پھوپھا جان اور دوسرے گھر والے بھی پہنچ جائیں گے اور ان کے آتے ہی منگنی کی باقاعدہ رسم کردی جائے گی اور اس وقت جب سب ہی اس فیصلہ کو اللہ کی رضا جان کر خوش اور مطمئن ہوچکے تھے درباب نے ایک ایسا دھماکہ کیا جسے سن کر ہر شخص حیران رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ نے کس سے پوچھ کر پھوپھو کو ہاں کی ہے؟"

وہ ارم کے سامنے تنی کھڑی اس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالے نہایت بدتمیزی سے جواب طلب کررہی تھی جبکہ حیران پریشان ارم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی بات کا کیا جواب دیں وہ تو ابھی تک اس کی اس قدر دیدہ دلیری پر ہی حیران ہورہی تھیں جس نے ماں اور بیٹی کے درمیان ادب و احترام ہی ختم کردیا تھا۔

"تو ابھی پوچھ لیں آپ نے کس سے پوچھ کر پھوپھو کو ہاں کی ہے۔"

وہ شروع سے ہی شہر پارا کو مما اور ارم کو چچی کہنے کی عادی تھی۔

"ہاں میں نے نہیں تمہارے ابو نے کیا ہے جاکر ان سے پوچھو۔" وہ بالآخر اپنا غصہ برداشت کرتے ہوئے بولیں۔

"اور یہ تم مجھ سے بات کس طرح کررہی ہو تمیز بھول گئی ہو کیا۔"

"میں اسی طرح بات کرتی ہوں آپ نے کبھی کی ہو تو آپ کو پتا چلے آپ کو تو ہمیشہ اپنے بچوں سے ہی فرصت نہیں ملی آپ نے صرف نایاب کو پیدا کیا تھا مجھے نہیں اور ہاں منع کردیجیے گا اپنے میاں کو میری شادی کی فکر میں انہیں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ تیزی سے کہہ کر واپس پلٹی اور سیڑھیاں چلتی چلی گئی جبکہ ارم اپنی جگہ پر کھڑی ہکا بکا اس کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھیں جانتی تھیں کہ وہ بہت زبان دراز اور بدتمیز ہے لیکن اس کا عملی مظاہرہ آج پہلی بار دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر درباب گل نے سب کے سامنے نہایت بے باکی اور جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے زوار سے شادی کرنے سے انکار کردیا اس انکار کو سن کر ہر شخص دنگ رہ گیا۔ شاہ ویز کا کہنا تھا کہ وہ بے باکی کی آخری حد ہے جس پر درباب کھڑی ہے اور اس کی یہ بے باکی آنے والے دنوں میں یقیناً" اسی کے لیے ایک عذاب ثابت ہوگی۔ جیسے ہی درباب نے انکار کیا پھوپھو کے من کی گویا مراد پوری ہوئی انہوں نے جھٹ پٹ سمرن کے لیے دامن پھیلا دیا ان کا کہنا تھا کہ زوار خود سمرن سے شادی کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کی آنکھوں پر بندھی دریہ کے عشق و حسن کی پٹی اتر چکی ہے پھوپھو کی اس خواہش کا علم جیسے ہی سمرن کو ہوا وہ اپنے باپ سرفراز صاحب کے پاس پہنچ گئی۔

"بابا آپ کا جہاں اور جس سے دل چاہے میری شادی کردیجیے لیکن پلیز زوار حسن سے نہیں اور آپ مجھ سے اس انکار کی وجہ پوچھیے گا بھی مت کیونکہ میرے پاس اس کا کوئی جواز نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں درباب کی ٹھکرائی ہوئی چیزوں کو اپنانے کا حوصلہ شاید اب خود میں نہیں پاتی۔"

نہایت خود اعتمادی سے بات کرتے کرتے اس کا لہجہ بھرا گیا اور آنکھوں میں پانی بھر آیا اس لمحہ سرفراز صاحب کو اپنی اس بیٹی پر ٹوٹ کر پیار آیا انہوں نے نہایت خاموشی سے اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھ کر اسے اپنے ساتھ کی یقین دہانی کروائی اور پھر اس کے عملی ثبوت کے طور پر اپنی بہن کو انکار کردیا اور اس انکار میں انہوں نے سمرن کا کوئی ذکر نہ کیا زوار نے بہت کوشش کی کہ وہ ایک دفعہ اس کی بات سن لے لیکن سمرن نے صاف انکار کردیا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ بات تب سنی جاتی ہے جب دلوں میں کوئی گنجائش موجود ہو یا فیصلوں میں لچک ہو لیکن جب ایسا نہ ہو تو بات سننے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اور یہی بات فاریہ بھابھی سے کہہ کر جب وہ نیچے اتری تو آخری سیڑھی پر اسے شاہ ویز کھڑا دکھائی دیا۔ چاہتی تھی کہ نظر انداز کرکے نکل جائے لیکن اس نے دیوار پہ ہاتھ رکھ کر اس کا راستہ مسدود کردیا ناچار اسے رکنا پڑا۔

"تھینک یو یار۔"

"کس بات کا۔" اس کی حیرانی بجا تھی۔

"زوار کے رشتہ سے انکار کا" جانتی ہو مجھے تم سے اتنی جرات مندی کی امید نہیں تھی لیکن تمہاری اس جرات نے تو مانو مجھے نئی زندگی بخش دی ہے۔"

"اوہ.... اس کا مطلب ہے بابا نے شاہ ویز کو وجہ بتا دی ہے۔" اس نے سوچا۔

"اچھا لیکن میرے انکار سے تمہارا کیا تعلق ہے۔"

وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولی۔

"تم نہیں جانتیں؟" وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں

دیکھتا ہوا بولا۔

"نہیں...... اچھا اب ہٹو آگے سے بابا آنے والے ہیں مجھے کھانا بنانا ہے۔" وہ شاہ ویز کی نظروں سے خائف ہوتے ہوئے بولی۔

"ہٹ جاتا ہوں لیکن پہلے وعدہ کرو میرے پرپوزل پر تو انکار نہیں کرو گی نا۔" وہ یک دم ہی بنا کسی تمہید کے بولا اور سمرن کچھ بول ہی نہ پائی۔

"ویسے تو بڑے کہتے ہیں خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود میں تم سے جواب سننا چاہوں گا جو یقیناً "ہاں" ہی ہو گا۔"

"جب تمہیں پتا ہے تو پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟ اور چلو اب ہٹو آگے سے۔" وہ اپنے اعتماد کو بحال کرتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"تھینک یو یار۔ تھینک یو سو مچ اور ہاں یاد رکھنا تم میری سیکنڈ چوائس نہیں ہو بلکہ پہلی اور آخری پسند ہو کیونکہ مجھے کم از کم دریاب جیسی لڑکیاں کبھی پسند آ ہی نہیں سکتیں۔" وہ اسے راستہ دیتا ہوا بولا۔

"جانتی ہوں۔" یہ کہہ کر سمرن تیزی سے آگے کی جانب بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

موسم بدل رہا تھا ہلکی ہلکی خنکی کے ساتھ فضا میں ہر طرف ایک نامعلوم سی اداسی چھائی ہوئی تھی سمرن اپنے کمرے میں بیٹھی بظاہر تو پڑھ رہی تھی لیکن اس کی ساری توجہ برابر والے کمرے میں مرکوز تھی جہاں دانش سہگل اپنی کسی آنٹی کے ساتھ آیا بیٹھا تھا اور اس کی یہ آمد بلا مقصد نہ تھی بلکہ وہ دریاب کا پرپوزل لے کر آیا تھا اس کی اس جرات پر جہاں شہباز صاحب سخت حیران تھے وہاں سرفراز صاحب نہایت ہی غصے میں تھے دانش سہگل، دریہ سے دو گنی عمر کا ایک معمولی شکل و صورت کا بندہ تھا جس کی واحد خوبی شاید اس کا بینک بیلنس اور لمبی چوڑی گاڑی تھی جس نے دریہ اور شہر پارا کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا اور اس میں کوئی ایسی خوبی نہ تھی جس کی بنا پر دریہ جیسی کم عمر اور حسین لڑکی اس کا مقدر بنائی جاتی۔

یہ ہی وجہ تھی کہ دونوں بھائیوں نے متفقہ فیصلہ کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا جیسے ہی شہر پارا نے کچھ کہنے کی کوشش کی سرفراز صاحب نے اسے جھڑک کر خاموش کروا دیا اور شاید وہ بھی موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خاموش ہو گئی تایا جی کی طبیعت کی خرابی کے باعث تایا جی اور تائی سادیہ بھی نیچے نہ آئے تھے جبکہ ارم چچی، دریاب کی اس دن کی بدتمیزی سے خاصی کبیدہ خاطر تھیں یہ ہی وجہ تھی کہ انہوں نے بھی نایاب کی بیماری کا بہانہ بنا کر اوپر آنے سے معذرت کر لی تھی۔ اور دریاب شاید اپنے اور شہر پارا کے مشترکہ کمرے میں تھی سمرن کی کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا جب اس نے دانش سہگل کو ایک نہایت ہی ماڈرن سی خاتون (جن کا جسم ساڑھی پہننے کے باوجود عریاں تھا) کے ساتھ واپس جاتے دیکھا دانش سہگل کے چلنے کا انداز اس کے اندرونی غصے کی غمازی کر رہا تھا جبکہ وہ خاتون شہر پارا سے جاتے جاتے آہستہ آہستہ کیا باتیں کر رہی تھیں جن کے جواب میں شہر پارا کی صرف گردن ہی ہل رہی تھی اور پھر وہ دونوں سیڑھیاں اتر گئیں اور سمرن نے یہ خبر سن کر اطمینان کا سانس لیا کہ چچا جان نے اس رشتہ سے انکار کر دیا ہے لیکن اس کا یہ اطمینان چند روزہ ہی ثابت ہوا۔

وہ جو کہتے ہیں نا کہ رشتے تو آسمان پر بنتے ہیں تو شاید درست ہی تھا حالانکہ خاندان کا کوئی بھی فرد اس رشتہ پر دل سے راضی نہ تھا کہاں زوار حسن جیسا خوبرو نوجوان اور کہاں دانش سہگل جیسا گھاگ اور منجھا ہوا مرد جو سمرن کو کم از کم ایک ایسا گھاگ شکاری نظر آتا جو معصوم پرندوں کو اپنے جال میں پھانسنے کا فن بخوبی جانتا تھا اور اس کی نزدیک دریہ بھی ایک ایسا ہی معصوم پرندہ تھا جو اپنی بے وقوفانہ خواہشات کے حصول کے لیے دانش کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے کے لیے بخوشی تیار تھی یہ ہی وجہ تھی کہ سب کے انکار کے باوجود وہ شہباز صاحب سے جواب طلبی کے لیے پہنچ گئی۔

"آپ نے دانش کے رشتہ سے انکار کیوں کیا ہے؟ کیا خرابی ہے اس میں؟" وہ ابھی ابھی گھر آئے تھے اور ہاتھ دھو کر کھانا کھانے ٹیبل کی جانب بڑھ رہے تھے جب اچانک دریاب ان کے راستہ میں آ گئی۔

"کیا بدتمیزی ہے دریہ آرام سے بیٹھو پہلے اپنے باپ کو کھانا کھانے دو پھر بات کرنا۔" ارم نے اسے کندھے سے تھام کر سمجھانا چاہا۔

"پلیز آپ میرے معاملے میں نہ ہی بولیں تو اچھا ہے۔ ورنہ آپ جانتی ہیں کہ میں کسی کا لحاظ کرنے کی عادی نہیں ہوں اور خاص طور پر آپ سے تو میری کوئی ایسی رواداری بھی نہیں ہے جس کی باعث میں آپ کا لحاظ کر جاؤں۔" وہ اپنے کندھوں سے ارم کے ہاتھ جھٹکتی ہوئی بولی تو نا صرف ارم بلکہ شہباز بھی اس کی اس قدر بدتمیزی پر ششدر رہ گئے۔

"تمہاری ماں ہے یہ معافی مانگو فوراً اس سے۔" وہ حتی الامکان اپنے غصہ کو دباتے ہوئے آہستہ آواز میں بولے۔

"میری ماں یہ نہیں شہر پارا مما ہیں یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں یہ صرف نایاب آرزو اور ولید کی ماں ہیں اور ویسے بھی میں آپ سے یہ نہیں پوچھنے آئی کہ میری ماں کون ہے؟ اور نہ ہی مجھے اب اس کی ضرورت رہی ہے میں تو آپ سے صرف آپ کے انکار کی وجہ پوچھنے آئی ہوں۔"

اس کے لہجہ میں ارم کے لیے اس قدر زہر بھرا ہوا تھا کہ ارم بھی ہکا بکا رہ گئیں۔

"اور ہاں اگر دانش میں کوئی برائی ہے تو بھی مجھے وہ قبول ہے اس لیے پلیز آپ کی عزت اسی میں ہے کہ آپ اپنی رضامندی کا بھی اظہار کر دیں۔"

وہ بے باکی سے اپنے باپ کے سامنے تن کر کھڑی تھی اور شہباز تو زمین میں گڑ کر رہ گئے ان کا رعب اور طنطنہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور انہیں ایسا محسوس ہوا کہ اب اگر انہوں نے مزید کوئی بات کی تو شاید دریہ ان کی اتنی بھی عزت نہ کرے جتنی اب تک کر چکی ہے اور اسی پل انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی عزت بچانے کا واحد حل یہ ہے۔ کہ بیٹی کو اپنے ہاتھوں رخصت کر دیا جائے یہ جانے بغیر کہ دانش سہگل کے ساتھ وہ خوش رہ سکے گی یا نہیں اور اسی میں ان کی عافیت تھی ورنہ دریہ سب کچھ ختم کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اور اس سب میں اس کے باپ اور خاندان کی عزت بھی شامل تھی جس کی اس کے نزدیک ذرا بھی وقعت نہ تھی اور پھر ایک پل لگا شہباز کو فیصلہ کرنے میں۔

"تم اوپر جاؤ میں ابھی بھابھی کے پاس آتا ہوں باقی بات وہیں ہو گی۔"

وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح بولے دریہ، ارم پر ایک تیز نظر ڈال کر دروازے سے باہر نکل گئی جبکہ شہباز بغیر کھانا کھائے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور آج اٹھارہ سال بعد ارم کو اس خسارے کا احساس ہوا جو انہوں نے اپنی اولاد کی طرف سے غفلت برت کر حاصل کیا تھا اور شاید یہ پہلا دن تھا جب وہ نایاب کو کھانا کھلانا بھی بھول گئیں وہ تو جب نایاب نے ٹوٹے ہوئے لفظوں میں واویلا کرنا شروع کیا تو انہیں ہوش آیا۔

"یا خدا ایک لڑکی اس حال میں اپنی بیماری کے ہاتھوں زندہ درگور اور دوسری خود اپنے ہاتھوں زندہ درگور ہونے جا رہی ہے یا میرے مالک ہم پر رحم کر۔" وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں پر گرائے ساکت بیٹھی تھیں جبکہ آنسو خود بخود ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اور پھر دانش سہگل کا پرپوزل قبول کر لیا گیا۔ اس پرپوزل پر سوائے دریاب اور شہر پارا کے کوئی خوش نہ تھا۔ دریاب تو بے حد خوش تھی دانش کے روپ میں اسے اپنی منزل قریب نظر آ رہی تھی شوبز کی چکا چوند نے بنا دیکھے ہی اس کے دل و دماغ پر قبضہ جما رکھا تھا وہ خود کو ہمیشہ کسی ایسی بڑی اداکارہ کے روپ میں دیکھتی جس سے آٹو گراف لینے والوں کی قطاریں لگی ہوں اپنے اس خواب کے حصول کے لیے دانش سہگل سے بہتر شخص اس کی نظر میں کوئی نہ تھا دانش کے تعلقات

شوبز کے حلقوں میں اوپر تک تھے اور نا صرف اپنے ملک بلکہ پڑوسی ملک کے بھی کئی ڈائریکٹرز اور ہدایتکار اس کے جاننے والے تھے۔ اور اسی چیز نے دریہ کو اس کا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ دریہ نے اپنی شادی کی ساری شاپنگ شہرپارا کے ساتھ جا کر مکمل کی یہاں تک کہ اپنی بری کی خریداری بھی اس نے خود شہر کے بہترین ڈریس ڈیزائنرز اور بوتیک کی تھی اس کی بارات کا سوٹ جانے کتنے لاکھ کا تھا جو خود دانش کی اپنی پسند کا تھا غرض کہ اس کی ہر چیز اعلا معیار اور کوالٹی کی تھی یہاں تک کہ اس کی بری دیکھ کر خاندان کی دیگر خواتین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں اور سب نے ہی ظاہری نمود نمائش دیکھ کر درّیاب کے مقدر کو خوب سراہا اور ان کے رشک سے بھرے جملے سن سن کر درّیاب کی گردن فخر و غرور سے تن سی گئی اور اسے ایسا لگا یہ بازی وہ پورے اعزاز کے ساتھ جیت چکی ہے اور اسی فخر و غرور کے ساتھ وہ دانش سہگل کی ہمراہی میں رخصت ہو کر اس کی طویل و عریض کوٹھی میں پہنچ گئی جہاں اس کا استقبال کرنے کے لیے سوائے چند ملازمین کے کوئی نہ تھا اسے ایک سجے سجائے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

"میم آپ آرام سے بیٹھیے۔"

اسکرٹ بلاوز میں ملبوس نہایت اسمارٹ سی ملازمہ نے اسے تکیہ سے ٹیک لگا کر آرام سے بٹھایا۔

"میم آپ کیا لینا پسند کریں گی جوس یا کافی۔"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ دھیمے سے بولی جبکہ احساس تفاخر واضح طور پر اس کی آواز سے چھلک رہا تھا۔

"میں آرام کروں گی تم جاؤ۔"

"ٹھیک ہے میم صغرا نے آپ کے کپڑے نکال کر باتھ روم میں رکھ دیئے ہیں آپ کو جب چینج کرنا ہو یہ بیل بجا دیجیے گا صغرا آپ کی مدد کو آجائے گی۔"

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔"

"بے وقوف عورت بھلا دانش کے دیکھے بغیر میں کیسے اس ڈریس کو چینج کر سکتی ہوں اتنا پیسہ خرچ کرکے میں جس کے لیے تیار ہوئی ہوں وہ ہی نہ دیکھے تو کیا فائدہ ہوا۔" وہ تفکر سے سوچتی کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی دروازے پر ہونے والے کھٹکے سے وہ یک دم ہڑبڑا کر اٹھی تو پہلے تو یہ ہی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟ اور جیسے ہی اندر آتے دانش پر نظر پڑی ایک دم بوکھلا کر اٹھ بیٹھی فوراً" اپنا دوپٹہ درست کیا جو بھی تھا تھی تو وہ ایک کم عمر اور شریف خاندانی لڑکی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا وہ لاکھ بے باک سہی لیکن پھر بھی اس کے جذبات میں کبھی پہلے کسی غیر مرد نے کوئی ایسی ہلچل نہ مچائی تھی دانش تھکا تھکا سا کمرے میں داخل ہوا۔

"تم نے ابھی تک اپنا ڈریس چینج نہیں کیا۔" وہ حیرانی سے بولا اور اس دم دریہ کی نگاہ سامنے دیوار پر لگے بیش قیمت وال کلاک پر پڑی جو پانچ کا ٹائم دے رہی تھی۔

"او مائی گاڈ کہیں تم عام مڈل کلاس لڑکیوں کی طرح میرا انتظار تو نہیں کر رہی تھیں۔" وہ اس کے قریب ہی نیم دراز ہوتا ہوا بولا۔

"بٹ سوری میری جان میں ان تمام فارمیلٹیز کا عادی نہیں ہوں بہرحال تمہاری منہ دکھائی تمہیں دینا ضروری تھی اسی لیے آیا ہوں ورنہ کس کافر کا دل چاہتا تھا کہ اتنی حسین رقاصہ کو چھوڑ کر....."

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور گاڑی کی چابی نکال کر اس کی گود میں رکھ دی وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائی۔

"یہ تمہاری گاڑی کی چابی ہے لیکن یہ یاد رکھنا تم میری مرضی کے بغیر گاڑی لے کر باہر نہیں جاؤ گی کیونکہ اب تم کوئی عام عورت نہیں بلکہ دانش سہگل کے نام سے منسوب ہو۔" وہ سرخ سرخ آنکھوں سے دریہ کو گھورتا ہوا بولا۔

اور دریہ جو اپنے لیے ستائشی جملے اور تعریفی کلمات سننے کی منتظر تھی ایک بالکل نئی صورت حال کا سامنا کرنے پر حیران نظر کر اس کی شکل دیکھے جا رہی تھی اپنی تعریف کی شوقین دریہ حیران تھی کہ یہ کیسا مرد ہے جسے اپنی بیوی کی خوبصورتی میں کچھ نظر نہیں

آرہا تھا۔

"اور ہاں۔" وہ یک دم دریہ کے قریب ہوا تو اس کے منہ سے آنے والے بدبو کے بھبکے نے دریہ کو احساس دلایا کہ وہ نشہ میں ہے۔

"تم بھی ڈریس چینج کرکے باہر ہی آجاتیں ہال میں۔ آکر دیکھتیں تارا بائی کو کیا زبردست ناچتی ہے اس کا رقص بانو مردہ جسم میں جان ڈال دیتا ہے قیامت ہے قیامت۔"

وہ آنکھیں بند کرکے تصور ہی تصور میں تارا بائی کے لچکیلے بدن کا تصور کرتا ہوا بولا۔

"لیکن پھر بھی تمہاری والی بات نہیں ہے تم تو جب میدان میں آؤ گی نا میری جان تو یقین کرنا تمہارے سامنے تو کوئی بھی نہ ٹک سکے گا بلیو می۔"

وہ اچانک ہی دریہ کا دوپٹہ کھینچ کر بولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کر لیا اور دریہ جو اس کی کچھ دیر قبل کی گئی گفتگو سے خاصی بدمزا ہوئی تھی ایک دم ہی اس کی قربت کے احساس سے دہک اٹھی اسے اپنے دل کی دھڑکن اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔

"تم بہت خوبصورت ہو میری جان بہت خوبصورت بالکل کسی گڑیا کی مانند باربی ڈول۔" وہ دریہ کو کندھوں سے تھام کر بولا۔

"لیکن جانتی ہو گڑیا صرف اس وقت تک اچھی لگتی ہے جب تک شوکیس میں سجی ہو اگر اسے باہر نکال کر کھیل لیا جائے تو وہ جلد ہی میلی ہو جاتی ہے اور میلی گڑیا جلد ہی کوڑے دان کا حصہ بن جاتی ہے اور پھر اس کی جگہ کوئی اور خوبصورت اور نئی گڑیا لے لیتی ہے لیکن میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں جو تم سے کھیل کر تمہیں کوڑے دان میں پھینک دوں....." پھر وہ رک کر تھوڑا سا مسکرایا۔

"یاد رکھنا تم ہمیشہ ایک قیمتی اور خوبصورت تمغہ کی مانند میری الماری میں ہی سجی رہو گی۔" وہ دریہ کے بالکل قریب ہو کر بولا لیکن دریہ تو اس وقت ہوش میں ہی نہ تھی یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بھی نظرانداز کر چکی تھی اس کا سپر اسٹار بننے کا خواب نہیں دور رہ گیا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی کہ اچانک ہی دانش کے ہاتھوں کی حرکت تھم گئی اور وہ بالکل ساکت سے ہو گئے۔ صرف اس کی سانسوں کی آواز تھی جو دریہ کے کانوں میں سنائی دے رہی تھی اس نے کسی انہونی کے احساس کے تحت یک دم آنکھیں کھول کر دیکھا دانش سو چکا تھا اس کے بازو پر اپنا سر دھرے بے خبر اور بدمست دریہ کو ایسا لگا جیسے وہ تپتے صحرا میں ننگے پاؤں کھڑی ہے اس کے اندر آگ کے جلتے بھانبھڑ تھے جن پر پانی ڈالنے والا ابھی کوئی نہ تھا وہ یک دم ہی بے بسی کے احساس تلے دب کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

صبح تقریباً" دس بجے اس کے گھر سے ناشتا آگیا شہرپارا، سمرن اس کی خالہ زاد نورین خلافِ توقع شاہ ویز کے ساتھ ناشتا لے کر آئیں تو سہگل ابھی سو ہی رہا تھا جبکہ دریہ کو ایک ماہر بیوٹیشن تیار کرکے جا چکی تھی اس کا گھر اور ٹھاٹ باٹ دیکھ کر اس کی کزن نورین خاصی حیران ہوئی جبکہ سمرن اور شاہ ویز بالکل ہی خاموش تھے دانش کی غیر موجودگی کا عذر پیش کرتے ہوئے دریہ نے چپکے سے شہرپارا کو بتایا کہ وہ صبح ہی سوئے ہیں شہرپارا اس کی وضاحت کو اپنی مرضی کے معنی پہنا کر خوش ہو گئی دریہ نے سب کو اپنی گاڑی دکھائی جو اسے منہ دکھائی میں ملی تھی اور شاہ ویز کی خاموشی محسوس کرکے دل ہی دل میں خوب اترائی۔

"ہونہہ دیکھا کیسا جلا میرے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر۔"

وہ ایسی ہی تھی ہمیشہ لوگوں کے بارے میں غلط اور جلدی اندازے لگانے والی اور جانتی تھی کہ ہمیشہ شاہ ویز کے سلسلے میں لگایا جانے والا اس کا اندازہ غلط ہوتا ہے لیکن پھر بھی باز نہ آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات شہر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں اس کا ولیمہ تھا اور دریہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی دانش کی ہدایت کے مطابق بے حد ڈیپ گلے کی سلیولیس میرون کلر کی

میکسی پہننا پڑی جس پر اونچا کر کے بنایا گیا ہیر اسٹائل اس پر خوب کھل رہا تھا گلے اور کانوں میں پہنی ہوئی ڈائمنڈ جیولری اپنی عجیب ہی بہار دکھا رہی تھی جب ماہر حسن نے تیار کر کے اسے آئینہ کے سامنے کھڑا کیا تو اپنا روپ دیکھ کر وہ خود بھی مبہوت سی ہو گئی ایسے میں اپنے لباس کی عریانی کا احساس اس کی پیشانی کو عرق آلود کر گیا اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اس کے گھر والے کیا سوچیں گے لیکن جب دانش کی ہمراہی میں اس نے بنکویٹ ہال میں قدم رکھا تو خود پر پڑنے والی ستائشی نظروں اور تعریفی جملوں نے ایک دم ہی اس کے احساس عریانی کو زائل کر دیا ہر طرف سے اس کے کانوں میں پڑنے والے جملوں نے اسے احساس دلایا کہ شاید وہ کوئی اپسرا ہے جو آسمان سے اتری ہو پارو تو اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی تائی ساویہ کے گھر سے صرف فاریہ بھابھی اور بھائی ہی آئے تھے۔ فاریہ بھابھی اور سمران نے اسے دیکھتے ہی بے اختیار شرم سے اپنی نظریں جھکا لیں ارم بے تاثر چہرہ لیے بیٹھی شکر ادا کرتی رہیں کہ شاہ ویز اور شہباز نہیں آئے جبکہ پھوپھو اور ان کی فیملی کا کوئی بھی فرد شادی میں شریک نہ ہوا تھا ایسے میں سرفراز صاحب نہایت ہی شرمندہ دکھائی دیے انہیں شدت سے یہ احساس ہوا کہ بے راہ روی اور بے حیائی کا جو پودا وہ شہریار کی شکل میں لائے تھے اس نے دریہ نامی بیل کو اپنے گرد لپیٹ کر خوراک ضرور فراہم کی تاکہ وہ زندہ رہ سکے لیکن اس بیل کا اپنا وجود بالکل ختم کر دیا جبکہ دریہ کسی بھی احساس سے عاری دانش کی سنگت اور ہمراہی میں خود کو آسمانوں پر اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

تقریب میں بے حیائی، رقص و سرود اور ام الخبائث کا دور اپنے عروج پر تھا یہ ماحول سرفراز صاحب اور ان کی فیملی کے باقی لوگوں کے لیے تقریباً "ناقابل برداشت تھا یہ ہی وجہ تھی کہ وہ لوگ بغیر کھانا کھائے تایا جی کی طبیعت کی خرابی کا عذر پیش کر کے جا چکے تھے لیکن دریہ کو کسی کی بھی کوئی پروا نہ تھی وہ تو دانش کی بہکی بہکی نظریں محسوس کر کے اسی احساس سے سرشار تھی کہ یقیناً" آج دانش سہگل اس کے قدموں میں ہو گا اور اسے تسخیر کر لے گا لیکن رات کے بڑھتے سایوں نے اس کی اس غلط فہمی کو جلد ہی دور کر دیا ہوٹل سے واپس آتے ہی دانش اپنے بار روم میں چلا گیا تھا جو کہ اس نے اپنے گھر کی بیسمنٹ میں بنایا ہوا تھا۔

"پلیز ابھی ڈریس چینج نہ کرنا۔" وہ دریہ کے ہاتھ تھام کر حسن کے حضور درخواست پیش کرتا ہوا بولا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" دریہ آنے والے خوش کن لمحات کے تصور میں گھر کے اس کا انتظار کرنے لگی اس کا انتظار ابھی طویل نہ ہوا تھا کہ اچانک ہی کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھول کر کوئی اندر داخل ہوا وہ اس کی میڈ میری تھی۔

"میم آپ کو صاحب نیچے بلا رہے ہیں اپنے بار روم میں۔" اطلاع دے کر وہ جواب کے انتظار میں مودب کھڑی تھی۔

"کیوں؟" وہ حیرت زدہ تھی۔

"پتا نہیں میم آپ آئیں میں آپ کو وہاں تک چھوڑ دوں۔" وہ خاموشی سے اٹھ کر میری کے پیچھے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی بیسمنٹ کا شیشہ کا دروازہ میری نے کھولا تو وہ خاموشی سے اندر داخل ہو گئی میری دروازہ بند کر کے واپس جا چکی تھی بیسمنٹ میں بکھری ہوئی رنگین روشنی میں اس نے دیکھا کہ سارے ہال میں صرف قالین ہی بچھا ہے جبکہ دیوار کے ساتھ کچھ گاؤ تکیے رکھے ہوئے ہیں ایک دیوار کے ساتھ چند کرسیاں بھی دھری تھیں جو فی الوقت ساری ہی خالی تھیں اے سی کی خنکی محسوس کرتے ہی اسے اپنی کم لباس کا احساس ہوا قیمتی ایئر فریشنر کی خوشبو بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی وہ خاموشی سے آگے بڑھی دیوار گیر الماریوں میں مہنگے برانڈڈ مشروبات رکھے تھے۔

"آجاؤ یہیں آجاؤ میرے پاس۔" دانش سامنے ہی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا "ام الخبائث" پی رہا تھا نہایت ہی نفیس اور بلوریں گلاس اس کے پاس دھرے تھے وہ خاموشی سے اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"پیو گی..." اس نے خالی جام اٹھاتے ہوئے

دریافت کیا۔

"پلیز دانش میں نہیں پیتی۔" وہ یک دم گھبرا گئی اس کی گھبراہٹ دیکھ کر دانش بہت محظوظ ہوا اور دھیرے سے ہنسا۔

"کوئی بات نہیں خود ہی پینے لگو گی ہمارے ساتھ رہو گی تو ضرور پیو گی جانتی ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا تھا۔" اس نے آہستہ سے اپنی گردن نفی میں ہلا دی۔

"آج میں نے تارا بائی کو منع کر دیا کیونکہ آج میں تمہارا رقص دیکھنا چاہتا ہوں صرف تمہارا میری جان۔"

"یاخدا یہ کیسی فرمائش تھی جو اس کا شوہر شادی کی دوسری رات اس سے کر رہا تھا بغیر یہ جانے کہ اس کے جذبات کیا ہیں اس کے دہکتے اور کنوارے جذبوں کی اسے کوئی پروا نہ تھی وہ صرف اپنے نفس کا بندہ تھا اپنی خواہشات کا غلام ..... اور تم؟" کوئی اس کے اندر دھیرے سے ہنسا۔

"تم کون ہو؟ تم نفس کی غلام نہیں ہو؟ ناچنا گانا تو خود تمہارا ابھی شوق رہا پھر اب کیا ہوا جو تمہارے شوہر نے تم سے فرمائش کر دی غیروں کے سامنے بھی تو ناچنا ہی ہے نا۔" اس کا ضمیر دل کھول کر ہنس رہا تھا اس کا مذاق اڑا رہا تھا وہ ایک دم گھبرا اٹھی۔

"اب انتظار نہ کرواؤ۔ تم نہیں جانتیں جب شراب کا نشہ مجھ پر چڑھتا ہے تو رقص اس کو دوچند کر دیتا ہے اسی لیے آج کی میری اس محفل کو صرف تم سجاؤ گی صرف تم۔" اب کوئی چارا نہ تھا وہ خاموشی سے کھڑی ہو گئی دانش سی ڈی پلیئر پر گانا لگا کر تکیے کے سہارے لیٹ گیا اور اس ساری رات ناچ ناچ کر دریہ کا انگ انگ ٹوٹ گیا تھکن سے اس کا جسم چور ہو گیا لیکن جانے دانش کا شوق کیسا تھا جب تک صبح پانچ بجے تک وہ نہ سویا اس نے دریہ کے پیروں کو تھمنے نہ دیا اور آج پہلی بار اسے پتا چلا اپنے شوق سے کوئی کام کرنا اور کسی جبر کے تحت وہ ہی کام کرنا دونوں کس قدر مختلف امر ہیں لیکن بہر حال یہ ایک ایسا راستہ تھا جس کا انتخاب اس نے خود کیا تھا بنا کسی نتیجہ کی پروا کیے اور ظاہر ہے اب اس راستہ پر اسے آگے تک کا سفر اکیلے ہی طے کرنا تھا بنا کسی سہارے کے بغیر تھکے.....

☼ ☼ ☼

"تم ایک گھنٹہ تک تیار ہو کر میرے آفس آجانا تمہارا پاسپورٹ بنوانا ہے اور ہاں اپنے تمام ضروری پیپرز بھی ساتھ لے آنا۔"

دانش نے تیار ہو کر خود پر پرفیوم کا اسپرے کیا اور پھر ایک اچٹتی سی نظر خاموش بیٹھی دریہ پر ڈالی اور شیشہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اپنے بال درست کرتی بستر سے اتر آئی اور خاموشی سے باتھ روم کی جانب بڑھ گئی بنا کوئی سوال و جواب کیے۔ ایک پل کے لیے تو دانش بھی حیران ہوا اور پلٹ کر دریہ پر ایک نظر ڈالی لیکن اسے اپنی جانب متوجہ نہ پا کر پھر سے اپنی تیاری میں مشغول ہو گیا اور پھر اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر دریاب کا پاسپورٹ بن کر آ گیا۔

"اپنی پیکنگ کر لو ہم کل شام کی فلائٹ سے ملائشیا جا رہے ہیں۔"

دانش نے رات اس کا پاسپورٹ چیک کر کے اپنے کاغذات میں رکھتے ہوئے اسے اطلاع دی اور وہ جو بڑی بے دلی سے گلاس پر گلاس چڑھاتے دانش کو تک رہی تھی اس اطلاع پر حیران رہ گئی جو یقیناً" اس کے لیے غیر متوقع تھی۔

"اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟ دراصل میں ملائشیا میں کپڑے کی مارکیٹ چیک کرنا چاہتا ہوں عام خیال ہے کہ وہاں پڑوسی ملک کے ڈریسز خاصے مقبول ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ وہاں اپنے کچھ نئے ڈریسز متعارف کرواؤں بس اسی لیے ایک ہفتہ کا وزٹ ہے سوچا تمہیں بھی لے چلوں اسی بہانے ہمارا ہنی مون بھی ہو جائے گا۔"

دریاب تو ملائشیا جانے کا سن کر ہی اس قدر خوش

ہو گئی تھی کہ اسے مزید کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہ رہی تھی اس کا دل چاہا فوراً گھر پر فون کر کے شہر یار کو اطلاع دے تاکہ سارے گھر میں یہ خبر نشر ہو جائے کہ درباب سہگل ملائشیا جا رہی ہے وہ اونچائی جس کے خواب بچپن سے وہ دیکھتی آئی تھی اس کی پہلی سیڑھی پر اس نے قدم رکھ دیا تھا اور اب جلد ہی اس کے خواب کی تعبیر اسے ملنے والی تھی دولت کے بعد' شہرت اور پہچان بھی جلد ہی اس کا مقدر بننے والی تھی اسے یقین تھا جلد ہی شوبز کی دنیا کا وہ ایک چمکتا دمکتا ستارہ بننے والی تھی جس کے آٹو گراف کے لیے لوگ اس کے پیچھے بے قرار پھریں گے اس کے اسکول اور کالج کی فرینڈز اسے دیکھ کر حسرت سے کہا کریں گی۔

"کاش ہم نے درباب سے ایک آٹو گراف لے لیا ہوتا اے کاش۔"

یہ خیال آتے ہی اسے خود ہی ہنسی آ گئی یقیناً" یہ ہی تو وہ خواب تھا جس کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے اس نے دانش سہگل کا انتخاب کیا تھا وہ جانتی تھی کہ اس جیسی معمولی سا بیک گراؤنڈ رکھنے والی لڑکی کو یہ مقام صرف اور صرف دانش کی جان پہچان سے ہی حاصل ہو سکتا ہے دانش کے سنگ ہی وہ بلندی کا یہ سفر بہ خوبی طے کر سکتی تھی ورنہ اپنے گھر کے دقیانوسی ماحول میں تو سوائے شادی اور بچوں کے اس کے لیے کسی تیسری چیز کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ فیض محمد سے ملنے آرٹ اکیڈمی آیا تھا لیکن فیض محمد کو اپنے کمرے میں موجود نہ پا کر اسے ڈھونڈتا ہوا اوپر ہال میں آ گیا جہاں غالباً" کوئی رقص کا پروگرام تھا جس کی اطلاع اسے فیض محمد پہلے ہی دے چکا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مہر علی اچھے رقص کا شیدائی تھا۔ ایک وڈیرا ہونے کے باوجود مہر علی آرٹسٹک ذہن رکھنے والا بندہ تھا خوبصورت کلاسیکل رقص اس کی کمزوری تھے حالانکہ جس فیلڈ سے اس کا تعلق تھا وہاں تو اتنی نازک مزاجی کا کوئی عمل دخل ہی نہ تھا لیکن مہر علی کو اپنے پیشہ سے زیادہ آرٹ سے دلچسپی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ آرٹ سے منسلک لوگوں سے اس کی ہمیشہ اچھی دوستی رہی اسی بنا پر فیض محمد اس کے بہترین دوستوں میں شمار ہوتا تھا ابھی بھی جیسے ہی وہ ہال میں داخل ہوا اس کی نگاہیں ہال کے ملگجے اندھیرے سے گزر کر فوراً" سامنے اسٹیج پر مرکوز ہو گئیں۔ جہاں سفید فراک اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس "اپسرا" کو محو رقص دیکھ کر اس کی نظریں ساکت ہو گئیں اور آج اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی چال اس قدر دلکش کیوں تھی؟ یقیناً" وہ ایک فنکارہ تھی اور پھر اس کا ہر اٹھتا قدم مہر علی کو اپنے دل پر پڑتا محسوس ہوا' جانے کب پروگرام ختم ہوا اس لڑکی کو غالباً" پہلا انعام بھی دیا گیا لیکن مہر علی کو کچھ پتا نہ چلا جب ہوش آیا تو ہال تقریباً" خالی ہو چکا تھا اور وہ اسی اپسرا کے خیال کو دل میں بسائے خاموشی سے فیض محمد کے ہمراہ ہال سے باہر آ گیا۔

☼ ☼ ☼

جیسے ہی اس نے کے ایل ایئرپورٹ پر قدم رکھا اس کی گردن فخر و غرور سے تن گئی کون کہہ سکتا تھا کہ درباب گل جس نے کبھی اسلام آباد بھی اپنی زندگی میں نہ دیکھا ہو آج ایک شان سے کوالمپور ایئرپورٹ پر کھڑی ہو گی جہاں باہر نکلتے ہی باوردی ڈرائیور اور شہر کے بہترین فائیو اسٹار ہوٹل کا ایک بہترین سویٹ اس کا منتظر ہو گا کاش' شاہ ویز دیکھ سکتا میں کس قدر شان سے یہاں کھڑی ہوں شاہ ویز جسے مجھ جیسی لڑکیاں ناپسند تھیں اونہہ....." نخوت سے سوچتے ہوئے اس نے اپنی گردن کو جھٹکا دیا اور فخر و غرور کے احساس میں گھری ہوٹل کی جانب رواں ہو گئی اور پھر پورا ایک ہفتہ اس نے ملائشیا کا چپا چپا گھوما اور خوب شاپنگ کی دانش تو سارا دن اپنے کام میں مصروف رہتا جبکہ درباب کو اس نے گاڑی اور ڈرائیور کی سہولت فراہم کر رکھی تھی جس کا دریہ نے خوب فائدہ اٹھایا۔

وہ کے ایل سی سی گئی تو وہاں کی خوبصورتی نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا آئی لینڈ اس کے خوابوں کا جزیرہ جہاں اگر وہ گئی ہیں ... ہوٹ زائی اور پھر لنکاوی نے دیکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ واقعی دنیا حسن و خوبصورتی سے بھری ہوئی ہے یہ سات دن کس طرح گزرے اسے احساس ہی نہ ہوا اور جس دن وہ واپس آئی اس کے قدم ہی زمین پر نہ تھے اس کا دل چاہا آج ہی گھر جائے اور سب کو اپنی تصاویر دکھائے تاکہ گھر کا ہر فرد اس کی قسمت پر رشک کرے وہ یقیناً" ان لوگوں میں سے تھی جن میں خود نمائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور جو دوسروں سے تعریف و توصیف سمیٹنا اپنا حق سمجھتے ہیں ان ہی سوچوں میں گھری وہ اپنے بیڈ روم تک آ گئی دانش فریش ہوتے ہی بیسمنٹ میں چلا گیا تھا جہاں اس کا بار روم تھا جبکہ اس کے ساتھ صغرا اسی کے روم میں آ گئی تھی۔

وہ فریش ہو کر ڈھیلا سا گاؤن پہن کر باہر آئی تو صغرا کو اپنا منتظر پایا وہ جانتی تھی کہ صغرا کیوں بیٹھی ہے؟ اس کے بستر پر بیٹھتے ہی صغرا نے اس کے پاؤں اپنی گود میں رکھ لیے اور نہایت ہی پیار سے اس کے نرم و نازک پاؤں کا مساج شروع کر دیا اسے ایک عجیب سی راحت ملنے لگی اس سے قبل کہ وہ سو جاتی مس میری اس کے لیے تازہ اورنج جوس لے آئی جو اسے بے حد پسند تھا اس نے بڑی نزاکت سے جوس کا گلاس تھاما اور اپنے لبوں سے لگا لیا گھونٹ گھونٹ جوس اس کے حلق کو تر کرنے لگا اس تمام عرصہ میں میری نہایت مودب سی اس کے پاس کھڑی رہی جوس ختم کر کے اس نے خالی گلاس میری کے ہاتھ میں موجود کرسٹل کی نازک سی ٹرے میں دھر دیا اور خود ٹشو سے اپنا منہ صاف کیا صغرا اب اس کے کندھے دبا رہی تھی جبکہ میری ابھی بھی اپنی جگہ پر کھڑی تھی یقیناً" کوئی خاص بات تھی جو وہ اس سے کرنا چاہتی تھی۔

"کوئی کام ہے تمہیں مجھ سے۔"

"جی میم دراصل آپ کے کزن آئے تھے آپ سے ملنے کے لیے' شاہ ویز آئی تھنک یہ ہی نام انہوں نے بتایا تھا۔"

"کتنا جلا ہو گا جب اسے پتا چلا ہو گا میں ملائشیا گئی ہوں اپنے ہی ہنی مون ٹرپ پر گئے ہیں۔" اپنے ایک وزٹ کو ہنی مون ٹرپ کا نام دے کر اس نے خود ہی لطف لیا اور اب اپنی عادت کے مطابق شاہ ویز کے سلسلے میں غلط اندازے لگا کر خود ہی خوش ہو رہی تھی۔

"میم وہ آپ کے لیے مٹھائی دے کر گئے ہیں۔"

میری نے اسے خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا اور خوب پیٹ بھرا ہونے کے باوجود مٹھائی کا سن کر اس کا دل للچا گیا کیونکہ وہ بچپن سے ہی مٹھائی بہت شوق سے کھاتی تھی جبکہ شادی کے تقریباً" ایک ماہ بعد سب کچھ میسر ہونے کے باوجود اس نے مٹھائی نہ چکھی تھی کیونکہ دانش کا خیال تھا کہ مٹھائی اور سوفٹ ڈرنک عورت کے فیگر کو خراب کر دیتے ہیں اور یہ ہی سوچ کر اس نے بھی دل پر جبر کر لیا کہ اپنا حسن اور جسمانی خوبصورتی اس کا بھی جنون تھا۔

"بتایا نہیں مٹھائی کس خوشی میں لایا تھا۔"

وہ تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند چکی تھی۔

"جی میم غالباً" ان کی انگیجمنٹ ہوئی ہے آپ کی کزن سمرن کے ساتھ۔" میری نے سب کے نام اچھی طرح رٹ رکھے تھے۔

بظاہر یہ کوئی ایسی بات نہ تھی پھر بھی جانے کیوں درباب کا حلق اندر تک کڑوا ہو گیا اور اس کے دل میں اک پھانس سی چبھ گئی۔

"اونہہ بڑا آیا نیک پاکباز' نیک پروین سے شادی کرنے کا خواہشمند کنویں کا مینڈک۔"

"بس صغرا اب مجھے سونا ہے تم جاؤ اور ہاں جاتے ہوئے کچن سے مٹھائی لے جانا تمہارے بچے کھالیں گے میں اور تمہارے صاحب مٹھائی بالکل پسند نہیں کرتے اور میری اب تم بھی جا سکتی ہو جاتے ہوئے لائٹ آف کر دینا۔"

صغرا سے بات ختم کر کے اس نے میری کو ہدایت دی اور تکیے سے ٹیک لگا کر خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

وہ چاہتی تھی کہ ملائشیا سے لائے گفٹ گھر جا کر خود

دے آئے ویسے بھی شہر یار کے دو تین فون آچکے تھے وہ دریہ سے ملنے کے لیے بے قرار تھی وہ گھر جانے کے لیے خوب نک سک سے تیار ہو کر لاؤنج میں داخل ہوئی تو سامنے بیٹھے دانش پر نظر پڑ گئی جو نہایت اطمینان سے صوفے پر نیم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" دانش نے اس کے دلکش سراپے پر ایک نظر ڈالی اور بلیک اور وائٹ سوٹ میں اس کے کھلتے ہوئے حسن کو دل ہی دل میں سراہا۔

"گھر۔" مختصر سا جواب دے کر اس نے ڈرائیور کو فون کر کے گاڑی نکالنے کا حکم دیا اس تمام عرصہ میں دانش بڑی خاموشی سے اس کے جائزہ لیتا رہا۔

"میرا خیال ہے تم یہ تمام تحائف نور محمد کو دے دو وہ تمہارے گھر پہنچا دے گا۔" دریہ کے موبائل آف کرتے ہی دانش نے سامنے ٹیبل پر رکھے ہوئے تحائف پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر حکم نامہ جاری کیا۔

"کیوں.....؟" اس نے ابرو اچکاتے ہوئے دانش کی طرف دیکھا۔

"مجھے صرف تحائف ہی نہیں دینے بلکہ اپنے گھر والوں سے ملنا بھی ہے مما کئی بار فون کر چکی ہیں۔"

"مل لینا میری جان گھر والوں سے بھی مل لینا ایسی بھی کیا جلدی ہے مگر آج نہیں آج میں نے تمہاری بیوٹیشن کو ٹائم دے رکھا ہے وہ بس آنے ہی والی ہوگی۔ دیکھو تمہاری اسکن کتنی رف ہو رہی ہے۔"

دانش اسے رام کرنے کے تمام گر جان چکا تھا۔

"آج کا پورا دن تمہارا ہے اسے خوب ریلیکس ہو کر گزارو آرام کرو کیونکہ کل میں نے فارم ہاؤس پر چوہدری عبدالباری کے اعزاز میں ایک شاندار فنکشن ارینج کر رکھا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس فنکشن میں تم سب سے نمایاں نظر آؤ کیونکہ چوہدری صاحب کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں اور پھر وہ ایک فلم بھی پروڈیوس کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کو خوش کر کے نا صرف مجھے انگلینڈ میں ملبوسات کا ایک بڑا آرڈر مل سکتا ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں اپنی نئی فلم میں بطور ہیروئن بھی سائن کر لیں ویسے تو خیر ہمارے ملک میں فلم کا کوئی اچھا مستقبل نہیں ہے لیکن پھر بھی آگے جانے کی ابتدا تو یہیں سے ہی کرنا ہوگی۔"

دانش نے دریہ کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے قائل کرنے کی کوشش کی اور اس طرح دانش سہگل نے خوبصورت الفاظ میں لپیٹ کر کونین کی کڑوی گولی کو بھی میٹھا بنا دیا جو با آسانی درباب کے حلق سے اتر گئی اور نا صرف درباب نے اسے نگلا بلکہ اس نے درباب کے جسم میں کیف و سرور سا بھر دیا اس نے تمام سامان ڈرائیور نور محمد کے ہاتھ گھر بھیج دیا اور پھر اس کا سارا دن بے حد مصروف گزرا کیونکہ آنے والا کل اس کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا اسے خراج وصول کرنا تھا اپنے حسن و خوبصورتی کا۔

☼ ☼ ☼

یقیناً آج وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگ رہی تھی بہت مختصر سا ساٹن کا ریڈ ٹاپ جس کا قدرے ڈیپ گلا ایک لمحے کے لیے اسے بھی شرمسار کر گیا تھا لیکن جلد ہی وہ اپنی شرمساری کے حصار سے نکل کر پر اعتماد ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس فنکشن میں اس سے بھی زیادہ مختصر لباس دکھائی دیں گے ٹاپ کے نیچے نہایت مختصر سا بلیک اسکرٹ اس کی ٹانگوں کے حسن کو مزید نمایاں کر رہا تھا اور وہ جانتی تھی کہ آج کی رات صرف اس کی ہے اور وہ سب کچھ جو وہ اور دانش سہگل حاصل کرنا چاہتے تھے با آسانی حاصل کر لیں گے اور ایسا ہی ہوا چوہدری عبدالباری اسے دیکھتے ہی پاگل سا ہو گیا جس کا اندازہ اسے فارم ہاؤس میں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا دانش اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کرتا ہوا اسے چوہدری صاحب کے قریب لے گیا جو اپنے قریب کھڑے کسی شخص سے باتیں کرنا بھول کر یک ٹک دریہ کی جانب تک رہا تھا۔

"چوہدری صاحب ان سے ملیں یہ درباب سہگل ہیں مائی وائف۔" چوہدری کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اس نے ستائشی انداز میں اپنی باچھوں کو مزید پھیلا لیا اور دریہ کو اس کے منہ سے باقاعدہ طور پر رال ٹپکتی محسوس ہوئی۔

"بے شرم پچاس سال کی عمر میں بھی یہ حال ہے۔"

دریہ نے سوچا ضرور مگر کہا نہیں۔

"آیئے۔ آیئے درباب میرے پاس بیٹھیں۔" وہ درباب کو بازو سے تھام کر قدرے اندھیرے گوشے میں رکھے صوفے کی جانب بڑھ گیا اور دریہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی صرف اپنے مفاد کے پیش نظر کوئی مزاحمت نہ کر سکی اور نہایت خاموشی سے صوفے پر اس کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اور پھر ایک پچاس سالہ شخص کو بیس سالہ عاشق کا رول پلے کرتے دیکھ کر دریہ کی گردن فخر و غرور سے اکڑ گئی اور آج پہلی بار اس نے دانش کے کہنے پر سب کے سامنے ایک مختصر سا رقص بھی پیش کیا جو صرف اس کے فن کے اظہار کے طور پر تھا۔ اور اس مختصر رقص کے دوران اس نے نا صرف چوہدری عبدالباری بلکہ آس پاس موجود تمام افراد کو حیرت سے گنگ کھڑے دیکھا اور لوگوں کے چہرے پر نظر آنے والی ستائش نے اس کے اندر بجلی سی بھر دی اور پھر رقص کے اختتام پر اسے اتنی داد و تحسین ملی کہ پل بھر کو وہ آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئی اور محفل میں جو رنگ دریہ کے رقص نے بھرا پھر وہ بعد میں آنے والی کمرشل رقاصائیں بھی نہ بھر سکیں۔

چوہدری نے اس رات دریہ کے حصول کی بہت کوشش کی لیکن دانش سہگل نے اس کی اس کوشش کو کسی طور بھی بار آور ثابت نہ ہونے دیا دانش جیسا گھاگ شخص دریہ کی قیمت بڑھانا جانتا تھا اور ویسے بھی وہ اس کے نزدیک ایک نرم و نازک گڑیا کی حیثیت رکھتی تھی جو زیادہ ہاتھوں میں جا کر مسلی جا سکتی تھی اس کی اپنی ذاتی رائے تھی کہ ایسی قیمتی اور نایاب چیزوں کو بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیا جانا چاہیے اور وہ بھی اس وقت جب آنے والے وقتوں میں اس سے دگنا منافع حاصل کیا جا سکے اسی خیال کے پیش نظر بالکل مدہوش چوہدری کو اپنی بلائی ہوئی ایک رقاصہ کے حوالے کر کے وہ نہایت خاموشی سے دریہ کو وہاں سے نکال لایا اس کے اس عمل نے دریہ کو اندر تک مطمئن کر دیا اور وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گئی کہ شاید دانش سہگل نے یہ قدم دریہ کو اپنی عزت سمجھ کر اٹھایا ہے آخر تھی تو مڈل کلاس کی پست ذہن عورت جو یہ سمجھتی تھی کہ مرد اپنی عورت کا محافظ و نگران ہوتا ہے اسے کیا پتا تھا ایسے مرد تو صرف اس معاشرے میں پائے جاتے ہیں جسے وہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی اب تو جس معاشرے کو وہ اپنا چکی تھی یہاں تو عورت صرف ایک کھلونا تھی ایک قیمتی اور نایاب کھلونا جسے صرف اپنے مفاد اور ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس سے زیادہ اس سوسائٹی میں عورت کی کوئی عزت نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"میڈم چوہدری صاحب کا فون ہے۔" وہ جانے کب تک بے خبری سے سوئی رہتی اگر چوہدری کی مسلسل آنے والی کال کی بنا پر میری کو اسے بے دار نہ کرنا پڑتا۔

"کیا ٹائم ہوا ہے۔" کارڈلیس میری کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے دریافت کیا۔

"میم سکس او کلاک۔"

"او مائی گاڈ مجھے تو دانش کے ساتھ فنکشن میں جانا تھا۔" یہ خیال دماغ میں آتے ہی وہ بجلی کی سی پھرتی سے اٹھی اور فون کو کان سے لگا لیا۔

"جی چوہدری صاحب کیسے یاد کر لیا۔" اپنے لہجہ میں حتی الامکان شیرینی گھولتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

"وہ جی آپ آج رات میرے ساتھ ڈنر کر رہی ہیں نا۔"

چوہدری کا خوشامد بھرا لہجہ اس کے کان سے ٹکرایا۔

"ڈنر..... لیکن مجھے تو آج دانش کے ساتھ....."

"گولی مارو دانش کے ساتھ کو آپ نے میرے ساتھ جانا ہے، میں ابھی دانش کو فون کر کے بات کر لیتا ہوں۔"

چوہدری نے اس کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے بڑی بے قراری سے کہا اور پھر چوہدری کے فون رکھنے کے صرف چند سیکنڈز ہی دانش کا فون آگیا جس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دریہ نے خود کو ڈنر کے لیے اچھی طرح تیار کیا تقریباً" نو بجے چوہدری صاحب کا ڈرائیور اسے لینے آگیا اور پھر باوردی ڈرائیور کی ہمراہی میں وہ شہر کے مشہور فائیو اسٹار ہوٹل پہنچی جہاں اس کا استقبال باری نے بڑی ہی بے صبری اور بے قراری سے کیا۔

"اتنی دیر، ہم تو آپ کے انتظار میں جان سے ہی گزر گئے تھے۔"

باری نے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"بس باری صاحب میری طبیعت ٹھیک نہ تھی آپ نے بلایا تو انکار نہ کر سکی۔" دریہ نے کرسی سنبھالتے ہوئے نزاکت سے کہا۔

"چلیں پھر پہلے آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔"

"نہیں نہیں پلیز آپ بیٹھیں میں میڈیسن لے کر آئی ہوں۔"

دریہ نے جلدی سے گھبراتے ہوئے کہا اور پھر اس ڈنر کے بعد دریہ نے بمشکل باری سے اپنی جان چھڑوائی اور تقریباً" ایک بجے کے قریب گھر واپس آئی۔

☼ ☼ ☼

"جانتی ہو عبدالباری نے میرے ساتھ مل کر انگلینڈ میں ملبوسات کی نمائش پر سرمایہ لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

دانش غالباً" اس کے انتظار میں ہی بیڈ روم میں موجود تھا یہ خبر دریہ کو سناتے ہوئے خوشی اس کے لہجہ سے چھلک رہی تھی دریہ نے ایک نظر اس کے خوشی سے بھرپور چہرے پر ڈالی اور اپنا پرس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر دیں صوفہ پر نیم دراز ہو گئی صغرا نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں کو جوتے کی قید سے آزاد کیا۔

"لیکن اس کی ایک شرط ہے۔"

دریاب نے آنکھیں کھول کر دانش کی جانب دیکھا جو بیڈ سے اٹھ کر اس کے قریب صوفہ پر بیٹھ چکا تھا۔

"وہ تمہیں بھی ساتھ لے کر جانا چاہتا ہے اس کا خیال ہے کہ تمہیں بھی ان ملبوسات کی نمائش میں بطور ماڈل حصہ لینا چاہیے تاکہ تمہاری خود اعتمادی کو مزید جلا ملے۔"

"لیکن میں تو ماڈلنگ کر ہی نہیں سکتی یہ کیٹ واک میرے بس کا کام نہیں ہے۔" دریہ نے قطعی انداز اختیار کیا۔

"پھر بھی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

دانش نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

"اور دیکھو نا اس میں فائدہ بھی سراسر تمہارا ہی ہے اسی بہانے تم نا صرف میڈیا بلکہ شوبز سے وابستہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بھی بن جاؤ گی کیونکہ اس فیشن شو میں تقریباً" تمام ہی ممالک حصہ لے رہے ہیں اور ہو سکتا ہے اس طرح میڈیا میں کلک ہونے کے بعد تمہیں [illegible] حاصل ہو جس کا تم نے تصور بھی نہ [illegible]"

دانش نے [illegible] لہجہ میں ایسا ضرور کچھ ہوتا تھا جو کہ دل بھی [illegible] مرضی کے راستہ کی جانب گامزن کر لیتا تھا [illegible] بھی ایسا ہی ہوا اور اس فیشن شو میں دریاب کے تین رقص شامل کر لیے گئے اس کے کلاسیکل رقص کے لیے سلوائے گئے مشرق و مغرب کے امتزاج کے ساتھ تیار کردہ بہترین ملبوسات کا شمار قیمتی برائیڈل ڈریسز میں ہوتا تھا اور پھر دریاب کے حسین جسم پر سج کر ان ملبوسات کی قیمت کئی سو گنا بڑھ گئی یہ ایک اہم شو تھا جس پر دانش سہگل اور چوہدری عبدالباری نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا اور اس پیسے کو سو فیصد منافع کے ساتھ واپس حاصل کرنے میں بھی وہ دونوں اتنے ہی پرامید تھے یہ ہی وجہ تھی کہ اس شو کی تیاری بڑے اہتمام سے کی جا رہی تھی دانش کا زیادہ تر

وقت اپنے اسٹوڈیو میں گزرتا جہاں وہ مختلف ماڈلز کو اس شو کے متعلق بریفنگ دیتا ایسے میں دریاب بھی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ویسے تو اس نے باقاعدہ ڈانس اکیڈمی سے رقص سیکھا تھا لیکن پھر بھی یہاں ایک ڈانس ڈائریکٹر کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا جو ماڈلنگ کے لحاظ سے دریاب کو رقص کی پریکٹس کروا رہا تھا۔ دریہ کو ہر لباس کے حساب سے رقص کا اتار چڑھاؤ سکھایا جا رہا تھا اس تمام عرصہ میں چوہدری بھی ہمہ وقت وہیں پایا جاتا جہاں دریہ ہوتی اور اس کی پیاسی نگاہیں ہر دم دریہ کا طواف کرتی رہتیں۔ جس دن صبح چھ بجے کی اس کی لندن کی فلائٹ تھی اسی رات اس کے پاس شہر پارا کا فون آگیا۔

"کہاں غائب ہوتی ہو تم نہ کوئی اتا نہ پتا۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ تمہارے بغیر میں کتنی تنہا ہو چکی ہوں۔"

دریاب سے شکوہ کرتے ہوئے خود بخود اس کی آواز بھرا گئی۔

"جذباتی بلیک میلنگ۔" اس نے نخوت سے سوچا۔

"کہیں نہیں ہوتی مما بس آج کل کچھ بزنس کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔" اور بزنس کی مصروفیات کیا ہیں؟ یہ جاننے سے زیادہ شہر پارا کے لیے اس بات کی اہمیت تھی کہ دریہ، دانش سہگل کے ساتھ خوش ہے۔

"مصروفیات سے تھوڑا وقت نکال کر گھر کا ایک چکر لگا لو کیونکہ نایاب کی طبیعت کافی خراب ہے دو دن ہسپتال میں ایڈمٹ رہ کر کل ہی گھر آئی ہے۔" نایاب بیمار تھی یہ کوئی ایسی خبر نہ تھی جو دریاب کے دل کے تاروں کو چھوتی کیونکہ اسے نایاب سے تو کیا اپنے گھر کے کسی بھی فرد سے کوئی جذباتی لگاؤ نہ تھا اس نے تو آنکھیں کھولتے ہی اپنے پاس رشتہ کے نام پر صرف شہر پارہ کو ہی دیکھا تھا یہ ہی وجہ تھی کہ وہ صرف شہر پارہ ہی کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھ سکتی تھی ورنہ تو باقی سب اس کے لیے ایک ہی جیسے لوگ تھے لیکن پھر بھی دنیاداری نبھانا بھی ایک فن ہے جیسے وقت کے ساتھ ساتھ دریہ بھی سیکھ چکی تھی۔

"کیا ہوا نایاب کو۔" یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شروع سے ہی دماغی عارضہ کا شکار ہے الفاظ خود بخود اس کے منہ سے پھسل گئے۔

"اسے پھر بہت زیادہ ٹمپریچر ہے شاید دماغ پر بخار چڑھ گیا ہے اکثر ہی دورے پڑ رہے ہیں اب تو بیٹھے بیٹھے بے ہوش بھی ہو جاتی ہے۔"

"اگر مما مجھے نہ بتائیں تو شاید گھر کا کوئی دوسرا فرد مجھے کبھی بھی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھے" ایک دم ہی یہ شکوہ اس کے دل میں ابھرا۔

"جب میرے اپنے ماں باپ نے مجھے اطلاع دینا ضروری نہ سمجھا تو پھر میں وہاں کیوں جاؤں۔"

اس کی انا نے نایاب کو دیکھنے کی خواہش کو پیدا ہونے سے قبل ہی ختم کر دیا۔

"وہ ایسا ہے مما کہ میں کل انگلینڈ جا رہی ہوں۔ ان شاء اللہ دو ہفتہ تک واپس آجاؤں گی پھر گھر آؤں گی اس سے قبل تو میرا آنا تقریباً" ناممکن ہے اور ہاں اگر آپ کو کچھ چاہیے تو بتا دیں میں لیتی آؤں گی۔" اور محبت کے اس اظہار نے شہر پارا کا خون سیروں بڑھا دیا وہ کھل اٹھی۔

"نہیں بیٹا مجھے کچھ نہیں چاہیے بس تم خیریت سے واپس آجاؤ میرے لیے یہ ہی کافی ہے۔"

☼ ☼ ☼

لاکھ کوشش کے باوجود مہر علی کو آخری کیس بھگتاتے، دوپہر کے دو بج ہی گئے اس نے اپنی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور کورٹ سے نکل کر تیزی سے اپنے چیمبر کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کی سیکریٹری مس نین تارا غالباً" اسی کی منتظر تھی۔

"ایگزیکٹوزی سر آپ کے ٹکٹ آگئے ہیں۔"

کمپیوٹر پر مصروف نین تارا، مہر علی کو دیکھتے ہی اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"گڈ۔ کب کی فلائٹ ہے۔" مہر علی نے وہیں کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر دریافت کیا۔

"جمعہ کو صبح چھ بجے۔" نین تارا نے ٹیبل کی دراز

سے ٹکٹ نکال کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج منگل ہے۔ یعنی ٹھیک تیسرے دن اس کا مطلب ہے کہ میرے پاس گاؤں جانے کے لیے صرف یہ ہی دو دن ہیں۔" مہر علی نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ "جانے بابا جان کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے جو اس قدر ایمرجنسی میں بلاوا بھیجا ہے۔

تارا میرے اگلے دو دن کی اپائنمنٹ کینسل کر کے نئی تاریخ دے دیں کیونکہ میں گاؤں جا رہا ہوں۔" مس تارا کو یہ اطلاع فراہم کر کے وہ باہر نکلا جہاں اللہ بخش گاڑی لے کر اس کا منتظر تھا۔

گاؤں سے اس کی کوئی بھی ایسی جذباتی وابستگی نہ تھی کہ اسے وہاں جا کر خوشی حاصل ہوتی گاؤں کے ساتھ ہی صدوری کا تصور اس کے ذہن میں آکر اس کی طبیعت کو خاصا مکدر کر گیا۔ صدوری نا صرف اس کی بیوی اور دو بیٹیوں کی ماں تھی بلکہ اس کے چچا کی اکلوتی بیٹی اور سات بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی دو بہنوں کی نند بھی تھی یہ ہی نہیں بلکہ وہ مہر علی کے بابا نواز علی کی خاص منظور نظر بھی تھی مہر علی جیسے آرٹسٹک بندے کے ساتھ صدوری جیسی بے تحاشا موٹی اور کھانے کی شوقین عورت ذرا نہ جچتی تھی لیکن کیا کیا جائے خاندانی رسم و رواج میں جکڑے ہوئے لوگ لاکھ چاہنے کے باوجود اپنے پیروں کو ان زنجیروں سے آزاد نہیں کر سکتے جو جائیداد کی حریصانہ خواہش نے ان کے پیروں میں ڈال رکھی تھیں۔

مہر علی کو اپنے گاؤں کے رسم و رواج اور جاگیردارانہ نظام سے سخت نفرت تھی یہ ہی وجہ تھی کہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باوجود اس نے کبھی بھی جاگیر کے معاملے میں دلچسپی نہ لی تھی بلکہ یہ کام اس کے چچا کا بیٹا اور اس کا بڑا سالا منصور علی لغاری ہی کرتا تھا اس کی بانسبت منصور اس کے باپ کا نا صرف دست راست بلکہ نہایت منہ چڑھا بھی تھا یہ ہی وجہ تھی کہ مہر علی اس سے بہت کم بات چیت کرتا تھا۔ اور اب بھی گاؤں جا کر گزارنے والے چوبیس گھنٹے اس کے لیے سوہان روح تھے اسے ہر حال میں جمعرات کو واپس آنا تھا تاکہ جمعہ کی صبح لندن کے لیے روانہ ہو سکے جہاں اہم کلائنٹ سے اس کی ملاقات طے تھی۔

عبدالرب گوندل ایک اعلا حکومتی عہدیدار ہونے کے علاوہ قومی اسمبلی کے ممبر بھی تھے پاکستان میں ان کی کچھ جائیداد تھی جس کے سلسلے میں انہیں مہر علی کی خدمات درکار تھیں اسی سلسلے میں مہر علی کو ایک ہفتہ کے وزٹ پر لندن جانا تھا اس کے علاوہ بھی وہاں اس کو اپنا بھی کوئی ذاتی کام تھا اور چونکہ اگلا پورا ہفتہ کورٹ متوقع ہڑتال کے سبب بند تھا۔ اس لیے مہر علی کے پاس اس سے بڑھ کر کوئی اچھا موقع نہ تھا۔ گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی مہر علی کو ایک عجیب سی تھکن نے گھیر لیا اور اس نے اپنی آنکھیں موند کر خاموشی سے اپنا سر گاڑی کی سیٹ سے ٹکا لیا۔

☼ ☼ ☼

آنے والے چوبیس گھنٹوں نے درباب کی زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا وہ انگلینڈ کی سرزمین پر پہنچ چکی تھی ہوٹل موون لائٹ کے سویٹ میں پہنچ کر بھی اسے یقین نہ آیا کہ وہ لندن جیسے عظیم الشان شہر میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ پاکستان سے آئی ہوئی دوسری ماڈلز بھی تھیں لیکن وی آئی پی کمرہ اس کے پاس تھا اور یہ بات اس کے لیے بہر حال اعزاز کی تھی کہ وہ مسز دانش سہگل تھی لیکن اپنے اس اعزاز پر فخر و غرور کرنے کا موقع اسے بہت کم ہی نصیب ہوا اور جلد ہی اس کی ملاقات مشہور ماڈل نشاء سے ہو گئی نشاء نے ان کے گروپ کو لندن میں ہی جوائن کیا تھا اور دوسری ماڈلز کی نسبت وہ خاصی منہ پھٹ اور صاف گو شخصیت کی مالک تھی درباب سے اس کی ملاقات فیلکن ہال میں ہوئی جہاں یہ نمائش منعقد ہوئی تھی اس نمائش میں حصہ لینے کے لیے مختلف ممالک کے علاوہ پاکستان سے بھی دوسرے اور لوگ آئے ہوئے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی ملبوسات اور جیولری کی نمائش تھی اور اس وقت جب وہ دانش کی ہمراہی میں ہال کے ڈریسنگ روم میں موجود ماڈلز کی آخری تیاریاں دیکھ رہی تھی اچانک

ہی نشاء آگئی دانش اس سے اسی طرح ملا جیسے دوسری ماڈلز سے ملتا تھا یہ سب اس کلچر کا حصہ تھا جس میں دریاب قدم رکھ چکی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اسے یہ سب بالکل بھی برا نہ لگتا تھا۔

"میٹ ہر شی از مائی وائف دریاب سہگل۔"

اس نے بڑی ترنگ سے دریاب کا تعارف نشاء سے کروایا اور نشاء اس تعارف پر حیران سی رہ گئی اور جیسے ہی دانش وہاں سے ہٹا وہ دریاب کے قریب آگئی۔

"تمہارے ماں باپ نہیں ہیں۔" اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر دریہ سے سوال کیا۔

"کیوں؟" اس کا سوال ہی ایسا تھا کہ دریاب کا حیران ہونا بجا تھا۔

"حیرت ہے میری جان تم جیسی معصوم اور خوبصورت ہرنی کو کون سے ماں باپ ہوتے ہیں جو دانش جیسے مرد کے ہاتھوں میں سونپ دیتے ہیں۔" وہ سگریٹ کا دھواں اس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے تلخی سے ہنسی۔

"میں شاید غلط کہہ گئی دانش تو مرد کہلانے کے قابل بھی نہیں ہے کیونکہ مرد تو وہ ہوتا ہے جو کسی عورت کو عزت، سائبان، تحفظ اور محبت دے سکے جبکہ دانش کے پاس تو دینے کے لیے ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے یہاں تک کہ وہ تو کسی عورت کے قابل بھی نہیں ہے پھر تم اتنے ماہ سے کیسے اس کے ساتھ رہ رہی ہو حیرت ہے مجھے۔"

تاسف اس کے لہجے سے جھلک رہا تھا اور اس کے الفاظ دریاب کو کسی نیزے کی انی کی مانند لگ رہے تھے۔

"جانتی ہو عورتوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں اسٹیج پر چلنا سکھاتے سکھاتے اس میں خود وہ تمام خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں جو دیگر مردوں کو اس کی جانب متوجہ کرتی ہیں یقین نہ آئے تو کبھی آزما کر دیکھ لینا۔"

الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ جو اس نے دریاب کے کانوں میں انڈیل دیا اور پھر بنا اس کے درد کا درماں کیے اس پر ایک تاسف بھری نظر ڈال کر کچھ دور کھڑے پریس فوٹو گرافر شکیل کی جانب بڑھ گئی جبکہ دریاب اس نئے انکشاف کے بعد زمین میں ہی گڑ گئی دانش کا گریز آج اس کی سمجھ میں آیا وہ بھرم جو اس نے اپنے اور دانش کے درمیان پچھلے کئی ماہ سے قائم کر رکھا تھا ریت کی دیوار ثابت ہوا اور اس کو اپنا آپ جلتی دھوپ میں جھلستا محسوس ہوا۔

"تو کیا دانش کے تمام ملنے والے اس حقیقت سے واقف ہیں؟ سب جانتے ہیں کہ دانش میرے حقوق پورے نہیں کر سکتا۔؟" یہ ایسے سوال تھے جنہوں نے اس سے اس کا فخر و غرور سب چھین لیا۔

"میں جو دنیا کے سامنے فخر و غرور سے گردن اکڑائے گھومتی ہوں کہ میں مسز دانش سہگل ہوں تو یہ سب لوگ مجھ پر کتنا ہنستے ہوں گے؟ سوچتے ہوں گے آسائشات کی ماری عورت ایک ادھورے مرد کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔" لاکھ خود کو سمجھانے کے باوجود وہ اندر سے بالکل ٹوٹ گئی اس رات فلکن ہال میں پیش کیا جانے والا فیشن شو ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا دریاب کے تینوں رقص بے حد پسند کیے گئے اسے لوگوں نے بے حد سراہا اس کا انداز فیشن ماڈلنگ میں بالکل ایک نیا لک تھا۔ ان ڈریسز کی مانگ سب سے زیادہ رہی جنہیں دریاب نے دوران رقص استعمال کیا تھا لیکن پھر بھی جانے کیوں اس سب سے بھی دریاب کو ویسی خوشی حاصل نہ ہوئی وہ اندر سے بالکل بکھر چکی تھی اسے رونے کے لیے ایک کندھا درکار تھا جیسے ہی ان کا شو ختم ہوا وہ خاموشی سے باہر نکل کر لابی میں آگئی اور یقیناً" آج اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا وہ لابی میں بالکل تنہا کھڑی تھی جب کسی کام سے باہر آتے چوہدری عبدالباری کی نگاہ اس پر پڑی۔

"زہے نصیب سرکار آپ کدھر جا رہے ہیں۔"

وہ اپنی حریصانہ نظریں اس کے جسم کے پار اتارتے ہوئے بولا۔

"اپنے روم میں۔" وہ تھکی تھکی آواز میں بولی۔

"گولی مارو جی اپنے روم کو آؤ میرے ساتھ۔"

چوہدری نے اس کی کمر کے گرد اپنا بازو حمائل کر کے اسے سہارا دیا اور وہ کوئی احتجاج بھی نہ کر سکی کیونکہ اس وقت وہ اپنے حواسوں میں ہی نہ تھی بنا کسی مزاحمت کے نہایت خاموشی سے وہ چوہدری کے روم میں آگئی اور یہ پہلی رات تھی جب اس نے ام الخبائث کو منہ لگایا اور پھر پیتی چلی گئی اسے اپنے دکھ درد دور کرنے کے لیے چوہدری کا کندھا نصیب ہو گیا تھا اور چوہدری نے اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی محبت کی پھوار سے وہ گوہر مقصود حاصل کر لیا جس کے لیے شطرنج کی یہ بساط بچھائی گئی تھی یہاں بھی وہ اپنی بے خبری کے ہاتھوں ماری گئی صبح کے طلوع ہوتے سورج نے رات کے گناہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور صبح جب وہ بے دار ہوئی تو اسے پہلا خیال دانش کا ہی آیا دانش کا خیال آتے ہی وہ متضاد کیفیات میں گھر گئی کہیں دانش ناراض ہی نہ ہو جائے۔ پہلا خیال اسے یہ ہی آیا میں دانش کو اس رات کا کیا جواز دوں گی؟ وہ گھبرا اٹھی شاور لیتے ہوئے بھی اس کی ذہنی رو بھٹک کر دانش کی سمت ہی جا رہی تھی اسے حیرت تھی کہ اس کی غیر حاضری کو محسوس کرتے ہوئے دانش نے اب تک اسے تلاش کیوں نہ کیا؟

اس کے موبائل پر دانش کی کوئی ایک مس کال نہ تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ چوہدری کے ساتھ گزارا جانے والا وقت دانش کی مرضی کے مطابق ہی تھا جس کے لیے وہ ایک بڑی اور معقول رقم معاوضہ کی شکل میں چوہدری سے حاصل کر چکا تھا جبکہ دریہ اپنی بے خبری کے سبب دانش کا سامنا کرتے ہوئے سخت شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ اپنے اسی گلٹ اور احساس شرمندگی کے بوجھ تلے دبی جب وہ دانش سے ملی تو اس کے نارمل رویہ نے جلد ہی اس کے احساس شرمندگی کو زائل کر دیا۔

"افوہ میں تو ایسے ہی گھبرا رہی تھی اسے تو کچھ پتا ہی نہیں چلا۔"

وہ سمجھ رہی تھی کہ رات غالباً" دانش اس کے کمرے میں آیا ہی نہ تھا۔ ابھی وہ اس سوسائٹی کی روایات اور تقاضوں سے بے بہرہ تھی ورنہ جان جاتی کہ یہاں اس طرح کے واقعات پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی جاتی بلکہ اپنے عاشقی کے ایسے واقعات کو نجی محفلوں میں فخریہ بیان کیا جاتا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ جو کچھ ان کے ماحول کے حساب سے بے راہ روی اور بے حیائی میں شمار ہوتا تھا وہ اس جدید معاشرے کا فیشن تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ جیسے ہی رائل اپارٹمنٹ کی لفٹ سے باہر نکلا سرد ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا اس نے فوراً" اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر لیے اور تیزی سے پارکنگ کی جانب بڑھ گیا جہاں گوندل صاحب کا شوفر اسی کا منتظر تھا گوندل صاحب سے اس کی آج کی یہ ملاقات کاروباری اعتبار سے کافی کامیاب رہی تھی تمام ضروری معاملات ڈسکس کر کے وہ ان کا کیس لینے کا فیصلہ کر چکا تھا اس سلسلے میں تقریباً" تمام کاغذی کارروائی اس نے مکمل کر لی تھی ان کی جائیداد کے ضروری کاغذات اس کے ہاتھ میں موجود فائل میں لگے ہوئے تھے جس کا گھر جا کر اس نے اچھی طرح مطالعہ کرنا تھا تاکہ کیس کی شروعات کے سلسلے میں مدد مل سکے ابھی وہ گاڑی تک پہنچا ہی تھا کہ اس کے موبائل کی مخصوص دھن بجنے لگی موبائل کوٹ کی اندرونی جیب میں تھا جسے نکالتے نکالتے بھی کال منقطع ہو گئی شوفر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اس سے قبل کے وہ اندر بیٹھتا فون بجنے لگا اس نے اسکرین پر ایک نظر ڈالی۔

"شعازل کالنگ۔" اسکرین پر جگمگا رہا تھا اس نے فوراً" یس کا بٹن دبا کر فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔"

"ہاں ہو مہر علی تم ابھی تک میری exhibition میں نہیں پہنچے۔"

مہر علی نے بے اختیار اپنی گھڑی پر نظر ڈالی جہاں سات بج رہے تھے پھر اس نے گاڑی کے شیشے سے باہر

جھانکا جہاں چھائی ہوئی دھند کے سبب سارا شہر لندن تیز روشنیوں میں نہا سا گیا تھا۔

"شو کتنے بجے شروع ہو گا؟"

"تقریباً" آٹھ بجے تک۔"

"او کے میں آرہا ہوں۔" اس نے ایک پل کو سوچا اور جواب دے کر فون بند کر دیا۔

"ایسا کرو مجھے وکٹوریہ روڈ پر فیلکن ہال کے پاس ڈراپ کر دو۔"

آج اگر شعازل نے فون کر کے یاد دہانی نہ کروائی ہوتی تو یقیناً" میں اس کا یہ شو بھول چکا تھا اس نے دل ہی دل میں شعازل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی کی سیٹ سے سر ٹکا لیا۔

شعازل نا صرف اس کی بہترین دوست تھی بلکہ ایک مشہور ڈریس ڈیزائنر بھی تھی لیکن اس کے شو میں شرکت کی اصل وجہ فیض محمد سے کیا ہوا وعدہ تھا شعازل مسز فیض محمد تھی۔ اور فیض محمد اپنے کسی آفیشل کام کی بدولت لندن نہ آسکا تھا یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے مہر علی کو اس شو میں شرکت کرنے کی خاص ہدایت کی تھی اور اگر آج وہ اپنا وعدہ بھول جاتا تو فیض محمد یقیناً" ناراض ہوتا اور اسے یقین تھا کہ تقریباً" ایک گھنٹہ تک وہ فلیکن ہال پہنچ جائے گا۔

☼ ☼ ☼

وہ جیسے ہی یونیورسٹی سے واپس آئی گھر میں پھیلے ہوئے سناٹے نے اس کا استقبال کیا یقیناً" تمام لوگ ہسپتال گئے ہوئے تھے کیونکہ رات سے نایاب کی حالت کافی خراب تھی جس کی بنا پر اسے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا تھا نیچے کے فلور پر صرف تحریم اور ولید تھے وہ خاموشی سے اوپر آگئی کچن میں جا کر کھانا گرم کیا ابھی کھانے ہی بیٹھی تھی کہ موبائل پر ایس ایم ایس کی مخصوص دھن سنائی دی یقیناً" سمن کا میسج ہو گا کیونکہ آج کل سب نایاب کی وجہ سے خاصے پریشان تھے اس نے فوراً" موبائل اٹھا کر چیک کیا میسج تو سمن کا ہی تھا لیکن کیوں کیا تھا یہ فوری طور پر سمن کی سمجھ میں نہ آیا میسج میں کسی ویب سائٹ کا ایڈریس دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس ویب سائٹ کو جلد از جلد سرچ کرنے کی ہدایت بھی درج تھی۔

"ماتنی کیا ایمرجنسی ہو گئی اس ویب سائٹ کو سرچ کرنے کی۔"

سمرن نے حیرانی سے سوچا ویب سائٹ کسی فیشن شو کے متعلق تھی جبکہ سمرن کو کبھی بھی کسی ایسی ویب سائٹ سے دلچسپی نہ تھی اور یہ بات سمن اچھی طرح جانتی تھی پھر بھی اگر اس نے سمرن کو چیک کرنے کی ہدایت کی تھی تو ضرور کوئی خاص بات ہی تھی سمرن کو کسی انجانی بے چینی نے گھیر لیا اس نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور فوراً" کمپیوٹر آن کر دیا۔ کمپیوٹر کے آن ہوتے ہی وہ فوراً" سمن کی بتائی ہوئی ویب سائٹ سرچ کرنے لگی جو تھوڑی ہی دیر میں اسے مل گئی لندن میں ہونے والے مختلف فیشن شوز" اسٹیج پر کیٹ واک کرتی ماڈلز کچھ بھی ایسا نہ تھا جو سمرن کی دلچسپی کا سبب بنتا اس سے قبل کہ وہ کمپیوٹر بند کر دیتی۔ اسکرین پر نظر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چلنا بھول گئیں۔

"او میرے خدا۔" اسے یقین ہی نہ آیا کہ جو وہ دیکھ رہی ہے سچ ہے۔

"دریاب...... یہ دریاب ہے نا۔"

عقب سے آتی شاہ ویز کی آواز سن کر وہ کرنٹ کھا کر پلٹی اس کی طرح شاہ ویز بھی غیر یقینی کیفیت میں گھرا اسکرین کی جانب یک ٹک دیکھ رہا تھا پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا اس کے قریب آگیا۔

"تمہیں اس ویب سائٹ کا کس نے بتایا۔"

"سمن نے۔" سمرن نے تھکی تھکی آواز میں جواب دیا۔

"کمپیوٹر بند کرو اور کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا کیونکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ارم چچی پہلے ہی نایاب کی وجہ سے سخت ٹینشن کا شکار ہیں اب انہیں کچھ اور مت بتانا۔"

اسے سختی سے ہدایات دیتا ہوا شاہ ویز تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ وہ کئی دیر حیران کن کیفیت میں گھری ہوئی اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اتفاق کی بات تھی کہ آج تیسری دفعہ بھی مہر علی نے اسے اسٹیج پر ہی دیکھا تھا بے حد خوبصورت پرفارمنس دیتے ہوئے لیکن جانے کیوں وہ مہر علی کو پچھلی دو بار کی دیکھی ہوئی "اپسرا" سے قطعی مختلف لگی نہایت گم سم اور کھوئی کھوئی۔

"آج میں ضرور اس سے بات کروں گا۔" اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے مہر علی دل ہی دل میں پکا ارادہ کر چکا تھا لیکن شاید اس کے نصیب میں ابھی یہ ملاقات نہ تھی یہ ہی وجہ تھی کہ شو ختم ہونے کے بعد وہ اسے کہیں دکھائی نہ دی مہر علی نے اپنے طور پر اسے کافی تلاش کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا اس لیے بنا کسی سے کچھ پوچھے خاموشی سے اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آگیا۔

"اب مجھے یہ ضرور معلوم کرنا ہے کہ یہ لڑکی کون ہے۔" مہر علی اسے کھوجنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر واپس آتے ہی اسے پہلی خبر یہ ملی کہ نایاب فوت ہو گئی۔

"اچھا ہی ہوا اس زندگی سے موت اچھی ہے۔"

اس نے اپنے دل میں اطمینان محسوس کیا بے شک وہ اپنے گھر کے ہر فرد سے لاتعلق رہ کر زندگی گزارتی آئی تھی لیکن یہ بھی سچ تھا کہ نایاب کی حالت دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی اور اکثر ہی سوچتی تھی کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا اگر اس سے پہلے ارم چچی کو کچھ ہو گیا تو؟ یہ وہ سوال تھے جو دریاب جیسے بے حس اور رشتوں سے بے بہرہ لڑکی کے ذہن میں بھی کبھی کبھی آہی جاتے تھے لیکن پھر بھی نایاب کی وفات کا سن کر اسے وقتی طور پر دکھ ضرور ہوا جو بھی تھا جیسی بھی تھی تھی تو ایک انسان اور پھر اس کی بہن جس نے ہوش سنبھالتے ہی دنیا میں دیکھا ہی کچھ نہ تھا۔

"صغیرا کوئی سا بھی وائٹ کاٹن کا سوٹ نکال کر رکھو مجھے ابھی اپنے گھر جانا ہے۔" صغرا کو ہدایات دے کر وہ واش روم کی جانب بڑھ گئی شاور لیتے ہوئے بھی نایاب ہی اس کے ذہن پر سوار رہی' جانے کیوں آج اسے گھر جانے کی بھی جلدی تھی وہ جیسے تیسے شاور لے کر باہر نکلی تو سامنے بیڈ پر نیم دراز دانش کو دیکھ کر ساکت سی رہ گئی دانش کا رویہ اس سے ہمیشہ ہی فارمل سا رہا تھا وہ جب بھی کبھی کمرے میں آتا صوفے پر بیٹھ کر خوب پیتا اور اکثر وہیں ڈھیر ہو جاتا دریہ کوئی روایتی بیوی تو تھی نہیں جو اس کی خدمت کرتی اور جوتے اتار کر ٹانگیں سیدھی کر دیتی لہٰذا اس کام کے لیے وہ فوراً" سے بیشتر صغرا کو بلاتی اور خود نہایت اطمینان اور بے نیازی سے اپنے بیڈ پر سو جاتی آج شاید یہ پہلا موقع تھا کہ دانش اس کے روم میں اس کے بیڈ پر نیم دراز تھا وہ مکمل طور پر اسے نظر انداز کرتی ڈریسنگ کے سامنے آکر اپنے بال سلجھانے لگی اسے احساس ہو گیا تھا کہ دانش نہایت باریک بینی سے اس کا جائزہ لے رہا ہے اور ابھی کچھ پوچھنے والا ہے۔

"کہیں جا رہی ہو؟" بالآخر اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔

"ہاں! اپنے گھر میری بہن کی ڈیتھ ہو گئی ہے آج سے تقریباً" دس دن قبل جب میں لندن میں تھی۔"

اس نے تفصیلی جواب دینا مناسب سمجھا اسے خدشہ تھا کہ کہیں دانش اسے جانے سے منع ہی نہ کر دے اور جلد ہی اس کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔

"ویری سیڈ یار بہت افسوس ہوا۔" وہ آہستہ آہستہ چلتا دریہ کے قریب آگیا نہایت قریب یہاں تک کہ اس کی سانس کی آواز دریہ کو اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی لیکن جانے کیوں آج دریہ کو اس کا اس قدر قریب آنا ذرا اچھا نہ لگ رہا تھا۔ اس کے کلون اور سگریٹ کی ملی جلی خوشبو جس نے شادی سے قبل دریہ کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا اب اپنی اہمیت کھو چکی تھی کیونکہ اب دریاب کسی حد تک اس کی شخصیت کے گھناؤنے کردار سے واقف ہو چکی تھی بے شک وہ جس قدر گھٹیا شخص تھا اتنا تو دریاب شاید کبھی بھی نہ

جان پاتی لیکن جو اس نے جانا وہ بھی اس کے لیے قابل نفرت ہی تھا بظاہر اوپر سے نظر آنے والا ایک صحت مند مرد اندر سے کیا تھا یہ تو صرف وہ ہی جانتی تھی یا وہ لوگ جو دانش سہگل کے قرب کا شرف رکھتے تھے دریاب اپنی چین گلے میں ڈال کر لاک لگانے کی کوشش کر رہی تھی دانش نے خاموشی سے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر لاک بند کر دیا۔

"شکریہ۔" وہ اپنی جوتی کی جانب بڑھی اس کی کوشش تھی کہ جلد از جلد اس کمرے سے باہر نکل جائے۔

"وہ ایسا ہے دریاب جان تم اپنے گھر کل چلی جانا۔" اسے اپنے عقب سے دانش کی پرسکون آواز سنائی دی وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔

"واٹ ڈیو یو مین؟ دانش صاحب میں نے ابھی آپ کو بتایا ہے کہ میری بہن کو فوت ہوئے دس دن ہو چکے ہیں پورے دس دن میرے گھر والے میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے اس بات کا احساس ہے آپ کو؟ کیا میں اتنی بے حس ہو چکی ہوں کہ اپنی سگی بہن کی عیادت تو نہ کر سکی اب تعزیت بھی نہ کروں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جان لیکن آج رات چوہدری صاحب نے مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک تقریب کا اہتمام کیا ہے جس کی مہمان خصوصی تم ہو۔" وہ نہایت ڈھٹائی سے اسے خود سے قریب کرتا ہوا بولا۔

"اور جانتی ہو اس تقریب میں لاہور سے ایک دو فلمی پروڈیوسر بھی خاص طور پر شرکت کرنے آرہے ہیں جنہیں اپنی فلم کے لیے نئے اور فریش چہروں کی تلاش ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہیں اپنی فلم میں بطور ہیروئن منتخب کرلیں اس لیے رات تمہارا فریش ہونا نہایت ضروری ہے۔" وہ نہایت گھاگ شکاری تھا اس نے دریاب کو اس کی پسند کا دانہ ڈال دیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم ابھی اچھا سا ناشتا لو میں ارج کو فون کر دیتا ہوں وہ آکر تمہاری سروس کر دے گی دوپہر میں اچھی نیند لینا تاکہ رات کو تمہارے چہرے پر تھکن کے آثار نہ ہوں تمہارے ڈریس اور میک اپ کے لیے بھی میں نے ارج کو ہدایات دے دی ہیں اس کی ایکسپرٹ رات آٹھ بجے تک آئے گی تمہیں تیار کرنے میں چاہتا ہوں آج کا پورا دن تم مکمل ریلیکس ہو کر گزارو تاکہ تمہارے چہرے پر ایک فریش لک آئے جہاں تم نے دس دن تعزیت تمہیں کی وہاں ایک دن اور رک جاؤ۔" اس نے رک کر دریاب پر ایک نظر ڈالی۔

"ویسے کوئی زبردستی نہیں ہے اگر تم جانا چاہو تو تمہاری مرضی۔"

وہ جانتا تھا دریاب کو اپنا مفاد دنیا کے ہر رشتہ سے زیادہ عزیز ہے۔

"ٹھیک ہے میں کل چلی جاؤں گی۔" شوبز کی متوقع چکا چوند نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا تھا۔

"گڈ گرل۔" وہ آہستہ آہستہ اسے اپنے ساتھ لگائے بیڈ تک لے آیا اور دریاب بالکل بھول گئی کہ اس کی سگی بہن کو فوت ہوئے محض دس دن ہوئے ہیں۔

اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ اپنی ماں جائی کی تعزیت کے لیے جانا چاہتی تھی اس یاد رہا تو صرف اتنا کہ آج کی رات اس کی زندگی میں روشنیاں بھرنے والی تھی آج کی رات اس کی زندگی کو کامیابیوں کی راہ پر گامزن کر دینے والی ایک رات تھی جس کا ہر لمحہ اس نے کشید کرنا تھا۔ اپنی پہچان اپنا نام بنانے کے لیے اسے صرف ایک فلم چاہیے تھی ایک فلم کے بعد کامیابی اس کا مقدر بن جانے والی تھی وہ جانتی تھی کہ اوپر جانے کے لیے پہلا اسٹیپ مل جائے تو پھر اونچائی پر پہنچنا کچھ مشکل نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

رات چوہدری صاحب کی منعقد کردہ پارٹی میں اس کی ملاقات مشہور فلمی پروڈیوسر فاضل کریم سے ہوئی جو دریاب کو دیکھ کر حقیقی معنوں میں دنگ رہ گیا دریاب کرنکل شیفون کی ریڈ عربین میکسی میں غضب ڈھا رہی تھی میکسی کے دونوں جانب سے اوپر تک

کھلے چاک اس کے جسم کی خوبصورتی کو واضح طور پر نمایاں کر رہے تھے تقریب میں موجود ہر شخص اس کی اک نظر کرم کا متمنی تھا لیکن وہ صرف فاضل کریم کی توجہ چاہتی تھی جس میں مکمل طور پر کامیاب رہی اور تقریب کے اختتام تک وہ اسے کل رات شہر کے مہنگے ترین ہوٹل میں ڈنر پر انوائیٹ کر چکا تھا اور دریاب کے نزدیک یہ شہرت کی سیڑھی پر رکھا جانے والا پہلا قدم تھا جو جلد ہی اسے آسمان کی بلندیوں تک لے جانے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

گھر میں داخل ہوتے ہی برآمدے میں بچھی دری پر اسے ارم نظر آئیں غم کی شدت سے نڈھال دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ارم کو دیکھتے ہی جانے دریاب کو کیا ہوا ارم کی اس قدر ناگفتہ بہ حالت کو دیکھتے ہی اس کا دل دکھ اور غصہ کی شدت سے بھر گیا۔

"اونہہ۔۔۔ ایک پاگل بیٹی کا اتنا دکھ اور کہاں میری زندگی بھر بھی کوئی خبر ہی نہ لی۔" وہ خاموشی سے ارم کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

"کیسی ہیں ارم چچی آپ۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ارم کے ہاتھ تھام لیے اور اس کا دل یک دم ماں کی محبت سے بھر گیا۔

"میری نایاب چلی گئی مجھے چھوڑ کر۔" ارم ذرا سا دل جوئی کا احساس پاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں دریہ جس کا دل کچھ دیر قبل ماں کی محبت سے لبریز ہونے چلا تھا نایاب کی خاطر ماں کو روتا دیکھ کر یک دم مکدر سا ہو گیا۔

"آج نایاب گئی تو اتنا دکھ کل مجھ ایک دن کی بچی کو دوسروں کی گود میں ڈالا تھا تب دل نہ کانپا تھا۔" چاہا کہہ دے لیکن حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے خاموش رہی اور جلد ہی ارم کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ کھینچ کر کچھ دور ہو کر بیٹھ گئی۔

"ارے دریاب آئی ہوئی ہے۔" اچانک ہی سمرن کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اس نے پل بھر کو نظر اٹھا کر سمرن کی جانب دیکھا سانولی سلونی سمرن پہچانی ہی نہ جا رہی تھی بلیک اور ریڈ سوٹ میں وہ دریاب کو پہلے سے کہیں زیادہ مختلف اور خوبصورت نظر آئی شاید اس کے حسن کو یہ جلا شاہ ویز کی محبت نے بخشی تھی۔

"کیسی ہو تم اور مما کہاں ہیں نظر نہیں آرہیں۔" بیک وقت کئی سوالات اس نے سمرن سے کر ڈالے۔

"میں ٹھیک ہوں البتہ مما کی طبیعت پچھلے کچھ دنوں سے خراب ہے بخار نہیں اتر رہا۔"

"اوہ چلو پھر میں اوپر ہی چلی جاتی ہوں۔" وہ فوراً سے بیشتر اٹھ کھڑی ہوئی اور سیڑھیاں چڑھ کر شہر یارا کے فلور پر آگئی شہر یارا اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔

"ارے تم، تم کب آئیں۔" اس کے تن مردہ میں جان سی پڑ گئی۔

”بھئی آئی تھی کیا ہوا آپ کو۔“ وہ کرسی کھینچ کر شہر یارا کے بیڈ کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں بس معمولی سا بخار ہے تم بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔“

”نہیں نہیں مما پلیز آپ بیٹھیں میں بس آپ سے مل کر جاؤں گی مجھے دیر ہو رہی ہے دانش میرا انتظار کر رہے ہوں گے کئی مس کال آچکی ہیں۔“

”ارے بیٹھو ابھی تم کہاں جا رہی ہو کھانا کھا کر جانا۔“ سمرن اس کے لیے اورنج جوس لے کر آئی تھی۔

”تم نے خوامخواہ زحمت کی۔“ ٹرے سے گلاس اٹھاتے اس نے سمرن کو مخاطب کیا۔

”زحمت کیسی تم اتنے دنوں بعد آئی ہو کم از کم اتنی خدمت تو تمہارا حق بنتا ہے۔“ سمرن نے مسکرا کر جواب دیا اور وہیں بیڈ پر شہر یارا کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”تمہاری شادی کب ہو رہی ہے۔“ گھونٹ گھونٹ جوس حلق میں اتارتے ہوئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوال کر بیٹھی۔

”اصل میں تایا جی اور تائی سادیہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے گئے ہوئے ہیں جیسے ہی واپس آئیں گے تاریخ رکھ دی جائے گی بس ان کے ساتھ ساتھ سمن اور شاہ زیب بھائی کا انتظار ہے۔“

”شاہ ویز آج کل کہاں جاب کر رہا ہے۔؟“

”بینک میں۔۔۔ ویسے تو اسے شارجہ میں ایک بہت اچھی جاب آفر ہوئی تھی لیکن چونکہ اس وقت گھر کی تمام ذمہ داری اسی پر ہے اس لیے اس نے اس آفر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔“

”حیرت ہے تم نے سمجھانا تھا دوسروں کے لیے کیوں اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا رہا ہے۔“

”میں نے ہی سمجھایا کیونکہ میں بغیر رشتوں کے زندگی نہیں گزار سکتی اور ویسے بھی دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے نمود و نمائش ہی کام نہیں آتی اپنوں کا ساتھ بھی بہت تقویت دیتا ہے۔“

اچانک ہی جوس کا گھونٹ اس کے حلق میں پھنس گیا اس نے آدھا گلاس واپس رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں چلوں دیر ہو رہی ہے۔“

شہر یارا سے گلے مل کر وہ واپس پلٹی تو جانے یک دم سمرن کو کیا ہوا۔

”ارے یاد آیا میں نے تمہارے فیشن شو کی تصویریں دیکھی تھیں۔“ اپنی عادت کے برخلاف جانے کیوں وہ دریہ کو جتائے بنا نہ رہ سکی۔

دریہ نے یک دم پلٹ کر سمرن پر ایک نظر ڈالی۔

”میری تصویریں تم نے کہاں دیکھ لیں؟“ ایسے جیسے اسے سمرن کی بات پر یقین ہی نہ آیا ہو۔

”نیٹ پر۔“ سمرن کا اطمینان قابل دید تھا۔ جیسے اسے دریہ کے اس اقدام سے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔

”اچھا میں چلوں دانش کئی فون کر چکے ہیں۔“ سمرن کی بات کو یکسر نظر انداز کرتی وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

”کوئی دیکھتا ہے تو بے شک دیکھے آخر کل جب میں نے فلم سائن کرنی ہے تب بھی تو ان لوگوں کو پتا چلنا ہی ہے نا۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اپنے دل کو تسلی دی ویسے بھی اس نے کبھی کسی کی پروا کرنے کی عادت ڈالی بھی نہ تھی تو خوامخواہ میں دوسروں کا سوچ کر اپنے شاندار مستقبل کو وہ داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی اور یہ یقیناً اس کا آخری فیصلہ تھا۔

✲ ✲ ✲

اکیس دسمبر کو سمرن کی شادی تھی سمن کو آئے ہوئے ہفتہ ہو چکا تھا اور سمرن کی شادی کی تیاریاں اس نے اور فاریہ بھابھی نے مل کر کی تھیں رات ہی کارڈ چھپ کر آئے تھے جن پر نام لکھا جا رہا تھا۔

”دریہ کو کارڈ دینے جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے جانا۔“ یہ بات وہ جانے کتنی بار شاہ ویز کو بتا چکی تھی کہ اسے دریہ سے ملنے اس کے گھر جانا ہے اس لیے کارڈ دینے جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے۔ جائے کیونکہ وہ پچھلے پانچ سالوں سے دریاب سے نہیں ملی تھی۔

”چلو آجاؤ میں جا رہا ہوں۔“ شاہ ویز کارڈ پر نام لکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اس کے ساتھ دریہ کے گھر آگئی گاڑی جیسے ہی اس کے عظیم الشان بنگلہ کے سامنے کھڑی ہوئی سمن ہکا بکا رہ گئی۔

”واؤ بھئی زبردست بڑا خوبصورت گھر ہے۔“ سنگ مرمر سے بنے سفید بنگلے پر نظر ڈالتے ہی ستائشی جملہ خود بخود اس کے منہ سے نکل گیا۔

”یہ تم ظاہری نمود و نمائش پر کب سے جان دینے لگیں۔“

شاہ ویز نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے گیٹ کا انٹر کام بجایا۔

دریاب دو دن قبل ہی اپنی فلم کی شوٹنگ سے واپس لوٹی تھی اور اس کی اس ہی سرگرمی کے متعلق فی الحال کسی کو علم نہ تھا فلم پچھتر فیصد مکمل ہو چکی تھی ڈبنگ اور ایڈیٹنگ کا کام جاری تھا وہ بڑی بے چینی سے اپنی اس فلم کے مکمل ہو کر سنیما میں لگنے کی منتظر تھی تاکہ اسے اپنی مارکیٹ ویلیو کا اندازہ ہو سکے اسی لیے اس نے پہلے کسی کو نہ بتایا تھا وہ اچانک میڈیا میں آکر سب کو حیران کر دینا چاہتی تھی خاص طور پر اپنے اسکول اور کالج کی فرینڈز کو جن کے لیے دریاب کو بحیثیت ایک اداکارہ دیکھنا یقیناً ”حیرت انگیز ہوتا ابھی بھی وہ ان ہی خوش کن خیالات میں گھری ہوئی تھی جبکہ صغرا اس کا مساج کر رہی تھی اتنے میں انٹر کام پر اسے اپنے گھر سے آئے ہوئے مہمانوں کے متعلق اطلاع ملی۔

”اندر بھیجو۔“ ملازم کو ہدایت دے کر وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگی اپنے گھر سے کسی کی آمد کا سن کر اسے یقیناً ”دلی خوشی ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی شاہ ویز کا تصور اس کی طبیعت کو خاصا مکدر کر گیا کیونکہ وہ ابھی بھی فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں شاہ ویز سے اچانک ہونے والے اس سامنے کو بھولی نہ تھی یہ ہی سب سوچتی ہوئی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

”او ہو سمن باجی آپ کب آئیں۔“ اتنے سالوں بعد سمن کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ باقی سب کچھ یکسر فراموش کر بیٹھی اور بڑی محبت سے سمن کے گلے ملی۔

”مجھے تو ایک ہفتہ ہو گیا۔“ سمن نے بڑی محبت سے اس کا ماتھا چوما۔

”شاہ ویز کے پاس ہی وقت نہ تھا ورنہ میں تو تم سے ملنے میں کبھی اتنے دن نہ لگاتی۔“ سمن کی اس وضاحت پر اس نے ایک سرسری سی نظر شاہ ویز پر ڈالی جو چہرے پر یکسر اجنبیت طاری کیے بیٹھا تھا۔

”اور تم تو ماشاء اللہ بہت ہی خوبصورت ہو گئی ہو۔“ سمن کے نا صرف الفاظ بلکہ نظروں میں بھی اس کے لیے ستائش تھی سمن کی اس تعریف پر وہ صرف ہلکا سا مسکرا اس کے قریب صوفہ پر بیٹھ گئی صغرا ٹرالی لے کر آگئی تھی۔

”ارے تم نے یہ سب اتنا تکلف کیوں کیا میں تو بس اب جا رہی ہوں۔“ سمن شاہ ویز کو مسلسل پہلو بدلتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔

”جی نہیں آپ آج کھانا کھا کر جائیں گی۔“ جانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سمن آج کچھ دیر اور اس کے پاس بیٹھے اسے یک دم ہی سمن کی وہ محبت یاد آئی جو ایک گھر میں رہتے ہوئے سمن اس سے اور سمرن سے کرتی تھی اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آگئی جانے کیوں وہ اس قدر جذباتی سی ہو رہی تھی۔

”میں پھر آؤں گی یہ سمرن کی شادی کا کارڈ ہے تم نے ہر رسم میں شرکت کرنی ہے میں خاص طور پر تمہارا انتظار کروں گی دانش بھائی کو بھی لے کر آنا۔“ شاہ ویز کے اشارہ کرتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا اللہ حافظ۔“ اب کے دریاب کے انداز میں وہ والہانہ پن نہ تھا اور یہ بات سمن بھی محسوس کر چکی تھی اس لیے جیسے ہی اس سے الوداعی ہاتھ ملایا اس کے دونوں ہاتھوں کو بڑی محبت سے تھام کر بولی۔

”تمہارا گھر بڑا خوبصورت ہے بالکل تمہاری طرح

اور ہاں شادی پر ضرور آنا ہم سب تمہارا انتظار کریں گے۔" سمن کی والہانہ محبت اور ستائشی جملوں نے اس کے دل کے بوجھل پن کو کافی حد تک دور کردیا۔ شاہ ویز شیشے کا دروازہ دھکیل کر باہر نکل چکا تھا۔ اس نے سمن سے وعدہ ضرور کیا کہ وہ شادی کی تمام رسومات میں شریک ہوگی لیکن بظاہر اس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا اس نے کارڈ اپنے کمرے میں لے جاکر خاموشی سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔

☼ ☼ ☼

اس کی فلم اگلے ہفتہ تک سینما میں لگنے والی تھی فلم کے پوسٹرز مختلف سینما گھروں کے باہر لگ چکے تھے ہاتھ سے بنے ہوئے ان پوسٹرز میں وہ قدرے مختلف دکھائی دے رہی تھی اس کا فلمی نام "دل ربا" رکھا گیا تھا یہ ہی وجہ تھی کہ ابھی تک اس کے قریبی جاننے والوں کو بھی اس کی اس نئی سرگرمی کا علم نہ ہوسکا تھا یا شاید کسی کو اس حد تک امید نہ تھی وہ ریڈ کارپٹ کے سلسلے میں ایک دوٹی وی چینل پر بھی آچکی تھی اور اب جانچنا چاہتی تھی کہ آیا لوگ اسے فلم اسٹار دل ربا کی حیثیت سے جان پائے ہیں یا نہیں یہ ہی سوچ کر وہ سمن کے ولیمہ میں شریک ہونے پیراڈائز لان آگئی۔

ریڈ قیمتی ساڑھی میں خوبصورت اور جدید جیولری کے ساتھ وہ ایک منفرد سی شخصیت دکھائی دے رہی تھی باہر استقبالہ پر ہی اسے شاہ ویز کے ہمراہ زوار بھی کھڑا نظر آگیا ان دونوں کو یکسر نظر انداز کرتی وہ تایا سرفراز کی جانب بڑھی جنہوں نے اس کے سلام کا جواب دے کر منہ دوسری جانب پھیرلیا۔

"مجھے انہیں بھی سلام نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ سخت پچھتائی اور اندر کی جانب بڑھ گئی شہر پارا بڑی محبت اور والہانہ پن سے ملی۔

"ایکسکیوز می میڈم آپ دل ربا ہیں نا۔" وہ کوئی پندرہ، سولہ سالہ لڑکی تھی جو بڑے اشتیاق سے اس سے دریافت کررہی تھی۔

"جی......" لڑکی کو مختصر سا جواب دے کر وہ پارو کی رہنمائی میں آگے بڑھ گئی۔

"اس کا مطلب ہے میں لوگوں میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوچکی ہوں۔" ٹیبل کے گرد دھری کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس سوچ نے اطمینان کی ایک لہر اس کے اندر تک اتار دی اسے محسوس ہوا تقریب میں موجود اکثر افراد اسے پہچان چکے ہیں یا پہچاننے کی کوشش کررہے ہیں اس خیال کے آتے ہی اس کی گردن فخر سے اکڑ گئی وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرے بڑے تفاخر سے بیٹھی تھی کہ اچانک ہی اس کی نظر بے دھیانی میں اسٹیج پر جاپڑی جہاں رسٹ اور اورنج شرارہ سوٹ میں سمن بے حد خوبصورت دکھائی دے رہی تھی اور اس کے پہلو میں بیٹھا شاہ ویز خوشی سے کھلا جارہا تھا اس کی خوشی کا اندازہ وہ اتنے فاصلے سے بھی لگا سکتی تھی وہ جانے سمن کے کان میں ہر سیکنڈ بعد کیا کہتا تھا کہ سمن کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ ایک مکمل منظر جو کبھی اس کا نصیب نہ بن سکا پتا نہیں اس منظر میں کب تک وہ کھوئی رہتی اگر اسے سمن کی آواز نہ سنائی دیتی۔

"ارے تم یہاں کیوں بیٹھی ہو وہاں آؤ اسٹیج پر سمرن سے ملو۔" اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سمن کے ساتھ اسٹیج پر جانا پڑا جہاں تائی سیادیہ، پھوپھو اور فاریہ بھابھی بھی پہلے سے ہی موجود تھیں۔ ان تینوں خواتین کا رویہ اس سے بالکل روکھا سا تھا۔ اس نے بھی کوئی پروانہ کی اور بڑی نزاکت سے سمرن کے پاس جابیٹھی اس کے فوٹو سیشن کے فوراً بعد آرزو اور زوار بھی ایک ساتھ ہی اوپر آگئے بجی سنوری آرزو پہچانی ہی نہیں جارہی تھی پھوپھو بڑی محبت سے اس سے ملیں اور اسے لاکر سمرن کے پہلو میں بٹھادیا۔

"اصل میں کل ہی زوار اور آرزو کا نکاح ہوا ہے کیونکہ زوار کو لندن میں جاب مل گئی ہے پھوپھو اسے اکیلا بھیجنا نہیں چاہتی تھیں اسی لیے ان دونوں کا اچانک ہی نکاح ہوگیا۔" سمن آرزو کی جانب محبت سے دیکھتے ہوئے جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی لیکن اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ زوار حسن آج بھی اس کی محبت کا جوگ لیے بیٹھا ہے سمن کی فراہم کردہ اس اطلاع نے اس کی اس غلط فہمی کو یکسر ختم کردیا زوار حسن کے چہرے پر اپنی محبت کھوجتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہاں اب آرزو کا نام درج تھا وہ بے حد بددل ہوگئی اور پھر کھانا کھائے بغیر گھر واپس آگئی۔ حالانکہ اسے شہر پارا، سمرن، سمن حتیٰ کہ ارم نے بھی روکا لیکن وہ نہ مانی یہ عادت اس کی بڑی پرانی تھی جب کوئی کام کرنے کا فیصلہ کرلیتی تو کبھی بھی اس سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹتی آج بھی اس نے ایسا ہی کیا وہ جو یہ سمجھتی تھی کہ اس کا رعب حسن لوگوں کے دلوں کو اسیر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

شاہ ویز کے بعد اب زوار کا نظر انداز کیا جانا بالکل بھی برداشت نہ کرسکی اور اس رات شاید پہلی بار وہ اپنے اکیلے کمرے میں پھوٹ پھوٹ کررو دی۔

☼ ☼ ☼

آج اس کی فلم کا پریمیئر شو تھا جس میں شرکت کے لیے وہ فاضل کریم کے ساتھ آگئی تھی۔ دانش اپنے بزنس کے سلسلے میں دوبئی گیا ہوا تھا اور اگر ہوتا بھی تو کون سا اس کے ساتھ آجاتا اور اسی پریمیئر شو کے دوران اس کی ملاقات شعازل کے ہمراہ موجود مہر علی سے ہوگئی۔

"آپ نہیں جانتیں آپ سے ملاقات میرا ایک دیرینہ خواب تھا جو آج شعازل کے طفیل پورا ہوا۔" مہر علی کا بطور مذاق کیا جانے والا یہ جملہ جانے کیوں اس کے دل میں ترازو ہوگیا اسے بھی یہ سانولا سلونا، بھرے بھرے جسم والا ہینڈسم سا نوجوان اچھا لگا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی محبت دریہ کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھی۔

"شاید مجھے غلط فہمی ہوگئی ہو۔" یہ کہہ کر دریہ نے اپنے دل کے کہے کو جھٹلانا چاہا لیکن پھر بھی وہ کئی دنوں تک مہر علی سے ہونے والی اپنی اس سرسری سی ملاقات کو بھلا نہ پائی۔ حالانکہ وہ لوگوں کو اتنا عرصہ یاد رکھنے کی عادی نہ تھی۔

اس کی فلم ریلیز ضرور ہوئی لیکن باکس آفس پر کوئی خاص بزنس نہ کرسکی اور اس کی دو ہی وجوہات ہوسکتی تھیں ایک تو یہ کہ پاکستان میں فلموں کی وہ مارکیٹ ویلیو نہ رہی تھی جو کچھ عرصہ قبل تک تھی دوسرا شاید ہماری عوام اتنی باشعور ہوگئی تھی کہ فلم میں اچھی اور معیاری کہانی چاہتی تھی اور آٹھ، دس گانوں اور ڈانس کے ذریعے کسی بھی فلم کو کامیاب نہیں بنایا جاسکتا جو بھی تھا اس فلم کی ریلیز سے دریہ کو فائدہ ضرور ہوا شوبز کے حلقہ میں وہ پہچانی جانے لگی تھی۔ وہ ٹی وی کے ایک دو مارننگ شوز میں بھی بطور مہمان بلوائی گئی اور پھر اسے کچھ اشتہارات بھی مل گئے پہلے تو دل ربا نے اشتہار کرنے سے انکار کردیا اس کے خیال میں اس طرح اس کی مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہونے کا خطرہ تھا لیکن پھر دانش کے سمجھانے پر آمادہ ہوگئی اب اس نے پڑوسی ملک میں فلم حاصل کرنے کی اپنی کوشش کو مزید تیز تر کردیا۔

☼ ☼ ☼

جے آنند کا تعلق پڑوسی ملک کی انڈسٹری سے تھا دانش کی ہر ممکن کوشش تھی کہ وہ اپنی فلم میں دل ربا کو بھی کاسٹ کرے اسی سلسلے میں اس نے آج جے آنند کے اعزاز میں ایک فنکشن کا اہتمام کررکھا تھا جس کی روح رواں "دل ربا" تھی رات اس تقریب میں جب وہ شفون کی سفید ساڑھی میں نہایت مختصر بلاوز کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی تو ہر نگاہ میں اس کے لیے ستائش ہی ستائش تھی اور پھر بھیگی رات میں چند مخصوص مہمانوں کے لیے سجائی گئی اس محفل میں اس کے قیامت خیز رقص نے ایسا سماں باندھا کہ مہمان پروڈیوسر جے آنند اپنا دل اس کے قدموں پر رکھنے کے

لیے آمادہ ہوگیا۔

پھر اگلے چوبیس گھنٹے دل ربا کی زندگی میں ایسے آئے کہ اس کی پوری زندگی ہی بدل گئی دل ربا نے بطور ہیروئن جے آنند کی فلم سائن کرلی اب تو جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اگلے ہی ہفتے وہ جے آنند کے ساتھ دوبئی روانہ ہوچکی تھی جہاں اس فلم کی اوپننگ تھی یقیناً" اس کی زندگی کا وہ سنہرا دور شروع ہوچکا تھا اس کے لیے اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

دانش اسے جے آنند کے ساتھ دوبئی چھوڑ کر آج صبح کی فلائٹ سے لندن چلا گیا تھا جہاں سے اس کی واپسی تقریباً" پندرہ دن بعد تھی وہ فلم کے دیگر افراد کے ساتھ ہوٹل مون لائٹ میں مقیم تھی جے آنند کی منظور نظر ہونے کے سبب اسے یہاں بھی خاصا وی آئی پی پروٹوکول دیا جارہا تھا وہ صبح سو کر اٹھی تو جے آنند جاچکا تھا پہلے اس نے سوچا کہ ناشتا کمرے میں ہی منگوالے لیکن جانے کیا سوچ کر اپنے اس خیال کو اس نے خود ہی مسترد کردیا اور شاور لے کر جینز پر لیمن کلر کی ٹی شرٹ کے ساتھ وہ نیچے ہال میں آگئی۔

"ہیلو۔" ناشتے کی ٹرے اپنے آگے سرکا کر ابھی اس نے پلیٹ ہی اٹھائی تھی کہ ایک جانی پہچانی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی بغیر دیکھے ہی وہ جان چکی تھی کہ یہ آواز یقیناً" نشاء کی تھی جو کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ چکی تھی۔

"کیسی ہو تم؟"

"ٹھیک ہوں۔" مختصر سا جواب دے کر وہ ناشتا کرنے میں مشغول ہوگئی کہ نشاء نہایت فرصت سے اس کا جائزہ لینے کا شغل سرانجام دینے لگی۔

"آج کل تو بھئی تمہارے بڑے ٹھاٹ ہیں' سنا ہے جے آنند کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہو۔" سگریٹ سلگاتی ہوئی نشاء کی اس بات نے دل ربا کو اندر تک سلگا ڈالا۔

"تمہیں کس نے یہ غلط اطلاع فراہم کی ہے؟ تم شاید جانتی نہیں میں نے اس کی فلم سائن کی ہے جس کا معاوضہ اس نے مجھے ادا کیا ہے جو کہ میرا حق تھا۔" باوجود کوشش کے بھی وہ اپنا لہجہ دھیمانہ رکھ سکی۔

"اس معاوضے کے علاوہ میں نے ابھی تک جے آنند سے ایک روپے کا کوئی گفٹ بھی حاصل نہیں کیا۔" اپنی صفائی پیش کرکے اس نے نیپکن اٹھالیا تاکہ ہاتھ صاف کرسکے کیونکہ نشاء کی آمد نے اس کی طبیعت خاصی مکدر کردی تھی۔ اس کی بھوک بالکل ختم ہوچکی تھی۔

"بے بی یا تو تم بہت معصوم ہو یا بننے کی کوشش کررہی ہو۔" وہ ٹیبل پر آگے کی جانب جھکی اور قدرے رازدارانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"حیرت ہے تم نہیں جانتیں دانش سہگل تمہارے قیمتی وقت کی قیمت دونوں ہاتھوں سے وصول کررہا ہے وہ قیمتی وقت جو تم جے آنند کو فلم کے علاوہ دے رہی ہو۔" اس کا انداز قدرے استہزائیہ تھا جبکہ یہ دل ربا کے لیے ایک بالکل نیا انکشاف تھا۔

"غلط کہہ رہی ہو تم ایسا نہیں ہوسکتا امپاسبل۔" بے یقینی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"ہوسکتا ہے میں جھوٹ ہی کہہ رہی ہوں لیکن تمہارے پاس یقیناً" چوہدری صاحب' فاضل کریم اور اپنے دیگر چاہنے والوں کے نمبر تو ضرور ہوں گے تو ہوسکے تو ان سے رابطہ کرکے دریافت کرنا کہ دانش تمہاری اب تک کتنی قیمت وصول کرچکا ہے۔" بڑی بے دردی سے تمام حقیقت اس کے گوش گزار کرکے وہ اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ دل ربا کے جسم میں تو گویا جان ہی نہ رہی اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا اور وہ بڑی مشکل سے خود کو گھسیٹ کر کمرے تک لے کر آئی۔

اسے اس احساس نے شدت سے گھیر لیا کہ آج تک وہ دانش کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی مانند زندگی گزارتی رہی ایک ایسا کھلونا جس کی قیمت وہ دونوں ہاتھوں سے وصول کرتا رہا جبکہ وہ بے خبر ہی رہی اس احساس نے دل ربا کا دل دانش سے مکمل طور پر اچاٹ کردیا۔

"اگر مجھے کامیابی حاصل کرنی ہے تو سب سے پہلے دانش سہگل سے چھٹکارہ پانا ہوگا۔" یہ فیصلہ کرتے ہی اس کا دل مطمئن ہوگیا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے پھر بھی اسے یقین تھا کہ وہ کامیاب ضرور ہوگی کیونکہ اب وہ دریاب گل نہیں بلکہ ایک فلم اسٹار "دل ربا" تھی اسے تلاش تھی کسی ایسے ہاتھ کی جو اسے دانش کے چنگل سے باحفاظت نکال سکے۔ اور قدرت نے یہ موقع بھی اسے خود ہی فراہم کردیا جلد ہی اس کی ملاقات ایک مشہور صنعت کار راجہ بشارت سے ہوگئی راجہ صاحب کی شخصیت اور طاقت دیکھتے ہوئے دل ربا کو یقین آگیا کہ یہ ہی وہ ہاتھ ہے جو اسے دانش سہگل کے چنگل سے نکال سکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

فلم میں اس کا کام تقریباً" مکمل ہوچکا تھا اور وہ آج رات کی فلائٹ سے واپس جارہی تھی اس دو ماہ کے عرصہ میں صرف ایک بار دانش اس سے ملنے آیا اسی وقت جب وہ بنکاک میں شوٹنگ کے سلسلے میں مصروف تھی وہ دانش سے اسی طرح ملی جیسے آج تک ملتی آرہی تھی جے آنند دوبارہ ملنے کا وعدہ لے کر اسے ایئرپورٹ چھوڑ گیا تھا وہ نہایت ہی سست قدموں سے لاؤنج میں داخل ہوئی دو ماہ کی تھکن اس کے جسم پر قابض تھی فلائیٹ دو گھنٹے لیٹ تھی وہ وہیں لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی اس سامان لوڈ ہوچکا تھا جبکہ ہینڈ کیری کے طور پر ایک بیگ اس کے قریب دھرا تھا اسی طرح بیٹھے اسے جانے کتنی دیر ہوچکی تھی وہ اپنے آس پاس موجود چہروں کو خالی الذہنی سے تکتی ہوئی ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی جب اس کے قریب کوئی آکر بیٹھا۔

"ایکسکیوزمی مس۔" اس نے پلٹ کر دیکھا چالیس سال سے اوپر کا ایک مرد' جس کی صحت قابل رشک تھی نہایت قیمتی ٹی شرٹ میں ملبوس اس سے کچھ دور بیٹھا تھا۔

"کافی۔" اس نے اپنے ہاتھ میں موجود ایک دل ربا کی جانب بڑھایا۔

"نو تھینکس آپ پئیں۔"

"میں پی چکا ہوں یہ کپ آپ کے لیے ہے۔" دل ربا نے حیرت سے پلٹ کر اس کی جانب تکا۔

"دراصل میں کافی دیر سے آپ کو نوٹ کررہا ہوں۔ آپ تنہا ہیں اور شاید کچھ ڈپریسڈ بھی اسی لیے سوچا آپ کو کچھ کمپنی دی جائے۔" دل ربا کی آنکھوں میں جھانکتا سوال شاید وہ پڑھ چکا تھا اسی لیے وضاحت کرتا ہوا بولا۔ اب انکار کی گنجائش نہ تھی دل ربا نے خاموشی سے کپ تھام لیا اور آہستہ آہستہ پینے لگی حالانکہ چائے اور کافی وہ بالکل نہ پیتی تھی۔

"مجھے راجہ بشارت کہتے ہیں اور آپ؟" اس کے قریب سے آتی مہنگے ترین کلون اور پرفیوم کی خوشبو اس کے اعلا ذوق کی نشاندہی کررہی تھی۔

"دل ربا۔" اتنا ہی تعارف کافی تھا راجہ بشارت درحقیقت ایک بہت بڑا صنعت کار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی عیاش شخص تھا اسے پہلی ہی نظر میں دل ربا کے معصوم حسن نے ہی متوجہ کرلیا تھا کوئی اور وقت ہوتا تو دل ربا کبھی بھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کرتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دانش کی رضامندی کے بغیر وہ کسی شخص سے دوستی جیسا بے ضرر رشتہ بھی استوار نہیں کرسکتی تھی لیکن اب پہلے والی بات نہ تھی "نشاء" کی لگائی ہوئی آگ نے اس کے تمام جسم کو جلا کر خاکستر کرڈالا تھا اور وہ بغاوت کی آگ میں گیلی لکڑی کی مانند سلگ رہی تھی اسی جذبے نے اسے راجہ بشارت کے قریب کردیا اور راجہ بشارت کو زیادہ مشقت نہ کرنی پڑی چونکہ عورت تو ہوتی ہی شخصیت پرست ہے خصوصاً" وہ شخصیت جو تقدس کا لبادہ اوڑھ کر آئے وہ اسے کہیں کا نہیں چھوڑتی اور ایسا ہی دل ربا کے ساتھ ہوا وہ بھی راجہ بشارت کی ظاہری شخصیت سے دھوکا کھا گئی یا شاید دھوکا تو اس فیلڈ میں آتے ہی اس کا مقدر ہوچکا تھا اس کا سفر راجہ بشارت کی ہمراہی میں نہایت ہی سہل اور آرام دہ ہوگیا

راجہ نے اسے اپنا رابطہ نمبر دے دیا اور اس کا نمبر خود حاصل کرلیا تاکہ آگے ملاقاتوں کے لیے راہ ہموار ہوسکے۔

☼ ☼ ☼

"تم راجہ بشارت سے کب سے مل رہی ہو۔" وہ ابھی سو کر اٹھی تھی جب دانش زوردار آواز سے دروازہ کھولتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"پلیز آہستہ بولو میرے سر میں درد ہے۔" دانش کی بات کو مکمل طور پر نظرانداز کرتی وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی پاؤں میں سلیپر ڈالے اور اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر باتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔

"میری بات کا جواب دو پھر تم کہیں جاسکتی ہو۔" اس سے قبل کہ وہ باتھ روم کے دروازے کی ناب گھماتی طیش میں بل کھاتا ہوا دانش اس کے اور دروازے کے درمیان میں حائل ہوگیا دانش کا یہ روپ اس کے لیے بالکل انوکھا تھا۔

"تمہیں میری ذاتیات جاننے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔" دل ربا کا جواب دانش کے غیض و غضب میں اضافہ کا سبب بن گیا لیکن وہ نہایت گھاگ شخص تھا وقت کے بدلتے چہرے کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کا فن جانتا تھا۔ دریاب کا موڈ اسے بہت کچھ سمجھا گیا۔

"اختیار ہے کیونکہ میں تمہارا قانونی اور شرعی شوہر ہوں۔" اس کا لہجہ پہلے سے کافی تبدیل ہوگیا اور وہ اپنی آواز کو قدرے دھیما کرتا ہوا بولا۔

"شوہر۔" دل ربا پر ہنسی کا شدید دورہ پڑا ہنستے ہنستے اسے کھانسی ہونے لگی اور آنکھوں سے پانی بہہ نکلا وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھ گئی دانش کھسیانا سا ہوگیا۔

"شوہر' دانش صاحب آپ نے آج کیسے خود کو میرا شوہر تسلیم کرلیا۔ حیرت ہے؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ روی سے چلتی دانش کے عین مقابل آکھڑی ہوئی۔

"آپ شوہر کا مطلب جانتے ہیں؟" وہ عین اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی دانش کے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

"شوہر وہ ہوتا ہے جو اپنی بیوی کو عزت' محبت اور تحفظ فراہم کرے' خود اپنے ہاتھوں اپنی بیوی کا سودا کرنے والا آج شوہر کہلانے کا حق دار کیسے ہوگیا بولو جواب دو۔؟ تم شوہر نہیں ایک عزت دار دلال ہو نہایت ماڈرن سوسائٹی میں عزت کے ساتھ لڑکیاں سپلائی کرنے والے۔" اس نے لفظ عزت پر زور دیا۔

"بہر حال تم جو بھی ہو مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ میں اب تم جیسے نامکمل مرد کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی مجھے تم سے طلاق چاہیے۔" طلاق کا لفظ نہایت روانی سے اس کی زبان سے ادا ہوگیا اور وہ خود بھی حیران رہ گئی جبکہ دانش ابھی تک ناقابل فہم حالت میں کھڑا تھا اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ دل ربا میں اتنی بڑی تبدیلی آئی کیسے؟ وہ سخت پچھتا رہا تھا کوس رہا تھا اس وقت کو جب اس نے راجہ بشارت کے سلسلے میں دل ربا سے باز پرس کی۔

"اور ہاں۔" باتھ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ پھر رکی۔

"میرے ساتھ کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ راجہ بشارت تمہیں زمین میں زندہ ہی گاڑ دے گا۔"

وہ تیزی سے دروازہ بند کرکے باتھ روم میں گھس گئی۔

"الو کی..... میں نہ ہوتا تو دیکھتا آج کون تمہیں اپنی فلم میں سائن کرتا۔" بند دروازے کو دیکھتے ہوئے دانش نے زیر لب نہایت بے ہودہ گالیاں دیں اور باتھ روم کے دروازے کو ٹھوکر مارتا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

دل ربا آج کل راجہ بشارت کے دیے ہوئے فلیٹ میں رہائش پذیر تھی جبکہ کورٹ میں اس نے خلع کا مقدمہ بھی دائر کردیا تھا۔ دل ربا کی انڈین فلم ریلیز ہوچکی تھی جس میں اس کے کردار کو نا صرف مختصر بلکہ نہایت مسخ کرکے پیش کیا گیا تھا جس نے دیکھنے والوں پر کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا اب اس کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہ تھا سوائے راجہ بشارت کے' شوبز کے حلقوں میں اس کی پی آر اتنی نہ تھی جتنا وہ سمجھ بیٹھی تھی اب اسے احساس ہوا کہ جو بھی تھا دانش غیر محسوس انداز سے اس کے سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا یہ ہی وجہ تھی کہ آج تک اس نے اپنی ظاہری خوبصورتی کو ہی استعمال کیا تھا دماغی استعمال کا تو کبھی اسے موقع ہی نہ ملا یقیناً "کوئی ایسا پر خلوص دوست چاہیے تھا جو اس میں اس کی رہنمائی کر سکتا۔ آخر کار بہت کوشش کے بعد اسے ایک ٹیلی فلم میں کام تو ملا لیکن اسے جلد ہی یہ اندازہ ہوگیا کہ ٹی وی اس کی منزل نہیں ہے کیونکہ وہ تو ڈانس کی شیدائی تھی جبکہ ٹی وی میں اداکاری دیکھی جاتی ہے جو شاید اس کے بس کی بات نہ تھی لاکھ کوشش کے باوجود وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو سین کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب نہ ہوسکتی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ ایک ڈرامے کے بعد اس کا دل ٹی وی سے مکمل طور پر اچاٹ ہوگیا اور ایسے ہی بے زار ترین دنوں میں اسے راجہ نے ایک انوکھا مشورہ دیا۔

"تم اپنے ڈانسز کی ایک پرائیویٹ سی ڈی کیوں نہیں تیار کرکے ریلیز کرواتیں؟"

شام سے ہی راجہ اس کے فلیٹ پر تھا ابھی ابھی کے ایف سی کا نمائندہ ان کی مطلوبہ ڈیل پہنچا کر گیا تھا وہ راجہ کے پہلو میں بیٹھی اپنا پسندیدہ مشروب پینے میں مشغول تھی راجہ کا دیا ہوا مشورہ اسے ایک پل تو حیران کرگیا۔

"جانتے ہو سی ڈی کی تیاری اور ریلیز کے لیے کتنا پیسہ چاہیے۔ اور سچ یہ ہے کہ میرے پاس اگر پیسہ ہوتا تو میں اپنی ایک ذاتی فلم نہ بنالیتی۔"

"خیر فلم میں تو زیادہ سرمایہ درکار ہے اس کام میں اتنی رقم کی ضرورت نہیں پڑتی اگر تم تیار ہو تو اس سلسلے میں میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔" راجہ نے اسے نیم رضامند دیکھ کر اپنی خدمات پیش کیں اس کا کوئی ایسا جاننے والا تو تھا نہیں جس سے مشورہ کرنے کی ضرورت پیش آتی لہٰذا تھوڑے سے پس و پیش کے بعد خود ہی آمادہ ہوگئی۔

اور پھر جلد ہی اس کے رقص کی پرائیویٹ سی ڈی تیار ہو کر مارکیٹ میں آگئی اور اس سی ڈی کی تیاری اور پھر مارکیٹ میں اس کا تعارف' اس قدر مشکل اور تھکا دینے والا مرحلہ تھا کہ دل ربا نے دوبارہ ایسی غلطی نہ کرنے کا پکا فیصلہ کرلیا دوسری طرف دانش نے اپنے کیس کی بالکل بھی پیروی نہ کی اور جلد ہی اسے کورٹ سے خلع حاصل ہوگئی راجہ بشارت اپنے قیمتی وقت کی قیمت اس کی قربت سے حاصل کرکے کنارہ کش ہوچکا تھا لیکن اب دل ربا اس ماحول کی عادی ہوچکی تھی وہ جان چکی تھی کہ کچھ حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کھونا پڑتا ہے پھر کامیابی حاصل ہوتی ہے لیکن اصل مشکل تو یہ تھی کہ جو کامیابی وہ چاہتی تھی اس تک پہنچنے کے لیے اسے کوئی راستہ نہ مل رہا تھا اور اس وقت جب وہ شہرت کی بلندیوں کی جستجو میں غلاظت کی دلدل میں دھنستی جارہی تھی ایک بار پھر قسمت نے اس پر یاوری کی اور اس کی ملاقات مہر علی سے ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

"میڈم ایک کلاسیکل فلم ہے اگر آپ کام کرنا چاہیں تو میں کوشش کروں۔" سہیل باجوہ کو اس نے حال ہی میں اپنے سیکریٹری کے طور پر اپائنٹ کیا تھا اس سے قبل وہ ایک مشہور فلمی اداکارہ کے ساتھ ہوتا تھا جس کی شادی نے باجوہ کو مکمل طور پر فارغ کردیا تھا۔

"کس کی فلم ہے؟" اس نے اپنے ناخن فائل کرتے ہوئے بڑی بے نیازی سے دریافت کیا۔

"مہر علی شاید کوئی نیا پروڈیوسر ہے آپ نہیں جانتیں۔"

مہر علی کا نام سنتے ہی دل ربا کے ذہن کے پردہ اسکرین پر مسکراتی آنکھوں والا ایک نوجوان آگیا جس

سے ہونے والی کئی ماہ قبل کی ملاقات وہ آج تک نہ بھولی تھی۔

"تم ایڈووکیٹ مہر علی کی بات تو نہیں کر رہے۔" بے یقینی اس کے لہجہ سے عیاں تھی۔

"وہ مہر علی جو شاید مشہور ڈیزائنر شعانزل کا بھی دوست ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ ہی ہو آپ جانتی ہیں اسے؟" باجوہ نے سوالیہ انداز سے اس کی جانب دیکھا۔

"ہوں۔ ہو سکے تو میری اس سے ایک ملاقات کروا دو میں ہی نہیں مجھے یقین ہے وہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا ہو گا۔" اسے یقین تھا کہ مہر علی اسے نہ بھولا ہو گا اور اپنے اس ہی یقین کو جانچنے کے لیے وہ مہر علی سے ملنا چاہتی تھی اور پھر سہیل کی کوششوں کی بدولت اس کی یہ خواہش جلد ہی پوری ہو گئی مہر علی سے ہونے والی ملاقات نے اسے یقین دلا دیا کہ اس سے ملنا مہر علی کی بھی ایک ایسی خواہش تھی جو یقیناً باجوہ کے ذریعے پوری ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کلاسیکل فلم بنانے کا آئیڈیا فیض محمد کا تھا جس کا سرمایہ مہر علی نے فراہم کیا لیکن ان ہی دنوں اچانک فیض محمد کو اپنے کسی کام سے ابروڈ جانا پڑ گیا جس کی بنا پر فلم میکنگ کا یہ منصوبہ التوا کا شکار ہو گیا لیکن اس فلم کے ذریعے مہر علی اور دل ربا ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ دل ربا کو آج کئی سالوں بعد ایک حقیقی دوست کا ساتھ میسر آیا مہر علی اس کا ایک ایسا دوست تھا جسے اس کے جسم سے کوئی غرض نہ تھی اس کے نزدیک دل ربا آج بھی ایک دیوی کی حیثیت رکھتی تھی جس کی صرف پوجا کی جا سکتی ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ مہر علی عام مردوں سے ہٹ کر ایک قدرے پر خلوص مرد تھا دل ربا کے تمام حالات جان کر اسے اس لڑکی پر بہت افسوس ہوا جس نے شوبز کی جھلملاتی روشنیوں کے تعاقب میں خود کو اندھیروں کی نذر کر دیا یہ جانے بغیر کہ یہ چکا چوند ہر ایک کا نصیب نہیں ہوتی اور اب وہ اتنا منفرطے

کر چکی تھی کہ واپسی کے راستے مسدود ہو گئے تھے جلد ہی باجوہ کے مشورے پر لاہور منتقل ہو گئی۔

دانش سے طلاق کے بعد وہ اپنے موبائل کے سم تبدیل کر چکی تھی اور اس تمام عرصہ میں اس نے اپنے گھر والوں سے بالکل بھی رابطہ نہ کیا جانے کیوں اسے کبھی کبھی یہ احساس شدت سے ہوتا کہ اسے اس مقام تک پہنچانے میں زیادہ کردار اس کے ماں باپ کا ہے جن کی لاپرواہی کے سبب وہ کھرے اور کھوٹے کی پہچان بھول کر ان راہوں کی مسافر ہو گئی جہاں کوئی کسی کا نہیں ہوتا سب اپنی غرض کے بندے ہوتے ہیں نہایت مایوسی کے عالم میں اسے شدت کے ساتھ یہ احساس گھیر لیتا کہ اگر آج اس سے بے جا لاڈ پیار نہ کیا گیا ہوتا تو شاید وہ بھی ثمن، سمرن اور آرزو کی طرح گھریلو زندگی گزار رہی ہوتی لیکن اس پر مایوسی اور خود شکستگی کی یہ یلغار کچھ ہی دیر کے لیے ہوتی پھر وہ جلد ہی ان تمام خیالوں کو اپنے ذہن سے جھٹک کر خود کو اپنی موجودہ زندگی کی رنگینوں میں گم کر لیتی کیونکہ اب یہ ہی اس کا اصل تھا باقی سب تو بہت پیچھے رہ گیا تھا اور پیچھے پلٹ کر دیکھنا اسے پسند نہ تھا۔

اس دن وہ اپنا پرانا ہینڈ بیگ چیک کر رہی تھی کہ اچانک اسے اپنی پرانی سم مل گئی جانے کیا سوچ کر اس نے وہ سم موبائل میں لگائی وہاں سمرن کا ایک میسج موجود تھا جو جانے کب کا تھا۔

"مما بہت بیمار ہیں اگر ہو سکے تو ایک بار آکر مل جاؤ۔" میسج بے شک پرانا تھا لیکن پھر بھی وہ رک کر رہ نہ سکی اور پہلی ہی فلائیٹ سے کراچی آگئی ایئرپورٹ سے اسے مہر علی نے ریسیو کیا اور اپنے فلیٹ پر لے آیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد فریش ہو کر وہ مہر علی کی گاڑی اور ڈرائیور کے ہمراہ آشیانہ گل پہنچی جہاں گیٹ پر ہی اس کی مڈبھیڑ ارم سے ہو گئی جن کے ساتھ غالباً ولید تھا آٹھ نو سالہ ولید ایک خوبصورت نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا جانے کیوں اس کا دل چاہا وہ ولید کو گلے لگا کر پیار کرے لیکن وہ جانتی تھی کہ تقریباً ناممکن ہے کیونکہ ارم کے ساتھ ساتھ ولید کی

آنکھوں میں بھی وہ اپنے لیے اجنبیت اور سرد مہری دیکھ چکی تھی ارم اس کے پاس سے ایسے گزریں جیسے دیکھا ہی نہ ہو وہ بھی نہایت خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر شہر یار اکے فلور میں آگئی۔

سامنے ہی سمرن بیٹھی جانے شہر یار اسے کیا باتیں کر رہی تھی کہ یک دم ہی اس کی نگاہ دروازے پر کھڑی دل ربا پر پڑی جو آج بھی اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی اس گھر سے جاتے ہوئے، ہوتے ہیں کچھ ایسے لوگ جن پر زمانے کے سرد و گرم اپنے اثرات مرتب نہیں کرتے۔ سمرن نے دل ہی دل میں اس کی خوبصورتی کو سراہتے ہوئے اپنی کرسی خالی کر دی لیکن وہ بیڈ پر شہر یار اکے قریب ہی بیٹھ گئی شہر یار اکو جانے کیا ہوا اسے دیکھ کر خود پر ضبط نہ کر سکی اور دار یہ کو گلے لگاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی دریہ نے بڑی مشکل سے اسے خود سے دور کیا اور قریب رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کے منہ سے لگایا پانی پلا کر ٹشو سے اس کا منہ صاف کیا اور تکیے سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا اتنی دیر میں سمرن اس کے لیے جوس کا گلاس لے آئی اور بنا کچھ کہے خاموشی سے اس کے سامنے رکھی ٹیبل پر دھر دیا۔

"ممی اب جاتی ہوں شانزل جاگ گیا تو بہت روئے گا۔" اس نے دریہ کی طرف ایک نظر ڈالنا بھی گوارہ نہ کیا بات کرنا تو دور کی بات تھی۔ دریہ بھی مکمل طور پر اسے نظر انداز کر کے شہر یار اکی طرف ہی متوجہ تھی کہ یک دم ہی دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔

"کتنی دفعہ کہا ہے نیچے آؤ تو اسے..."

باقی الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے ایک دم ہی اس کی نگاہ دریہ پر پڑی دریہ نے پلٹ کر دیکھا شاہ ویز کی نگاہوں میں اپنے لیے موجود واضح نفرت اسے قدرے فاصلے سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"چلو اوپر تم..." دریہ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے اپنی گود میں موجود بے حد خوبصورت بچہ جو تقریباً ایک سال کا تھا سمرن کی گود میں ڈالا اور واپس پلٹ گیا سمرن بھی اس کے پیچھے ہی نکل گئی اب کمرے میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا سوائے سانسوں کی آواز کے

جو شہر یار اور دریہ کی تھیں اور جانے کیوں پندرہ منٹ شہر یار اکے ساتھ گزار کر جب وہ واپس آئی تو سارے راستہ اس کی نگاہوں میں رہ رہ کر گل گوتھنے سے شانزل کا چہرہ ہی آتا رہا اور شاید وہ پہلی رات تھی جس دن وہ کئی سالوں بعد اپنے گھر والوں کی یاد میں ٹوٹ کر روئی آج اسے سب کچھ بہت یاد آیا یہاں تک کہ آج پہلی بار اس نے اپنی کھوئی ہوئی عصمت اور عزت کو بھی یاد کر کے آنسو بہائے تھے۔

☆ ☆ ☆

اسٹوڈیو میں جو ایک دو فلمیں زیر تکمیل تھیں مکمل ہو گئیں اب اسٹوڈیو میں مکمل طور سے سناٹا طاری ہو گیا۔ باجوہ اپنے بھائی کے پاس دبئی چلا گیا تھا دل ربا مختلف پروڈیوسرز کے پاس چکر لگانے لگی۔ ایسا ہی ایک دن تھا جب وہ اسٹوڈیو کی لابی میں بیٹھی ملک حیات سے ملاقات کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک ہی وہاں میڈم روبی آگئی میڈم روبی ان چند لوگوں میں سے تھی جو خود کو دنیا کے ساتھ نبھانے کا فن جانتے ہیں وہ اپنے وقت کی ایک کامیاب اداکارہ بھی تھی اور اب نا صرف اسٹیج کی کامیاب اداکارہ بلکہ پروڈیوسر بھی تھی فلموں کی گرتی ہوئی ساکھ نے روبی جیسے لوگوں پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا اس کے ٹھاٹ باٹ ابھی بھی اپنے ہی شاہانہ تھے ایک نئی فلمی اداکارہ کے طور پر وہ دل ربا کو پہچانتی تھی۔

"کیا بات ہے دل ربا یہاں کیوں بیٹھی ہو۔" چلتے چلتے اچانک ہی اس کی نگاہ دل ربا پر پڑی اور اس نے اپنے بڑے سے کالے چشمے کی اوٹ سے اسے جھانکا۔

"کچھ نہیں ملک صاحب سے ملنے آئی تھی۔" اس نے اندر موجود پروڈیوسر کا نام لیا۔

"یہ تم کیا ملک صاحب کے چکروں میں پڑ گئی ہو جانتی تو ہو کہ آج کل فلموں کا دور ختم ہو گیا ہے اب کوئی بھی عقلمند سرمایہ دار فلموں پر اپنی رقم نہیں ڈبوتا چھوڑو فلم کا چکر میرے ساتھ آجاؤ میں تمہیں اسٹیج کی ملکہ بناؤں گی دیکھنا دولت اور شہرت دونوں تمہارے قدم چومیں گی اب تو اسٹیج کا دور ہے چھوڑو ان فلموں

کے چکر کو۔

"یہ میرا کارڈ رکھ لو اگر آنا چاہو تو مجھ سے رابطہ کر لینا۔" اس نے اپنی ساڑھی کے پلو کو بڑی نزاکت سے جھٹکا دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی وہ تو اپنی آفر دے کر جا چکی تھی اب فیصلہ دل ربا کو کرنا تھا۔ اور اب اس کے فیصلے عام طور پر مہر علی سے مشورے کے بعد ہوتے تھے آج بھی ایسا ہی ہوا گھر آ کر اس نے مہر علی کو فون کیا تو اس کا موبائل آف تھا گھر کے نمبر سے پتا چلا کہ وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ ایک ہفتہ تک مہر علی سے رابطہ نہ ہو سکا اب وہ مایوس ہو گئی مایوس کن حالت میں گھبرا کر اس نے میڈم روبی سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہیں سے اس پر کامیابیوں کا ایک نیا در وا ہوا اپنے ہیجان خیز رقص کی بدولت وہ تماشائیوں کے دلوں پر راج کرنے لگی اس کا رقص لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا اسے بھی اس کام میں لطف آنے لگا اس کے دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں میڈم اسے ایک معقول معاوضہ دیتی اپنے وقت کو رنگین بنانے کے لیے اس کے آس پاس کئی پروانے منڈلانے لگے تھے ان دنوں وہ مہر علی کو مکمل طور پر فراموش کر چکی تھی۔ وہ حالتِ مایوسی سے نکل گئی تھی اب ایک اور منزل اسے اپنے سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ اور اس منزل تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا' باقر درانی' جو نا صرف ایک بہت بڑا زمین دار بلکہ اعلا حکومتی عہدیدار بھی تھا۔

باقر درانی سے دل ربا نے خوب فائدہ اٹھایا باقر نے بھی دل کھول کر اس پر رقم خرچ کی۔

ان دنوں بھی وہ باقر کے ساتھ مری آئی ہوئی تھی جہاں سخت سردی میں اسے مال روڈ پر واک کرنا اچھا لگتا دو دن بھوربن پی سی میں گزارنے کے بعد وہ مری میں باقر کے کاٹیج میں قیام پذیر تھی اس شام برف باری کے بعد ایک دم ہی سردی بڑھ گئی تھی وہ فر کا کوٹ پہنے سر پر مفلر لیے باقر کے ساتھ مال روڈ پر گھوم رہی تھی جب اپنے عقب میں سنائی دینے والی آواز نے لمحہ بھر کو اسے ساکت کر دیا۔

"منع کیا تھا تمہیں کہ باہر بہت سردی ہے بیمار پڑ جاؤ گی لیکن تمہاری سمجھ میں کوئی بات آئے تب نا چلو اب جلدی واپس چلو۔" "یقیناً" یہ آواز زوار کی تھی وہ مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی اسے یقین تھا کہ آج اگر اس نے مڑ کر دیکھ لیا تو ساری زندگی پتھر کی بن کر گزار دے گی اس کے دل میں ایک تیز درد کی لہر اٹھی جس نے اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا پیچھے آنے والے اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے تھے اس نے نہایت حسرت سے دیکھا زوار کے ساتھ آرزو تھی جس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا وہ دونوں نہایت خوش و خرم تھے ایک دوسرے کو پانے کا احساس نا صرف ان کی آواز بلکہ چال سے بھی چھلک رہا تھا سب ہی ایک مکمل زندگی گزار رہے تھے ہنستی کھیلتی زندگی اور وہ خود کہاں کھڑی تھی۔ انجانے میں ہی اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

"یہ شال دیکھو کیسی ہے؟" باقر درانی نے بے حد خوبصورت پنک شال اس کے کندھوں پر ڈالتے ہوئے نہایت پیار سے پوچھا۔

"اچھی ہے۔" اس کی دھیمی آواز آنسوؤں سے رندھی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا تمہیں۔" باقر علی سخت حیران تھا۔

"میری ایک بات مانو گے۔" اسے جانے کیا ہوا ایک دم ہی باقر علی کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔

"مجھ سے شادی کر لو بے شک مجھے اپنے گھر نہ لے کر جاؤ یقین جانو میں کبھی تم سے کچھ نہ مانگوں گی پلیز تم صرف مجھ سے شادی کر لو۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"ٹھیک ہے آؤ پہلے کاٹیج چلیں پھر وہاں بات کریں گے۔" باقر علی اس کی بکھری ہوئی حالت دیکھ کر پریشان ہوا تھا اور بڑی مشکل سے اسے بہلا پھسلا کر گھر تک لایا وہ ساری رات اس نے تڑپ تڑپ کر رو کر گزار دی درانی نے اسے بہلانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر لا حاصل دوپہر دو بجے جب وہ جاگی تو رات والے کمزور لمحہ کی گرفت سے نکل چکی تھی شاور لینے کے بعد خاموشی سے اس نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا درانی بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ کے کش لگا تا ہوا

خاموشی سے اس کی ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" بالآخر اس سے رہا نہ گیا سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"لاہور۔"

"ابھی تم لاہور کیسے جا سکتی ہو جانتی ہو تمہاری مجھ سے ایک ہفتہ کی کمٹ منٹ ہے جبکہ ابھی صرف تین دن۔۔۔"

"اپنے سارے پیسے مجھ سے واپس لے لینا لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جب میں کوئی فیصلہ کر لوں تو واپس نہیں ہٹتی مجھے آج اگر لاہور جانا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آج ہی' آج سے کل ہونا میرے لیے ناممکن ہے۔" وہ تیزی سے بیگ زپ بند کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے چلی جانا میں تمہیں نہیں روک رہا لیکن پہلے کچھ کھا تو لو۔" درانی نے بڑے پیار سے اسے کندھے سے تھامتے ہوئے کہا اور دل ربا کو ہمیشہ سے درانی کی یہ ہی عادت پسند تھی وہ زبردستی کرنے کا قائل نہ تھا اور پھر رات ہونے سے قبل وہ لاہور واپس آ گئی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مری میں اس کا دوبارہ سامنا آرزو یا زوار سے ہو وہ خود میں ان سے سامنا کرنے کی ہمت نہ پاتی تھی۔

☼ ☼ ☼
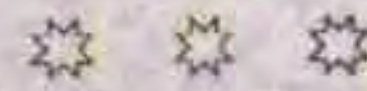
الحمرا میں لگا اس کا ڈرامہ "گجر بادشاہ" بہت ہی کامیاب جا رہا تھا اس کے ہوشربا رقص نے تماشائیوں کے دل لوٹ لیے تھے میڈم روبی اس سے بہت خوش تھیں تقریباً" دس دن کی مصروفیات کے بعد آج اس ڈرامہ کا وقفہ تھا دل ربا بہت تھک چکی تھی سارا دن ہی بے خبر سو کر گزار دیا جانے کب شام ہوئی کچھ پتا ہی نہ چلا آنکھ کھلی تو کمرے میں مکمل طور سے اندھیرا طاری تھا اور اس اندھیرے میں سیل فون کی آواز ایک عجیب ہی سماں پیش کر رہی تھی جو جانے کب سے بج رہا تھا۔

اس نے جب سے اسٹیج ڈراموں میں کام شروع کیا تھا مہر علی نے اس سے رابطہ ہی نہ رکھا تھا شروع میں تو ایک دوبارہ فون کر کے اس نے دل ربا کو منع بھی کرنے کی کوشش کی لیکن جب وہ باز نہ آئی تو وہ خاموشی سے کنارہ کش ہو گیا بغیر دیکھے ہی اس نے فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔"

"کہاں غائب ہو کب سے فون کر رہا ہوں۔" دوسری جانب درانی تھا۔

مری سے واپسی کے بعد آج کئی دن کے بعد اس کا فون آیا تھا۔

"بس سو رہی تھی۔" اس نے مختصر سا جواب دیا ابھی تک وہ اس رات کے اپنے جذباتی پن پر شرمندگی محسوس کر رہی تھی جانے درانی میرے بارے میں کیا سوچتا ہو گا یہ خیال اکثر ہی اسے جی بھر کر شرمندہ کرتا۔

"مجھ سے شادی کرو گی۔" درانی کا سوال اتنا اچانک تھا کہ وہ ایک سیکنڈ کے لیے شاکڈ ہی رہ گئی۔

"یہ یقیناً" مجھ سے مذاق کر رہا ہے۔" اس سوچ نے اسے مزید شرمندہ کیا۔

"دیکھو درانی اس رات میں۔۔۔"

"کوئی وضاحت نہیں صرف ہاں یا نہ جلدی بولو میں ایک گھنٹہ تک تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں لیکن صرف اس صورت میں جب تمہارا جواب ہاں میں ہو۔" وہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔

"ٹھیک ہے آ جاؤ۔" اسے صرف ایک پل لگا اور فیصلہ ہو گیا اور اسی رات اپنے وعدہ کے مطابق درانی نے اس سے نکاح کر لیا بے شک یہ ایک مکمل طور پر خفیہ شادی تھی لیکن اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا باقر درانی نے اس رات کی اس کی جذباتی کیفیت کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس کی بات کو اہمیت دے کر اسے "مسز باقر درانی" کا اعزاز بخشا۔

باقر چاہتا تھا کہ وہ اب ڈراموں میں کام نہ کرے لیکن چونکہ اس نے کچھ ڈراموں کا ایڈوانس لے کر ایگریمنٹ سائن کر رکھے تھے اس لیے ان میں کام کرنا ضروری تھا اور ویسے بھی میڈم روبی نے جس طرح اس

کا ساتھ دیا تھا اس کے لیے لازم تھا کہ وہ بھی ایک حد تک اس کا ساتھ دے اور آہستہ آہستہ ڈرامے چھوڑے باقر اسے اپنے ساتھ لے کر ہنی مون منانے بنکاک لے گیا جہاں سے واپس آتے ہی باقر نے اسے ایک پوش ایریے میں فرنشڈ فلیٹ خرید کر دیا اس فلیٹ کے تمام ضروری کاغذات اس کے حوالے کرتے ہوئے باقر کی صرف ایک ہی شرط تھی کہ اس فلیٹ میں باقر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص دل ربا سے ملنے نہ آئے اور اس وقت جو دل ربا کی کیفیت تھی اس کے سبب اس کے پاس کسی بھی بات سے انکار کی گنجائش ہی نہ تھی یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے باقر کی اس شرط کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کیا ویسے بھی باقر کے ساتھ نے اسے بہت خوشی بخشی تھی۔

☼ ☼ ☼

کچھ عرصہ بعد ہی زندگی پرانے ڈگر پر واپس آگئی پرانے ڈرامے ختم ہونے سے قبل ہی اس نے مزید نئے ڈرامے سائن کرلیے وہ جو کہتے ہیں کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی تو دل ربا اس کی عملی تفسیر تھی ہر بار وہ دل میں تہیہ کرتی کہ یہ اس کا آخری ڈرامہ ہے بس ایک آخری بار لیکن جلد ہی اپنا عہد توڑ کر نیا ڈرامہ سائن کرلیتی۔

شروع شروع کے جوش کے بعد درانی کا جذبہ محبت بھی کافی حد تک ماند پڑ چکا تھا اس کی بیٹی کی منگنی ہوچکی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی کے سسرال تک کوئی ایسی خبر پہنچے جس کا اثر اس کی بیٹی کی آئندہ زندگی پر پڑے یہ ہی وجہ تھی کہ دل ربا سے ملنے میں وہ مزید محتاط ہوچکا تھا پھر آہستہ آہستہ اس نے دل ربا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اس کے شروع دنوں والا والہانہ پن تقریباً ختم ہوچکا تھا شاید اس طرح کی غلطیاں درانی جیسے مردوں کی زندگی کا حصہ تھیں جنہیں کرکے بھول جانا ان کی فطرت میں شامل تھا اب دل ربا صرف اس کی ضرورت بن کر رہ گئی تھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے باقر نے ایک فلیٹ کے عوض اس کی زندگی کو گروی رکھ لیا ہو اور اسی سوچ نے ایک دفعہ پھر اس کے دل میں بغاوت کے جذبہ کو ابھار دیا یہ ہی وجہ تھی کہ جب کئی دنوں بعد باقر کو اس کی یاد آئی تو وہ سلگ ہی اٹھی وہ چاہتی تھی کہ جس طرح وہ اس کی دوری میں تڑپتی ہے باقر بھی تڑپے اور اس کی اسی سوچ کی بنا پر وہ سب کچھ ہوگیا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

رات ہی باقر کا فون آیا تھا وہ تقریباً دو دن بعد لاہور اس سے ملنے آنے والا تھا اس کے فون نے دل ربا کو کوئی دلی مسرت نہ دی اور پھر اپنے ڈرامہ کی مصروفیات میں وہ باقر کی آمد یکسر فراموش کر بیٹھی۔

☼ ☼ ☼

"اب آپ ملاقات کا شرف کب بخشیں گی۔" گاڑی سے باہر نکلتے نکلتے وہ حیدر کا سوال سن کر رک گئی اور ایک ادا سے اس کی جانب پلٹ کر دیکھا۔

"جب آپ چاہیں۔"

"ہم تو چاہیں گے کہ آج کی ملاقات ہی کبھی ختم نہ ہو۔" وہ ہنس کر بولا۔ وہ جاتے جاتے رک گئی۔

"سوچ لیں حیدر صاحب اگر آپ کی بیوی کو پتا چل گیا تو جانتے ہیں نا کیا ہوگا۔" کھنکتے لہجہ میں اس کو وارن کرتی وہ داخلی گیٹ کی جانب بڑھ گئی جبکہ حیدر اس وقت تک کھڑا اسے دیکھتا رہا جب تک داخلی گیٹ سے اندر داخل ہوکر اس نے الوداعی ہاتھ نہ ہلایا پارکنگ عبور کرکے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھی تو اسے یک دم ہی باقر یاد آگیا۔

"آج جب نور محمد نے واپس جاکر میرے نہ آنے کی اطلاع دی ہوگی تو کس قدر تڑپا ہوگا۔" یہ تصور ہی دل ربا کے لیے بڑا خوش کن تھا باقر کی بے چینی کے تصور ہی نے اسے سرشار کردیا۔

بڑی ترنگ سے اس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور برس جھلاتی اندر داخل ہوئی تو سامنے صوفہ پر بیٹھے باقر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ باقر تمام احتیاط بالائے طاق رکھ کر اس کے فلیٹ تک آجائے گا اس نے ایک نظر باقر کی جانب دیکھا جو بلوریں گلاس ہاتھ میں لیے گھونٹ گھونٹ تلخ مشروب اپنے حلق سے نیچے اتار رہا تھا سامنے رکھی بوتل تقریباً خالی ہوچکی تھی۔

"اس کا مطلب ہے یہ کافی دیر سے آیا بیٹھا ہے۔" وہ دل ہی دل میں سوچتی اسے یکسر نظر انداز کرتی اندر کمرے کی جانب بڑھی۔

"کہاں سے آرہی ہو؟" باقر کی سخت آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک دیے۔

"تم سے مطلب۔" وہ سخت چڑی ہوئی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ باقر کا استحقاق جتانا اسے ذرا اچھا نہ لگا۔

"مجھ سے مطلب نہیں تو پھر کس سے مطلب ہوگا؟" صوفے پر ہی بیٹھے بیٹھے وہ اس کا بھرپور جائزہ لیتا ہوا بولا۔

"اور یہ کون تھا جس کے ساتھ تم اتنی رات کو آئی ہو۔" اس کا اشارہ یقیناً حیدر کی جانب تھا۔

"میرا دوست۔" جواب دے کر اس نے اندر کی جانب بڑھنا چاہا، لیکن ایک دم ہی باقر اس کے سامنے آگیا۔

"تمہیں پتا تھا آج میں نے آنا ہے، پھر کیوں گئیں کسی اور کے ساتھ ہاں بولو، جواب دو کیوں گئیں؟" وہ اس کے بازو کو سختی سے تھام کر بولا۔

"میں تمہاری غلام نہیں ہوں، باقر کہ جب تمہارا دل چاہے تم میرے پاس آؤ یہ جانے بغیر کہ میرا دل کیا چاہتا ہے میں جو دن رات تنہائی کی آگ میں سلگتی رہتی ہوں تمہیں احساس ہے اس بات کا تم سے نکاح کرکے تو میں اور اکیلی ہوگئی ہوں۔" وہ غصہ کی شدت سے پھٹ ہی پڑی اور چلا کر بولی۔

"یہ تم اکیلی ہو ابھی تو اپنے کسی یار کے ساتھ عیاشی کرکے آئی ہو۔" اپنی عادت کے برخلاف وہ تیز آواز میں چیخا اس کی بڑھتی ہوئی طلب غصہ کی شکل میں ظاہر ہو رہی تھی۔

"بکواس مت کرو تم اچھی طرح جانتے ہو میں اس طرح کے انداز گفتگو کی عادی نہیں ہوں۔" جواباً وہ بھی دھاڑی۔

"اچھا ٹھیک ہے نہیں بکواس کرتا۔ چلو شاباش اندر آؤ تم جانتی ہو میں تمہارے پاس اپنے سارے غم بھولنے آتا ہوں اسی لیے چاہتا ہوں کہ جب میں آؤں تو تم صرف میرے لیے ہو صرف میرے لیے۔" وہ اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کرتا قدرے نرم لہجہ میں بولا لیکن جانے کیوں دل ربا کا دل اس کی قربت کے تصور سے ہی متلانے لگا شاید وہ تھکن سے نڈھال ہونے کے سبب باقر کی ضرورت پوری کرنے کی ہمت خود میں نہ پا رہی تھی۔ اسے باقر کی ایک ماہ کی غیر حاضری پر بھی غصہ تھا اس نے دل ہی دل میں یہ عہد کر رکھا تھا کہ باقر کو ایک دفعہ کم از کم انکار ضرور کرے گی تاکہ اسے احساس ہو کہ ضرورت پوری نہ ہونا کس قدر تکلیف دہ امر ہوتا ہے۔

"تمہیں اپنی ضرورت کا تو بہت احساس ہے کبھی میری ضرورت کا سوچا ہے تم نے اپنا پابند کرکے میری تمام ضروریات سے پردہ پوشی اختیار کر رکھی ہے۔"

"ہر مرد ایسا ہی ہوتا ہے، عورت کو اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے کب مرد اسے بلائے اور دیکھ لو آج میں صرف تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ کر آیا ہوں اب یہ دو دن میں صرف اور صرف تمہارا ہوں۔" وہ اسے کمرے کی جانب لے جاتا ہوا بولا۔

"وکی۔ وکی۔" اس نے پوری شدت سے زور لگا کر خود کو باقر کی گرفت سے چھڑانے کی ایک اور کوشش کی۔

اس نے خود کو چھڑانے کے لیے باقر کو پیچھے کی جانب دھکا دیا نشہ میں ہونے کے باعث باقر لڑکھڑا کر صوفہ پر جا گرا اس کی شدت پسندی، غصہ اور ضد نے باقر جیسے ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی کو یک دم ہی غصہ دلا دیا وہ اپنا صبر و ضبط کھو بیٹھا اور غصہ کی شدت سے اس پر پل پڑا دل ربا نے بھی اپنے بچاؤ کے لیے اس کی کمر اور منہ پر ناخن مارے لیکن جو بھی تھا ایک عورت کسی بھی طرح مرد کا مقابلہ نہیں کرسکتی، تھی تو وہ ایک نرم و نازک عورت اور باقر ایک طاقتور مرد جو نشہ میں ہونے کے باوجود اس پر حاوی ہوگیا اور اس وقت

جب وہ نڈھال دل ربا کو سر کے بالوں سے گھسیٹتا ہوا کمرے کی جانب لے جا رہا تھا جانے کیسے دل ربا کے ہاتھ میں کارپٹ پر لڑھکی ہوئی شیشے کی بوتل آگئی جو اس نے کھینچ کر باقر کو مارنی چاہی باقر تو بچ گیا لیکن ٹوٹی ہوئی بوتل کا شیشہ پورے کارپٹ پر پھیل گیا اور ایک نوکیلا ٹکڑا اچانک ہی دل ربا کے پیٹ میں گھس گیا خون کا فوارہ ابل پڑا خون دیکھتے ہی باقر کے حواس ساتھ چھوڑ گئے وہ بوکھلاہٹ میں سب کچھ ویسے ہی چھوڑ کر باہر کی جانب بھاگا۔ اور اگر کچھ دیر تک وکی واپس نہ آتا تو شاید خون کی زیادہ مقدار بہہ جانے کے سبب وہ مر ہی چکی ہوتی لیکن وکی کی بروقت آمد اس کی زندگی بچانے میں کافی مددگار ثابت ہوئی وکی گیارہ سالہ لڑکا تھا جو اس کے پاس بطور ملازم کام کرتا تھا۔ دل ربا کو خون میں نہایا دیکھ کر فوری طور پر وہ اپنے حواس کھو بیٹھا وہ جان چکا تھا کہ یہ سب کارروائی باقر صاحب کی ہے اس کے لیے اس وقت بڑا مسئلہ دل ربا کو اسپتال پہنچانے کا تھا۔

اس نے صرف ایک سیکنڈ لگایا اور سب سے پہلے میڈم روبی کو اس حادثہ کی اطلاع دی میڈم روبی کے ساتھ ہی ایمبولینس بھی پہنچ گئی اسے فوری طبی امداد کے لیے ایمرجنسی پہنچایا گیا بے شک یہ پولیس کیس تھا لیکن میڈم کے تعلقات نے دل ربا اور وکی دونوں کی مشکلوں کو قدرے آسان کردیا۔

☼ ☼ ☼

سمرن ابھی ابھی حوریہ اور علی کو ہوم ورک کروا کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ اچانک بدحواس سی شہر پارا گھبرائی ہوئی اوپر آگئی اس کے ہاتھ میں ایک فلمی اخبار تھا سمرن جانتی تھی کہ اس کی ماں شام کے علاوہ صبح شائع ہونے والے اخبارات کے بھی فلمی صفحات بڑے شوق سے پڑھتی تھی غیر شعوری طور پر وہ دل ربا سے متعلق کسی بھی خبر کی منتظر رہتی اور ایسے تمام اخبارات کو الماری میں چھپا کر رکھتی جن میں دل ربا کا نام بھی شائع ہوا ہو۔

"یہ دیکھو سمرن یہ اخبار میں کیا آیا ہے۔" گھبراہٹ کے سبب وہ بول ہی نہ پا رہی تھی سمرن کو اس کی آواز رندھی ہوئی محسوس ہوئی۔

"کیا ہو گیا ہے امی آرام سے بیٹھیں۔" سمرن نے اخبار ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ ان کی حالت اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ معاملہ خاصا سیریس ہے ان کی آواز سن کر فاریہ بھابھی اور تائی سادیہ بھی باہر نکل آئیں۔

"مشہور اسٹیج ڈانسر دل ربا اپنے فلیٹ پر شدید زخمی حالت میں پائی گئیں عام طور پر خیال کیا جا رہا ہے کہ ان کا اپنے کسی چاہنے والے سے جھگڑا ہوا ہے جس کی طرف سے کیے گئے تشدد نے انہیں اس حال تک پہنچایا ہے۔"

بے شک پچھلے کئی سالوں سے ان کا دل ربا سے کوئی تعلق نہ تھا پھر بھی انسانیت کے ناتے اس خبر نے سمرن اور فاریہ بھابھی دونوں کو ہی لمحہ بھر کے لیے دکھی کردیا۔

"ظاہر ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی' برے کا انجام برا۔" یہ تائی سادیہ تھیں جو ہمیشہ سے ہی دریہ کی آزاد خیالی کی سب سے زیادہ مخالف رہیں سمرن نے پلٹ کر خاموشی سے انہیں اندر جاتے دیکھا اور خود شہر پارا کے قریب بیٹھ گئی جو گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔

"خاموش ہو جائیں امی اللہ بہتر کرے گا۔" ظاہر ہے وہ صرف تسلی ہی دے سکتی تھی اس کے تسلی آمیز الفاظ سنتے ہی شہر پارا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"میری بچی جانے کس حال میں ہو گی تنہا' بالکل اکیلی۔" روتے روتے اچانک ہی اس نے سمرن کے ہاتھ تھام لیے۔

"خدا کے لیے سمرن مجھے اس کے پاس لے چلو میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

"میں......" سمرن گھبرا اٹھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ گھر کا کوئی بھی فرد اسے اکیلے شہر پارا کے ساتھ لاہور نہ جانے دے گا ویسے بھی اس نے خود بھی کبھی اتنا سفر اکیلے طے نہ کیا تھا۔

"آپ جانتی ہیں مجھے شاہ ویز کبھی نہیں جانے دیں گے۔"

"شاہ ویز سے میں خود بات کرلوں گی بس تم ہاں کرو۔" وہ منت بھرے لہجہ میں بولی۔

"ٹھیک ہے آپ بات کرکے دیکھ لیں۔" اور پھر اس کا خدشہ درست ثابت ہوا شاہ ویز ساری بات سنتے ہی بھڑک اٹھا۔

"سمرن تو کیا گھر کا کوئی فرد بھی اسے دیکھنے لاہور نہیں جائے گا۔" اس نے حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"بیمار کی عیادت عین ثواب ہے وہ جیسی بھی بری سہی' تھی تو ہمارا خون سمرن تم تیاری کرو شہر پارا کے ساتھ جانے کی میں ابھی تم دونوں کے ٹکٹ منگوا دیتا ہوں بلکہ میرا خیال ہے کہ شاہ ویز تم بھی ان کے ساتھ چلے جاؤ۔" تایا جی کے فیصلے نے پل بھر کو سب ہی کو حیران کردیا اور شاہ ویز جس نے اپنے گھر کے کسی بھی فرد کو کبھی دریہ سے ہمدردی کرتے نہ دیکھا تھا اپنے باپ کی بات سن کر ساکت ہی رہ گیا؟

"دیکھو بیٹا ہم کون ہوتے ہیں کسی کے گناہ پر اسے سزا دینے والے سزا اور جزا کا اختیار تو صرف اس کو ہے جو سب کا خالق و مالک ہے۔" وہ اٹھ کر شاہ ویز کے قریب آگئے اور بڑی شفقت سے اس کے دائیں کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"تمہاری نفرت بجا سہی لیکن یہ یاد رکھو جب اللہ اپنے بندوں کے بڑے سے بڑا گناہ معاف کردیتا ہے تو پھر ہمیں بھی دلوں میں بغض اور کینہ رکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے وہ اچھی ہے یا بری اس بات کا فیصلہ کرنا ہمارا تمہارا کام نہیں ہے۔"

اور اب شاہ ویز کے پاس انکار کی گنجائش بالکل نہ تھی رات ہی ان کے ٹکٹ آگئے اگلے دن صبح آٹھ بجے کی ان کی فلائیٹ تھی اسپتال کا نام اخبار میں درج تھا جسے سمرن نے نوٹ کرلیا اور اگلے ہی دن وہ تینوں اس اسپتال پہنچ گئے جہاں دریہ ایڈمٹ تھی۔

☼ ☼ ☼

باقر درانی شدید پچھتاوے کا شکار تھا۔ وہ اپنے حلقہ سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑ رہا تھا جبکہ اس کی بیٹی کی شادی بھی طے ہوچکی تھی ایسی حالت میں اس طرح کا سنگین اسکینڈل نا صرف اس کے سیاسی بلکہ خاندانی کیریئر کی دھجیاں بکھیر دیتا۔ اس اسکینڈل کو بننے سے پہلے ختم کردینا ضروری تھا اور یہ صرف اس وقت ہی ممکن ہو سکتا تھا جب دل ربا اسے معاف کردیتی۔ وہ جانتا تھا کہ دل ربا کا پولیس بیان اس کی ساری زندگی کی محنت پر پانی پھیر سکتا تھا اس کا نام اخبار کی زینت بن جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی کھوئی ہوئی عزت کو بحال نہیں کرسکتی تھی وہ میڈیا کی طاقت سے خوف زدہ تھا اس نے پہلی ہی فرصت میں میڈم روبی کے ذریعے دل ربا کو بھاری معاوضہ کے عوض اپنی زبان بندی کا پیغام بھیجا جبکہ دل ربا کا پہلے ہی کوئی ایسا ارادہ نہ تھا اس کے پیچھے کوئی ایسی طاقت نہ تھی جس کی بنا پر وہ درانی سے الجھنے کی کوشش کرتی ایسے میں درانی کی آفر قبول کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا لہٰذا دل ربا کی زبان بندی کا بھاری معاوضہ اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کردیا گیا۔

پولیس کو دیے جانے والے بیان کے مطابق یہ ڈکیتی کا واقعہ تھا جس کے دوران مزاحمت پر ڈاکوؤں نے اسے تشدد کا نشانہ بنایا' باقر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے دل ربا کے ساتھ' ساتھ پولیس کی زبان بھی بند کرچکا تھا اب اسے کوئی خطرہ نہ تھا صرف رسمی کارروائی تھی جو پوری کی جا رہی تھی دل ربا کا پیٹ کا زخم کافی گہرا تھا جس کی بنا پر وہ ابھی تک ہسپتال میں ایڈمٹ تھی نور محمد نہایت رازداری سے طلاق کے پیپرز اور حق مہر کی رقم اسے دے گیا تھا جس کے ساتھ ہی اس کے اور درانی کی درمیان موجود رشتہ دھاگے کی مانند ٹوٹ گیا۔

ابھی ابھی نرس اس کے پیٹ کی ڈریسنگ کرکے گئی تھی جس کی بنا پر وہ شدید تکلیف میں مبتلا تھی وکی گھر گیا ہوا تھا میڈم روبی بھی آج صبح ہی اس سے مل کر گئی تھی اور ظاہر ہے اب اسے ملنے کس نے آنا تھا نرس کا لایا ہوا سوپ قریبی میز پر دھرا تھا لیکن اس کا سوپ پینے

کو بالکل بھی دل نہ چاہ رہا تھا اسپتال کے سناٹے نے اس کے دل کو بوجھل سا کر دیا تھا وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی جب اچانک ہی دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔

"وکی یہ سوپ پی لو میرا دل نہیں چاہ رہا۔" یقیناً" یہ وقت وکی کے ہی آنے کا تھا اس لیے وہ بنا دیکھے چادر منہ تک لیتے ہوئے بولی۔

"ہائے میری بچی یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔" یہ آواز تو شہر یار اماں کی تھی اس نے ایک دم ہی چادر کو ہٹایا کچھ پل تو وہ بالکل ہی ساکت رہ گئی۔ اپنے سامنے موجود شہر یار' سمرن اور شاہ ویز کو دیکھ کر' کئی پل تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہے حقیقت ہے اور پھر جو وہ شہر یار کے گلے لگ کر بلک بلک کر روئی تو سنبھالی ہی نہ گئی ایک رات اسپتال میں گزار کر سمرن اور شاہ ویز اسلام آباد پھوپھو فاریہ کے گھر چلے گئے جبکہ شہر یار' دل ربا کے پاس ہی رہ گئی اس نے سمرن کو اپنا حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"جب تک یہ مکمل صحت یاب نہ ہو گی مجھے کراچی نہیں آنا۔" دل ربا بھی اپنی تنہائی سے خوف زدہ تھی اس لیے اس نے بھی شہر یار کو نہ جانے دیا دل ربا کا زخم آہستہ آہستہ بھر رہا تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھی اس زخم میں اتنی ٹیسیں اٹھتیں کہ وہ تکلیف کی شدت سے بے حال ہو جاتی فی الحال وہ رقص کے قابل نہ رہی تھی اسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی اس نے پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ کر لیا وہ چاہتی تھی کہ باقر کا دیا ہوا فلیٹ جلد از جلد بیچ کر اپنی رہائش کہیں اور اختیار کر لے فی الحال وہ لاہور چھوڑ کر نہ جا سکتی تھی کیونکہ اس کا کیس مقامی عدالت میں زیر تفتیش تھا۔

☼ ☼ ☼

ابھی ابھی وہ ہسپتال سے آئی تھی آج اس کا چیک اپ تھا وکی کچھ سودا سلف لانے قریبی مارکیٹ تک گیا ہوا تھا وہ لاؤنج میں رکھے ہوئے صوفہ پر ہی نیم دراز ہو گئی شہر یار کچن میں اس کے لیے سوپ تیار کر رہی تھی حالانکہ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کے باعث وہ کافی عرصہ سے کچن کا کام مکمل طور پر چھوڑ چکی تھی پھر بھی دل ربا کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے کچھ تیار کرنا اسے آج بھی ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگتا تھا سوپ تقریباً" تیار ہو چکا تھا اس سے قبل کہ وہ اسے باؤل میں نکالتی یک دم داخلی دروازے کی گھنٹی کی تیز آواز سنائی دی یہ یقیناً" وکی نہ تھا کیونکہ اس کے پاس گھر کی چابی موجود تھی شاید دل ربا کا کوئی جاننے والا اس کی عیادت کو آیا ہو کیونکہ اکثر و بیشتر ہی اس کے اسٹیج کا کوئی نہ کوئی ساتھی اسے دیکھنے آجاتا تھا اس نے باؤل سلیب پر رکھا اور ٹشو سے ہاتھ صاف کرتی دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھی پیچھے سے دریہ کی آواز سنائی دی۔

"دروازے کی زنجیر ہٹائے بغیر دیکھیے گا باہر کون ہے؟" اس نے دریہ کی ہدایت کی عین مطابق دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

"جی فرمائیے۔" باہر تقریباً" پینتیس سالہ ایک اجنبی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں موجود بکے اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ دل ربا سے ملنے آیا ہے اس کا قیمتی لباس اور پرفیوم کی مہک شہر یار کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

"دل ربا ہیں گھر پر۔" آنے والے نے نہایت ہی نرم لہجہ میں شہر یار سے دریافت کیا یہ آواز اور یہ لہجہ تو دریاب آج بھی لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

"مہر علی۔" اس کے لبوں سے بے آواز ادا ہوا اور وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی جانب لپکی دروازہ کھولتے ہی وہ مہر علی کے گلے لگ کر رونے لگی مہر علی یقیناً" اس کا ایک ایسا دوست تھا جس سے وہ کچھ بھی نہیں چھپا سکتی تھی۔ وہ ساری دنیا' میڈیا' پولیس سب سے جھوٹ بول سکتی تھی لیکن مہر علی کے سامنے اس نے سب کچھ اگل دیا خود پر ہونے والی زیادتی من و عن سنا ڈالی اس کی تکلیف کے احساس سے ہی مہر علی کا حساس دل دکھ اور غصہ کی زیادتی سے بھر گیا لیکن وہ بھی باقر ورانی کے خلاف کچھ نہ کر سکتا تھا۔

وہ دل ربا کی دل سے عزت کرتا تھا یہ جانتے ہوئے

بھی کہ وہ ایک ایسی عورت ہے جس کو معاشرہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا اس نے کبھی تنہائی میں بھی کوئی ایسی غیر اخلاقی حرکت نہ کی تھی جس سے دل ربا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ مہر علی کے نزدیک وہ ایک باعزت عورت نہیں ہے دل ربا مہر علی کے گھریلو حالات سے بھی مکمل طور پر واقف تھی وہ جانتی تھی۔ اس کے خاندان میں کبھی بھی کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ وہ اکیلا کہاں رہتا ہے اور سارا دن کیا کرتا پھرتا ہے؟ غرض ایسا لگتا تھا کہ اس کے گھر میں کسی کو بھی اس سے دلچسپی نہ تھی یہ تو مہر علی ہی کی شرافت تھی کہ وہ آج تک کسی غلط سرگرمی میں ملوث نہ ہوا بلکہ وہ تمام برائیاں جو اس کے خاندان کے مردوں میں بدرجہ اتم موجود تھیں مہر علی ان سے بھی ہمیشہ دور رہا اسے شراب اور شباب سے بھی کبھی دلچسپی نہ رہی لیکن جانے کیوں دل ربا کو دیکھتے ہی اس کا دل ہمیشہ اس کے ساتھ کا خواہاں رہا اس کے باوجود ان دونوں کے تعلقات ایک صاف ستھری دوستی سے آگے نہ بڑھ سکے۔

دل ربا اپنا فلیٹ بیچ چکی تھی مہر علی کی کوششوں سے اسے قریبی علاقہ میں ہی ایک اچھا فلیٹ کرائے پر مل گیا جہاں وہ شہر یار کے ساتھ شفٹ ہو گئی جب کہ مہر علی پچھلے ایک ہفتہ سے کراچی گیا ہوا تھا آج دل ربا کی عدالت میں پیشی تھی رسمی سی کارروائی نبٹا کر وہ اپنے وکیل کے ہمراہ باہر نکل رہی تھی۔ جب اس کی نگاہ مہر علی پر پڑی جو احاطے کے باہر گاڑی کا شیشہ نیچے کیے غالباً" اسی کا منتظر تھا اسے خوشگوار سی حیرت نے گھیر لیا۔

"اچھا وکیل صاحب اب اجازت دیں۔" تیزی سے کہتی ہوئی وہ گیٹ کے سامنے کھڑی گاڑی کے پاس آگئی۔

"تم کب آئے؟" ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک ہفتہ نہیں بلکہ ایک سال بعد آیا ہو۔

"آج ہی آؤ بیٹھو۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا دل ربا خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"کیا کھاؤ گی؟" اس نے ایک نگاہ دل ربا کے ڈھلے تھکے سے چہرے پر ڈالی جو مہر علی کو دیکھتے ہی کھل اٹھا تھا اس کی خوشی کا اندازہ مہر علی بھی لگا چکا تھا۔

"کڑاہی۔" مختصر سا جواب دے کر اس نے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا لی مہر علی نے اپنی گاڑی کا رخ ایک قریبی ریسٹورینٹ کی جانب موڑ لیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے یہ کیس کتنے عرصہ میں ختم ہو جائے گا۔"

"میرا خیال ہے ایک' دو پیشیاں اور ہوں گی۔" وہ سامنے رکھی ہوئی سی ڈیز نکال کر دیکھتے ہوئے بولی مہر علی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ اور پھر دل ربا نے اس کے ساتھ ایک اچھا سا لنچ کیا۔

"مما کے لیے کیا پیک کرواؤں۔" مہر علی کے منہ سے شہر یار کے لیے کہا گیا لفظ مما دل ربا کو اندر تک نہال کر گیا اسے بہت اچھا لگا مہر علی کی اپنائیت نے اس کا دل خوش کر دیا۔

"جو تمہارا دل چاہے لے لو وہ سب کچھ خوش ہو کر کھا لیتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم گاڑی میں چل کر بیٹھو میں کھانا لے کر آتا ہوں۔" وہ گاڑی کی چابی دل ربا کو دیتا ہوا بولا اور پھر جلد ہی شہر یار کے لیے لنچ پیک کروا کر لے آیا جانے کیا بات تھی واپسی کا سارا سفر اس نے خاموشی سے طے کیا دل ربا کو لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا وہ کچھ الجھا ہوا سا تھا جلد ہی دل ربا کا اپارٹمنٹ آگیا۔

"مما کو میرا سلام دینا۔" شاپر دل ربا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے وہ بولا۔

"کیوں تم اندر نہیں آؤ گے۔" وہ حیران رہ گئی۔

"میں کسی کام سے جا رہا ہوں شام کو آؤں گا۔" دل ربا مزید کچھ کہنے بنا خاموشی سے نیچے اتر آئی۔

"اللہ حافظ۔" کہتی ہوئی وہ آگے بڑھی۔

"دریہ۔" اچانک ہی اسے اپنے عقب سے مہر علی کی آواز سنائی دی آج پہلی بار اس نے دل ربا کو اس نام سے پکارا تھا وہ شاکڈ رہ گئی اس کے قدم زمین میں گڑ

لیے وہ ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکی مہر علی گاڑی سے اتر آیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آگیا۔

"دریہ مجھ سے شادی کرلو۔" وہ بولا ہی بڑا مہر علی کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ نے دریہ کو گنگ کردیا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے تیز تپتی ہوئی دھوپ میں بارش ہوگئی ہو اس کا سارا جسم محبت کی پھوار میں بھیگ گیا۔

"خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔" آج اسے اللہ کی رحمت پر یقین آہی گیا اس کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

"دریہ مجھ سے شادی کرلو یقین جانو میں بہت تنہا ہوں بالکل تمہاری طرح آؤ ہم دونوں مل کر ایک دوسرے کی تنہائیاں بانٹ لیں۔" وہ اسے کندھوں سے تھام کر بولا اور آج پہلا موقع تھا جب مہر علی نے اسے چھوا تھا وہ اس کے ہاتھوں کی حرارت سے پگھل گئی۔

"اور تمہاری بیوی۔" وہ اس قدر ہی بول پائی تھی کہ مہر علی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ گاؤں میں رہتی ہے تم میرے شہر والے گھر میں رہوگی میرے ساتھ' یقین جانو میں تمہیں پورا پورا وقت دوں گا تمہاری ہر ضرورت پوری کروں گا تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی لیکن میری صرف ایک شرط ہے تمہیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔" انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی اور نہ ہی اس کے پاس کوئی ایسا جواز تھا کہ جس کی بنا پر وہ مہر علی جیسے بندے کا دل توڑتی۔

"میں تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں لیکن مجھے کبھی دھوکہ مت دینا ورنہ یقین جانو میرا اعتبار دنیا کے ہر رشتے سے اٹھ جائے گا میں تم پر بہت مان کرتی ہوں میرا مان نہ توڑنا مہر علی ورنہ میں مرجاؤں گی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"موت کے علاوہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہیں کرسکتی یہ ایک مرد کا قول ہے۔" وہ نہایت پیار سے اس کے ہاتھ تھپتھپا کر بولا اور دل ربا کا سیروں خون بڑھ گیا۔

"میں شام میں آؤں گا باقاعدہ طور پر تم سے تمہارا ہاتھ مانگنے۔" وہ واپس پلٹتا ہوا بولا اور گیٹ سے اپارٹمنٹ تک کا فاصلہ دریہ نے ایسے طے کیا جیسے وہ ہوا پر چل رہی ہو اسی روز' رات آٹھ بجے مہر علی' شعازل اور فیض محمد کے ساتھ آگیا اپنے ساتھ وہ لوگ مٹھائی اور پھول بھی لے کر آئے تھے۔

"ہم دریہ کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔ مہر علی کے لیے۔" یہ فیض محمد تھا اور شہر یارا کو ایسا محسوس ہوا جیسے دریہ کے لیے کی جانے والی اس کی دعاؤں کو شرف قبولیت نصیب ہوگئی ہو جانے کیوں دریہ کے سلسلے میں ہمیشہ شہر یارا کو اپنا وجود گناہ گار لگتا تھا۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ دریہ سے اس کی اتنی محبت محض دنیا دکھاوے سے زیادہ نہ تھی در پردہ اس کا اصل مقصد تو شاید انتقام لینا تھا جو وہ آغا صاحب کے خاندان سے لینا چاہتی تھی لاشعوری طور پر وہ آج تک وہ الفاظ نہ بھولی تھی جو پہلی بار اس کی گل ہاؤس آمد پر آغا جی نے کہے تھے دوسروں کی نفرت اور اپنے بارے میں کہے جانے والے الفاظ تو شاید وہ فراموش کر ہی دیتی لیکن سرفراز صاحب کی بے اعتنائی اس کے دل کا ایسا ناسور تھی جس کی تسکین ہمیشہ دریہ کے حوالے سے ان سب کو پریشان دیکھ کر اسے حاصل ہوتی تھی لیکن اب وہ تھک چکی تھی اور چاہتی تھی کہ دریہ کو کوئی مضبوط سائبان مل جائے اور یقیناً" اس کی یہ خواہش مہر علی کی صورت میں پوری ہوسکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

نماز جمعہ کے بعد مقامی مسجد میں ان دونوں کے نکاح کی سادہ سی رسم ادا کی گئی جس میں فیض محمد' شعازل' شہر یارا' وکی کے علاوہ مسجد میں آنے والے چند نمازی شامل تھے جنہیں قاری صاحب نے نماز جمعہ کے بعد روک لیا تھا نکاح کے بعد مہر علی کی جانب سے مٹھائی اور چھوہارے تقسیم کیے گئے اور شاید یہ زندگی کا پہلا موقع تھا جب دریہ کے ساتھ شہر یارا نے

بھی اللہ کے حضور دو نفل شکرانے کے ادا کیے بے حد سادگی کے ساتھ کیا جانے والا یہ نکاح اس نکاح سے کہیں افضل ترین تھا جو آج سے کچھ سال قبل دریہ اور دانش کا ہوا تھا کیونکہ اس نکاح میں فریقین کا خلوص شامل تھا اور یہ بغیر کسی ذاتی مفاد کے ظہور پذیر ہوا تھا اور شادی کیا ہوتی ہے؟ اس کی دلی خوشی دریہ نے آج حقیقی معنوں میں محسوس کی تھی اور اسے یقین آگیا تھا کہ اللہ کبھی بھی اپنے بندوں کو فراموش نہیں کرسکتا بے شک وہ کتنے ہی نافرمان کیوں نہ ہوں۔

اس نے اپنا فلیٹ خالی کردیا تھا وکی جاچکا تھا آج شام کی فلائیٹ سے وہ اور شہر یارا مہر علی کے ساتھ کراچی آگئی تھیں جہاں ایئرپورٹ پر مہر علی کا ڈرائیور اور گاڑی موجود تھی بے بی پنک شلوار قمیص پر کالی چادر اوڑھے دریہ اس دل ربا سے قدرے مختلف لگ رہی تھی جسے ایک زمانہ جانتا تھا مہر علی نے کراچی کے ایک پوش علاقے میں اس کے لیے فلیٹ خرید رکھا تھا جس کی تزئین و آرائش ایک نامور ڈیکوریٹر نے کی تھی اس فلیٹ میں پہنچ کر دریہ کو گونا گوں سکون حاصل ہوا مہر علی کے ساتھ نے اسے چند ہی دنوں میں وہ اعزاز اور عزت بخش دی جو اتنے سال کی انتھک محنت اور اپنے وجود کی قربانی دے کر بھی وہ حاصل نہ کرسکی تھی سچی خوشی کیا ہوتی ہے؟ اسے اب پتا چلا' وہ خوشیوں کے ان لمحات کا پل پل کشید کرنا چاہتی تھی شاید اس لیے کہ اسے ملنے والی خوشیوں کی مدت ہمیشہ سے ہی کم ہوتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا لے آئے آپ۔" جان محمد ڈائننگ ٹیبل پر کچھ شاپرز رکھ کر جاچکا تھا جب کہ مہر علی قریبی صوفہ پر بیٹھا اپنے جوتے اتار رہا تھا دریہ ان شاپرز کو کھول کر دیکھ رہی تھی کہ وہ اس کی پشت پر آکھڑا ہوا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ میری جان' میری زندگی۔" مہر علی نے پیچھے سے اسے تھام کر اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"تھینک یو مہر علی تھینک یو سو مچ۔" اس کے پاس الفاظ نہ تھے جن سے وہ مہر علی کا شکریہ ادا کرسکتی۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ آج میری سالگرہ ہے۔"

"جن سے محبت کی جائے ان کے ہر پل کی خبر رکھنی پڑتی ہے چلو اب جلدی سے تیار ہوجاؤ کیک کاٹ کر ہم ڈنر کرنے باہر جارہے ہیں۔" وہ اس کے گال تھپتھپا کر اندر کمرے کی جانب جاتا ہوا بولا اور وہ دل سے مہر علی کی عظمت کی قائل ہوگئی۔

آج اس کی تیاری ہمیشہ سے مختلف تھی وہ بہت دل سے تیار ہوئی اس کی یہ تیاری صرف اور صرف اپنے شوہر کے لیے تھی اسے دنیا سے ستائش نہیں چاہیے تھی ریڈ اور اورنج سوٹ میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی پی سی میں داخل ہوتے ہی اسے بہت کچھ یاد آگیا یہ وہ ہوٹل تھا جہاں کسی زمانے میں اس کی ہر شام گزرتی تھی اسے دانش سہگل بھی یاد آیا اور دانش کے ساتھ گزرے ہوئے کل کی کئی تلخ یادیں اس کی آنکھیں بھگو گئیں جانے کیا بات تھی آج کل اس کا دل ذرا ذرا سی بات پر بھر آتا تھا اسے اپنے گھر والے بھی بہت یاد آتے تھے پہلے ان کا غم بھلانے کے لیے وہ تلخ مشروب کا سہارا لیتی تھی لیکن اب مہر علی کی قربت اسے تمام برائیوں سے دور لے جاچکی تھی اسے لگتا کہ اتنے سالوں کی لاحاصل کوششوں کے بعد آج اسے وہ عزت حاصل ہوئی ہے جو اس کی ماں اور بہن کا مقدر تھی آج وہ بھی ان سب کے مقابل کھڑی ہونے کی صلاحیت حاصل کرچکی تھی اور یقیناً" یہ سب کچھ مہر علی کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا۔

مہر علی کے ساتھ نے اسے احساس دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے شوہر کا مقام اتنا بلند کیوں رکھا ہے؟ یقیناً" آج اگر اللہ کے بعد کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو وہ ضرور کرتی۔ اتنا سب کچھ حاصل کرکے بھی وہ اپنے گھر والوں سے تعلق استوار نہ کرسکی بہت پہلے شہر یارا نے اسے بتایا تھا کہ ولید گھر میں اس کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا وہ نہیں چاہتا کہ کسی کو علم ہو دل ربا کبھی اس کی بہن تھی۔ وہ اس رشتہ کو مکمل طور پر فراموش کردینا چاہتا تھا اور اکلوتے بیٹے کی محبت نے ارم اور شہباز کو بھی مجبور

کرر کھا تھا کہ وہ دریہ کو بھول جائیں اور اب دریہ کے لیے ناممکن تھا کہ وہ خود سے قدم آگے بڑھاتی اپنا سب کچھ گنوا کر وہ صرف ایک چیز بچا پائی تھی اور وہ تھی اس کی "انا" یہ انا ہی تھی جس کے سبب کراچی میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے گھر والوں سے اتنی ہی دور تھی جتنی لاہور میں جہاں وہ دل ربا تھی۔ دلربا سے دریاب تک کی واپسی کا سفر بے شک وہ طے کر چکی تھی لیکن رشتوں کے معاملے میں آج بھی تنگ دست تھی اپنا وہ ماضی جو وہ دور کہیں دفنا آئی تھی شاید اس کے خاندان کی یادداشت میں زندہ تھا۔

پی سی میں مہر علی کے ساتھ کیا جانے والا کینڈل لائٹ ڈنر اس کی زندگی کے یادگار لمحوں میں سے ایک تھا جب وہ باہر نکلی تو ہوٹل کی لابی سے گزرتے ہوئے کئی سال پرانا منظر اس کی نگاہوں میں لہرا گیا جب وہ شاہ ویز کی نظروں میں ذلیل ہوئی تھی آج فرق صرف اتنا تھا کہ کل اس کے ساتھ فاضل کریم تھا اور آج اس کا شوہر مہر علی، آج وہ دنیا کی نگاہوں میں معتبر تھی۔ آج کوئی اس پر انگلی نہ اٹھا سکتا تھا اس کے اور مہر علی کے درمیان وہ ہی رشتہ تھا جو سمرن اور شاہ ویز کا تھا بغیر کسی ڈر، خوف، شرمندگی کے وہ نہایت فخر سے مہر علی کی ہمراہی میں چلتی ہوٹل سے باہر آئی۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل اس نے ایک بھرپور نظر مہر علی پر ڈالی اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں اندر بیٹھ گئی یہ جانے بغیر کہ اس کی خوش قسمتی کسی کی نظر بد کا شکار ہو گئی ہے۔

آج سے کئی سال قبل اسی ہوٹل میں جس طرح وہ شاہ ویز کی نظروں میں آئی تھی بالکل اسی طرح آج بھی وہ کسی کی نظروں میں آچکی تھی اور وہ تھا "حبیب اللہ" مہر علی کا سالا اور بہنوئی، صدوری کا بھائی "حبیب اللہ۔"

☼ ☼ ☼

حبیب اللہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ڈنر کے لیے آیا تھا کہ اچانک ہی اس کی نگاہ ریڈ اور اورنج سوٹ میں ملبوس اس خوبصورت سی لڑکی پر پڑی ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے اور اگلے ہی پل اسے یاد آچکا تھا یقیناً" یہ دل ربا تھی۔ مشہور اسٹیج ڈانسر دل ربا، جس سے اس کی ملاقات اپنے دوست عباسی کی ایک نجی محفل میں ہوئی تھی جہاں وہ بطور ڈانسر مدعو تھی جانے اس میں ایسی کیا بات تھی کہ چند سال قبل ہونے والی ایک ملاقات آج بھی حبیب اللہ کو یاد تھی ورنہ تو اس کی زندگی اتنی رنگینیوں کا مرقع تھی کہ اسے ہر گزرتی رات پچھلی رنگینی بھلا کر نئے دور، اور نئی رنگینی میں گم کر دیتی تھی۔ دل ربا کو دیکھ کر وہ حقیقی معنوں میں حیران رہ گیا یہ دل ربا اس دل ربا سے بالکل مختلف نظر آرہی تھی جس سے کبھی حبیب اللہ ملا تھا اور اگلے ہی پل حبیب اللہ کی حیرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا جب اس نے دل ربا کے پیچھے آتے مہر علی کو دیکھا جانے مہر علی نے دل ربا سے کیا کہا اس کے چہرے پر پھیلی ایک آسودہ سی مسکراہٹ حبیب اللہ کو اتنے فاصلے سے بھی دکھائی دے رہی تھی اس کی حیرانی، بے چینی میں تبدیل ہو گئی مہر علی اور دل ربا، حبیب کے لیے ایک ایسا سوال تھا جسے حل کرنا اس کے لیے لازمی ہو چکا تھا اگر مہر علی، ان کی طرح کوئی عیاش مرد ہوتا تو یقیناً" حبیب اللہ نظر انداز کر دیتا لیکن مہر علی جیسے شریف النفس بندے کے ساتھ، دل ربا۔ یہ بات یقیناً" اسے ہضم نہ ہو رہی تھی اور پھر دل ربا کی بدلی ہوئی شخصیت اسے کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی جس کا سراغ لگانا ضروری ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا کہہ رہے ہو ادا! تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ گھر جانے کے بجائے سیدھا اپنے چچا کے گھر آگیا اور فوراً" صدوری سے ملنے اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"یہ مہر علی آخری بار گاؤں کب آیا تھا؟" وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"یہ ہی کوئی ایک ماہ قبل جب حارث علی اور شیر علی اپنی چھٹیوں میں گاؤں آئے تھے۔ کیوں کیا مہر علی نے کچھ کہہ دیا تھا۔" وہ اپنے بھائی کے چہرے پر نظر ڈال کر قیاس آرائی کرتے ہوئے بولی۔

"کہنا کیا ہے بابا اس نے تو کر لیا ہے۔"

"کیا کر لیا ہے۔؟" وہ حبیب اللہ کی بات سمجھ نہ سکی۔

"شادی۔ اور کیا کرنا ہے اور وہ بھی ایک ناچنے گانے والی عورت سے۔"

وہ برا سا منہ بنا کر نفرت سے بولا۔

کچھ دیر تو صدوری منہ کھولے حیرت سے اپنے بھائی کی بات ایسے سنتی رہی ہے جیسے کچھ سمجھ ہی نہ آرہا ہو اور پھر ایک دم ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"نہیں تو سمجھی جانے مہر علی نے کیا کر دیا ہے ادا یہ کون سی نئی بات ہے یہ تو ہماری خاندانی روایات ہیں، ہمارے مردوں کی شان ہے ایک سے زیادہ شادیاں کرنا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"اور پھر کب تک رہے گی وہ ناچنے والی اس کے ساتھ ایسی عورتیں کسی ایک کھونٹے سے بندھی نہیں رہ سکتیں جلد ہی منہ کالا کر کے چلی جائے گی اور پھر مہر علی نے کہاں جانا ہے یہ سب چھوڑ کر۔" یقیناً" اس کا اشارہ جائیداد کی طرف تھا۔

"ویسے بھی ادا میں نا صرف اس کی خاندانی بیوی ہوں بلکہ اس کے دو بیٹوں کی ماں بھی ہوں اور مہر علی تو جیتا ہی اپنے بچوں کے لیے ہے۔"

اپنے بیٹوں کا ذکر کرتے ہی اک احساس تفاخر اس کے لہجہ میں در آیا لیکن حبیب اللہ کو چین نہ آیا اور ویسے بھی صدوری نہیں جانتی تھی کہ دل ربا کے سلسلے میں لگایا جانے والا اس کا اندازہ سو فیصد غلط ہے جبکہ حبیب اللہ جان چکا تھا کہ مہر علی نے دل ربا سے یہ رشتہ وقتی جذبہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہیں جوڑا وہ اس سلسلے میں مہر علی کا والہانہ لگاؤ جانچ چکا تھا اور شاید محبت کرنا مہر علی کا وہ جرم تھا جس کی سزا دل ربا نے بھگتنی تھی کیونکہ یہ اس کے نصیب میں لکھا جا چکا تھا اور نصیب کا لکھا اٹل ہے جسے گزرتا وقت بھی نہیں بدل سکتا۔

مہر علی کی دوسری شادی کی خبر اس کی دونوں بہنوں کے حواس پر بجلی بن کر گری اور انہیں سب سے پہلی فکر اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق لاحق ہو گئی وہ دونوں حبیب اللہ اور حسیب اللہ کی فطرت سے واقف تھیں، جانتی تھیں کہ وہ مہر علی کی ضد میں نا صرف دوسری شادی کر سکتے تھے بلکہ ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ یہ شادیاں ڈنکے کی چوٹ پر کرتے اور ان کی متوقع سوکن کو حویلی میں ہی لا بساتے اس سوچ نے فاطمہ اور ماروی کی راتوں کی نیند اڑا دی بلکہ فاطمہ نے تو فوراً" ہی مہر علی کو فون کر کے اس سلسلے میں باز پرس کرنے کی بھی کوشش کی۔

"مہر علی ایسا کرتے ہوئے تم ہمیں کیوں بھول گئے کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری اس غلطی کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑے گا۔" وہ حبیب اللہ سے چھوٹے حسیب اللہ کی بیوی تھی جو نا صرف غصہ کا بہت تیز بلکہ اپنی اکلوتی بہن سے بے حد محبت بھی کرتا تھا۔

"ادی تم غلط کہہ رہی ہو جو میں نے کیا وہ کوئی غلطی نہیں ہے بلکہ میرا شرعی حق ہے تمہارا میاں جو کچھ کرتا ہے میں سب جانتا ہوں لیکن تم خود بتاؤ کیا میں نے کبھی اس سے باز پرس کی؟ نہیں نا تو پھر وہ کون ہوتا ہے مجھ سے سوال کرنے والا۔"

مہر علی کو بہت کم ہی غصہ آتا تھا وہ عام طور پر دھیمے مزاج کا حامل شخص تھا۔

"تم جانتی ہو ادی اگر وہ صدوری کا بھائی ہے تو میں بھی تمہارا اور ماروی کا بھائی ہونے کے علاوہ ان کا بہنوئی بھی ہوں اور جائیداد کا بھی اتنا ہی وارث ہوں جتنے وہ، لیکن تم خود ایمانداری سے بتاؤ کہ میں نے آج تک کبھی کسی کو اس بات کا احساس دلایا؟ کبھی کسی کے ذاتی معاملے میں دخل اندازی کی نہیں نا تو پھر ان کو بھی سمجھا دینا میرے معاملے میں مت بولیں۔" یہ تو کوئی اور ہی مہر علی تھا جو مروت و لحاظ بھول چکا تھا شاید دریاب کی محبت اور ساتھ نے مہر علی کو دوسروں کے سامنے کھڑا ہونا سکھا دیا تھا وہ جان چکا تھا کہ اگر آج وہ اپنے سالوں سے ڈر گیا تو اس کا نتیجہ دریہ سے دوری کے علاوہ کچھ نہ نکلنا تھا اور یہ ہی وہ نہیں چاہتا تھا اور اسی چیز نے

اسے بے خوفی بخشی تھی دریہ جو مہر علی کے قریب ہی بیٹھی تھی یہ سب سن کر دنگ رہ گئی اسے یہ امید نہ تھی کہ مہر علی اپنے خاندان والوں کے سامنے ڈنکے کی چوٹ پر اپنی شادی کا اقرار کرے گا وہ تو آج تک اس شادی کو خفیہ ہی سمجھ رہی تھی مہر علی کے اس اقرار نے دریہ کو اس کا بے مول غلام بنادیا فاطمہ کے بعد نیاز علی کا فون آگیا وہ مہر علی سے سخت ناراض تھے۔

"بابا اس ناچنے والی کو فوراً" طلاق دے کر گاؤں واپس آؤ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" ان کے لہجہ کی گرج مہر علی کو بہت کچھ سمجھا گئی لیکن وہ بھی ان ہی کا بیٹا تھا ایک عورت کو محبت کے نام پر دھوکہ دیں کر بیچ منجدھار میں چھوڑنا اس کے مردانہ وقار کے خلاف تھا وہ دریہ سے محبت کرتا تھا سچی اور حقیقی محبت۔

"بابا جان پلیز وہ کوئی ناچنے والی نہیں ہے بلکہ میری بیوی اور آپ کی بہو ہے اگر آپ نے اس کے لیے دوبارہ کوئی ایسا لفظ استعمال کیا تو شاید آپ اپنے بیٹے کو ہمیشہ کے لیے کھودیں۔" بے شک لفظ ناچنے والی نے اس کے خون کو گرما دیا تھا پھر بھی وہ باپ کا احترام ملحوظ رکھ کر بولا۔

"اگر آئندہ آپ مجھ سے بات کریں تو پلیز دریہ کے متعلق کوئی بات نہ ہو تو بہتر ہے۔" اس نے حتمی انداز سے کہتے ہوئے بات ختم کی اور نیاز علی کو اندازہ ہو گیا کہ مہر علی کی زندگی سے اس عورت کو نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے اور اس ناممکن کو ممکن کس طرح بننا تھا اس کا فیصلہ نیاز علی نے کرنا تھا جس کے لیے مناسب وقت کا انتظار اس کی مجبوری بن گیا۔

"فی الحال اس عورت کو مہر علی کی ضد نہ بنایا جائے۔" یہ نیاز علی کا حکم تھا جبکہ صدوری اور اس کے تمام بھائی بھی اس فیصلہ سے متفق تھے وہ جان چکے تھے کہ مہر علی ضد میں آکر کچھ بھی کر سکتا تھا انہیں خدشہ تھا کہیں مہر علی جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ نہ کردے۔

"ایسی عورتیں صرف دولت کی عاشق ہوتی ہیں۔" یہ نیاز علی کی رائے تھی۔

"کسی ایک مرد کے ساتھ ساری زندگی گزارنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی مہر علی نہ سہی وہ مہر علی کو جلد ہی چھوڑ جائے گی اور ہمیں اسی وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔" وہ وقت آنے سے پہلے ہی قدرت نے دل ربا کو وہ بیش بہا خزانہ عطا کردیا جس کے لیے وہ کئی سالوں سے ترس رہی تھی اس کی سونی دھرتی پر رحمت کی وہ بارش برس گئی جس میں وہ سرتاپا بھیگ گئی اللہ نے اسے وہ معتبری بخشی جو اس سے قبل زندگی بھر اسے نصیب نہ ہوئی تھی اللہ نے اسے "ماں" کے رتبہ پر فائز کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی طبیعت کچھ دنوں سے خراب ہو رہی تھی کچھ کھانے کو دل نہ چاہتا۔ اگر جو کچھ کھالیتی تو ہضم ہی نہ ہوتا یہ ہی وجہ تھی کہ آج وہ مہر کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے آئی ہوئی تھی ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے علاوہ اس کے کچھ ٹیسٹ بھی کیے اور پھر جو خبر اسے سنائی سن کر وہ دنگ رہ گئی اسے یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ ڈاکٹر نے بتایا ہے وہ درست ہے۔

"آپ پریگننٹ ہیں۔" یہ وہ خبر تھی جس نے دریہ کو چند لمحوں کے لیے ساکت کردیا اور جب اسے ہوش آیا تو وہ خوشی سے رو ہی پڑی۔

"واقعی اللہ بہت مہربان ہے جو مجھ جیسے گناہ گار بندوں کو بھی نواز دیتا ہے۔" یہ وہ سوچ تھی جس کے زیر اثر اس دن شاید کئی سالوں بعد دریاب نے نا صرف نماز پڑھی بلکہ اللہ کے حضور دو نفل شکرانے کے بھی ادا کیے۔

اس دن وہ حقیقی معنوں میں بہت خوش تھی اور چاہتی تھی کہ اپنی یہ خوشی کسی سے شیئر کرے اور یقیناً" وہ شہر یار کے علاوہ کوئی دوسرا نہ ہو سکتا تھا شہر یار اس خبر کو سنتے ہی خوشی سے نہال ہو گیا۔

"میں جلد ہی تم سے ملنے آؤں گا اپنا خیال رکھنا۔" فون رکھنے سے قبل وہ اسے ہدایت کرنا نہ بھولا مہر علی اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتا اس سے شادی کے بعد وہ دوبارہ گاؤں جا چکا تھا جہاں اب کوئی بھی اس سے دریہ کی بابت کوئی ذکر نہ کرتا تھا پھر بھی جانے کیوں وہ یہ چاہتا تھا کہ یہ خبر اس کے خاندان تک نہ پہنچے لیکن اپنی اس کوشش میں وہ زیادہ عرصہ تک کامیاب نہ ہو سکا اور جلد ہی یہ خبر اس کے باپ اور گھر کے دیگر افراد تک پہنچ گئی جسے سنتے ہی ہر فرد ششدر رہ گیا۔

"اس کا مطلب ہے وہ دو ٹکے کی ناچنے والی ہماری بہن کے مقابل آگئی اب حیا باختہ عورتیں شرفاء کا مقابلہ کریں گی۔" حسیب اللہ غصے کی شدت سے تلملا رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دل ربا کو گولی مار کر اس سارے قصے کو ہی ختم کردیتا۔

"اگر اس عورت کا بیٹا ہو گیا تو۔" صدوری کا خدشہ اس کی زبان تک آہی گیا۔

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہوگا اب ہمیں ضرور ایسا کچھ کرنا ہوگا جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" یہ اس کا اپنا باپ تھا سگا باپ نیاز علی جس کے نزدیک بیٹے سے زیادہ زمین اہم تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ دل ربا کے ماں بننے کی صورت میں اس کی جائیداد دو حصوں میں تقسیم ہو اور یہ ہی بات صدوری کے بھائیوں کو پسند نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر بیل ہو رہی تھی۔ اس کی طبیعت صبح سے بھی بہت خراب تھی سارا دن ہو گیا اسے الٹیاں کرتے ہوئے ابھی بھی وہ باتھ روم میں ہی تھی پتا نہیں باہر کون ہے؟ یہ وقت مہر علی کے گھر آنے کا نہ تھا ویسے بھی اس کے پاس داخلی گیٹ کی چابی موجود تھی جانے کون ہے؟ یہ سوچتی ہوئی وہ نڈھال سی واش روم سے نکلی اور بے دم سی بستر پر گر گئی۔

"بی بی جی بڑی مالکن اور فاطمہ بی بی آئی ہیں آپ سے ملنے۔" ایک دم دروازہ کھول کر گھبرائی ہوئی رضیہ اندر داخل ہوئی اور آہستہ آواز میں بولی رضیہ کچھ عرصہ قبل مہر علی کے ساتھ گاؤں سے آئی تھی جسے وہ دریاب کی دیکھ بھال کے لیے لے کر آیا تھا یہ ہی وجہ تھی کہ وہ ان دونوں عورتوں سے واقف تھی۔

"کون بڑی مالکن؟" اس نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولیں۔

"وہ جی صدوری بی بی مہر سائیں کی پہلی گھر والی۔" رضیہ کا تعلق مہر علی کے گاؤں سے ہی تھا۔ اس لیے پہچان کے سلسلے میں کوئی غلطی اس سے متوقع نہ تھی۔

"صدوری۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟" دریہ نے سوچا ضرور مگر بولی نہیں۔

"تم چلو میں آتی ہوں۔" باہر جانے سے پہلے اس نے مہر علی کو فون کرکے اس کے گھر والوں کی آمد کی اطلاع دینا ضروری سمجھی اس کے نزدیک مہر علی کا باخبر ہونا ضروری تھا ویسے بھی اس وقت مہر علی کی گھر موجودگی بہت ضروری تھی وہ اکیلی ان عورتوں کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہ پا رہی تھی۔

"جانے یہ عورتیں کس ارادے سے آئی ہیں۔" یہ ہی سوچتی ہوئی وہ خاموشی سے اٹھی اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا تنقیدی جائزہ لیا وہ پہلی بار اپنے سسرال سے آئے کسی فرد کے سامنے جا رہی تھی بے شک آنے والی ہستی اس کی سوکن ہی تھی پھر بھی وہ ہر حال میں خود کو بہتر دکھنا چاہتی تھی اس وقت وہ اسکن کلر کے شوکنگ پنک کڑھائی والے ملگجے سے سوٹ میں بھی خاص خوبصورت لگ رہی تھی ممتا کا نور اس کے چہرے پر حسن بن کر جھلک رہا تھا اچھی طرح مطمئن ہو کر اس نے پنک لپ اسٹک لگائی بال بنائے ڈریسنگ سے نکال کر اپنی چوڑیاں پہنیں وہ ہر حال میں مہر علی کی خاندانی بیوی سے بڑھ کر نظر آنا چاہتی تھی ہر طرح سے مطمئن ہو کر نہایت پر اعتماد چال چلتی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔" سامنے بیٹھی عورت یقیناً" صدوری تھی جبکہ دوسری عورت یقیناً" مہر علی کی بڑی بہن تھی اس کی شکل کافی حد تک اپنے بھائی سے ملتی تھی۔

"ہائے میں صدقے جاؤں تم تو بہت خوبصورت ہو میرے اندازے سے کہیں بڑھ کر خوبصورت۔" صدوری نے اسے گلے لگا کر ماتھا چومتے ہوئے کہا اور

یہ صورت حال اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھی کیا کوئی عورت اپنی سوکن سے اس طرح بھی مل سکتی ہے؟ وہ تو خود کو ایک مختلف صورت حال کے لیے تیار کرکے یہاں تک آئی تھی اسے یقین تھا مہر علی کی بیوی ضرور اس سے لڑنے جھگڑنے آئی ہوگی اس نے حیرت سے پہلے خود کو گلے لگا کر چومتی صدوری کو دیکھا اور پھر ذرا فاصلے پر بیٹھی اس عورت کو دیکھا جو ٹانگ پر ٹانگ دھرے بڑی نخوت سے اسے ہی تک رہی تھی اس کی آنکھوں میں لہراتی واضح نفرت و حقارت اسے دور سے بھی نظر آرہی تھی۔

"میں نے تو جب سے سنا تم امید سے ہو' رہ نہ سکی' تم سے ملنے کو میرا دل تڑپ اٹھا تمہارا تو پہلا بچہ ہے پھر کوئی رشتہ دار بھی قریب نہیں' جانے اس حال میں تم کس طرح رہتی ہوگی یہ ہی سوچ کر تم سے ملنے آگئی آخر تم میرے سر کے سائیں مہر علی کے بچے کی ماں بننے والی ہو وہ بے شک مجھ سے محبت نہ کرے میں تو اس سے وابستہ ہر شے سے محبت کرتی ہوں مانو جس کو اس نے پیار سے دیکھا وہ شے میرے لیے معتبر ہوگئی۔" اپنے آنسو پونچھتی یہ عورت اسے مہر علی کی بتائے گئے تجزیہ سے قدرے مختلف لگی شاید مہر علی کو ہی کبھی اس کے پیار کا احساس ہی نہ ہوا ہو وہ یہ سوچ کر رہ گئی۔

"آپ بیٹھیں میں رضیہ کو دیکھوں کیا کر رہی ہے۔"

وہ مہر علی کی بہن کی نظروں سے قدرے خائف ہوکر بولی۔

"تم مجھے ادی یا آپا کہہ کر بلا سکتی ہو کیونکہ تم میری چھوٹی بہن جیسی ہی ہو اور رہنے دو رضیہ کو تم یہاں بیٹھو میرے پاس' اسے سب پتا ہے مہمانوں کی خاطرداری کس طرح کرتے ہیں وہ خود سب کچھ کرلے گی۔" صدوری نے اسے کندھوں سے تھام کر صوفہ پر لا بٹھایا۔

"تم تو خود اتنی بیمار اور کمزور دکھ رہی ہو کہ لگتا ہے رضیہ تمہاری کوئی دیکھ بھال نہیں کرتی۔" دریہ نے بے اختیار اس عورت کی جانب دیکھا جس نے کالی کڑھائی والی بے حد خوبصورت چادر اوڑھ رکھی تھی ناک میں پڑی بڑی سی لونگ اس کے چہرے پہ اچھی لگ رہی تھی کچھ تو ویسے ہی وہ اس سے عمر میں زیادہ تھی کچھ اس کے فربہی مائل جسم نے اس کی عمر میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا اور وہ کہیں سے بھی مہر علی جیسے بندے کی بیوی دکھائی نہ دے رہی تھی اس سب کے باوجود اس کی شخصیت بڑی بارعب نظر آرہی تھی دریہ اطمینان سے بیٹھی اس کا بھرپور جائزہ لے رہی تھی جبکہ وہ اپنے ساتھ لایا ہوا مختلف سامان رضیہ اور سکینہ کی مدد سے اٹھوا کر کچن میں رکھوا رہی تھی کہ یک دم باہر کا دروازہ کھول کر مہر علی اندر داخل ہوا' اور اندر داخل ہوتے ہی سامنے دکھائی دینے والے منظر نے اسے حیران سا کردیا وہ جانے کیا کیا قیاس آرائیاں کرتا ہوا بڑی گھبراہٹ کے عالم میں گھر تک پہنچا تھا یہاں تک کہ باہر گاڑی میں موجود ڈرائیور سے بھی اس نے سلام دعا تک نہ کی تھی وہ تو اپنے گھر میں ایک معرکہ کا تصور کرتا ہوا داخل ہوا تھا لیکن سامنے دکھائی دینے والے منظر نے اس کی پریشانی ایک لخت ختم کردیا اور وہ کافی حد تک پرسکون دکھائی دینے لگا۔

"سلام ادی۔" صدوری پر ایک نظر ڈال کر وہ فاطمہ کے سامنے جا کھڑا ہوا بھائی کو سامنے دیکھتے ہی فاطمہ تمام گلے شکوے بھلا کر کھڑی ہوئی اور نہایت سے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

"کیسے ہو میرے بھائی تمہیں تو دیکھنے کو ہماری آنکھیں ہی ترس گئیں۔ گاؤں آتے ہو تو کبھی بہنوں کی خیریت پوچھنے ان سے ملنے بھی آجایا کرو۔" اور وہ جواب میں ان کے رویے اور ناراضی پر کوئی جوابی شکوہ نہ کرسکا اس کی بہن سب کچھ بھلا کر اس کے گھر آئی تھی۔ اس خوشی سے بڑھ کر مہر علی کے لیے کوئی دوسری بات نہ تھی۔

"کچھ کھانے کا انتظام کیا ہے۔" بہن کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اس نے دریہ سے دریافت کیا۔

"ہاں رضیہ کو میں نے سب سمجھا دیا ہے وہ بنا رہی

ہے اسے پریشان نہ کرو۔" صدوری کا جواب اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھا آج تک جس صدوری سے وہ واقف تھا یہ صدوری اس سے سو فیصد مختلف تھی۔

"کھانا لگواؤ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ دریہ کی جانب دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"جی اچھا۔" اور پھر جلد ہی رضیہ نے کھانا تیار کرلیا مچھلی اور ساگ صدوری گاؤں سے لائی تھی اس کے علاوہ بریانی اور چکن کا سالن اس نے فٹافٹ تیار کرلیا جبکہ کباب پہلے سے فریزر میں موجود تھے نہایت ہی خوشگوار ماحول میں رات کا کھانا کھایا گیا صدوری گاؤں سے بہت ساری سوغات دریہ کے لیے لائی تھی جس میں بہت خوبصورت کڑھائی والے سوٹ' گرم شال اور کھانے پینے کا بے شمار سامان شامل تھا۔ اس کے پیار بھرے رویے نے دریہ کو بہت متاثر کیا اور اسے خود سے بے حد شرمندگی محسوس ہونے لگی اسے اپنا وجود مہر علی اور صدوری کے درمیان حائل ایک دیوار کی مانند لگنے لگا۔

"میرے آنے سے قبل ان دونوں کے تعلقات کون سے بہتر تھے۔" اس احساس نے اس کی شرمندگی کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کی ابھی وہ کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ حبیب اللہ آگیا۔

دریہ نے کھانا نہیں کھایا تھا کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لیے وہ قریب ہی صوفہ پر نیم دراز تھی جیسے ہی حبیب اللہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا وہ یک دم اٹھ بیٹھی اور اپنا ڈوپٹہ درست کرکے اوڑھ لیا۔

"سلام دل ربا جی کیسی ہو آپ۔" وہ بڑے انداز سے کہتا ہوا اس کے پاس ایسے آیا جیسے اسے صدیوں سے جانتا ہو اس کی اس حرکت نے دریہ کو جی بھر کر شرمندہ کیا اسے ایک دم ہی اپنا گزرا ماضی یاد آگیا۔

"یقیناً" یہ مجھ سے واقف ہے ورنہ مجھ سے اتنی بے تکلفی نہ برتتا۔" شہرت کا جنون' ایک وقتی دیوانگی اس کا ایسا گزرا ہوا کل تھا جو کہیں نہ کہیں اس سے آکر ٹکرا ہی جاتا تھا اس سے نگاہیں ہی نہ اٹھائی گئیں۔

"اس کا نام دل ربا نہیں دریاب ہے دریاب مہر علی۔" اس کے منہ سے لفظ دل ربا مہر علی کو کس قدر ناگوار گزرا تھا اس کا احساس دریہ کو مہر علی کے لہجہ سے ہی ہوگیا تھا وہ ایک دم ہی جی اٹھی اس کی آنکھیں احساس تشکر سے بھر گئیں اس نے نظر اٹھا کر مہر علی جانب دیکھا جو لب بھینچے حبیب اللہ کو تک رہا تھا۔

"اوہ دریاب علی لیکن ہم نے تو دل ربا سنا تھا چلیں ہو سکتا ہے ہمیں ہی سننے میں غلط فہمی ہوگئی ہو۔" اپنے مذاق پر خود بھی لطف اندوز ہو کر وہ کھلکھلا کر ہنس دیا اور مہر علی محض خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا سچ ہے اس معاشرے میں مرد کچھ بھی کرلے کوئی سوال نہیں کرتا لیکن عورت کا ماضی ساری عمر اس کے لیے کس طرح ایک طعنہ بن جاتا ہے یہ ہر گزرتا دن دریہ کو احساس دلاتا تھا پچھتاوے ناگ بن کر اسے ڈستے تھے کاش.....

"دریہ تم اندر جاؤ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" مہر علی غالباً" اس کی اندرونی کیفیت بھانپ چکا تھا حبیب اللہ کی موجودگی میں وہ خود کو خاصا بے چین محسوس کر رہی تھی اسی لیے بنا کوئی جواب دیئے خاموشی سے اٹھ کر اندر چلی گئی صدوری اور فاطمہ اس سے مل کر جلد ہی گاؤں واپس چلی گئیں اور جاتے جاتے صدوری نے پھر آنے کا وعدہ بھی کرلیا۔

☼ ☼ ☼

پھر وقتاً" فوقتاً" صدوری نے کئی چکر دریاب کے گھر کے لگائے یہاں تک کہ ایک دفعہ تو وہ اسے بے حد اصرار سے اپنے ساتھ گاؤں بھی لے گئی جہاں جاتے ہوئے دریہ بے حد گھبرا رہی تھی لیکن مہر علی کے ساتھ نے اسے تقویت بخشی وہ جو بے انتہا خدشوں میں گھری مہر علی کی آبائی حویلی آئی تھی یہاں کے لوگوں کا خلوص دیکھ کر جلد ہی ان اندیشوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی جو اس کے دل میں سر ابھار رہے تھے اس دن جب انہوں نے شہر واپس آنا تھا اچانک ہی حبیب اللہ' مہر علی سے ملنے حویلی آگیا۔ اسے دیکھتے ہی دریہ گھبرا سی گئی اسے لگا وہ یقیناً" اس شخص سے پہلے

بھی مل چکی ہے لیکن کہاں؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس پر زیادہ غور و خوض کر کے وہ مزید شرمندگی کی دلدل میں نہیں دھنسنا چاہتی تھی لیکن جلد ہی اس کے خیال کی تردید ہو گئی جبیب اللہ کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہ تھی اور یہ بات یقیناً اس کے لیے باعث اطمینان تھی۔

صدوری چاہتی تھی کہ اپنی ڈلیوری کے ایام دریہ حویلی میں رہ کر گزارے لیکن جانے کیوں مہر علی اس بات پر آمادہ نہ تھا شاید وہ اپنے گھر والوں پر ابھی تک اعتبار نہ کر سکا تھا اسے سب سے زیادہ حیرت اپنے باپ کے رویہ پر تھی جو دریہ سے اس طرح ملا جس طرح پیار و محبت سے وہ صدوری سے ملتا تھا دریہ کے بارے میں کہے گئے الفاظ لگتا تھا جیسے کسی اور شخص کی زبان سے ادا ہوئے ہوں کم از کم مہر علی اپنے باپ کو ضرور جانتا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کم تر لوگوں کو کبھی منہ لگانے کے قابل نہیں سمجھتا چاہے وہ دولت میں کم تر ہوں یا عزت میں اور ایسے میں دریہ سے اس کا رویہ مہر علی کو خاصا الجھا گیا یہ ہی وجہ تھی کہ سب کے بے حد اصرار پر بھی وہ دریہ کو دو دن رکھ کر اپنے ساتھ ہی کراچی واپس لایا ویسے بھی یہ ہدایت اسے شہر یار انے گاؤں جانے سے قبل کی تھی کہ وہ دریہ کو اکیلا چھوڑ کر نہ آئے وہ کچھ خوف زدہ تھی اور اپنا یہ ہی خوف اس نے مہر علی کے اندر بھی منتقل کر دیا منع تو اس نے دریہ کو بھی کیا تھا کہ وہ صدوری سے زیادہ تعلقات استوار نہ کرے بقول اس کے سوکن کی مثال اس ناگن کی سی ہے جس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا لیکن جانے کیوں دریہ نے ہر طرف سے اپنے کان بند کر رکھے تھے اس پر صدوری کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ جب سے گھر آیا تھا کچھ پریشان سا لگ رہا تھا الجھا الجھا کچھ سوچتا ہوا بڑی بے دلی سے تھوڑا سا کھانا کھایا اور اب بھی سامنے چائے کا کپ رکھے جانے کیا سوچ رہا تھا بظاہر تو اس کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر مرکوز تھیں لیکن دریہ جانتی تھی کہ اس کا دھیان کہیں اور ہے۔

"کیا بات ہے مہر آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔"

بالآخر اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ پوچھ ہی بیٹھی حالانکہ کسی بھی بات کی تفتیش اور کرید کرنا اب اس کی عادت نہ رہی تھی۔

"آں۔۔۔ ہاں کچھ نہیں۔" وہ یک دم چونک اٹھا اور خالی خالی نظروں سے دریہ کی جانب تکنے لگا۔

"آپ نہ بتانا چاہیں تو آپ کی مرضی۔" وہ کندھے اچکاتی آگے بڑھی اور مہر علی کے سامنے دھرا ٹھنڈی چائے کا کپ اٹھا لیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب مہر علی نے یہ چائے نہیں پینی مہر علی خاموشی سے اس کی جانب تکتا رہا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس کے واپس پلٹتے ہی مہر علی سے نہ رہا گیا اور ایک دم ہی اس کا آنچل تھام کر روک لیا۔

"دوسری چائے بنا لاؤں۔"

"ناراض ہو گئی ہو۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

"نہ مہر بھلا میں آپ سے ناراض ہو کر زندہ رہ سکتی ہوں۔"

جانے کیا ہوا دریہ کی آنکھیں ایک دم ہی آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"آپ تو میرے سر کے سائیں ہیں آپ ہی سے تو میری پوری دنیا آباد ہے نہ مہر میں آپ سے ناراض نہیں ہو سکتی میں تو دوسری چائے بنانے جا رہی ہوں آج رضیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ جلدی سو گئی تھی۔" اس نے گیلی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو چائے یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" مہر علی نے چائے کا کپ دریہ کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور اسے تھام کر صوفے پر لا بٹھایا اور خود بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"بات یہ ہے دریہ۔" وہ پل بھر کو رکا اور اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جو نہایت معصومیت سے اس کی جانب تک رہی تھی۔

"کون کہہ سکتا ہے یہ لڑکی ماضی کی اسٹیج ڈانسر دل ربا ہے ایک غلاظت بھری دلدل میں ڈوب کر ابھرنے والی یہ تو آج بھی ویسی ہی پاکیزہ اور معصوم ہے عام لڑکیوں جیسی ایک لڑکی۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر دریہ کی جانب دیکھا جو منتظر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"دراصل بابا جان کا چیک اپ ہے جس کے لیے انہوں نے ابروڈ جانا ہے۔" بات کرتے کرتے اس نے دریہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"پہلے بھائی منصور ان کے ساتھ جاتے تھے لیکن اب انہوں نے اپنی ذاتی مصروفیات کا بہانہ بنا کر انکار کر دیا ہے وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ وہ تم اچھی طرح جانتی ہو اسی طرح حبیب اور حسیب اللہ نے بھی منع کر دیا ہے اب ظاہر ہے ان کے ساتھ چیک اپ کے لیے کسی کو تو جانا ہی ہے اور میرے سوا کون ایسا ہے جو بابا جان کے ساتھ جائے اسی سلسلے میں شام ان کا فون آیا تھا۔" اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگاتا ہوا مہر علی آہستہ آہستہ تمام تفصیل بتاتا گیا۔

"تو اس میں اتنی پریشانی والی کیا بات ہے۔" دریہ ابھی بھی اس کی پریشانی کا سبب جان نہ پائی۔

"اس حال میں تمہیں اکیلا چھوڑنے پر میرا دل آمادہ نہیں ہو رہا تمہارے پاس کم از کم کسی ایک مرد کا ہونا ضروری ہے اگر خدانخواستہ تمہیں آدھی رات کو کوئی پرابلم پیش آجائے تو تم دونوں عورتیں کیا کرو گی بس یہ ہی سوچ کر میں پریشان ہوں گاڑی اور ڈرائیور کا ہر وقت تمہارے پاس رہنا ضروری ہے۔" وہ دریہ کے ماتھے سے بال ہٹاتا ہوا بولا۔

"بات یہ ہے کہ دریہ میں اپنے گاؤں کے کسی بھی بندے پر بھروسہ نہیں کر سکتا یہ ہی وجہ ہے کہ میں حویلی کے کسی بھی بندے کو یہاں تمہارے پاس اکیلا نہیں چھوڑ سکتا بظاہر میری ہمدردی کا دم بھرنے والے لوگ بھی اصل میں میرے باپ اور سالوں کے غلام ہیں، ان کے اشاروں پر ناچنے والے، دم ہلاتے کتے۔" وہ کسی قدر نفرت اور حقارت سے بولا۔

"میرا خیال ہے تم مما سے بات کرو، اگر وہ کچھ دن آکر رہ لیں تو میری تسلی ہو جائے گی۔"

"چلیں ٹھیک ہے میں بات تو کر لوں گی، لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ وہ آسکیں، کیونکہ ان کی شوگر ہائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جوڑوں کے عارضے میں بھی مبتلا ہیں، بہرحال کل فون کروں گی۔" اور پھر دریہ کا اندیشہ درست ثابت ہوا، شہر یار انے اپنی بیماری کے سبب آنے سے انکار کر دیا، کیونکہ وہ سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی تھی۔

"ایسا کرو تم میرے پاس آجاؤ۔" پارو کو اس سے بہتر کوئی حل نہ سوجھا۔

"نہیں مما جب اس گھر کے لوگ مجھے زندہ دفنا چکے تو میں کیوں سامنے آکر ان کی رسوائی کا سبب بنوں۔" اسے اچانک ہی ولید کی کہی بات یاد آگئی۔

"چلیں اللہ مالک ہے، خود ہی کوئی بندوبست ہو جائے گا۔" کچھ دیر ادھر ادھر کی بات کر کے اس نے فون بند کر دیا۔

"ایسا کرو تم میرے ساتھ گاؤں آجاؤ پندرہ دن کا تو مسئلہ ہے پھر تو مہر علی نے آہی جانا ہے۔" صدوری اکثر و بیشتر ہی دریہ کو فون کرتی اور گھنٹوں لمبی لمبی گفتگو کیا کرتی، جس میں زیادہ تر وہ اپنی نندوں کے شکوے بیان کرتی جن کی عیاریوں سے وہ ہمیشہ ہی خائف رہتی، جبکہ دریہ صرف ہوں ہاں ہی کرتی، کیونکہ اس کا واسطہ ابھی تک نند نامی اس رشتہ سے کھل کر نہ پڑا تھا، اسے کبھی کبھی صدوری کی باتیں سن کر احساس ہوتا کہ نندوں کی بے اعتنائی اور بہن کی غیر موجودگی نے اسے دریہ کے قریب کر دیا تھا۔ وہ شاید اپنا اور دریہ کا رشتہ بھی فراموش کر بیٹھی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ جیسے ہی اسے دریہ کا مسئلہ پتا چلا فوراً فون کر کے اسے گاؤں آنے کی آفر دے ڈالی۔

"دیکھو دریہ تمہاری طبیعت خراب ہے، اس

حالت میں اکیلی رضیہ تمہیں نہیں سنبھال سکتی' جبکہ مہر علی کے ساتھ تم نہیں جاسکتیں' اگر ممکن ہوتا تو میں تمہارے پاس آجاتی' لیکن یہ بھی ممکن نہیں' اس لیے مہر علی سے کہو تمہیں میرے پاس گاؤں چھوڑ آئے۔" جبکہ مہر علی دریہ کی بات سنتے ہی بھڑک اٹھا' وہ کسی بھی حالت میں صدوری پر اعتبار کرنے کا قائل نہ تھا۔

"تم بہت سیدھی ہو دریہ' تم صدوری کو کبھی نہیں جان سکتیں۔"

"جانے کیوں آپ ادی سے اتنی نفرت کرتے ہیں' وہ تو بہت اچھی ہیں' نرم خو اور مجھ سے محبت کرنے والی۔" دریہ بات کرتے کرتے رکی اور مہر علی کی جانب دیکھا۔

"چلیں میں ادی کو منع کردیتی ہوں' پھر آپ بتائیں میں کہاں جاؤں' میرا کون سا میکا ہے' جو مجھے اپنی آغوش میں چھپالے گا' مہر علی خود سوچیں میں اکیلی کیسے رہوں گی۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے مگر۔" مہر علی نے اس کے تھکے تھکے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔

"چلو تم تیار ہو جاؤ میں تمہیں اور رضیہ کو آج ہی گاؤں لے جاؤں گا' وہاں اپنا بہت خیال رکھنا' رات کو اچھی طرح دروازہ بند کر کے سونا' یاد رکھنا اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو گی تو ہی فائدے میں رہو گی' ورنہ تم ہماری حویلی کی روایات کو نہیں جانتیں میری جان کسی دھوکہ میں نہ آنا' اپنا بہت خیال رکھنا۔" جانے کون سی بات مہر علی کو دہلا رہی تھی اور مہر علی کی باتیں اسے الجھا رہی تھیں۔

"بھلا مجھے کوئی کیا دھوکہ دے گا۔" اس نے سوچا ضرور' لیکن مہر علی سے پوچھا نہیں اور پھر اسی رات اسے گاؤں چھوڑ کر بہت سی ہدایات دیتا ہوا مہر علی ابروڈ کے لیے روانہ ہو گیا' جہاں سے واپس تو اسے پندرہ دن بعد آجانا تھا' لیکن بابا جان کے کچھ کام کی وجہ سے اس کا قیام ایک ہفتہ مزید بڑھ گیا' دریہ کے بغیر ایک' ایک پل اسے صدیوں کا زمانہ محسوس ہو رہا تھا' آنے سے تین دن قبل اس نے دریہ کو فون کیا تو وہ بے حد خوش تھی۔

صدوری نے اس کا بہت خیال رکھا تھا' بالکل اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح۔

"مہر جب واپس آؤ تو جو کچھ میرے لیے لاؤ ادی کے لیے بھی ضرور لے کر آنا۔" فون رکھتے رکھتے وہ اسے تاکید کرنا نہ بھولی۔

"شاید میں ہی صدوری کو نہ سمجھ سکا۔" پل بھر کو اسے افسوس ہوا' صدوری کے سلسلے میں لگائے گئے اس کے تمام اندیشے غلط ثابت ہوئے' دریہ کی خوشی نے اسے بھی اندر تک مطمئن کردیا۔

☼ ☼ ☼

دو دن بعد مہر علی نے آنا تھا وہ بہت خوش تھی ایک' ایک پل اسے گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ دل چاہتا وقت پر لگا کر اڑ جائے اور مہر علی اس کے سامنے آکھڑا ہو' ابھی بھی مہر علی سے ملنے کے لیے درمیان میں اڑتالیس گھنٹوں کا وقت حائل تھا۔ صدوری اس کی یہ بے قراری کب سے نوٹ کر رہی تھی۔ لیکن کچھ بول نہ پائی' کیونکہ اس وقت اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ حسیب اللہ نے آج ہی رضیہ کو اس کے گھر واپس بھیج دیا تھا' جس کا علم دریہ کو نہ تھا' وہ تو اپنی خوشی میں مگن حویلی والوں کے بدلے رویے بھی نہ جانچ سکی' اسے پتا ہی نہ چلا کہ پندرہ دن میں ایک بار بھی حویلی نہ آنے والی اس کی نندیں آج صبح سے وہاں کیوں موجود ہیں؟ وہ تو مہر علی کی ہدایت کے مطابق اپنے کمرے میں ہی موجود تھی' اسے کیا خبر تھی کہ اس کا کمرہ ہی اس کی قتل گاہ بننے والا ہے۔

مہر علی کے بدترین اندیشے درست ثابت ہونے والے تھے' اس کے گرد ملک الموت کا پھیلایا جانے والا جال کس دیا گیا تھا۔ کاش وہ مہر علی کی بات مان لیتی' لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے تو بالکل درست کہتے ہیں۔ دریہ نے اپنا وہ بیگ کھولا ہوا تھا جس میں صدوری نے ڈھیروں ڈھیر چھوٹے چھوٹے کپڑے ڈال کر بھر دیا تھا' وہ سارے کپڑے بیڈ پر پھیلا کر بیٹھی تھی' صرف دو ماہ بعد اس کا سب سے بڑا خواب پورا

ہونے والا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی' دنیا کی سب سے بڑی اور سچی خوشی اس سے محض چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ماں بنتے ہی سب سے پہلے مہر علی کے ساتھ جاکر ارم سے ملے گی اور اپنی تمام غلطیوں' نافرمانی اور کوتاہیوں کی معافی مانگے گی' جیسے جیسے ولادت کا وقت قریب آرہا تھا اس کا دل عجیب سی کیفیات میں گھرتا جارہا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے ماں' باپ کا دل دکھا کر گناہ کبیرہ کیا ہے۔

"بس میرے اللہ مجھے خیریت سے فارغ کرنا' میں ضرور اپنے ماں' باپ سے معافی مانگوں گی۔" دل ہی دل میں پختہ ارادہ کرتی وہ بستر پر نیم دراز ہو گئی کہ ایک دم ہی اس کے نتھنوں میں پیٹرول کی تیز بو آئی' جس کی شدت سے اس کا دل متلا گیا' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے؟ شاید جنریٹر میں پیٹرول ڈالا گیا ہے۔" اس کے کمرے کی کھڑکی باہر گیلری میں کھلتی تھی جہاں ایک عدد جنریٹر رکھا ہوا تھا' اس خیال کے آتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اسے متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ باتھ روم جانے کے لیے وہ کھڑکی کے پاس سے گزری تو اچانک ہی کھڑکی کی گرل سے کسی نے اس پر سیال پھینکا بدبو مزید تیز ہو گئی' وہ سر سے پاؤں تک بھیگ گئی۔

"پیٹرول۔" اسے یہ بدبو اپنے کپڑوں سے آئی۔

"یہ مجھ پر پیٹرول کس نے ڈالا ہے۔" وہ یک دم گھبرا گئی' ایک لمحے کے ہزارویں پل میں ہی اس کی چھٹی حس نے اسے کسی خطرے کا احساس دلا دیا' وہ متلی کرنا بھول گئی اور پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگی' دروازہ کھلا ہوا تھا' وہ باہر نکل آئی' دالان میں کوئی نہ تھا' جانے کیوں وہ مزید خوف زدہ ہو گئی' اپنے وجود کو گھسیٹتی ہوئی وہ بمشکل باہر کی طرف بھاگی' جہاں صحن میں سب ہی جمع تھے' وہ بھاگتے بھاگتے صدوری کے سامنے جا کھڑی ہوئی جو بڑی خاموشی سے اس کی جانب تک رہی تھی۔

"ادی۔۔۔ ادی۔" اس کی سانس پھول گئی' اس سے بات کرنا دشوار ہو گیا' اسے لگا وہ ابھی گر جائے گی اس کے قدموں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

"یہ مجھ پر کسی نے پیٹرول پھینکا ہے۔" وہ اٹک اٹک کر اپنی بات مکمل کر گئی۔

"کسی نے نہیں ہمیں نے پھینکا ہے؟" ایک سفاک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی' اس نے پلٹ کر دیکھا یقیناً" وہ حسیب اللہ تھا ہاتھ میں تیل کا ڈبا اٹھائے ہوئے اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی کوئی وضاحت طلب کرتی' اس نے ڈبے کا سارا تیل اس کے قریب فرش پر گرا دیا' وہ جیسے ہی آگے بڑھی سلپ ہو گئی اور گرتے گرتے اس نے صدوری کے ہاتھوں میں ماچس کی ڈبیا دیکھ لی' وہ ہراساں ہو گئی' اسے صدوری کی آنکھوں میں اپنے لیے واضح نفرت اور درندگی جھلکتی نظر آرہی تھی' اور یہ ہی نفرت اور سفاکی اس سے کچھ دور کھڑے تمام افراد کے چہروں پر درج تھی' اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہ رہی' وہ اٹھ کر کھڑی بھی نہ ہو سکی' جب اس نے ماچس کی تیلی کو اپنے جانب بڑھتے دیکھا' اس کے حلق سے نکلنے والی دلدوز چیخ نہایت ہی بھیانک اور دردناک تھی جو اس حویلی کی اونچی اونچی دیواروں میں گھٹ کر دم توڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس سے پہلے کہ بچھڑ جائیں گے
دو قدم اور مرے ساتھ چلو

ابھی دیکھا نہیں جی بھر کے تمہیں
ابھی کچھ دیر مرے پاس رہو
مجھ سا پھر کوئی نہ آئے گا یہاں
روک لو مجھ کو اگر روک سکو

جانے کب کا آیا ہوا دریہ کا میسج مہر علی کئی بار پڑھ چکا تھا لیکن ہر بار پڑھنے پر وہ اسے نیا ہی محسوس ہوتا اور اس کا دل دریہ کی محبت سے سرشار ہو جاتا کراچی ایرپورٹ سے باہر نکلتے ہی اس نے ایک بار پھر دریہ کو فون کیا جانے کیوں پچھلے دو دن سے اس کا موبائل آف تھا جبکہ وہ جانتی بھی کہ آج مہر علی نے آنا ہے پھر فون کیوں آف ہے۔؟ اسی سوچ نے اسے پریشان کر رکھا تھا جبکہ باباجان کی موجودگی میں اپنی پریشانی وہ ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔

"ہو سکتا ہے بیٹری ختم ہوگئی ہو یا شاید فون ہی خراب ہو گیا ہو۔" اس خیال سے اس نے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن جانے کیوں پچھلے دو تین دنوں سے اس کا دل گھبرا رہا تھا پورے پندرہ دن اس نے روزانہ دریہ سے بات کی تھی اگر باباجان کی مصروفیت کے سبب وجہ فون نہ کر پاتا تو دریہ خود کر لیتی لیکن ان پچھلے دو دنوں سے دریہ نے اس سے رابطہ ہی نہ کیا تھا اور یہ ہی بات اس کی پریشانی بڑھانے کا سبب بن رہی تھی باہر غلام رسول گاڑی لے کر ان کا منتظر تھا وہ چاہتا تھا کہ باباجان کے ساتھ اسی وقت گاؤں روانہ ہو جائے لیکن باباجان بے حد تھکے ہوئے تھے لندن سے کراچی تک کے سفر نے انہیں تھکا دیا تھا یہ ہی وجہ تھی کہ وہ رات مہر علی کے فلیٹ پر گزار کر صبح روانہ ہونا چاہتے تھے اور مہر علی ان کی حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا ورنہ اس کے لیے تو اب ایک پل بھی دریہ کے بغیر گزارنا دشوار تھا گھر جاتے ہی نہا دھو کر فریش ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر دریہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ جو ممکن نہ ہو سکا بے شک وہ بہت تھکا ہوا تھا لیکن دریہ کی یاد نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

صبح سویرے ہی بائی روڈ وہ اپنے گاؤں کی جانب روانہ ہو گیا پانچ گھنٹوں کا یہ سفر اسے پانچ صدیاں محسوس ہو رہا تھا لیکن جانے کیا بات تھی جیسے جیسے گاؤں قریب آ رہا تھا مہر علی کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ شاید وہ اب کبھی دریہ کو نہ دیکھ سکے گا۔ اس عرصہ میں اس نے کئی بار دریہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن لاحاصل اس کا رابطہ حبیب اللہ سے ضرور ہوا لیکن وہ دریہ کے متعلق کوئی سوال نہ کر سکا۔ جیپ حویلی کی چار دیواری میں اندر داخل ہوئی تو حویلی کی چہل پہل معمول سے کچھ زیادہ تھی وہ اندر کی جانب بڑھا دالان میں بچھی دریوں پر بیٹھی عورتوں میں دریہ نہ تھی۔

"دریہ کہاں ہے؟" بالآخر اس سے صبر نہ ہو سکا اس نے صدوری سے سوال کیا جو ابھی ابھی باباجان کو کمرے میں پہنچا کر واپس آئی تھی اور صدوری کے جواب نے مہر علی کے حواس پر بجلیاں گرا دیں اسے حویلی کے در و دیوار خود پر گرتے ہوئے محسوس ہوئے صدوری کی دی ہوئی خبر نے مہر علی کو ہوش و حواس سے مکمل طور پر بیگانہ کر دیا۔

"دریہ کا سوئم......" یہ خبر تھی یا کوئی بم دھماکہ جس نے مہر علی کے پرخچے اڑا دیے اور پھر جو وہ بے ہوش ہو کر گرا تو پورا ایک ہفتہ لگا اسے مکمل طور پر ہوش میں آنے کے لیے۔

☼ ☼ ☼

جانے کیوں آج صبح سے ہی شہر یارا کا دل بہت بے چین تھا کبھی وہ اوپر جاتی کبھی نیچے ارم کے پاس آ جاتی لیکن اسے کہیں بھی سکون نہ مل رہا تھا سمرن، شاہ ویز اور بچوں کے ساتھ اسلام آباد گئی ہوئی تھی جبکہ ولید بھی ان کے ساتھ ہی تھا فاریہ اور سادیہ سے اس کی ویسے بھی کبھی نہ بنی تھی لے دے کر ارم ہی تھی جس کے پاس وہ کچھ دیر جا کر بیٹھ جاتی تھی۔

"سمرن نے کب آنا ہے؟" کبھی سمرن کے لیے اتنی بے قراری اس کے لہجے میں نہ آئی تھی جانے کیا بات تھی جو آج اسے سمرن کا بے چینی سے انتظار تھا یہ بات ارم نے محسوس تو کی لیکن کچھ بولی نہیں۔

"میرا خیال ہے کل تک آ جائیں گے آپ کو کوئی کام ہے اس سے۔" ارم غور سے شہر یارا کو دیکھتے ہوئے بولی جس کے چہرے پر چھائی بے چینی کسی انہونی کا پتا دے رہی تھی۔

"آں...... ہاں کچھ نہیں وہ اصل میں درباب کا فون پچھلے کچھ دنوں سے مسلسل بند ہے۔ بس اسی لیے میرا دل ہول رہا ہے۔" دل کا خدشہ زبان تک آ ہی گیا۔

"ہو سکتا ہے اس نے نمبر تبدیل کر لیا ہو۔" ارم اطمینان سے کہتی کپڑے تہہ کرتی رہیں۔

"اس کے میاں سے پوچھ لیں اس کا نمبر بھی تو ہو گا آپ کے پاس۔"

"نمبر تو ہے لیکن وہ یہاں نہیں ہے لندن گیا ہوا ہے دریہ بھی گاؤں اپنی سسرال میں ہے میں نے تو منع بھی کیا تھا نہ سوکن پر اعتبار کر نہ جا گاؤں میرا دل نہیں مان رہا لیکن اس نے کبھی کسی کی سنی ہو جو اب سنتی اسے تو ہمیشہ سے عادت رہی ہے اپنی من مانی کرنے کی جو دل میں آیا صرف وہ ہی کیا۔" ساری تفصیل بتاتے بتاتے شہر یارا کی آواز بھرا سی گئی اور وہ خاموشی سے اٹھ کر اوپر چلی گئی جبکہ ارم حیران سی اسے پیچھے تک دیکھتی رہیں اور پھر جلد ہی شہر یارا کی بے چینی کا راز سب پر کھل گیا۔

☼ ☼ ☼

سمرن آ گئی تھی ابھی ابھی وہ اپنے کپڑے وغیرہ الماری میں رکھ کر فارغ ہوئی تھی شہر یارا دو تین چکر لگا کر جا چکی تھی وہ جب بھی آتی سمرن کو مصروف دیکھ کر بنا کچھ کہے خاموشی سے پلٹ جاتی لیکن سمرن اس کی بے چینی بھانپ چکی تھی تیسری بار جب وہ اوپر آئی تو سمرن پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کیا بات ہے امی کوئی کام ہے آپ کو مجھ سے۔"

"ہاں ذرا درباب کا تو پتا کرو گاؤں سے آئی ہے کہ نہیں اس کا موبائل بند ہے گھر کا فون بھی کوئی نہیں اٹھا رہا۔" شہر یارا کے لہجے کا خوف سمرن کو بھی محسوس ہو چکا تھا۔

"جب اس کا فون ہی بند ہے تو کیسے پتا کروں۔"

سمرن کی بات سنتے ہی شہہ پارا نے ایک چھوٹی سی ڈائری اس کی سمت بڑھائی۔

"اس میں مہر کا نمبر ہے ملا کر دیکھو شاید وہ باہر سے آگیا ہو۔"

مہر علی نے دوسری ہی بیل پر فون ریسیو کرلیا اس نے جیسے ہی شہہ پارا کی آواز سنی بلک بلک کر رو دیا اس کا رونا شہہ پارا کو کسی انہونی کا احساس دلا رہا تھا وہ مزید خوف زدہ ہوگئی۔

"مما دریہ اب ہم میں نہیں رہی چلی گئی ہے مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر دریہ مرگئی مما۔" الفاظ تھے یا کوئی بم جو شہہ پارا کو اپنے گرد بلاسٹ ہوتا محسوس ہوا اس کے ہاتھ سے فون ہی گر گیا جبکہ اسے آگے بڑھ کر سمرن نے سنبھال لیا۔

"کیا ہوا امی خیریت تو ہے؟" وہ گھبرا اٹھی۔ اس سے پہلے کہ شہہ پارا کوئی جواب دیتی اس کا فون پھر بج اٹھا دوسری طرف یقیناً" مہر علی تھا۔ سمرن نے فوراً" فون ریسیو کیا اس سے قبل کہ وہ "ہیلو" کہتی مہر علی کی کراہتی آواز ائیر پیس سے ابھری۔

"میں لندن سے آیا تو مجھے پتا چلا دریاب جل گئی ہے مما میرے گھر والوں کا کہنا ہے کہ رضیہ کی غیر موجودگی کی بنا پر وہ بغیر کسی سے کہے چائے بنانے کچن میں گئی تھی جہاں شاید چولہا کھلا رہنے کے سبب گیس بھر چکی تھی یا ماچس جلاتے ہی اسے آگ نے پکڑ لیا رات زیادہ تھی اس لیے اس کی چیخ و پکار پر جب تک سب پہنچے وہ نوے فیصد جل چکی تھی وہ جل گئی مما اس کا جسم جل کر کوئلہ ہوگیا اور میں کچھ نہ کرسکا۔" وہ بلک بلک کر رو رہا تھا سمرن حیرت سے گنگ رہ گئی اس کے منہ سے کوئی لفظ ہی نہ نکلا وہ دکھ اور غم کی شدت سے مہر علی سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ دریاب تو چائے ہی نہ پیتی تھی پھر وہ کیوں کچن میں گئی۔؟

اس سے ملنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ چائے پینا تو درکنار اس نے تو کبھی خود سے اٹھ کر چولہا جلانے کی بھی زحمت نہ کی تھی کیونکہ وہ حد درجہ کام چور اور کاہل تھی اور پھر اس حالت میں اتنی خرابی طبیعت کے باوجود کیا مجبوری تھی جو دریاب کو آدھی رات کو کچن میں لے گئی۔ اتنے ملازمین کے ہوتے ہوئے وہ کیوں کچن میں گئی لیکن مہر علی کی مخدوش حالت کے پیش نظر وہ کچھ نہ بول سکی اس سے قبل کہ وہ خاموشی سے فون رکھ دیتی مہر علی کی آواز پھر سنائی دی اس کی آواز کا کرب سمرن کا دل ہولا رہا تھا۔

"میں نے سمجھایا تھا کہ میرے گھر والے قابل اعتبار نہیں مگر وہ نہ مانی کیونکہ وہ کبھی کسی کی نہ مانتی تھی اس نے ضدوری پر بھروسہ کیا' ضدوری سے محبت کرکے بہت غلط کیا مما آپ تو جانتی ہیں ناکہ دریاب کبھی چائے نہیں پیتی تھی ان سب نے مل کر اسے مار دیا اور میں کچھ بھی نہ کرسکا۔" مہر علی کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

"تو یہ خود بھی سب کچھ جانتا ہے' آگہی رکھتا ہے پھر تو میرا کچھ بھی کہنا بے کار ہی ہوگا۔" یہ سوچتے ہی سمرن نے خاموشی سے فون بند کردیا اور وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی اس کا دل غم کی شدت سے پھٹ رہا تھا اس کی نگاہوں کے سامنے ہنستی مسکراتی خوبصورت ترین دریاب آگئی جو اپنی خوبصورتی کا بہترین استعمال جانتی تھی جو خوبصورتی سے محبت کرتی تھی اس دریاب کا خوبصورت جسم جل کر کوئلہ بن گیا اس کے تصور میں دریاب کا جھلسا ہوا جسم اور چہرہ آگیا اسے جھرجھری سی آگئی۔

"اف میرے خدایا دنیا میں ہی سزا اور جزا کا حساب کردیا۔"

اس سوچ کے آتے ہی وہ شہہ پارا کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اسے آج احساس ہوا کہ دریاب جیسی بھی تھی ان کی اپنی تھی اور اپنوں کا دکھ انسان کو کس طرح اندر تک چیر کر رکھ دیتا ہے اس کا ادراک سمرن کو ابھی ابھی ہوا تھا دریاب کی بے بسی اور موت کی اذیت کے احساس نے سمرن کے کلیجے کو چھلنی کرکے رکھ دیا اور وہ بے ساختہ ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

☼ ☼

شگفتہ بھٹی

گوشۂ عافیت

تیرہویں اور آخری قسط

اس رات میں نماز عشاء پڑھ کے مصلّے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی تو میرا وجود مجھے ایک بے جان پتھر کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ کسی بھی طرح کے جذبات اور احساسات سے عاری۔

مدینہ منورہ جانے کی وہ آرزو جو بچپن سے میرے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی کہ کاش میں بھی مدینہ جاؤں اور ان گلیوں اور راستوں کو دیکھوں جہاں میرے پیارے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے پھرتے تھے' رہتے تھے' میں بھی ان راستوں پر چلوں' مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جالیوں کو اپنی پلکوں سے صاف کروں' میری خواہش تو یہ تھی کہ میری آنکھیں جب بارگاہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیں تو پتھر ہو جائیں' اس نظارے کے بعد کچھ اور نہ دیکھیں' لیکن مدینہ تو ابھی دور تھا۔ میں تو یہیں پر پتھر ہو گئی تھی۔ میرے سینے میں دھڑکتا دل' میرے دماغ میں سنسناتا شعور۔۔۔ میری رگوں میں بہتا لہو' کچھ بھی تو مجھے میرے ہونے کا احساس نہیں دلا رہا تھا اور میرے پتھر ہوئے وجود کو اٹھانے والے پاؤں' وہ تو تھے ہی نہیں۔ میرے پاؤں تو پل صراط کی تلوار کی دھار کی اس چمک سے ہی کٹ گئے تھے جو مجھے گزشتہ رات کے خواب میں دکھائی دی تھی۔ میرے سر پر میری بداعمالیوں کا ایک گٹھڑ تھا۔ جس کے بوجھ سے میری اکڑی رہنے والی گردن میرے سینے میں دھنس گئی تھی۔

"عصمہ!" میں جائے نماز پر بے حس و حرکت بیٹھی تھی جب نصیر احمد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے بلایا۔

"آؤ' اب لیٹ جاؤ' تھک جاؤ گی' پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے تم یوں ہی بیٹھی ہو۔" انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اٹھانا چاہا۔

"نہیں۔۔۔ میں دعا تو مانگ لوں' میں نے تو ابھی دعا بھی نہیں مانگی؟" میں نے بے بسی سے نصیر احمد کو دیکھا۔

"پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے تمہارے آنسو دعا گو ہی تو تھے۔" انہوں نے میری آنکھیں اپنی ہتھیلیوں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کیا میں رو رہی تھی؟" مجھے حیرت ہوئی کہ میں رو رہی تھی اور مجھے خود اس کا احساس نہ تھا۔

"آتش عشق ایسی ہی ہوتی ہے' ہمارے باقی سب محسوسات کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے' ہم سے ہمارا اپنا آپ چھین لیتی ہے۔ پھر نہ کوئی آرزو رہتی ہے نہ طلب۔ اگر کچھ باقی رہتا ہے تو بس اپنے محبوب کی دید کی چاہ' اسے دیکھ لینے کی تڑپ' ہم عجیب ہو جاتے ہیں اگر ہمیں عشق ہو جائے تو ہمارا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے۔ ہمارا دل' ہماری روح ایک جگہ پر آ جاتی ہیں' یہ دونوں ہماری آنکھوں میں جذب ہو کر صرف اور صرف آتش بن جاتے ہیں' ایسی آتش جو دیدار یار سے ہی ٹھنڈی پڑتی ہے۔" وہ میرا ہاتھ تھامے تھامے مجھے بیڈ پر لے آئے۔

"چلو اب تم سو جاؤ۔" انہوں نے میرا سر تکیے پر رکھا۔

"نصیر احمد!" میں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"ہاں کہو۔۔۔ بلکہ اچھا ہے آج تم اپنے دل کی بات مجھ سے کرو۔" وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گئے اور ہولے ہولے میرا سر دبانے لگے۔

"نصیر! میں مدینہ منورہ کیسے جاؤں گی۔" میری آنکھوں میں واقعی شعلے بھڑکنے لگے۔

"میرے تو پاؤں۔۔۔" میں نے اپنے پیروں کی طرف دیکھنا چاہا' پتا نہیں کیوں مجھے میرے ٹخنوں کے ساتھ پاؤں دکھائی نہ دیے تھے۔

"یہ تمہارا احساس ندامت ہے عصمہ! اور کچھ نہیں' پاؤں ہیں تمہارے پاس بس اس عظیم سرزمین کو چھونے کی قابلیت نہیں پا رہی ہو تم۔۔۔ یہ تمہارا احساس گناہ ہے اور سنو! جسے یہ احساس میسر آ جائے اس سے زیادہ خوش بخت کون ہو گا؟" نصیر احمد نے میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے' ان کی آنکھیں

نم تھیں۔ میرے اندر شرمندگی کا احساس اور بھی بڑھ گیا۔ میں ان سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ بہت ساری باتیں، بہت سارے اقرار، جن میں یہ اقرار بھی شامل تھا کہ میں ان کی مجرم ہوں۔ بہت بڑی منافق ہوں میں نے میں نے انہیں...؟

میں ان سے کہنا چاہتی ہوں، مگر میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ ہونٹ، نہ آواز میرا تو پورا وجود ہی اس وقت آنکھ بن گیا... جلتی برستی آنکھیں، اور میں نے نصیر احمد کے چہرے کو اپنی ان آنکھوں میں سمو لیا۔ تب مجھے لگا میرے اندر اولے برسنے لگے ہوں اور میرے وجود کی آگ ٹھنڈی پڑنے لگی ہو۔ اگلی سحر میری دوسری ازدواجی زندگی کی پہلی مگر حسین سحر تھی۔

☼ ☼ ☼

سعودیہ ایئر لائن کے بوئنگ نے ابھی پرنس محمد بن عبدالعزیز ایئر پورٹ کے رن وے کو نہیں چھوا تھا۔ پائلٹ باری باری جہاز کے پروں کو دائیں بائیں جھکا اور اٹھا رہا تھا اور میں شہر جاناں کے چاروں طرف بکھرے چھوٹے بڑے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ "سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک نگاہیں ان میں سے کسی نا کسی پہاڑ پر تو ضرور پڑی ہوں گی۔ ممکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے گزرے بھی ہوں اور ان پتھروں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی کا اعزاز بھی حاصل ہوا ہو۔" میرا ذہن چودہ سو سال پہلے کے منظروں سے چھلکنے لگا۔ اتنے میں اعلان ہونے لگا۔

"اترتے وقت اپنا دستی سامان ساتھ لے جانا نہ بھولیں۔"

"کیا مدینہ آگیا؟" میں نے اپنے سینے کے بائیں جانب ہاتھ رکھ کر اپنا دل ٹٹولا۔ وہ بدستور غائب تھا۔ اور میرے سر میں بھی دماغ کی خالی جگہ سائیں سائیں کر رہی تھی اور اس وقت جو کچھ بھی تھا میری آنکھیں ہی تھیں۔

"نصیر احمد!" میں نے مارے پریشانی کے نصیر احمد کا ہاتھ پکڑ لیا جو ہمارے دستی بیگ سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اپنے پیروں کو دیکھے بغیر درود شریف پڑھتی ہوئی کھڑی ہو جاؤ۔" انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھے تھپکی دی۔

"میرا ہاتھ مت چھوڑنا نصیر احمد... ورنہ میں گر پڑوں گی۔" مجھے اپنی ٹانگوں میں بے حد نقاہت اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور مجھے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت نہ مل رہی تھی۔

"تم میرا ہاتھ پکڑے رکھنے کی خواہش کو زندہ رکھنا۔ میں تو اپنے عہد میں کھرا ہوں۔" نصیر احمد نے ذو معنی انداز میں کہا۔ مگر مجھے اس وقت ان کی کسی بات کا مفہوم سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میری سمجھ، میری دانش تو اس لمحے ویسے بھی میرے پاس نہ تھی۔ اگلے چند منٹوں میں ہم محمد بن عبدالعزیز ایئر پورٹ کے شان دار لاؤنج میں کھڑے تھے۔ اور پھر جلد ہی ایک ٹیکسی میں سوار مدینہ منورہ کی سڑکوں پر رواں دواں تھے۔

"دیکھا! تم مدینے میں آگئی ہو۔ تم ایسے ہی کہتی رہتی تھیں کہ میں اس لائق کہاں کہ کبھی مدینہ جاؤں۔ میں کیسے جاؤں گی، میرے تو پاؤں ہی نہیں۔" نصیر احمد مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے سمجھا رہے تھے کہ وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اگر رحمت اللعالمین تھے تو کس طرح۔

"پگلی! کیا تمہیں وہ نعت یاد نہیں؟" نصیر احمد بڑی ہی عقیدت سے نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنے لگے۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

میری آنکھیں بھر آئیں اور ضبط کے باوجود ٹپ ٹپ میرے آنسو گرنے لگے۔ اور میرا دل مچل مچل کے گواہی دینے لگا کہ یہ بلاوا مجھ جیسی خطاکار کو اللہ ہی کے کرم سے آیا ہے۔ وہ واقعی میری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ جس نے میرے ڈرے سہمے دل کی مخفی سی آرزو کو اتنی جلدی پورا کر دیا تھا کہ مدینے کو یوں

میرے قریب کر دیا تھا۔

مجھے یقین آگیا تھا کہ مدینہ بھی کسی کلمہ گو سے ہرگز دور نہیں۔ بلکہ اتنا قریب ہے کہ اپنے چاہنے والوں کی سسکیاں اور ہچکیاں رات کے پچھلے پہر سن ہی لیتا ہے۔ میرے آنسو تھے کہ تھمنے میں نہ آرہے تھے۔ نصیر احمد نے اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا اور وہ میرے کان میں ہولے سے بولے۔

"اس وقت ان آنسوؤں سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ یہ تو کسی کسی کو عطا ہوتے ہیں عصمہ! یہ آنسو نہیں، تمہارا ندامت بھرا دل ہے۔ جو قطرہ قطرہ پگھل رہا ہے۔" یکایک پھر مجھے میرا دل یاد آگیا اور میں ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں پر لگائے اڑتا ہوا میرا دل مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کے گلی کوچوں کو چومنے نکل چکا تھا۔ وہ گلی کوچے جہاں میرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطہر و مبارک قدم آیا جایا کرتے تھے اور جہاں کی فضائیں آج بھی میرے پیارے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عنبریں پسینے سے مشک بو تھیں۔

☼ ☼ ☼

ویسے تو ہم مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اذان فجر سے پہلے ہی آگئے تھے۔ عقیدت مندوں کے ریلے رنگ و نور کے سیلاب میں لہریں اٹھا رہے تھے... بھنور بنا رہے تھے اور آخر شب کی ان سعید ساعتوں میں ساری کائنات اس کے دالان میں سمٹ آئی تھی۔ نصیر احمد مردانہ سائیڈ پر اور میں خواتین والی طرف حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کھلنے کے منتظر تھے۔ فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر تک میں بیٹھی حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازوں کو دیکھ دیکھ کے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتی رہی اور جب حرم کے اندر داخل ہونے کی نوید ملی تو پھر میں فوراً ہی نہ اٹھ سکی۔ میرے گھٹنے، میرے ٹخنے اور ہاتھ پیر سب کے سب صحن حرم کے ساتھ یوں جڑ چکے تھے جیسے وہ اندر جانے سے روک رہے ہوں اور کہتے ہوں۔

"تم ایک غلاظت کی پوٹ ہو اور وہاں اندر تو پاک صاف، باوضو لوگوں کو جانے کی اجازت ہے۔ مت جاؤ، تمہارے اندر کی بدبو، تمہارے اعمال کی سڑاند، اندر کے مہکتے اور پاکیزہ ماحول کے قابل نہیں ہے اور پھر تم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤ گی۔ کیا کبھی صحابیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی اور اعمال صالحہ کو پڑھا تھا تم نے اور کیا تم جانتی بھی ہو کہ ایک مسلمان عورت کے معنی کیا ہیں، تم نے عورت کے کسی بھی روپ میں خود کو کبھی سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینے میں سنوارنے کی کوشش نہیں کی اور چلی ہو روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کرنے۔ اس دربار عالی شان اور اس محبوب خدا کے سامنے جانے کے قابل بھی ہو؟

میرے اک اک مسام سے میرا رواں رواں کھنچنے لگا۔ مجھے کچوکے لگانے لگا۔ میری آنکھوں میں مزید مرچیں بھر گئیں اور میں ان خواتین کو حسرت سے تکنے لگی جو اک دوسرے سے آگے بڑھ کر حرم میں داخل ہونے کی کوشش میں مچل رہی تھیں۔ ایک دم سے یہ اتنی ڈھیر ساری خواتین جانے کہاں سے آگئی تھیں۔ میں تو وہیں پر ڈھیر ہو گئی۔

"بیٹی اٹھو! تم کیوں یہاں بیٹھی ہو، چلو اندر چلو۔" میرے ساتھ آکر کھڑی ایک بزرگ خاتون نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے یوں اٹھا لیا جیسے میں اپنے وزن پر تھی ہی نہیں، میرا ہوا جیسا ہلکا وجود لمحہ بھر میں ان کے ساتھ بھی ہو لیا اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔

"جی... وہ میں؟" حرم نبوی کے دروازے پر عین اندر داخل ہونے کے وقت میرے پیر پھر پتھر کے ہو گئے۔

"لگتا ہے پہلی بار آئی ہو، آجاؤ، آجاؤ جھجکو مت۔ یہاں سب برابر ہیں۔ یہ اس نبی آخری الزماں صلی اللہ علیہ وسلم... اس رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ہے جہاں آنے والوں کے ظاہری رتبے میں کوئی فرق نہیں، البتہ کون کیا ہے؟ وہ اس مالک کو خبر ہو گی جو ذوالجلال ہے اور جس کا گھر مکہ میں ہے۔ یہ

تو... آؤ نا تم پریشان کیوں ہو۔" وہ خاتون جو عمر میں میری ماں کی بھی ماں کے برابر تھیں مجھ سے زیادہ توانا اور چست تھیں وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچ کر اندر لے گئیں اور میں اپنے آپ کو اپنے ہی اندر چھپاتی ان کے ساتھ چلتی گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ بزرگ خاتون میرا ہاتھ پکڑے مجھے کھینچے لیے جارہی تھیں۔ میری پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اندرونی فرش کو عقیدت سے چومے چلی جارہی تھیں جس پر بھلے اب قیمتی سنگ مرمر جڑا تھا اور دبیز قالین پڑے تھے۔ مگر اس کے نیچے جو مٹی تھی وہ تو وہ ہی مبارک مٹی تھی جس پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارکہ پڑتے رہے تھے۔ میں تو بس اسی نسبت سے حرم نبوی کے فرش کو اپنی پلکوں سے صاف کرتی' نگاہوں سے چومتی چلی جارہی تھی' ہوش سے بے گانہ' خرد سے عاری' اپنے آپ میں مگن' درود پاک کا ورد کرتی میں ان مہربان ہستی کے ہمراہ ایک بڑے ہال سے ہوتی ہوئی ایک صحن میں آئی اور پھر ہرے ستونوں کی چھت تلے میں منبر رسول رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑی تھی۔

جب میرے ہوش ٹھکانے آئے تو مجھے یوں لگا کہ یہاں تو میں صدیوں سے مقیم ہوں' ڈگمگاتے قدموں پر قابو پاتی' کچھ ڈولتی' کچھ کانپتی منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سے گزر کر میں جب روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اوٹ کے سامنے آئی جس کے پار میرے پیارے حبیب احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری آرام گاہ تھی' وہاں آکر میرے پاؤں پھر میرے نہ رہے اور میں وہیں پر ڈھے سی گئی۔ اپنے اطراف سے بے گانہ جہاں خواتین عقیدت مندوں کے غول ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ رو رہے تھے ہچکیاں لے رہے تھے۔ سلام پیش کررہے تھے۔ بے شمار خواتین کے ہاتھوں میں تو چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی تھیں جن میں سے دیکھ دیکھ کر وہ دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ میں نکمی' ناکارہ' تو بس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عقیدت پیش کرکے اور کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ مجھے تو یہ احساس شرمندگی ہی مارے جارہا تھا کہ میرے دامن میں سوائے گناہوں کے اور کچھ تھا ہی نہیں' میں تو' میں تو اس وقت ایسی حقیر تھی اپنی نظر میں کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت اور عقیدت کا بھی کوئی دعوا بیچ نہ لگ رہا تھا۔ میں تو اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہاں پر بس میں تھی اور میری کم مائیگی۔

میری نگاہیں مارے شرم کے زمین میں گڑی جارہی تھیں اور میرا آنچل اشکوں سے تر ہوا جارہا تھا۔

میں باوجود اپنے اعصاب کی تمام تر قوت کو مجتمع کرنے کے بھی اپنے پپوٹے اوپر کو نہ اٹھا پارہی تھی۔ اس وقت مجھے عربی کی کوئی بھی دعا یاد نہ تھی جنہیں ماما اور نصیر احمد نے خاص ہدایات کے ساتھ مجھے یاد کروایا تھا۔

میرے لب بھی پتھر کی سلوں کی طرح اک دوجے پر پڑے تھے۔ اور میرا دل' میری آنکھوں میں لرزتا ہوا بس درود پاک کا ورد کرتا جارہا تھا اور کبھی کبھی اک لمحے کو بیچ میں ایک ہچکی لے کر روتے ہوئے معصوم بچے کی طرح کہتا۔

"مجھے اپنی آغوش رحمت میں لیجیے آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔

میری گزشتہ زندگی کے ایام پر نگاہ نہ لیجیے گا سرکار عالم صلی اللہ علیہ وسلم

بس میری آئندہ زندگی کے شب و روز پر نظر کرم کردیجیے۔

میری سفارش' اے آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میری سفارش اس رب ذوالجلال کے حضور کردیجیے گا۔ اور میرے پاس اس وقت نہ کوئی لغت تھی' نہ الفاظ' نہ جملے اور نہ ہی اسلوب گفتار' نہ پیرایہ اظہار' بس ایک گہرے سکوت کے بھاری غلاف میں لپٹی کوئی بے نام سی التجا تھی۔ بالکل ماں کی نرم و گرم آغوش میں پڑے بچے کی غوں غاں سے بنتی کہانیوں جیسی۔

☼ ☼ ☼

تقریباً" تین گھنٹوں کے بعد میں اور نصیر مسجد نبوی کے مین گیٹ پر ملے۔ میں نے دیکھا نصیر احمد کی آنکھیں بھی متورم اور سرخ تھیں۔ وہ بھی تو پہلی بار مدینہ آئے تھے۔

"آؤ اب کچھ کھالیں۔" مسجد نبوی سے باہر آکر نصیر احمد نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے بمشکل کہا۔

"وہ تو مجھے بھی نہیں ہے' لیکن کیا ہم ان فضاؤں' یہاں کی نعمتوں سے فیض یاب نہ ہوں' بھلے ہمارے شکم کوئی خاص طلب نہیں رکھتے' لیکن کیا ہماری رگوں میں بہتے لہو میں مدینہ منورہ کی سرزمین کی اجناس اور پھل اس کی لالی میں اضافہ کا باعث نہ بنیں۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں مجھے کھانے کی طرف راغب کررہے تھے۔ میں مسکرادی' پھر ہم نے ایک قریبی ہوٹل میں ناشتا کیا اور اپنے ہوٹل آگئے جہاں رات ہم نے صرف اپنا سامان ہی رکھا تھا۔

"چلو اب کچھ دیر آرام کرلو' پھر نماز ظہر سے پہلے پہلے ہم نے حرم واپس جانا ہے۔" نصیر احمد نے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"آرام...!" میں نے وہاں موجود ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے زیر لب کہا' میں اپنے آپ کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"میں عصمہ احمد... آج کتنی عام سی عورت لگ رہی تھی۔ نہ میرے رخساروں پر وہ قدرتی گلابی پن تھا جس کی بدولت میری سفید رنگت اور بھی حسین دکھائی دیا کرتی تھی۔ نہ میرے لبوں پر نرم و ملائم گداز۔ نہ آنکھوں میں ہیروں کی سی چمک اور نہ ہی صراحی دار گردن میں تناؤ' بلکہ میری گردن تو میرے کندھوں میں دھنسی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور ہونٹوں پر زرد پپڑیاں... یہ میرے وجود پر کس کا چہرہ تھا۔ میں اپنے چہرے کو انگلیوں سے چھونے لگی۔ جیسے میرے حواس گم ہوں۔ مجھ پر کسی دیوانگی کا دورہ پڑ رہا ہو۔" نصیر احمد بھی شاید میری کیفیت دیکھ رہے تھے۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آگئے

"پریشان کیوں ہو؟" وہ میرے پیچھے کھڑے ہو کر مجھے آئینے میں دیکھنے لگے۔ پھر خود ہی بولے۔

"یہاں آکر ہم وہ نہیں رہتے جو ہم خود کو سمجھ رہے ہوتے ہیں' بلکہ ہم وہ ہوجاتے ہیں جو ہم درحقیقت ہوتے ہیں۔"

"یعنی...؟" میں نے کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے نگاہیں نصیر احمد کے چہرے پر جمادیں۔

"یعنی یہاں کی ہواؤں اور فضاؤں میں سچ اور حق کی تعلیمات' تدریس اور تلقین کی تاثیر ابد تک کے لیے بس چکی ہے۔ لہٰذا یہاں ہم جیسے منافقوں اور دو موہنوں کی اصلیت خود بخود ظاہر ہوجاتی ہے۔ اور بندہ اپنے اندر کو خود بخود اگل دیتا ہے۔" نصیر احمد نے مجھے آئینے کے سامنے سے ہٹا کر بیڈ پر بٹھایا۔ اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکرائے۔

"سوچو ذرا... جب کبھی ہمارا معدہ اضافی غذا سے بوجھل ہوجاتا ہے۔ تو ہماری طبیعت پر کیسی متلی سی طاری رہتی ہے اور جب قے ہوجائے تو کچھ ہی دیر میں ہم خود کو کیسے ہلکے پھلکے محسوس کرنے لگتے ہیں۔"

انہوں نے ایک بہت ہی سادہ سی مثال سے مجھے بہت گہری بات سمجھادی۔ یعنی ہماری روح پر جب ہماری بداعمالیوں' ہمارے جھوٹ اور ملمع سازی کا بوجھ بڑھ جائے تو پھر اس کی سیاہی ہمارے چہروں کو بدنما کردیتی ہے اور ہمارے اندر کے رنگ باہر جھلکنے لگتے ہیں۔

میں نے نصیر احمد کی نظروں سے اپنی نظریں چرائیں اور نہانے کا بہانہ کرکے باتھ روم میں گھس گئی۔

پھر میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دوبارہ نہ دیکھا۔ بلکہ میری نگاہیں مسلسل میرے اندر پر ٹک گئیں۔ میں اپنے آپ سے اوب رہی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح سے میرا اندر ہلکا ہوجائے۔

"نصیر..." دوبارہ مسجد نبوی جانے کی تیاری کرکے

میں نے نصیر احمد کو مخاطب کیا۔

"ہوں۔۔۔ کہو۔" وہ یقیناً" درود پاک پڑھ رہے تھے۔ مختصراً" بولے۔

"نصیر! یہ رکھ لیں۔" میں نے اپنی پشت پر چھپایا ہوا ہاتھ ان کے سامنے کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ میرے ہاتھ میں ایک ڈائری دیکھ کر کچھ حیران ہوئے۔

"اس میں میرا اصل ہے۔ میری حقیقت ہے۔ میرے اندر کا سارا بوجھ ہے۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔

"اچھا! تو میں اس کا کیا کروں گا۔" نصیر احمد نے اس ڈائری کو نظر انداز کر کے کہا۔

"میں اپنا بوجھ آپ کے ساتھ بانٹنا چاہتی ہوں اور آپ کو اپنا اصل چہرہ دکھانا چاہتی ہوں۔ آپ یہ ڈائری حرم کے صحن میں بیٹھ کر پڑھنا۔" میں نے وہ ڈائری زبردستی ان کے ہاتھ میں تھما دی۔

"اور اگر میں کہوں کہ میں جانتا ہوں کہ اس کے اندر کے اوراق میں کیا ہے تو؟" وہ ڈائری کو دوبارہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولے۔

"کک۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں ایک ہی لمحے میں عرش سے فرش پر آگئی۔

"آپ نے یہ ڈائری کب پڑھی اور کیسے؟ یہ تو میں نے بہت سنبھال کر رکھی تھی۔" مارے شرمندگی کے میرے لبوں سے پورے الفاظ بھی نہ نکل رہے تھے۔

"ہر روز۔۔۔ ہر لمحہ۔۔۔ جب بھی تمہاری آنکھوں سے میری آنکھیں ٹکرائیں' تمہارا اندر لفظ بہ لفظ میرے سامنے آتا رہا۔ تم نے عصمہ! اس ڈائری کو تو بہت سنبھال کے رکھا۔ مگر کاش! اپنی آنکھوں پر بھی کوئی پردہ گرا لیتیں۔" نصیر سنجیدہ تھے۔ بے حد سنجیدہ' ان کا لہجہ سرد تھا۔ برف کی مانند۔

"چلو دیر ہو رہی ہے۔" پھر وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر چل دیے۔ میں نے ڈائری کو وہیں بیڈ پر رکھا اور ان کے ساتھ چل پڑی۔ مگر اس وقت اتنے تیز قدم تھے کہ میں ان کے ہم قدم نہ ہو سکی۔ پتا نہیں میں کیوں شرمندہ تھی۔ حالانکہ آج تو میں نے خود چاہا تھا کہ وہ مجھے جان لیں۔

ہم حرم میں داخل ہوئے تو نصیر احمد نے لمحہ بھر کو رک کر مجھے دیکھا اور پھر بولے۔

"ہماری ملاقات اب بعد از نماز عشاء ہوگی۔ اس سارے وقت میں ہم دونوں سوچیں گے اور حرم پاک سے جب اٹھیں گے تو کچھ نا کچھ فیصلہ کر کے اٹھیں گے۔ یہ دہری زندگی اب میں بھی شاید زیادہ دیر نہ گزار سکوں۔"

عصمہ! ہم رات کو اپنا اپنا حال دل بھی اک دوجے سے کہیں گے اور آرزوئے دل بھی۔" انہوں نے نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اتنا کہا اور پھر تیزی سے مردانہ طرف سے حرم کے اندرونی دروازوں کی طرف بڑھ گئے۔

☆ ☆ ☆

نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد میں ریاض الجنتہ میں آگئی۔ اور ایک ستون سے لگ کر بیٹھ گئی۔ آج پھر نگاہیں منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مرکوز تھیں اور میں شفقت' محبت' اپنائیت اور لطافت میں گندھی اس فضا میں اپنے پرسکون دل کے ساتھ یہ سوچ رہی تھی کہ حضرت عائشہؓ سے جو روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"اے اللہ! مدینہ کی محبت ہمارے دلوں میں مکہ سے بھی زیادہ کر دے۔" یقیناً" یہ اسی دعا کا ثمر ہے کہ ہر کلمہ گو مسلمان مدینہ کے خواب دیکھتا ہے۔ مدینہ کی آرزو کرتا ہے اور مدینہ کے لیے زاد راہ جوڑتا اور مدینہ کی تمنائے بے تاب سے سرشار رہتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں جھانکا اور اپنا جائزہ لیا کہ کیا میرے دل میں بھی یہاں کی ایسی تڑپ ہے۔ سامنے اس سبز گنبد والے صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے کے سبز مخملیں پردوں پر (وہ اوٹ جو اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوابگاہ اور جالیوں پر خواتین کے حصے کی طرف کر دی گئی ہے اور ایسا اس لیے کیا گیا کہ بعض خواتین عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ادب و احترام کے تقاضوں کو بھول کر بدعات پر اتر آتی تھیں۔) نگاہ پڑی تو مجھے لگا میرے دل میں اک زلزلہ برپا ہو گیا ہو اور میرا بند بند ہلنے لگا ہو۔ میرا دماغ بھک سے اڑا اور اس فضائے مبارکہ میں کہیں تحلیل ہو گیا۔ میں نے شدت جذبات سے اپنا سر خدائے بزرگ و برتر کے حضور سجدے میں جھکا دیا۔ جس نے مجھے سعادت بخشی تھی کہ آج میں سرکار مدینہ کے گھر میں موجود تھی۔

مجھے کچھ یاد نہ رہا تھا کہ صبح میرے اور نصیر احمد کے بیچ کیا طے پایا تھا۔ اور مجھے اپنے بارے میں کیا فیصلہ کرنا تھا۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میں دراصل کیا چاہتی ہوں۔ میں تو بس ریاض الجنتہ میں بیٹھے بیٹھے بہت دور نکل گئی تھی۔ میرے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر ہے۔ یقیناً" یہ وہ نہیں ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مقدس میں تھا' لیکن اس کی علامتی حیثیت ضرور ہے۔ یہ منبر پورے ایک عہد کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ میں اپنے حواس سے نکل کر اپنے خیال میں بہت پیچھے چلی گئی تھی۔

میں عصمہ نصیر احمد جو اب تک اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اتنی بے قرار ہوئی اس منبر و محراب کو دیکھتے دیکھتے سسکنے لگی۔ میرے اندر سلگتی ہوئی لکڑیوں سی جلن اٹھی اور میری آنکھیں ان لکڑیوں کے دھوئیں کے باعث نم ہونے لگیں اور میں جنت سے اتارے گئے اس زمین کے ٹکڑے "ریاض الجنتہ" پر پھر سے سجدہ ریز ہو گئی۔ میں نے لمحوں میں صدیوں کا جو سفر طے کیا تھا اس نے مجھے پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت میں لفظوں کو چننا چاہتی تھی۔ مگر لفظ مجھ سے گریزاں تھے۔

تب آسودگی اور سکون سے لدی خوشبو بھری ہوا کا ایک جھونکا کہیں سے اندر آیا اور اس منبر کو چومتا ہوا آکر مجھ سے لپٹ گیا۔ تب میری زبان سے درود و سلام کے جھرنے پھوٹ نکلے اور میرا اندر ایک مشک بو گونج سے معمور ہو گیا۔

صلو علیہ و آلہ۔۔۔

صلو علیہ و آلہ۔۔۔

اور ایک سیدھا و شفاف راستہ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے چمکتا دکھائی دیا۔

بعد از نماز عشاء جب میں حرم سے باہر آئی تو نصیر مجھے بیرونی دروازے کے پاس ہی مل گئے۔ ان کے چہرے پر گو اب بھی سنجیدگی طاری تھی' مگر ان کے لب ایک نرم سی مسکان سے بھی مزین تھے۔

ان کے ہاتھ میں ایک بڑا شاپر تھا۔ جس میں کھانا اور کولڈ ڈرنکس کے ٹن تھے۔ میں سمجھ گئی کہ نصیر ہوٹل جانا چاہتے ہیں' اس لیے وہ کھانا پہلے سے ہی لے آئے ہیں۔ صبح بھی انہوں نے مجھے اسی طرح سے ایک شاپر تھما دیا تھا۔ جس میں بہت سی چیزیں میرے دن بھر کے کھانے کے لیے موجود تھیں۔ چپس' نمکو' سینڈوچ' چاکلیٹ اور اورنج جوس کے ٹن یہ ساری چیزیں میری پسندیدہ چیزیں تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پہلے سے موجود اس شاپر کو دیکھا۔ جو اسی طرح پھولا ہوا تھا۔ نصیر احمد نے بھی یہ صبح والا شاپر میرے ہاتھ میں دیکھا تو پوچھنے لگے۔

"کیا آج تم نے کچھ بھی نہیں کھایا؟" ان کے انداز میں میرے لیے فکر تھی۔

"میں نے جوس بھی پیا تھا اور چپس بھی کھائی تھی۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا' وہ خاموش ہو گئے اور ہم دونوں پھر راستہ بھر کچھ نہ بولے اور اپنے ہوٹل واپس آگئے۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔

"نصیر احمد! چائے پئیں گے۔" میں نے دسترخوان کو لپیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔ نصیر احمد بھی کھانے کے بعد چائے پینے کے عادی تھے اور مجھے بھی اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

"ہاں منگوا لو۔" وہ تکیہ فولڈ کر کے بیڈ کی ٹیک سے سیدھے ہو گئے' میں نے انٹرکام پر دو کپ چائے لانے کو کہا۔ اور پھر نصیر احمد سے اپنے وہ جذبات شیئر کرنے لگی جو آج مجھے دن بھر میں حرم میں محسوس ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑی ہی دلچسپی سے میری ساری باتیں

سنیں۔

"اور وہ بات جو ہم نے اس وقت کرنے کا طے کیا تھا؟" نصیر احمد نے اچانک ہی میرے دونوں ہاتھ تھام کے اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ انہیں میرا حال دل جاننے کی بہت بے قراری تھی۔

"خود ہی جان لو میری آنکھیں حاضر ہیں۔ دیکھو کہ میں نے ان اوراق میں اپنے دل کی کون سی بات لکھی ہے؟" میں نے شرارت سے مسکرا کر کہا اور اپنی آنکھیں اور بھی ان کے سامنے پھیلا دیں۔

"آج نہیں... آج تم اپنا حال دل خود کہو یہ میرا دل چاہتا ہے۔" وہ جذبات سے معمور آواز میں بولے۔

"میرا دل...؟" میں نے ان کا ہاتھ تھاما اور اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل پر رکھ دیا۔

"سنو میرا دل کیا کہہ رہا ہے؟"

"گواہی دے رہا ہے کہ میرے اندر ایک آرزو پوری سچائی اور شدت سے مچل رہی ہے اور چاہتی ہے کہ... نصیر احمد اس کا ہو جائے۔ پورے کا پورا... اور اپنے دل کا سارا میل اور وہم صاف کر کے میری پچھلی خطاؤں کو معاف کر کے۔" میں نے بغیر کوئی لمبی چوڑی تمہید باندھے کہا۔ بغیر روئے اور نصیر احمد کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگنے کے... حالانکہ میرا جرم بے حد سنگین تھا۔ پھر بھی میں نے نصیر احمد سے کوئی التجا نہ کی تھی۔

"اچھا... اور وہ وجیہہ الدین...؟" نصیر احمد مسکرائے، ان کی نرم مسکراہٹ بھی مجھے سنگسار کر رہی تھی۔

"وہ میرا ماضی تھا۔" میں نے نصیر احمد سے نظریں چرائے بغیر کہا۔

"لیکن تمہارے حال میں پیوست تھا وہ ماضی ابھی تک۔"

"سب کچھ تھا، اور ضرور تھا، مگر یہاں پر آنے سے قبل تھا۔ اس سرزمین پاک کو چھونے سے پہلے ہی میرے وہ پیر میرے ٹخنوں سے کٹ گئے تھے۔ جو صرف اور صرف وجیہہ کی طرف لوٹ جانے کی چاہ رکھتے تھے۔" میں نے اپنے اندر اعتماد بھرتے ہوئے کہا۔ مگر اب میری آواز میں کپکپاہٹ اور آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

"مگر اب میں کیسے یقین کر لوں کہ تمہارے اندر وہ نہیں ہے جو تمہارے لہو کے سارے سرخ و سپید جرثوموں میں شامل تھا۔ جو تمہارے بند بند کی حرارت اور ہر دھڑکن کے ہونے کی وجہ تھا۔" نصیر احمد کی آواز ٹوٹنے لگی اور ان کا چہرہ ٹھیک میرے چہرے کی طرح زردی مائل سیاہ ہونے لگا۔ ان کے نقوش بھی دبتے دبتے بھدے ہونے لگے اور وہ ایک مرجھائے ہوئے پتے کی طرح اپنے ہی وجود پر لٹک گئے۔

"نصیر احمد! آپ بھی؟" میں نے حیران و پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا اور انہیں کندھے تھام کے جھنجوڑنے لگی۔

"نصیر احمد! کیا آپ بھی میری ہی مانند منافق اور دہرے چہرے کے مالک تھے؟ اور کیا آپ کی وہ محبت اور توجہ بھی جھوٹی تھی۔ جس کا اظہار آپ ہر لحہ مجھ سے کیا کرتے تھے۔" مارے دکھ کے میری سانس بند ہونے لگی۔

"تم سے محبت۔" نصیر احمد نے میری طرف گہری اداس نظروں سے دیکھا۔

"تم سے محبت تو میں اپنے لڑکپن بلکہ بچپن سے کرتا ہوں۔ میری محبت میں کہیں کھوٹ نہیں۔ لیکن میرے عشق کو تمہاری طرف سے ملنے والی منافقت نے حسد کی آتش کی نذر کر دیا تو پھر میں دو حصوں میں بٹ گیا۔ مجھے اپنے چہرے پر چہرہ لگانا پڑا۔

میں کیا کرتا عصمہ! میں کیا کرتا! میں بھی تو انسان ہی ہوں اور پھر ایک مرد جس کی فطرت میں اپنی عورت پر شراکت کا مطلب ہے دوسرے کو جان سے مار کے پھانسی چڑھ جانا، مجھ جیسے مرد تو اکثر نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں اور اپنی عورت کو ہی مار ڈالتے ہیں۔

جانتی ہو جب مجھے یہ احساس ہوا کہ تم نے مجھ سے شادی محض اس لیے کی ہے کہ تم وجیہہ کو دوبارہ پا سکو، تو اس روز میں ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ میرا دل تم سے نفرت پر آمادہ تھا۔ چاہتا تھا کہ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں اور اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لوں۔ مگر پھر میری وہ محبت آڑے آ گئی جو مجھے تم سے تھی اور اسی نے مجھے ضبط کا حوصلہ دیا۔ مجھے آس بندھائی کہ شاید میری محبت تمہیں میری طرف دل سے مائل کر دے۔ لیکن تم... آہ! تم تو مجھے کھلونا سمجھتی رہیں۔" نصیر احمد کی آواز ٹوٹنے لگی وہ فرط غم سے رونے لگے، جبکہ میں مارے غیرت کے ان کے سامنے آنکھیں نہ اٹھا پا رہی تھی۔ اور میرے پاس اس وقت اقرار جرم کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔

"میں بھی کیا کرتی نصیر احمد! میرے پاس بھی تو کوئی اور راستہ نہ تھا۔ میں وجیہہ کو کھو کر جی نہ پا رہی تھی اور اس کی طلب نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔"

"تم سچ کہتی ہو عصمہ! کہ محبت چیز ہی ایسی ہے جسے ہو جائے اسے خود سے بے گانہ بنا دیتی ہے۔ مگر تم نے میرا انتخاب محض اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے کر کے مجھ پر ظلم کیا، بہت سنگین ظلم۔ تم نے تو مجھے جیتے جی مار دیا۔"

"عصمہ...!" نصیر احمد میرے ہاتھوں کی پشت اپنی آنکھوں سے لگا کر رو دیے، سسکیاں لینے لگے۔

"نصیر احمد! میں واقعی بہت بری ہوں۔ میں نے تمہیں دھوکہ دیا۔ مجھے اقرار ہے کہ میں نے وجیہہ کو پانے کے لیے تمہارا سہارا لیا اور تمہارے جذبات کو اپنی کھوکھلی محبت کی اداکاری سے پامال کیا۔ میں نے تم سے شادی وجیہہ کے مشورے پر کی تھی۔ ہم دونوں کا خیال تھا کہ تم جلد ہی مجھے چھوڑ دو گے جب جانو گے کہ میں اب بھی وجیہہ ہی سے محبت کرتی ہوں اور اسے پانا چاہتی ہوں۔" میں ایک بپنا ٹائزڈ کی طرح اپنے اندر کی مخفی باتیں بھی کہے جا رہی تھی۔

"اور میں... میں تمہیں اپنے ساتھ باندھنے کے بہانے تلاش کرتا رہا، تمہارے سامنے اچھا اور اچھا بنتا رہا، تاکہ تمہارے دل سے وجیہہ کی تصویر ہٹا کر اپنی لگا سکوں، وجیہہ کے ساتھ حسد نے مجھے تمہارا اور بھی گرویدہ بنا دیا۔ تمہیں دوبارہ کھو دینے کا احساس مجھے پاگل بنا دیتا تھا اور میں تمہیں اپنے مزید قریب کرنے کے جتن کرنے لگتا تھا۔" وہ بھی میرے جیسی کیفیت سے ہی دوچار تھے۔ خود بخود اپنے راز عیاں کر رہے تھے۔

"ہم نے اک دوسرے کے ساتھ بہت منافقت کی۔ اک دوسرے کے جذبات کو دھوکہ دیا، ہم دونوں ہی مجرم ہیں۔ سزاوار ہیں اپنے کیے کے۔" میں نے بہت دیر کے بعد اپنی بھیگی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ بھی اس لمحے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں اور پلٹنا بھول گئیں۔ "اور ہماری سزا اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ ہم اپنی اپنی محبت ہی کے ہاتھوں مارے جائیں۔"

"یعنی...؟" میری اداس اور ویران آنکھیں اس کے سامنے سراپا سوال تھیں۔

"ایسا نہ کہو نصیر... میں! میں اب کچھ بھی کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ اور تمہیں، تمہیں کھو کر تو میں...؟" لفظ میرے ہونٹوں پر ہی پتھرانے لگے اور میں زور زور سے رونے لگی۔

"اب ہمیں سوچنا ہو گا... اور اپنے اپنے ظرف کا بھی جائزہ لینا ہو گا۔ محبت کو انتظار کی اذیت ناک سولی سے اتارنا ہو گا۔ قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکتی یہ محبت کب تک ہمارے دلوں میں رہے گی۔ اور ہمارے دل بھی آخر کب تک زندہ رہیں گے۔ خود اذیتی کے اس عذاب سے اب ہمیں خود کو نکالنا ہی ہو گا۔

"عصمہ! تمہیں لوٹ کر جانا ہی ہو گا۔ وجیہہ کی سزا پوری ہو چکی۔" نصیر احمد نے گہرے اداس لہجے میں کہا اور پھر اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔

"نصیر! میں واپسی کا راستہ بھول گئی ہوں۔ مجھے کہیں اور نہیں جانا۔ وجیہہ کی سزا کو مجھے اس کی طرف لوٹا کر جزا مت بدلو نصیر! ورنہ... ورنہ میں برزخ سے نکل کر سیدھی جہنم میں جا پڑوں گی۔ میرا حساب کتاب رہنے دو۔ اگرچہ میرا نامہ محبت میری نیت کی کالی سیاہی سے لکھا ہے۔ پھر بھی تم اسے میرے بائیں ہاتھ میں مت دو۔" میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے

پیروں پر رکھ دیے۔

"توبہ کے معنی اور اس کا شعور ابھی تو مجھے نصیب ہوئے ہیں۔ ابھی تو میری معافی کا در کھلا ہے' مجھے اپنی دعائیں آزما لینے دو۔" میرا جی چاہا میں اپنا سر بھی اس کے قدموں میں رکھ دوں اور اتنا روؤں کہ میرے دل کی سطح شفاف ہو جائے اور نصیر کو اس میں اپنا چہرہ صاف دکھائی دینے لگے۔

"دعائیں ہی تو آزمانے آیا ہوں یہاں۔ عرضیاں ہی تو پیش کر رہا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ رب اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میرے اندر اس آگ کو ٹھنڈا کر دے۔ جس کا نام حسد ہے اور جس نے میری محبت کو جھلسا کر رکھ دیا۔ التجائیں ہی کر رہا ہوں صبح و شام نبی آخری الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ کے توسط سے کہ وہ مہربان' مجھ پر نظر کرم کر دے اور میرے دو چہروں میں سے ایک کو بھسم کر دے۔۔۔ کہ میں ان دو چہروں کا بار اپنی ایک روح پر مزید نہیں ڈال سکتا۔" نصیر احمد نے اپنے پاؤں سمیٹے اور ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر مجھے اٹھایا اور میرے چہرے پر اپنی زخم زخم رستی ہوئی آنکھوں کو جما کر بولا۔

"عصمہ! میں بھولتا جا رہا ہوں کہ میرا اصل چہرہ کون سا ہے۔ اور مجھے یہ بھی سمجھ نہیں آئی کہ تمہارا اصل چہرہ کون سا ہے۔ سب کچھ گڈمڈ ہو گیا ہے۔ سب کچھ۔" اس کی آواز میں ایک عجیب سا سناٹا اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ میں اس وقت اس سے بری طرح ڈر گئی اور میں نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز میں مسجد نبوی گئی تو روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہیں ایک ستون سے لگ کر بیٹھ گئی۔ آج میرا دل بہت غم زدہ تھا۔ وہ دل جو کل تک بڑا خوش فہم تھا کہ نصیر سے میں جب کہوں گی کہ میں سچ مچ ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں تو وہ میری ہر خطا کو معاف کر کے مجھے سینے سے لگا لے گا۔ مجھے یہ زعم تھا کہ مجھے پانے کے لیے نصیر میرا ہر جرم' ہر گناہ معاف کر دے گا اور یہ کہ وہ مجھے جس شدت سے چاہتا ہے اس میں اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ بھی تو نہیں کہ مجھے اپنا لے اور اپنائے رکھے' جواب میں میری محبت۔۔۔ یہ تو اس کی خوش بختی ہو گی۔ کیسا غرور' کتنا تکبر تھا مجھے اپنے آپ پر۔۔۔ اور اسی تکبر میں مجھے یہ بھول گیا تھا کہ نصیر احمد بھی ایک خوددار انسان ہے۔ غیرت مندی اس کا بھی تو وصف ہے۔۔۔ اور پھر میں نے اس کی تذلیل میں کون سی کسر اٹھا رکھی تھی۔ میں وجیہہ کے نام کی مالا اپنی سانس سانس میں جپتی رہی اور وہ پھر بھی مجھے معاف کر دے۔

نصیر احمد نے مجھے صاف صاف کہہ دیا۔ اپنا اندر پوری طرح سے مجھے کھول کر دکھا دیا تھا اور اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے طلاق دینے کو تیار ہے۔

جب میں چاہوں' چاہوں تو یہیں پر ہی۔۔۔ اور چاہوں تو واپس جا کر' مگر وہ مجھے وجیہہ کی طرح طلاق نہ دے گا۔ وہ کہتا تھا عورت کو یوں ایک بار میں ہی تین طلاقیں دینا اس کی تذلیل ہے اور حکم خداوندی کی سخت نافرمانی بھی۔

وہ مجھے تین طہروں میں طلاق دینا چاہتا تھا' تاکہ اس کے درمیانی وقت میں ہم دونوں کے پاس سوچنے سمجھنے کا وقت ہو اور کیا معلوم کہ ہمیں ہدایت کی راہ دکھائی دے جائے۔ مگر میں نے اسے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ میں ایسا نہیں چاہتی۔ بھلے وہ واپس جا کر عمر بھر مجھ سے دور رہے۔ مگر مجھے اپنے نام کے ساتھ جڑا رہنے دے۔

نصیر احمد کی شرافت اور عظمت کہ اس نے مجھ جیسی سیاہ کار کی بات مان لی تھی۔ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ستون سے لپٹ گئی۔ مجھے اس لمحے عرفان صدیقی کی خوب صورت نعت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ جو میرے حسب حال ہی تھی۔ میرے لب ہولے ہولے ان اشعار کو پڑھنے لگے۔

یہ داغ داغ جبیں اور یہ تیری دہلیز
ترے کرم کے کرشمے تری نظر کا فسوں

ایک بندہ ناچیز راندہ درگاہ
شکستہ پا غریب و فتادہ و محزوں

خراب و بے کس و بے چارہ و تہی داماں
شکستہ حال و نحیف و نزار و خوار و زبوں

میری بیاض عمل نامہ سیاہ کی طرح
مرے گناہ شمار و حساب سے افزوں

یہ چاہتا ہوں کہ پہنچوں قریب تر لیکن
قدم اٹھاؤں تو سو بار ڈگمگا جاؤں

میں کس خیال سے لپٹوں تیرے ستونوں سے
میں کس طرح تیرے روضے کی جالیاں چوموں

میرے لب میری دھڑکنوں کے ساتھ ہلتے رہے اور میں اس ستون سے بھی ذرا دور ہو کے بیٹھ گئی۔ مجھے اپنا آپ اس قابل بھی نہ لگ رہا تھا کہ میں یہاں کی کسی دیوار تک کو بھی چھو سکوں۔۔۔ مارے شرمندگی و ندامت کے میں وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ جب ایک بے حد نحیف و نزار سی خاتون نے آ کر میرا کندھا ہلا دیا۔

"بیٹی! مجھے اندر لے چل۔۔۔ زیارت روضہ رسول صلی اللہ و سلم کروا دے۔ میں کب سے اپنی نواسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ وہ جانے کہاں ہے۔۔۔ دیکھ پاکستانیوں کو زیارت کے لیے آواز پڑ رہی ہے۔ چل جلدی کر مجھے بھی لے چل' کہیں آج بھی میں محروم نہ رہ جاؤں' کل بھی مجھے زیارت نصیب نہ ہو سکی۔ چل۔۔۔ اٹھ جانا' جلدی کر۔" وہ خاتون مجھے اپنے ہاتھ سے اٹھا رہی تھیں۔ میں اٹھی اور ان کے ساتھ چل دی۔ ڈگمگاتے قدموں اور جھکی پلکوں کے ساتھ اور پھر جیسے ہی میں اندر پہنچی منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو ایک ستون سے دیوانہ وار لپٹ گئی۔

میرے اندر اک آتش بھڑک رہی تھی اور میں موم کی طرح پگھلتی اور مشت خاک کی طرح بکھرتی جا رہی تھی۔ وہاں میں ہی کیا میرے اردگرد ہر ایک کی یہ ہی حالت تھی۔ بلکہ وہ بزرگ خاتون جو میرے ساتھ آئی تھیں۔ وہ مجھ سے ذرا آگے ریاض الجنتہ میں سجدہ ریز ہوئی' ہچکیاں لے رہی تھیں۔ میں منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تکتی۔ جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے کے سامنے ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو لفظ ہی نہ ملیں
یہ سوچتا ہوں کہ مانگوں تو کس طرح مانگوں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم! رحمت کون و مکاں ہے آپ کا نام
ہر اک درخت کا سایہ' ہر ایک چھت کا ستون

ہر ایک درد کا درماں' ہر ایک غم کی دوا
ہر ایک آنکھ کی ٹھنڈک' ہر ایک دل کا سکوں

تیرے دامن رحمت سے بعید کہ میں
تیری گلی سے تہی دست لوٹ کر جاؤں

وہ جس کو ساقی کوثر کہا ہے قرآں نے
میں اس کے شہر میں آ کر بھی تشنہ لب لوٹوں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دہلیز پہ کھڑی ہوں میں
جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہوں حال دل تو کس سے کہوں؟

حضور بارگہ فیض سے عطا ہو مجھے
وہ کیف و درد کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

وہ آگ دے کہ پگھل جاؤں موم کی صورت
حریم دل کو اجالوں مثال شمع جلوں

نگاہ و قلب کی گہرائیاں ملیں مجھ کو
کہ دل پہ چوٹ بھی کھاؤں تو آہ تک نہ بھروں

مرے وجود کی قاشیں بکھر بکھر جائیں
میں تیرے شہر کی گلیوں کی دھول بن جاؤں

"اٹھو! بیٹی اٹھو! آؤ مجھے واپس بھی لے چلو۔۔۔ وہ

دیکھو ساری پاکستانی خواتین چلی گئی ہیں اور ڈیوٹی پر موجود وہ عورتیں مجھے بار بار ڈانٹ رہی ہیں' کہتی ہیں جاؤ دیدار روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کرلیا۔ اب جاؤ تاکہ دوسری خواتین کی بھی باری آئے۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ دو بوندیں ہونٹوں سے لگالینے سے کبھی صدیوں کی پیاس بجھتی ہے۔ وقت مقرر کردیا ہے بھلا عشق بھی جلدی جلدی کیا جاتا ہے۔ نفل تک تو آرام سے پڑھنے نہیں دیتیں۔ اری! پیارے حبیب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار سے بھی ڈانٹ ڈانٹ کر نکالتی ہیں۔ تمہارے سینے میں کیا دل نہیں ہے۔ خود تو ڈیوٹی کے نام پر سارا دن سیراب ہوتی ہیں دیدار کی بہاریں اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھواریں لیتی ہیں اور ہم جیسوں کو ذرا دیر کی خوش بختی بھی سمیٹنے نہیں دیتیں۔

چل اٹھ میری بچی! آ پھر وہیں چل کر بیٹھیں۔ ہمارا حال دل تو پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک وہاں سے بھی پہنچ جائے گا۔ اور ہمارے درود پاک کی آواز تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے بھی سن لیں گے۔"

اماں جی نے پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ٹھیک اس انداز میں واپس مسجد نبوی لے آئیں جیسے کچھ دیر پہلے وہاں سے اندر میری حاضری لگوانے لے گئی تھیں۔ میں ان کا ہاتھ تھامے حسرت بھری نگاہوں سے دربار نبی سے جدا ہو رہی تھی' کیونکہ کل صبح نماز فجر کے بعد ہم نے مکہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز فجر ادا کرنے کے بعد اور رحمت دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ ناز میں الوداعی سلام پیش کرنے کے بعد جب ہم احرام باندھ کر مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے تو میں نے ایئر کنڈیشنڈ بس کی سیٹ کا لیور دبا کے اسے کچھ اور آگے کیا' تاکہ کھڑکی سے باہر با آسانی دیکھتی رہوں تو میرے دل نے ہولے سے کہا۔

کچھ اندازہ بھی ہے کہ وہ سفر کیسا ہوگا؟ اور کچھ خبر بھی ہے کہ ان دونوں موسموں کی شدت کا کیا عالم ہوگا' جب چودہ سو سال پہلے ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا کارواں ان پہاڑوں اور گھاٹیوں میں نکلا ہوگا اور ان پتھریلی پگڈنڈیوں اور صحرا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارواں کے پاس کیسا سامان اور زاد راہ ہوگا؟"

میں نے کھڑکی سے باہر خاکی رنگ کے خشک پہاڑوں کو دیکھا جو اس وقت تیز دھوپ سے تپ کر تانبے جیسے ہو رہے تھے تو ان آسمان کو چھوتے پہاڑوں کی گرمی مجھے اس فل ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بھی پسینہ پسینہ کر گئی۔

اور یہ سوچتے ہوئے کہ "کیسے میرے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کٹھن راستوں کو عبور کرکے اور جانے کتنی کڑی راتیں اور سخت دن گزار کے مدینے پہنچے ہوں گے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت دو جہاں تھکن سے چور ہو کر کسی جگہ پڑاؤ کرتے ہوں گے تو جانے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھجوریں اور ستو میسر بھی آتے ہوں گے یا نہیں۔"

"لو عصمہ! یہ سیب کھالو! اور یہ جوس بھی لے لو۔" نصیر احمد نے جب ایک سرخ ترو تازہ سیب اور پنج جوس کاٹن میری طرف بڑھایا تو میں نے انتہائی شرمساری سے اپنی نگاہیں ان جلتے تپتے سے پہاڑوں سے چرا کر اندر موجود لوگوں پر گاڑ دیں' جو اپنی سیٹوں کو آرام دہ بنا کر نیم دراز تھے اور اکثر ہماری طرح کھانے پینے میں جت چکے تھے۔

میں نے نصیر احمد کا دیا ہوا سیب اور جوس اس وقت تو اپنے شولڈر بیگ میں ڈالا اور چند لمحوں کے بعد ہی میری نگاہیں مدینہ منورہ کے گرد احاطہ کیے مقدس پہاڑوں کا بوسہ لے رہی تھیں اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ان سب کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر ساتھ لے جاؤں اور اپنے اندر سمو لوں۔ تاکہ وہاں جا کر جب چاہے پلکیں نیچی کروں اور اپنے دل میں موجود ان نظاروں سے اپنی روح کو تازہ کرلیا کروں' لیکن ایسا کہاں ممکن تھا۔

وہ بھی مجھ جیسی نکمی اور نالائق کا دل.... جہاں دنیا کی ہزار اور محبتوں کے نظارے تھے' جو میں نے ایسے ہی خیال کے ساتھ قید کر رکھے تھے۔ سو میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ان میں موجود آنسوؤں کو بہنے دیا۔

جگر خراش ہے کچھ اس قدر حدیث وداع
یہ سوچتی ہوں بچھڑنے کی بات ہی نہ کروں

تری گلی سے جو نکلی تو یوں لگا مجھ کو
کہ عمر بھر کے لیے اپنے گھر سے جاتی رہوں

ہر ایک گام پہ ٹپکے میرے جگر کا لہو
ہر ایک موڑ کو اشکوں کے ہار پہناؤں

عطا ہو دولت عرفان و آگہی مجھ کو
ہزار کوس پہ جا کر بھی تیرے پاس رہوں

"آمین..... ثم آمین۔" میرا ریشہ ریشہ لرز رہا تھا اور لرزتا ہوا یہ ہی کہہ رہا تھا۔

مدینہ منورہ سے یہ جدائی مجھے دنیا کی ہر محبت کے جدا ہو جانے سے زیادہ اداس اور غم زدہ کیے جا رہی تھی۔ اور میرا روم روم گواہی دیتا جا رہا تھا کہ مجھے اپنے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں اور ان پر یقیناً" والدین اور میری اولاد اور میری ہر محبت قربان ہے۔

اگرچہ میں پہلی بار عمرہ کی سعادت کے لیے آئی تھی اور مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کی جانب بھی میرا یہ سفر پہلی بار ہی تھا۔ پھر بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ان راستوں کے ساتھ تو میرا جنم جنم کا رشتہ ہے۔ تب ہی تو مکہ سے دو چار کلو میٹر دور ہی جب میری نگاہ بلند پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر پڑی جہاں شہر مکہ کے آثار دکھائی دینے شروع ہوگئے تھے تو ان عام سے رہائشی گھروں کو دیکھ کر ہی میرا ذہن صدیوں پیچھے چلا گیا تھا اور تاریخ کے بے شمار اوراق میرے خیالات پر پلٹنے لگے تھے۔ اور جب تاریخ کا وہ سنہری ورق میرے ذہن کی روح کو چھوتا ہوا میرے سامنے پھیلا جب محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش مبارکہ ہوئی تھی تو میں خود خزاں رسیدہ پتے کی طرح کپکپانے لگی۔

واقعی اللہ جل شانہ نے اس شہر کو کیسے عظیم اعزاز سے نوازا تھا کہ اسے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت کے لیے منتخب کیا تھا۔ میرے دماغ کی اسکرین پر وہ فلم چلنے لگی جو بچپن سے میری آنکھوں کو دکھائی اور کانوں کو سنائی گئی تھی۔ پہلی جماعت کے اردو کے قاعدے سے لے کر بی اے تک میں اسلامیات کو ہی اپنا پسندیدہ مضمون صرف اس لیے رکھا تھا کہ یہ میرے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کی سیرت سے مزین تھا۔ اس وقت میرا ذہن بہت سے معصوم اور حسین سوالات سے معطر تھا کہ حضرت عبدالمطلب نے کس طرح اپنے پوتے کو ہاتھوں میں اٹھایا ہوگا اور وہ کس طرح سے خانہ کعبہ میں داخل ہوئے ہوں گے؟

جب انہوں نے آپ کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھا ہوگا تو ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ایک روز یہ ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم شاہ دو جہاں ہوں گے۔ اور اس روز کا سورج کس آب و تاب سے نکلا ہوگا اور اس رات کے چاند نے ریگ زار عرب میں اپنے سے لاکھوں گنا حسین چاند کا چہرہ مبارک دیکھ کر کیا محسوس کیا ہوگا؟ خیالات کی رو بہتی گئی اور اس لمحے کا تصور کرکے میرا دل بھر آیا جس لمحے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دادا کی شفقت سے محروم ہوئے اور پھر نہ ماں' نہ باپ' نہ دادا اور پھر مجھے حضرت ابو طالب کی شفیق' مگر بے خوف اور نڈر شخصیت کا خیال آیا اور میرا دماغ ماضی کی پگڈنڈیوں پر زمانی اور ترتیب کے بغیر بھٹکتا رہا۔ غار حرا' ابرہہ کا لشکر جرار' حضرت عبدالمطلب کے اونٹ' ابابیلوں کے جھنڈ' کھایا ہوا بھس' قریش کے مظالم' ابی طالب کی گھاٹی' صفا کا پہاڑ' مکہ میری نظروں کے سامنے تاریخ میں ڈھلتا رہا اور میں نے دیکھا کھڑکی کے باہر کے مناظر چودہ سو سال پہلے والے نہ رہے تھے۔ بلند و بالا آسمان کو

چھوتی جدید طرز تعمیر کے شاہکار' وہ عمارتیں جو اب میری نگاہوں کے سامنے تھیں' انہیں دیکھ کر میرا جی پریشان ہونے لگا اور میں نے بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔

لبیک اللھم لبیک۔

کچھ ہی دیر کے بعد جب ہم حرم کعبہ میں داخل ہو رہے تھے تو میرے سر سے میرا دماغ بھک کر کے نکل چکا تھا اور وہ ساری دعائیں بھی جنہیں میں حج و عمرہ کی کتابوں سے یاد کر کے آئی تھی اور جن کے بارے میں ماما نے بھی خاص تلقین کی تھی کہ جب کعبہ پر پہلی نگاہ پڑے تو یہ دعا پڑھنا اور یہ دعا پڑھنا اب کعبہ میری نگاہوں کے سامنے تھا اور میں نصیر احمد کا بازو سختی سے پکڑے ہوئے صرف اسے دیکھ رہی تھی۔

میرے سامنے سیاہ قبا میں ملبوس خانہ کعبہ موجود تھا اور گواہی دے رہا تھا کہ دنیا بھر میں اس سے عظیم' اس سے حسین اور اس سے عجیب کوئی اور گھر نہیں ہو سکتا۔ وہ گھر جسے اس کے جس بھی دروازے سے اور جس بھی زاویے سے کوئی دیکھے اس کا تمام تر جلال و جمال ایک سا دکھائی دیتا ہے اور جسے دیکھنے کے لیے کسی شعوری کوشش یا پلاننگ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ تشنگی سے سلگتی آنکھیں کسی مقناطیسی کشش کے تحت خود بخود اس کی طرف مڑ جاتی ہیں اور پھر اسی کا حصہ بن جاتی ہیں۔

نصیر احمد نے اپنا بازو مجھ سے چھڑا کے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور مجھے خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے جم غفیر کے اندر لے گئے تھے۔

جہاں اگلے چند لمحوں میں ہم بھی اس انسانی ریلے کا حصہ بن کر خانہ کعبہ کے گرد چکر کاٹ رہے تھے جو یقیناً" صدیوں سے یوں اس مدار کے گرد گھوم رہا تھا اور جسے یقیناً" دنیا کے ختم ہونے تک یہ سلسلہ جاری رکھنے کا حکم تھا۔

☼ ☼ ☼

حرم میں خاصا ہجوم تھا۔ پھر بھی ہمیں طواف و سعی

میں ڈیڑھ گھنٹے سے کم وقت لگا۔ سعی کے دوران بھی میرا ذہن بہت دور کے منظروں میں کھو گیا تھا۔ جب روتے بلکتے اسماعیل علیہ السلام کو ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے لٹا کر پانی کی تلاش میں حضرت ہاجرہؓ قریبی پہاڑی صفا تک پہنچیں اور ادھر ادھر دیکھا کہ شاید کوئی ذی روح پر نظر پڑ جائے جس سے وہ مدد لے سکیں۔ اور شاید کہیں پر پانی نظر آجائے۔ مگر ان کی نظریں مایوس لوٹیں تو وہ بے تاب ہو کر نیچے اتریں' بے کلی سے اپنی قمیص کا ایک کنارہ پکڑ کر اندوہ و غم کی تصویر بنی دوسری قریبی پہاڑی مروہ پر پہنچیں۔ وہاں بھی خشکی اور ویرانی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اسی بے قراری و بے کلی کی حالت میں انہوں نے سات چکر لگائے۔ ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی کی طرف جب بھی وہ آتیں تو روتا بلکتا بچہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا۔ وہ یہ فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرتیں' تاکہ ان کی نظریں جلدی سے بچے کو دوبارہ دیکھ سکیں۔ ساتویں چکر پر جب وہ مروہ کی پہاڑی پر پہنچیں تو ایک آواز سنائی دی۔ رک کر غور سے سننے کی کوشش کی۔ آواز پھر گونجی' ہاجرہؓ بے تابی سے بولیں "بولنے والے بول' میں نے تیری آواز سن لی ہے۔ اور سن!

"اگر تو میری کچھ مدد کر سکتا ہے تو کر۔"

فوراً" ہی ایک نورانی چہرے والا فرشتہ ظاہر ہوا جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس کھڑا تھا۔ اسماعیل علیہ السلام پیاس کی شدت سے اپنی نرم و نازک ایڑیوں کو زمین پر رگڑ رہے تھے۔ دیکھا تو وہاں سے ایک پانی کا چشمہ ابلنے لگا تھا۔

ہاجرہؓ دوڑی دوڑی آئیں اور پانی کے گرد مینڈھ سی بنانے لگیں اور پھر چلو بھر بھر کے مشکیزہ بھرنے لگیں۔ پانی کا چشمہ جوش سے ابل رہا تھا۔ جسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پلایا' تب فرشتے نے کہا۔

"یہ سامنے جو اللہ کا گھر ہے اسے ایک دن یہ بچہ اور اس کا باپ دوبارہ تعمیر کریں گے' کیونکہ اللہ اپنے دوستوں کو ضائع نہیں کرتا۔"

میں صدیوں قبل کے خیالی راستوں سے پلٹی تو سعی

کا ساتواں چکر پورا ہو جانے کے بعد باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔ حالانکہ آج حرم کے ان عالی شان ستونوں کے درمیان ہموار فرش والے راستے پر سعی کرنا کچھ صعوبت کا کام نہیں' مگر پھر بھی میری سانسیں پھول گئی تھیں اور میرا دل اعتراف کر رہا تھا حضرت ہاجرہؓ کی سعی کو اگر اللہ نے یہ عظیم درجہ دے ڈالا کہ اس رسم کو نبھائے بغیر عمرہ و حج کے فرائض پورے نہیں ہوتے تو واقعی ان کی سعی کا یہ ہی درجہ تھا۔ آخر وہ ایک ماں کی تڑپ تھی اور بے قرار دل کی ایک خاموش دعا' ماؤں کی دعائیں کیا مقام درجات رکھتی ہیں مجھے سمجھ آگئی اور ایسے میں مجھے میری ماما شدت سے یاد آگئیں۔ اور میرے آنسو نکل آئے۔ تب کعبہ کو نگاہوں میں سمو کر اور آب زم زم پیتے ہوئے مقام ابراہیم پر نوافل کی ادائیگی کے بعد میں نے اپنی ماما اور نصیر کی اماں کے لیے بہت سی دعائیں کیں۔ تب وہ دونوں ہستیاں نور کے ہالوں کی طرح مجھے اپنے آس پاس ہی محسوس ہوئیں۔

☼ ☼ ☼

دعائیں تو میں نے غلاف کعبہ سے لپٹ کے۔ حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے اور حطیم میں سجدہ ریز ہو کر بھی بہت کی تھیں۔ بہت روئی بھی بہت مچلی تھی۔

"میں عصمہ نصیر! اللہ جل شانہ کے سامنے صرف رو ہی سکتی تھی اور کر بھی کیا سکتی تھی میرے پاس تھا ہی کیا۔ اک یہ ہی آنکھوں کا پانی ہی تو تھا جو میری تمام تر آرزوؤں اور خواہشوں کی زبان بنا ہوا تھا اس وقت۔"

"چلو کچھ دیر کے لیے وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔" نصیر احمد نے رکن ایمانی کے پاس فرش پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا اور ہم دونوں وہاں آکر بیٹھ گئے۔

"تم نے محسوس کیا عصمہ! کہ کعبۃ اللہ میں اک عجیب طرح کا شکوہ ہے۔" نصیر احمد نے خانہ کعبہ پر اپنی نگاہیں عقیدت و محبت سے جما کر مجھ سے پوچھا۔

"ہاں۔ سیاہ مخملیں لباس میں لپٹی یہ عمارت ایک مرکز ثقل ہے۔ ایک ایسا مرکز ثقل جس کی طرف

ساری دنیا کے مسلمان کھنچے چلے آتے ہیں۔"

میں نے دیس دیس سے آئے ہوئے بے حساب مسلمانوں کی طرف دیکھا اس وقت خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنے والوں کا خاصا رش تھا اور اسی طرح سے لاتعداد لوگ وہ بھی تھے جو حرم میں بیٹھے اک وارفتگی سے خانہ کعبہ کو تک رہے تھے۔

"نصیر!" میں نے بھی اس چوکور سیاہ عمارت پر نگاہیں جمائے جمائے کہا جس کا نام کعبہ اگر تھا تو بالکل درست تھا اور یہ نام دنیا کی کسی اور عمارت کا نہیں تھا۔ نہ ہی ہو سکتا تھا۔

"ہوں۔" نصیر کی حالت بھی میری حالت سے جدا نہ تھی وہ بھی صرف اور صرف کعبے کو ہی تکے جا رہے تھے۔

"اس پر نگاہ پڑتے ہی روح میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوتا ہے اور بندگی کا احساس لہو کی ایک ایک بوند میں کسمسانے لگتا ہے...... ہے نا؟"

میں نے نصیر کی طرف دیکھے بغیر نصیر سے پوچھا...... یہاں آکر ہر مسلمان میری طرح سے اور کسی بھی جانب نہیں دیکھ سکتا۔ کعبہ کسی کو بھی اپنے سوا کچھ اور نہیں دیکھنے دیتا۔

"ہاں صنم آشنا دل رکھنے والوں کی جبینوں میں ہی ہزاروں سجدوں کی آرزو مچلنے لگتی ہے اور بڑے بڑے تاجروں کے سر خود بخود خم ہونے لگتے ہیں۔" وہ بھی اس کے سحر میں کھوئے کھوئے سے بولے۔

ہم دونوں ہی دیکھ رہے تھے اور ہماری طرح لاتعداد' بے حساب لوگ دیکھے جا رہے تھے...... روشنیوں سے نہائے ہوئے صحن حرم کے بیچوں بیچ اللہ کے سیاہ پوش گھر کا جاہ و جلال ہولے ہولے شفقت' دلبری اور دلداری میں بدلنے لگا تھا اس کی کشش اپنی طرف کھینچ رہی تھی ہمت بندھا رہی تھی حوصلہ بخش رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رب کریم کا دست عطا پھیلا ہوا ہے اور میزاب رحمت سے پکار اٹھ رہی ہے۔

"مانگ! تجھے کیا مانگنا ہے؟"

"بتا! تیری حاجت کیا ہے؟"

سے مالامال کردوں۔"

اور ایسے میں میرا کم حیثیت غریب و نادار دل میرے سینے میں مچل مچل کے رونے لگا تھا کہنے لگا تھا۔

"اے رب کریم! میں تجھ سے کیا مانگوں؟
کیا کہوں مجھے تو مانگنا نہیں آتا میرے مالک! تو جانتا ہے میری ساری حالتوں سے تو واقف ہے۔ میری سب حاجتوں کی تجھے خبر ہے اور تیرے سوا بھلا کون جانتا ہے کہ میں تو دعا مانگنے کا حوصلہ اور سلیقہ دونوں ہی گنوا بیٹھی ہوں۔ میں کم علم تو مانگنے کے آداب سے بھی نا آشنا ہوں۔
لیکن تو تو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ ہماری دھڑکنوں میں بسی تمناؤں سے بھی واقف ہے وہ تمنائیں جو لفظوں میں ڈھلنے کے قابل بھی نہیں سمجھتیں اپنے آپ کو تو نے بلایا تھا۔ ہم آگئے ہیں یا رب!
اب تو جان اور تیری رحمتیں مجھے تو بس اتنا یقین ہے کہ تیرے در سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔
اے بن کہے سننے والے! سن لے میری دھڑکنوں کی التجا کیا ہے۔
میں اپنی عرضوں کی پوٹلیاں کھول کر کیا کروں گی تو تو جانتا ہے ان پوٹلیوں میں کیا ہے
بس ان پوٹلیوں سے میری دعاؤں اور التجاؤں کا بوجھ ہلکا کردے
اور اپنی رحمتوں اور عنایتوں سے میرا دامن بھردے
"وہ جو میرا نہیں ہے اسے میرا کردے۔"

اس اونچے سیاہ شملے والے کو تکتے تکتے میں نے نصیر احمد کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا

میں کب سے حطیم میں کھڑی اور انتظار میں تھی کہ نیچے سجدوں میں گڑگڑاتے ہوئے لوگوں میں سے کوئی ایک بھی اٹھے تو میں اپنی جبیں وہاں رکھ دوں آج حطیم میں کچھ زیادہ ہی رش تھا تل دھرنے کی جگہ بھی نہ تھی اندر تو میں جیسے تیسے کرکے گھس ہی گئی تھی مگر نفل پڑھنے کا موقع نہ مل رہا تھا۔۔۔۔ جہاں میں کھڑی تھی وہیں پر مجھ جیسی کوئی گناہ گار پڑی جانے کب سے سسک رہی تھی۔ میں اس کے بچھونے لیتے وجود کو دیکھ کر سوچ ہی رہی تھی کہ اگر یہ اب یہاں سے اٹھے گی تو میں اس کی جگہ پر فوراً ہی جھک جاؤں گی۔۔۔۔ ادھر میں نے ابھی سوچا ہی تھا کہ اس کے بالکل ساتھ والی خاتون نے سجدے سے سر اٹھایا اور مجھے خود پکڑ کر اپنی جگہ پر کھینچ لیا۔ اور میں اس کالی کملی والے پر صدقے واری جاتی ہوتی سجدے میں جھک گئی۔ وہ واقعی انسان کی شہہ رگ سے بھی قریب ہے اور دلوں کے بھید جانتا ہے اور پھر یہاں پر تو واقعی وہ سانس سانس کے ساتھ سنتا اور جواب دیتا تھا اپنے ہونے کا یقین دلاتا تھا۔

دو نفل پڑھ کر میں نے سجدے سے سر اٹھایا تو وہ خاتون وہیں حطیم میں ہی ایک کونے میں سر دیے بیٹھی تھی۔۔۔۔ میری ایک نظر اس پر پڑی پلٹی اور پھر پڑی تو پلٹنا بھول گئی۔ قریب تھا کہ میں حیرت سے وہیں پر بے ہوش ہی ہو جاتی کہ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی اور آکر مجھ سے لپٹ گئی۔

"دلنشین بی بی۔" وہ مجھے اپنے سینے کے ساتھ بھینچے ہوئے سسک رہی تھی اور اس کے لبوں سے ایک ہی بات باری باری نکل رہی تھی۔

"قربان جاؤں میں اپنے سوہنے کے۔ جس نے میری دعا کو اتنی جلدی سن لیا مجھ خطاکار کی منت کو رائیگاں نہیں کیا۔ میں نثار ہو جاؤں اپنے مالک کے اپنے خالق کے جو میری ہر سانس کا مختار کل ہے۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ لپٹائے ہوئے تھی جب انسانوں کے اس ریلے نے ہلچل کی اور ہم دونوں ہی ایک دھکے کے ساتھ حطیم سے باہر آگئیں۔ یقیناً" وہ دعا پوری ہو چکی تھی جس کی قبولیت کے نتیجے میں ہم دونوں اس وقت حطیم میں اکٹھی ہوئی تھیں۔

اس کے وقت میرے سامنے شموں تھی مارے خوشی اور حیرانی اس کا برا حال تھا اس کے لب کپکپاتے۔۔۔۔ وہ میرا نام لیتی اور پھر خانہ کعبہ کے غلاف کو چومنے لگتی۔۔۔۔ اور میں اس سے زیادہ حیران فقط اپنے لرزتے وجود کو سنبھالے کبھی اسے دیکھتی اور کبھی مہربان گھر کو۔۔۔۔

جو میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"میرے لیے بچھڑے ہوؤں کو ملانا کیا مشکل ہے۔ بے شک میں ہی جدا کرتا ہوں اور پھر میں ہی ملا دیتا ہوں۔۔۔۔ کس کو کب اور کیوں؟ یہ میری مرضی؟" کعبہ اپنی شان و شوکت کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا اور میں اس کے پرسکون سائے میں کھڑی شموں کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ شموں! جو اس وقت اپنی متورم اور حلقوں والی آنکھوں کے باوجود بے حد پرکشش اور حسین دکھائی دے رہی تھی سفید احرام کے ہالے میں اس کا چہرہ بالکل نور کے ہالے میں مسکراتے ہوئے چاند جیسا دکھائی دے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کچھ دیر کے بعد میں، شموں، نصیر اور فضل بھاجی حرم کے اوپری حصے میں بیٹھے تھے۔
فضل بھاجی نے داڑھی رکھ لی تھی ان کا چہرہ اور بھی شفیق نظر آتا تھا وہ چہرے پر ہلکی ہلکی مسکان لیے حرم کو تکتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"یہ سب اسی کملی والے کی کرم نوازی ہے۔ یہیں پر میں نے اپنا دل اس سوہنے سرکار کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا میں اپنا دل اپنی نوک زبان پر نہ بھی لاتا تب بھی رب سچے نے جان ہی لینا تھا۔
بس یہ میرے آقا ہی کی محبت ہے۔ اسی کا کرم ہے کہ میری بات بن گئی شموں کی خواہش میرے لیے بس ایک دعا بن کر رہ گئی تھی۔۔۔۔ میں نے تو ڈھنگ سے مانگا بھی نہ تھا۔ بس اس رحمتوں والی سرکار نے پھر بھی مجھے نواز دیا۔"

فضل بھاجی کی آنکھوں سے نذرانہ عقیدت کے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر ان کی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے اور شموں کے ہونٹ تھرتھراتے ہوئے سسکیاں چھوڑ رہے تھے۔

"میں نے شموں کے سامنے اپنا دامن نہیں پھیلایا تھا کیوں شموں۔" وہ لحظہ بھر کو اپنی نگاہ کعبہ سے ہٹا کر شموں پر ڈالتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"مجھے کچھ خبر نہیں دلنشین بی بی! میرے ساتھ کیا ہوا؟ میں تو کسی اور کی طلب میں بھٹک رہی تھی۔ میں

سمجھتی تھی کہ میرا من اور تن سب کسی اور کا ہے اور میں سوائے اس کے کسی کے نام کا سرخ جوڑا نہ پہنوں گی..... لیکن کب میری محبت کا مدار بدل گیا کب میری نگاہوں کے زاویے فضل پر مرکوز ہو گئے مجھے کچھ خبر نہیں یہ سحر تھا یا کوئی تگڑا عمل میرا جی لاڈی سائیں سے ہٹ کر فضل کا مداح ہو گیا لبالب بھر گیا اس کی محبت سے اور اتنا بے کل ہو گیا کہ ایک روز میں اس کے قدموں میں جھک گئی میرے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ میں اسے کہتی..... مجھے اپنا لو..... میں تو اس کے بغیر اتنی اداس ایسی نکمی اور ادھوری ہو گئی تھی کہ میرا سارا وجود دیمک لگی لکڑی جیسا بے وزن اور کھوکھلا ہو کر رہ گیا تھا۔"

شموں نے فضل کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اس کی نظروں میں اس وقت جو محبت تھی وہ عقیدت اور ادب کی نمی سے لدی پھندی تھی جیسے وہ فضل کی محبوبہ نہیں بلکہ مرید ہو میری عقل، میری دانش اور میرا دل حیرانی سے اسے تکتے ہوئے انگشت بدنداں تھے وہ میرے سامنے اک معجزے کی طرح بدلی ہوئی بیٹھی تھی یہ کیا تھا کیا صرف فضل کی دعا کی گہرائی اور شدت تھی یا اس کے دل میں لگی آتش کا سینک جس نے شموں کا دل موم کی طرح پگھلا کر اس میں رکھے ہوئے معبدوں کی صورت بدل ڈالی تھی۔

"اور وجیہہ! وجیہہ کا کیا ہوا؟" نادانستہ ہی میرے لبوں سے نکل گیا۔

"وجیہہ سائیں کی حالت تو ہم سے بھی بری ہو گئی تھی وہ تو کملے ہو گئے تھے ملنگ بن گئے تھے یہاں، یہاں پڑے رہتے تھے دن رات۔"

فضل نے ذرا فاصلے پر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے ایک ستون کی نشاندہی کی میں نے دیکھا وہاں پر اب بھی ایک دیوانہ بیٹھا وارفتگی شوق سے کعبے کو تک رہا تھا..... ہوش سے بے گانہ اور خرد سے عاری۔

"سائیں تو بس روتے رہتے تھے ان کی ہچکیاں کسی پل نہ رکتی تھیں۔ وہ اپنے سینے کو اکثر اپنے ناخنوں سے کھرچتے اور کہتے تھے..... فضل! میرے اندر بڑی آگ ہے میرا کلیجہ جلتا ہے مجھے قرار نہیں ہے میری جان کو بڑی اذیت ہے میں کیا کروں؟" فضل کی آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی میں اور بھی روانی آ گئی۔

"وہ یہاں سے اٹھتے تو غلاف کعبہ سے جا لپٹتے..... بس اور نہیں تو وہ جاتے ہی نہ تھے نہ انہیں بھوک لگتی تھی نہ پیاس۔ میں کھانا لاتا جوس لاتا مگر سب کچھ پڑا کا پڑا رہتا..... اگر کبھی منہ میں کچھ ڈالتے تو دو تین کھجوریں اور جا کر وہاں مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر آب زم زم پیتے اور دعا کرتے میرے اللہ! میرے سینے کو ٹھنڈا کر دے..... پھر اٹھتے اور وہاں سعی کے مقام پر کھڑے ہو کر کعبہ رخ تکتے جاتے اور روتے جاتے تھے کہتے جاتے یا حی یا قیوم میری پیاس کو بھی بجھا دے اسی طرح جیسے کہ تو نے اسماعیل کی پیاس بجھائی تھی۔" اور پھر مجھ سے لپٹ کر سسکنے لگتے۔

"فضل! اسماعیل کی عظیم ماں نے تو اپنے بچے کی پیاس سے تڑپ کر یہاں سات چکر کاٹے تھے مگر میری ماں؟ کتنا بدنصیب ہوں میں کہ میرے ماں کو تو کبھی میری محبت نے اتنا بھی نہیں تڑپایا کہ وہ میری خاطر کبھی دو نفل نماز پڑھ کر دعا کرتی ہو ماؤں کے بہت فرائض ہوتے ہیں بہت ذمہ داریاں ہوتی ہیں اپنی اولاد کے لیے کاش میں بھی ایک سچی مسلمان ماں کا بیٹا ہوتا۔ کاش میری ماں نے بھی میری بھوک مٹانے کے لیے باوضو ہو کر مجھے اپنا دودھ پلایا ہوتا کاش! ایسا ہوتا تو میں کبھی کسی اور چیز کو تو منہ نہ لگاتا۔" وہ اپنی ماں کا گلہ مجھ سے کرتے اور پھر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے مانگتے بے حال ہو جاتے۔ وہ قابل رحم اور قابل عبرت بن کر رہ گئے تھے۔

فیض بتا رہا تھا اور میرا کلیجہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کٹتا جا رہا تھا اس لیے نہیں کہ اس وقت مجھے وجیہہ کی یاد آ رہی تھی اور اس کی حالت مجھے تڑپا رہی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ اس وقت مجھے اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا مجھے تو اپنے مجذوب ہو جانے کا خوف لرزا رہا تھا خود میرا سینہ کھانڈ دینے لگا۔

"اور پھر.....؟" میں نے کانپتے ہوئے لبوں سے

پوچھا۔

"پھر ایک رات وہ وہاں حطیم میں پڑے رہے..... بالکل خاموش اور خشک آنکھوں سے "میزاب رحمت" کو تکتے ہوئے۔ اس رات وہ بے قرار بھی نہ تھے اور اپنا سینہ بھی بار بار نہ مسل رہے تھے۔ نماز فجر کے بعد وہ وہاں سے اٹھے اور مجھے کہنے لگے۔ مدینہ منورہ جانے کا انتظام کرو۔

میں نے فوراً" ایک ٹیکسی کرائے پر حاصل کی اور ہم مدینہ منورہ آ گئے۔

"اور پھر..... پھر کیا ہوا؟" اب کی بار نصیر نے پوچھا تھا..... ان کی باریک سی آواز لگتا تھا کسی گہرے کنویں سے آ رہی ہو۔

"پھر وہ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جالیوں کے سامنے جا کر بیٹھ گئے..... میں دیکھتا تھا اب ان کے لبوں پر صرف درود پاک کا ورد ہوتا اور آنکھوں میں اک التجا نہ آنسو نہ ہچکی نہ ہی کوئی درد وہ ادب و احترام سے وہاں بیٹھے رہے ہم مدینہ منورہ ویسے بھی پہلی بار نہ گئے تھے بلکہ وہ ہماری کوئی پانچویں چھٹی حاضری تھی سرکار مدینہ کے حضور وہ رات ہم دونوں نے ہی اسی حالت میں وہاں گزاری..... اور اگلی صبح جب ہم دونوں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکلے تو ہماری منزلیں ہمارے سامنے روشن تھیں..... میں دیکھ رہا تھا کہ میرے جی میں شموں کے نام سے اک تیز خوشبو پھر سے پھیلتی جا رہی تھی اور وہ صنوبی بی بی کا نام لے لے کر کہہ رہے تھے..... میں صنوبی کے لہو کا حساب کروں تو وہ خالق آگے میرا حساب آسان کر دے گا۔

ان کے چہرے پر ایک پرسکون و پرکیف مسکراہٹ تھی..... ہم وہیں سے پاکستان چلے گئے لاڈی سائیں نے جا کر صنوبی بی بی کے قتل کا اقبال جرم کیا اور خود کو قانون کے حوالے کر دیا اور میں جب گھر لوٹا تو شموں میری راہ تک رہی تھی۔

"یعنی..... اس رحمن ورحیم نے تم دونوں پر اپنا کرم کر دیا تھا۔" نصیر احمد کی فرط جذبات سے لرزتی ہوئی آواز آئی۔

"ہاں وہ مالک کائنات! وہ غفور ورحیم! وہ متین! وہ قادر! وہی جانتا ہے کہ ہم سب کے لیے کیا بہتر ہے..... ہمارے دلوں پر بھی کل اختیار اسی کا ہے۔ اور کب کس کے دل کی حالتیں بدل دے ہم کچھ نہیں جانتے..... ہم جسے اپنا محبوب و معبود مجازی تصور کیے۔ اپنا سب کچھ اس کے نام کیے بیٹھے ہوتے ہیں وہ تو ہمارا ہے یا نہیں یہ بھی اس کعبے کے مالک کو پتا ہوتا ہے۔" شموں قالین سے اٹھی اور جا کر سامنے کی گرل پر جھک گئی۔ سامنے کھڑے اس رعب دار گھر کے جلال کو دیکھنے لگی

"اور ہمارے وہ جذبے وہ ہماری محبتیں جنہیں ہم اپنا اصل اور آخر تصور کیے بیٹھے ہوتے ہیں وہ کب بھربھری مٹی کی طرح ہمارے دلوں سے جھڑ جائیں ہم نہیں جانتے۔" میں بھی اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی اور سامنے کھڑے اس سیاہ جامے میں ملبوس عمارت کو دیکھنے لگی جس کی نظریں مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتی اور مجھے اپنی طرف بلاتی تھیں اور وہ آگ جو ہمارے سینوں کو جلا جلا کر بھسم کرتی رہتی ہے ہم اسے عشق کے نام سے منسوب کر کے خود کو اپنے سچے عاشق ہونے کی خود فریبی میں مبتلا کیے کیسے متکبر رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم اس لازوال جذبے کے وارث ہیں جو پہلے محبت..... اور پھر عشق کے نام سے منسوب ہوتا ہے..... حالانکہ وہ جذبے تو اکثر بے حد سطحی اور کچے ہوتے ہیں حسد اور بغض کے چند ہی شعلوں سے راکھ ہو جانے والے۔" نصیر احمد بھی میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

"اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی محبت ہے تو بس یہی ہے جو اس وقت ہم سب کے دلوں میں ہے اور اگر کوئی خوش بخت عاشقوں کی صفوں میں آتا ہے تو اسی سچے سائیں کے کرم سے آتا ہے اور پھر ہم تم جیسا بالکل ایک نکما اور ناکارہ سا بندہ بھی اتنا خاص اتنا چکل ہو جاتا ہے عشق جیسی نعمت اسے مل جاتی ہے اور وہ..... وہ لاڈی سائیں جیسا بن جاتا ہے۔ جس کا سینہ جب آتش عشق سے جلتا ہے تو پھر اس کے اندر باقی سب بھسم ہو جاتا ہے اگر کچھ رہتا ہے تو فقط اس کا نام اور اسی کی یاد اور پھر ایک شہزادہ اپنے مخملیں بستروں سے

نکل کر دھوپ اور چھاؤں کی پروا کیے بنا دن اور رات کے تصور کے بغیر بس چکر ہی کاٹتا رہتا ہے اور اسی کے گرد گھومتا رہتا ہے۔" فضل بھاجی نے خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کیا "اور جب اماں پاتا ہے تو جا کر شفقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سائے تلے جا کر پاتا ہے۔" فضل بھاجی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سبحان اللہ۔" شموں کی بلند آواز خانہ کعبہ کے غلاف کو چھونے کے لیے لپکی.... نصیر احمد میرے کچھ اور قریب ہو گئے اور انہوں نے میرے گرد اپنا بازو حائل کر کے میری طرف ایک میٹھی سی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بلاشبہ ہم جیسے کم ظرف کم حوصلہ اور تنگ دل لوگوں کو عشق جیسا انمول جذبہ عطا نہیں ہو سکتا ہم تو بس اپنی دنیاوی زندگی کے چار دنوں کے ساتھی کو ہی اپنا محبوب تصور کر لیں اور اس سے کچھ اخلاص کے ساتھ محبت کر لیں تو یہی بڑی بات ہے کسی کو ہم اور کوئی ہمیں معاف کر دے اور ایک عام سا انسان خطا کا پتلا جان کر ہماری خطاؤں سے درگزر کر دے تو بھی ہم باقی ماندہ زندگیاں محبت کے گوشہ عافیت میں بتا سکتے ہیں۔"

وہ میری طرف معذرت اور محبت کے ملے جلے جذبات سے لبریز آنکھیں لیے دیکھ رہے تھے تب میں نے اس مدار عشق کو اپنی نگاہوں میں سمو کر نصیر احمد کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا جس کے گرد اس وقت دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے مسلمان کسی انوکھی ہی کشش سے بندھے چکر لگا رہے تھے اور جو دنیا بھر کے پرہیزگاروں، عصیاں کاروں، گناہ گاروں، نیکوکاروں فقیر و بے نوا، غنی و تاجدار سب کے لیے باعث رحمت تھا سب کا گوشہ عافیت تھا میں نے اپنا سر نصیر احمد کے کندھے سے لگا کر اس مہربان گھر کو دیکھا تب میرے پُرسکون دل نے بے ساختہ کہا۔

نہ کہیں جہاں میں پناہ ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں

☼ ☼ ☼

مجھے کتنی اچھی طرح سے یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ وہ جو ہماری تقدیروں کو لکھنے والا ہے وہ اس میں اچھے اور برے وقت کو اگر لکھتا ہے تو اس میں کیا حکمتیں ہوتی ہیں۔ میری زندگی کی کڑی سے کڑی ملتی جا رہی تھی نصیر احمد کے رشتے کو ٹھکرا کر میرا وجیہہ سے شادی کرنا اور پھر وجیہہ کے ہاتھوں صنوبی کا قتل اور مجھے اس کا طلاق دے دینا۔ ان میں کیسا مضبوط ربط تھا اور جہاں اس سب کے دوران ہم سب نے کڑے دکھ اٹھائے تھے۔ وہیں پر اس مہربان نے ہم سب کے لیے راحت بھی رکھ دی تھی وجیہہ کو راہ ہدایت مل گئی تھی صنوبی قتل ہو کے امر ہو گئی تھی اور مراد جیسے منافق سے بچ گئی تھی۔ شموں کو اللہ نے فضل کی محبت سے فیض یاب کرنا تھا اور میں اور نصیر۔

ہم دونوں کو اللہ نے یہ بات اچھی طرح سے یاد کرائی تھی کہ ہم دونوں ہی انسان ہیں خطا کے پتلے دونوں میں کمیاں ہیں ـــــــ اور دونوں ہی کی محبت کامل نہ تھی جس پر ہم فخر یا تکبر کرتے اور یہ کہ ہم انسان ہیں فرشتے نہیں ہمیں کسی کی غلطی کو اس کی ذلت بنا کر خود کو عزت دار تصور کرنا ہماری اوقات نہیں۔ البتہ ہم دونوں کا نصیب ہمارا جوڑا اس نے ہی بنایا تھا اور بے شک بڑا بہترین بنایا تھا اور صد شکر اس کریم کا کہ اس نے ہم دونوں کے دلوں میں اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھر کے پھر اک دوجے کی محبت میں ڈال دی تھی اور اسی محبت نے مجھے نصیر کے لیے اور نصیر کو میرے لیے بے حد اہم اور معتبر بنا ڈالا تھا اب ہمارے دل اور ہمارے وجود اک دوسرے کے لیے گوشہ عافیت تھے۔

"الحمدُ للہ کہ ہمیں اس ذات باری تعالیٰ نے معاف کر دیا تھا اور اپنے گھر بلا کر ہدایت سے سرفراز کر دیا تھا بے شک وہ بڑا غفور و رحیم ہے بے شک!"

میں نے ایک بار پھر حطیم میں نوافل ادا کیے اور غلاف کعبہ کو چوم کے میزاب رحمت کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھا۔

☼ ☼

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی.... جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے ــــ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے.... زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے.... وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے.... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کر لیتا ہے۔ اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کر دیتا ہے....

(اب آگے پڑھیے)

۱۵

پندرہویں قسط

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رشیدہ کو کچا چبا جائیں وہ انہیں غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔

"ایسی کیا تڑپ تھی اسے گلفام کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی جو وہ اکیلی تن تنہا اتنی دور چل پڑی اور تم نے اسے جانے بھی دیا۔" رشیدہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عظمت خلیل کو کیا جواب دیں۔

یہ سب ان ہی کا تو کیا دھرا تھا وہ ابرار کے سامنے بے ساختہ یہ کہہ جاتیں نہ عظمت خلیل کو اتنی جلدی پتا چلتا اگر نمل کے واپس آجانے کے بعد وہ کچھ جان بھی جاتے تو بھی اس کے سامنے موجود ہونے پر شاید ان کا غصہ اتنا شدید نہ ہوتا۔

مگر انہوں نے ہمیشہ بڑی سیدھی سادی زندگی گزاری تھی' جھوٹ' دوغلا پن ان کی فطرت میں تھا ہی نہیں جو بات جیسے تھی ویسے ہی کہہ دی' کسی قسم کی تیزی طراری ان میں تھی ہی نہیں اور جب سے وہ معذور ہوئیں ان کی زندگی میں پیدا ہونے والی محرومی کے ساتھ ساتھ عظمت خلیل کے طعنے تشنوں نے ان کا رہا سہا اعتماد بھی ختم کردیا تھا۔ کسی عام سے معاملے میں چھوٹا سا جھوٹ بولتے وقت وہ پسینہ پسینہ ہوجاتی تھیں تو اس وقت جب ابرار نے ان سے ان کی فلائٹ' وہاں رہائش اور واپسی کے متعلق ایک کے بعد ایک سوال کیے تو وہ اتنا گھبرا گئیں کہ انہیں یاد ہی نہیں رہا نمل نے انہیں منع کیا تھا کہ اس کی آج کی فلائٹ کے متعلق کسی کو نہ بتائیں۔ مگر ابرار کے سوالوں سے بچنے کے لیے انہوں نے خود کو عجلت میں ظاہر کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ وہ ہی جارہے ہیں دوپہر کی فلائٹ سے۔

جب ابرار نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گئی ہیں۔

زبان سے نکلی بات اور کمان سے نکلا تیر واپس تو ہو نہیں سکتا۔ رشیدہ سے کوئی بات نہیں بنی تو انہوں نے فون بند کردیا اور اس کے بعد سے کسی کی کال اٹینڈ نہیں کی' مگر دنیا سے چھپ جانے سے دنیا آپ سے نہیں چھپ جاتی' انہوں نے سب سے رابطہ منقطع کردیا تو کیا ہوا۔ ابرار نے نمل کو چھوڑ عظمت خلیل کو فون کرلیا۔

یہ اندیشہ تو انہیں تھا کہ اب عظمت خلیل کو سب پتا چل جائے گا۔ اسی لیے نماز سے فارغ ہو کر وہ معمول سے زیادہ دیر تک دعاؤں میں مشغول ہو گئی تھیں۔

تب سے انہیں یقین تھا کہ اب عظمت خلیل کے عتاب کا نشانہ بننے والی ہیں' پھر بھی عظمت خلیل کو شدید طیش میں دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھولے جارہے تھے۔ "دن بہ دن اس کی خود سری بڑھتی جارہی ہے رومیلہ کے لیے اس کے باپ اور بھائی نے جو فیصلہ کیا ہوگا بہتر کیا ہوگا۔ وہ اتنی بڑی کب سے ہوگئی کہ شادی کے لیے لڑکا دیکھنے اور پرکھنے جانے لگے۔ تمہاری شہہ پر وہ اتنی باغی ہوگئی ہے۔" عظمت خلیل غصے سے ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے۔

رشیدہ نے خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھی' ویسے بھی ان میں بولنے کی سکت بھی نہیں تھی۔

عظمت خلیل کو پہلے ہی نمل پر بڑا غصہ تھا جس طرح حشام کے معاملے میں وہ ان کے روبرو آکھڑی ہوئی تھی وہ ہی ان کے لیے ناقابل برداشت تھا' ان کا تو ہاتھ تک اٹھ گیا تھا اس کی زبان درازی پر' مگر وہ ان کا وار صفائی سے بچا گئی۔ وہ اسی پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئے تھے۔

اب اس کا اتنا بڑا قدم اٹھالینا تو انہیں سراسر اپنی بے عزتی لگ رہی تھی دل چاہ رہا تھا کہ اسے ایسا سبق سکھائیں کہ آئندہ کبھی ان کے مقابل آنے کی جرات نہ کرے۔

وہ کافی دیر تک رشیدہ پر چلاتے رہے' رشیدہ سر جھکائے خاموشی سے ان کے زہر میں بجھے تیر سہتی رہیں۔ آخر ایک انسان کب تک اکیلا بول سکتا ہے' وہ بھی جب چیخ چیخ کر تھک گئے تو زوردار آواز میں دروازہ بند کرکے کمرے سے نکل گئے۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ رشیدہ کو کھری کھری سنانے کے باوجود انہیں سکون ملنا تو درکنار غصے میں ذرا سی کمی بھی ن

نہیں آئی تھی۔

اسی لیے انہوں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ نمل کے آنے کے بعد اس کا دماغ ضرور ٹھیک کریں گے۔

☼ ☼ ☼

کینیڈا پہنچتے ہی نمل کے ہوش اڑ گئے۔ موبائل کی جو سم وہ پاکستان میں استعمال کرتی تھی اس نے وہاں پہنچتے ہی کام کرنا بند کردیا۔

نمل ابرار بھائی کے دوست کو فون نہیں کرسکتی تھی اس نے اناؤنسمنٹ کرادی اور نمل خلیل کو کاؤنٹر نمبر 15 سے لے لینے کا کہہ کر خود وہیں کھڑی انتظار کرتی رہی۔

اجنبی ملک میں اجنبی لوگوں کے بیچ اس طرح کھڑے ہو کر ہر گزرنے والے کو بغور دیکھنا کہ کہیں یہ تو ابرار بھائی کا دوست نہیں اسے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔

تقریباً" بیس منٹ تک اس بے زاری اور کوفت کا سامنا کرنے کے بعد — تقریباً" ابرار بھائی کی ہی عمر کا شخص ہاتھ میں ایک بورڈ پکڑے کاؤنٹر پر آگیا۔

بورڈ پر اپنا نام لکھا دیکھ کر نمل تیزی سے اس کی طرف بڑھ گئی۔

"السلام علیکم۔ آپ ابرار کی کزن ہیں نا۔ میں اس کا دوست جعفر ہوں' بس اتنا سا سامان ہے آپ کے پاس۔"

"جی زیادہ سامان کی ضرورت ہی نہیں تھی۔" نمل کو ٹھنڈ تو محسوس ہو رہی تھی' مگر اس نے ظاہر نہیں کیا' حالانکہ پاکستان سے چلتے وقت اس نے احتیاطاً" موٹے کپڑے پہن لیے تھے۔ مگر پھر بھی سردی اس کے اندازے سے زیادہ تھی۔ حالانکہ وہ کوئی پہلی بار کینیڈا نہیں آئی تھی' مگر آخری بار وہ چار سال پہلے آئی تھی' وہ بھی محض کسی کاغذی کارروائی کے لیے۔

عظمت خلیل اور رشیدہ کے ساتھ اس کا قیام بڑا مختصر سا تھا' اس میں بھی وہ دونوں ماں بیٹی ہوٹل میں ہی رہتے تھے اور عظمت خلیل پاکستان کی طرح اپنے معمول کی طرح صبح کے گئے شام تک ہی آتے تھے۔

"آئیں میرے ساتھ۔" انہوں نے اس کا واحد ٹرالی بیگ کھینچتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے' وہ اس قدر تیز چل رہے تھے کہ نمل کو ان کے ساتھ چلنے کے لیے دوڑنا پڑ رہا تھا۔

"آپ کی وائف کہاں ہیں۔" نمل نے پوچھا۔

"وہ ایک اسپتال میں ڈاکٹر ہے' آج اس کی نائٹ ڈیوٹی ہے آپ کی اس سے صبح ہی ملاقات ہوسکے گی۔" نمل نے بے اختیار گھڑی کی طرف دیکھا۔

صبح ہونے میں تو بہت دیر تھی' وہ کیا ان کے ساتھ اکیلی گھر جائے گی' پھر تو گھر پر بھی رات میں کوئی نہیں ہوگا' جانے ان کا بچہ کتنا بڑا تھا۔

نمل کے قدم سست پڑ گئے۔ مگر اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ چنانچہ منتشر ذہن کے ساتھ چلتی پارکنگ میں آگئی۔

گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر انہوں نے اس کا بیگ اندر رکھا تو نمل بھی دوسری طرف کا پچھلا دروازہ کھولنے لگی۔

"Excuce me! i am not your driver" انہوں نے بڑی بے باکی سے اسے ٹوک دیا۔

نمل بے بسی سے انہیں دیکھتی فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی' اسے خود بھی احساس تھا کہ یہ حرکت اخلاق کے خلاف ہے' مگر اب تو اسے اس طرح ایک غیر ملک میں آجانا ہی اخلاقی طور پر ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

سارے راستے اس شخص نے کوئی خاص بات نہیں کی۔ نمل کو یہ دیکھ کر تھوڑا سکون ملا کہ وہ بلاوجہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کر رہے پھر بھی نمل دانستہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی تاکہ وہ کوئی رسمی سی بات چیت بھی شروع نہ کریں۔

ان کا گھر ایئرپورٹ سے کافی دور تھا۔ اتنا لمبا سفر کر کے نمل اچھا خاصا تھک گئی تھی' دل چاہ رہا تھا سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا کر سو جائے' مگر اس طرح کسی اجنبی کی موجودگی میں بے سدھ ہو جانا۔ سراسر بے وقوفی تھی' چنانچہ وہ زبردستی آنکھیں کھولے بیٹھی رہی۔

عجیب ویران سی جگہ پر پہنچنے کے بعد کہیں جا کر ان کا گھر آیا تھا۔

انہیں چابی سے لاک کھولتا دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں خود کو بہت لعنت ملامت کی تھی۔

"آپ کچھ لیں گی' کھانا یا کافی وغیرہ۔" انہوں نے دروازے کے ایک جانب ہوتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں کچھ نہیں۔" نمل نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔

"ارے کافی تو پی لیں ٹھنڈ میں اچھی لگے گی۔"

"آپ کا بیٹا کہاں ہے؟" نمل نے ان کے اصرار کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو بورڈنگ میں رہتا ہے' یہاں اس علاقے میں کوئی اچھا اسکول نہیں ہے اور روز' روز لانا لے جانا ممکن نہیں ہے۔" انہوں نے اطمینان سے کہا تو نمل کا رہا سہا اطمینان بھی رخصت ہو گیا۔

"آپ مجھے کوئی کمرہ بتا دیں پلیز' بہت تھک گئی ہوں۔" نمل کا رویہ حد درجہ خشک اور سپاٹ ہو گیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" وہ اسے اپنی رہنمائی میں ایک کمرے تک لے آئے' کمرہ کافی کشادہ اور آرائشی تھا۔ مگر نمل کو تو گھٹن ہو رہی تھی۔ جعفر نے جیسے ہی اس کا بیگ کمرے میں رکھا نمل بدتمیزی سے بولی۔

"اوکے گڈ نائٹ۔" انہوں نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا اور پھر کچھ بھی کہے بغیر کمرے سے نکل گئے تو نمل نے تیزی سے دروازہ بند کر کے لاک کر لیا۔

بس ایک پل کے لیے اسے سکون کا احساس ہوا' مگر اگلے ہی پل وہ دروازے میں لگی کوئی کنڈی ڈھونڈنے لگی۔ مگر اس ایک بٹن والے لاک کے علاوہ وہاں کوئی اور لاک تھا ہی نہیں۔

"اس کی چابی تو ان کے پاس ہی ہو گی۔" بے اختیار خود کلامی کے انداز میں نمل کے منہ سے نکلا' سفر کی تھکن جیسے ایک دم بہت بڑھ گئی تو وہ نڈھال سے انداز میں بستر پر بیٹھ گئی۔ ساری رات اس کی سوتے جاگتے میں گزری تھی۔ حالانکہ جس حساب سے وہ تھکی ہوئی تھی اسے تو بستر پر گرتے ہی غائب ہو جانا چاہیے تھا' اسی لیے صبح ہی صبح وہ نہا دھو کر کمرے سے نکل آئی گو کہ جعفر کا سامنا کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا' مگر وہ اس خیال سے جلدی ہی باہر آ گئی کہ عموماً" باہر کے ممالک میں آفس صبح جلدی لگ جاتے ہیں اور دور' دور جگہیں ہونے کے باعث لوگ منہ اندھیرے ہی گھروں سے نکل جاتے ہیں تو ایسا نہ ہو کہ وہ بھی چلے جائیں اور نمل' گلفام کے بارے میں ان سے کوئی بات ہی نہ کر پائے' پتا نہیں ان کی بیوی کی واپسی کب ہو اور جانے وہ اس معاملے میں اس کی کتنی رہنمائی کر سکیں' جبکہ اسے آج ہی جعفر سے بات کر کے گلفام سے آج ہی ملنا تھا۔

وہ راہ داری سے گزر کر کچن کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں درمیان میں سلیب لگا کر کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ وہ بیک وقت کچن بھی تھا اور ڈائننگ روم بھی۔

وہ جیسے ہی کچن کے نزدیک پہنچی کسی عورت کے تیز لہجے میں بولتی آواز نے اس کے قدم دروازے پر ہی روک دیے۔

"لیکن تمہارے دوست نے تو کہا تھا پوری فیملی ساتھ آ رہی ہے' اس کے ماموں' ممانی اور ان کی بیٹی۔ تو پھر ان کی کزن اکیلی کیوں آ گئی۔ پاکستان کوئی اتنا آزاد خیال ملک نہیں ہے۔ ایک جوان لڑکی کے پیرنٹس نے اسے اکیلا کیسے بھیج دیا۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو جان اس کے ماں' باپ ساتھ آ رہے تھے' اچانک کوئی ایمرجنسی ہو گئی تو وہ فی الحال اکیلی آ گئی ہے۔ ایک' دو دن میں وہ لوگ بھی آ جائیں گے۔" جعفر کی رسانیت بھری آواز پر بھی اس عورت کے لہجے کی تلخی میں کمی نہیں آئی' وہ اسی زہرخند لہجہ میں بولی۔

"تو جب تمہیں یہ بات پتا چلی تھی تم نے مجھے فون کر کے انفارم کیوں نہیں کیا' اکیلے اسے جا کر لے آئے اور رات بھر گھر میں بھی رکھ لیا۔" نمل اچھی خاصی سردی کے باوجود پسینے سے شرابور ہو گئی' اپنے کسی فیصلے پر اتنا پچھتاوا اسے آج تک نہیں ہوا تھا اس کا دل چاہا وہ ابھی اور اسی وقت پاکستان واپس لوٹ جائے۔

"تو اور کیا کرتا' ابرار نے فون ہی اتنی دیر میں کیا مجھے' جب وہ فلائٹ میں بیٹھ چکی تھی' اب اس وقت ایک دم سے میں اسے گھر لانے سے کیسے انکار کر دیتا۔" جعفر کی آواز میں بے بسی اور جھنجلاہٹ دونوں شامل تھیں۔

"ایسی کون سی ایمرجنسی آ گئی تھی کہ یہ محترمہ فلائٹ میں بھی سوار ہو گئیں اور ان کے پیرنٹس آ ہی نہیں سکے۔ یہ سب صرف بہانے ہیں میں اس کا بھروسہ نہیں کر سکتی۔" جعفر کی بیوی حقارت بھرے لہجے میں بولی۔

"صرف چھ دن کی بات ہے' ابرار نے کہا ہے وہ تین' چار دن میں چلی جائے گی۔"

"میں صرف ایک بات جانتی ہوں وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔" وہ نخوت سے بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے' آج برداشت کر لو میں شام تک اسے کسی ہوٹل میں چھوڑ آؤں گا۔ کیا اب تم خوش ہو؟" جعفر چڑ کر بولے تو وہ عورت تو کچھ نہیں بولی' البتہ برتنوں کو زور' زور سے پٹخنے کی آوازیں ظاہر کر رہی تھیں کہ ماحول میں در چا تناؤ ہنوز باقی ہے۔

نمل بکھرتے وجود کو سمیٹتی خود پر جبر کرتی ناچار' کچن میں داخل ہو گئی۔

"السلام علیکم۔" بڑی مشکل سے وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی تو جعفر سرسری نظر اس پر ڈال کر ایسے بن گئے جیسے بہت دیر سے اخبار پڑھ رہے ہوں' کیونکہ اخبار واقعی ان کے ہاتھ میں تھا' انہیں صرف اپنی نظریں اس پر مرکوز کرنی تھیں۔

جبکہ جعفر کی بیوی جو سلیب پر ناشتے کے برتن لگا رہی تھی طائرانہ نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگی۔ حالانکہ دیکھنے میں جعفر کی بیوی کافی معقول سی تھی' مگر اس کے چہرے کا زاویہ بتا رہا تھا کہ نمل کا حسن دیکھ کر وہ اس سے بری طرح خائف ہو گئی ہے۔

ان دونوں میں سے کسی نے بھی سوال کا جواب دیا نہیں تھا جو نمل کو آگے بات کرنے میں آسانی ہوتی' البتہ خود پر جعفر کی بیوی کی نظروں کی تپش کو کم کرنے کے لیے وہ ہمت کرتے ہوئے بولی۔

"جعفر بھائی! ابرار بھائی کی بہن کا رشتہ جس لڑکے کے ساتھ ہوا ہے کیا آپ آج ہی میری اس سے ملاقات کرا سکتے ہیں۔"

میرے امی' ابو کا آنا کچھ کنفرم نہیں ہو رہا' میں کل کی فلائٹ سے واپس چلی جانا چاہتی ہوں۔ اب اتنی دور آئی ہوں تو کم از کم اس شخص سے ہی مل لوں' جس سے میری کزن کی شادی ہو رہی ہے۔" نمل جلدی جلدی بولی' مبادا اس کی آدھی بات کا کچھ اور ہی مطلب نکالتے ہوئے جعفر کی بیوی بیچ میں ہی نہ بول پڑے۔

جس قسم کی نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی نمل نہیں چاہتی تھی اسی قسم کی زبان اس سے بھی وہ استعمال کرنا شروع کر دے اور نمل کا ضبط جواب دے جائے۔

اس کی بات پر ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اسے دیکھنے لگے۔
"لیکن کل تو پاکستان جانے والی فلائٹ بھی نہیں ہے۔" جعفر نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کے والدین کیوں نہیں آر ہے انہیں تو بس فلائٹ کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔
"اگر اس ایئر لائن سے نہیں ملے گی جس سے میں آئی ہوں تو کسی اور ایئر لائن سے چلی جاؤں گی' ایک ریٹرن ٹکٹ ہی تو ضائع ہو گا کیا فرق پڑتا ہے۔" نمل کچھ تلخ سی ہو گئی تھی اسی لیے رکھائی سے بولی۔
جعفر اس کی بات پر بیوی کو دیکھنے لگا' جبکہ اس کی بیوی بھنویں اوپر کرتے ہوئے کچھ تعجب بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگی' مگر کچھ بولی نہیں۔ شاید پیسے کی اتنی فراوانی نے انہیں حیران کیا تھا یا کوئی اور بات تھی' نمل نے غور کرنا ضروری نہیں سمجھا۔
"گلفام سے آج ہی ملنا تو بڑا مشکل ہے' میں کوشش کرتا ہوں۔" جعفر نے پرسوچ انداز میں کہا' وہ بات نمل سے کر رہے تھے' مگر ان کی نظریں اپنی بیوی کے تاثرات دیکھنے کے لیے اس پر جمی تھیں۔
"آپ میری ان سے بات کرادیں' میں انہیں سمجھاؤں گی' میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے' میرے پاس موبائل تو ہے' مگر میری سم نے کام کرنا بند کر دیا ہے' ورنہ میں خود ان سے بات کر لیتی۔" نمل نے کہا تو جعفر کچھ تعجب سے اسے دیکھنے لگے۔
"تم نے یہاں اپنے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع بھی نہیں دی پاکستان میں تمہارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" نمل کے دل میں ایک ہوک اٹھی تھی۔
امی سے بات کرنے کا کتنا دل چاہ رہا تھا' پہلی بار وہ ان سے اتنی دور ہوئی تھی۔
رشیدہ بھی وہاں اس کی خیریت کی طرف سے پریشان ہوں گی' اس کے فون کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اگر ابرار بھائی نے عظمت خلیل کو کچھ بتا دیا تو رشیدہ کو تو مشکل ہو جائے گی۔ پتا نہیں وہ اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔
نمل کا ذہن کہیں سے کہیں نکل گیا۔
کل رات گھر میں داخل ہو کر جب اس نے خود کو یہاں تنہا دیکھا تو فوراً اپنے کمرے میں بند ہو گئی' ورنہ جہاز میں بیٹھتے وقت اس نے سوچ لیا تھا وہاں پہنچتے ہی امی کو فون کرے گی' لیکن ایئر پورٹ پر جب اس نے دیکھا کہ اس کا موبائل کام نہیں کر رہا تو اس نے جعفر بھائی کے گھر سے کال کرنے کا ارادہ کر لیا۔ امی تک اپنی خیریت کی اطلاع پہنچانا ضروری تھا۔ جعفر کو وہ پیسے بھی دے سکتی تھی۔
مگر اب صورت حال مختلف تھی' اب جعفر کی بیوی آچکی تھی اسے اتنا محتاط ہونے کی ضرورت نہیں تھی تب ہی کافی اعتماد سے بولی۔
"جی مجھے اپنی امی سے بات تو کرنی ہے' مگر پہلے آپ گلفام بھائی سے میری بات کرا دیں۔ میں آپ کو دونوں کالز کے پیسے دے دوں گی۔"
"ارے نہیں' نہیں پیسوں کی بات نہیں ہے۔" جعفر نے اپنی بیوی کو تائیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا' وہ چاہ رہا تھا کہ وہ بھی کچھ بولے' مگر وہ نمل کو بغور دیکھنے اور سننے کے باوجود کچھ بھی بولنے سے گریزاں تھی۔
"مجھے معلوم ہے پیسوں کی کوئی بات نہیں' لیکن مجھے خوشی ہو گی اگر آپ پیسے لے لیں گے' بس آپ جلدی سے میری گلفام بھائی کے ساتھ اپائنٹمنٹ فکس کرا دیں میں جلد سے جلد یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" نمل نے زبردستی اپنے لہجے کو تھوڑا سا نرم بناتے ہوئے کہا۔
وہ ابرار بھائی کے دوست تھے' اسے اپنے گھر لے کر آئے تھے' اب اگر ان کی بیوی کا رویہ اسے اکیلا دیکھ کر ناگوار ہو گیا تب بھی اسے ان پر بگڑنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

"نہیں آپ بے فکر رہیں' میں آج ہی آپ کی گلفام سے ملاقات کرا دوں گا۔" جعفر نے بیوی پر ایک مایوسی بھری نظر ڈال کر اتنی سنجیدگی سے کہا جیسے اسے یقین نہ دلا رہے ہوں' بلکہ خود آج ہی گلفام سے ملنے کا عزم کر رہے ہوں۔

☼ ☼ ☼

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ کل تمہارے اور نمل کے بیچ کچھ ہوا تھا یا نہیں۔" وکی جیسے خرم کی سچائی پرکھ رہا تھا۔
مگر خرم اتنا جذباتی نہیں تھا کہ بغیر یہ جانے کہ وکی کتنا بے خبر ہے اور کتنا باخبر کچھ بھی اگلنے کے لیے تیار نہیں تھا' کیا پتا وکی کس بابت پوچھ رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ کچھ بتا کر اپنی بے عزتی کیوں کراتا' تب ہی آنکھیں کھولتے ہوئے قدرے سختی سے بولا۔
"جب میں کل یونیورسٹی گیا ہی نہیں تو بھلا میرے اور نمل کے بیچ کچھ کیسے ہو جائے گا۔"
"مگر فیس بک میں جو موی ہے اس میں تم اور نمل صاف پہچانے میں آرہے ہو' صرف یہ پتا نہیں چل رہا کہ وہ لڑکا کون ہے' جس نے نمل کو چھیڑا تھا۔" خرم کو زندگی میں پہلی بار اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی تھی۔
وہ ششدر سا موبائل کان سے لگائے کھڑا رہ گیا۔
وہ تو یہ سوچ کر ہی اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ کہیں وکی کو کچھ پتا تو نہیں چل گیا' مگر یہاں تو اس واقعے کی موی بنا کر کسی نے فیس بک میں ڈال دی تھی۔
کسی لڑکے کو تھپڑ پڑنے کا واقعہ عموماً ویسے ہی بہت مشہور ہو تا تھا اور یہاں تو پوری موی موجود تھی' وہ بھی خرم جیسے مقبول طالب علم پر مبنی فلم' گویا یہ حادثہ جتنا بھی زبان زد عام ہو کم ہے۔
خرم حسن کو کسی لڑکی نے تھپڑ مارا یہ خبر تو جنگل کی آگ کی طرح پوری یونیورسٹی میں پھیل جائے گی۔ خرم اس قدر شاک میں چلا گیا تھا کہ اسے یہ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا کہ دوسری طرف وکی کیا بولے جا رہا ہے' بلکہ ہیلو ہیلو کی تکرار کرنے کے بعد فون پر موجود بھی ہے یا بند کر چکا ہے۔
کچھ دیر سکتہ کی عالم میں کھڑے رہنے کے بعد جیسے خرم ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آنے لگا۔
اسے اپنے اعصاب چٹختے ہوئے محسوس ہو رہے تھے' اس نے موبائل کان سے ہٹاتے ہوئے اسے آف کیا اور یہ دیکھے بغیر کہ اس کے والدین اس کے منتظر ہیں کہ وہ بات ختم کر کے آئے تو وہ نمل کے متعلق سلسلہ کلام دوبارہ جوڑیں۔ خرم تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
کمپیوٹر آن کر کے فیس بک میں جاتے ہوئے اس پر عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ سوار تھی۔
زندگی میں کبھی کسی چیز کی اس نے اتنی شدید خواہش نہیں کی تھی جتنی اس پل وکی کی کہی بات غلط نکلنے کی خواہش وہ کر رہا تھا۔
مگر محض چند منٹ میں ہی وہ سارے احساسات شدید قسم کی مایوسی میں تبدیل ہو گئے۔
وہ بے بسی سے کل صبح پیش آئے سانحہ کی مکمل ویڈیو دیکھے گیا۔
پکچر وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں وہ لڑکا آکر جان بوجھ کر نمل سے ٹکراتا ہے۔ پھر نمل کا اسے تھپڑ مارنا اس کے بعد اس لڑکے کا جارحانہ انداز یہاں تک کہ خرم کا آنا اس سے دو' دو ہاتھ کرنا اور پھر نمل کا اس پر ہاتھ اٹھانا خرم کو برا بھلا کہہ کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھنا اور خرم کا اپنی جگہ کھڑے رہ جانا۔
پورا کا پورا منظر عکس بند ہو چکا تھا۔ موی ایسی جگہ سے بنائی گئی تھی کہ ان سب کی شکلیں واضح طور پر نظر

آرہی تھیں اور پھر اس لڑکے کے نمل سے ٹکرانے سے پہلے ہی کسی نے کیمرہ آن کیا تھا جیسے اسے پتا ہو یہاں ابھی ایسا کچھ ہونے والا ہے۔

مووی چل کر ختم بھی ہو گئی، خرم ساکت نظروں سے اسکرین کو دیکھتا رہ گیا۔

اب اس مووی کو دیکھنے کے بعد یونیورسٹی میں اس کی لوگوں کی نظر میں کیا عزت رہ جائے گی۔

کیا مقام ہو گا اس کا؟ خرم حسن کو ایک لڑکی نے تھپڑ مار دیا۔ اور خرم حسن کھڑا دیکھتا رہا۔ بے عزتی اور ذلت کے احساس سے خرم کا سارا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا، اسے لگ رہا تھا غصے کی شدت سے اس کی دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔

اتنے شدید ذہنی تناؤ میں بھی اس کے دماغ نے تیزی سے تانے بانے بننے شروع کر دیے۔

یہ سب کچھ ایسے ہی اچانک اتفاقیہ نہیں ہو گیا، بلکہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہے۔ جس لڑکے نے نمل کو چھیڑا تھا اس کی شکل مووی میں صاف نظر آرہی تھی، پھر بھی وہ شکل ذرا سی بھی جانی پہچانی نہیں لگ رہی تھی۔

ویسے تو یونیورسٹی میں اتنے اسٹوڈنٹس تھے کہ کسی ایک کو نہ جاننا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی، مگر خرم کا وجدان کہہ رہا تھا کہ یہ لڑکا ان کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہی نہیں ہے، اسے صرف اس ڈرامے میں ایکٹ کرانے کے لیے لایا گیا تھا۔

یہ سب کچھ ایک طے شدہ سازش تھی۔ جس کے لیے پہلے سے مووی کیمرہ یا موبائل میں موجود کیمرے کا استعمال کر کے ایسی جگہ کا انتخاب کیا گیا جہاں سے کھڑے ہو کر پورا منظر بمع تمام کرداروں کی شکلوں کے نہایت آسانی اور عمدگی کے ساتھ عکس بند کیا جا سکے۔

اور یہ سب کچھ صرف اور صرف خرم کو ذلیل کرنے کے لیے کیا گیا تھا، کیونکہ اس لڑکے کے اٹھ کر بھاگنے پر ایک پل کے لیے بھی کیمرے نے اسے کیچ کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں جا رہا ہے، اس کے برعکس خرم کے چہرے کے تاثرات فوکس کیے گئے ہیں کہ جب نمل اس کی شان میں قصیدہ گوئی کر رہی تھی تو خرم کے کیا احساسات تھے۔

خرم نے شٹ ڈاؤن کیے بغیر بے اختیار کمپیوٹر کا تار کھینچ کر نکال پھینکا اور کمپیوٹر چیئر پر سے اٹھتے ہوئے غصے سے ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔

یہ سب یقیناً "سمیر کا کیا دھرا تھا۔ خرم نے وکی اور حمید کو آزمانے کے لیے جو کہانی گھڑی تھی وہ کہانی سمیر نے جا کر نمل کو بھی سنا دی۔ مگر ظاہری بات ہے خرم کا اس طرح غنڈے بھیج کر نمل کو پریشان کرنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ چنانچہ وکی اور حمید کی اصلیت کھل جانے کے بعد خرم خاموش ہو کر بیٹھ گیا، مگر سمیر کو یہ خاموشی پسند نہ آئی، تب ہی اس نے اسی خرم کے گھڑے فرضی پلان پر عمل کرتے ہوئے نمل کو چھیڑنے کے لیے جانے کس کو بھیج دیا اور ایسے وقت پر بھیج دیا کہ خرم بھی آس پاس موجود ہو اور یہ سب ملاحظہ فرماتے ہی عین اسی طرح دخل اندازی کرے، جس طرح سمیر نے نمل کو خبردار کرتے وقت بتایا ہو گا۔

اسی لیے مناسب جگہ پر کیمرہ وغیرہ تیار کر کے انہوں نے پورا سین شوٹ کر لیا۔

اگر اس ساری کہانی میں نمل نے خرم پر ہاتھ نہ اٹھایا ہوتا تو سمیر یہ ساری مووی فیس بک میں کبھی نہ ڈالتا، لیکن نمل سے ایسے ہی کسی ردعمل کی توقع کرتے ہوئے تو اس نے یہ ساری سازش رچائی تھی اور نمل نے اس کی توقع پر پورا اترتے ہوئے اتنا جاندار سین فلم بند کرایا کہ اگلے ہی دن سمیر نے یہ ویڈیو فیس بک پر ڈال دی۔

یہ ایک ایسی مووی تھی کہ اس کی شہرت بھی تیزی سے ہونی تھی اور ذہن سے محو بھی آسانی سے نہیں ہونی

تھی۔

خرم تو خرم، نمل کا نام بھی جہاں کہیں یونیورسٹی میں آئے گا اس مووی اور اس تھپڑ کا ذکر لازمی طور پر ساتھ ہو گا۔

جتنا خرم سوچ رہا تھا اس کا غصہ اتنا ہی بڑھتا جا رہا تھا، دل چاہ رہا تھا ابھی اور اسی وقت سمیر کے گھر جا کر اسے قتل کر دے۔

مگر دل کی اس خواہش پر دماغ اسے سختی سے جھڑک رہا تھا، بے عزتی کا بدلہ اگر کسی کو قتل کرنے سے پورا ہوا کرتا تو سب سے پہلا نشانہ تو نمل کو بننا چاہیے تھا، لیکن کسی کو جان سے مار دینے سے تو اس کی تکلیف ایک پل میں ختم ہو جائے گی اور کیا پتا اتنی مظلوم موت مرنے پر اس کے چھوٹے موٹے گناہ ہی معاف ہو جائیں اور خواہ مخواہ وہ شہادت کے درجے پر پہنچ کر سیدھا جنت میں ہی چلا جائے۔

انتقام تو تب پورا ہو گا جب وہ زندہ رہے اور ساری زندگی اپنے کیے پر پچھتائے۔

چنانچہ یہ وقت سمیر سے الجھنے کا نہیں تھا۔ فی الحال اس کی ساری توجہ صرف اور صرف نمل کے معاملے پر ہونی چاہیے تھی۔ دنیا نے اگر یہ دیکھا تھا کہ نمل نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا ہے تو دنیا کو اب یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ اسی شخص کا نمل نے زندگی بھر کے لیے ہاتھ بھی تھاما ہے۔

اور یہ سب اسے جلد از جلد کرنا تھا۔

ایک بار پھر اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا۔ خرم اسکرین پر سرسری نظر ڈالتا موبائل میز پر ہی چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

کیونکہ دوسری طرف ہارون موجود تھا، وہ بھی وہی سب کہنے والا تھا جو وکی نے کہا تھا اور خرم میں دوبارہ وہ سب سننے کی تاب نہیں تھی۔ یقیناً "وکی نے ان سب کو بھی فون کر دیا ہو گا، اس کے سارے دوست اپنے اپنے گھر میں بیٹھے یہ مووی دیکھ رہے ہوں گے۔

اور ابھی تو آغاز تھا، ابھی تو یہ نظارہ نہ جانے کس کس کو دیکھنا تھا، خرم لاکھ چاہتے ہوئے بھی "Whos cares" کہہ کر اپنی جان نہیں چھڑا پا رہا تھا، تب ہی اگلے ہی پل اپنے ماں، باپ کے سامنے کھڑا وہ کہہ رہا تھا۔

"مام آپ آج ہی نمل سے ملنا چاہ رہی تھیں نا۔ آپ کو واقعی آج ہی اس سے مل لینا چاہیے۔ اس کے والدین اس کا کہیں اور رشتہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اگر انہوں نے ایک بار ہاں کر دی تو وہ کبھی اپنی زبان سے نہیں ہٹیں گے اور نمل ان کے سامنے زبان کھولے گی نہیں۔ اس لیے جو کچھ بھی کرنا ہے آپ لوگوں کو کرنا ہے اور فوراً "کرنا ہے، کیونکہ آپ کا بیٹا اسے ہر حال میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے کسی قیمت پر نہیں کھو سکتا۔" خرم کا انداز اور لہجہ اس قدر حتمی اور بے لچک تھا کہ فرقان حسن اور مسز فرقان حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔

اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی اور اس کی سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر فرقان حسن پریشان ہو کر اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے۔

ان کے سامنے ہی تو خرم کا موبائل بجا تھا، جو وہ بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

فرقان حسن یہ ہی سمجھے کہ وہ فون نمل کا تھا اور اس نے ابھی اپنے کسی رشتے کے متعلق بتایا ہو گا۔ تب ہی خرم اتنا جذباتی اور فکر مند ہو گیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ارشاد فرمایا۔

"قیامت کے دن حساب کے لیے بارگاہ الٰہی میں جب پیشی ہوگی تو آدمی کے پاؤں اپنی جگہ سے سرک نہ سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کا سوال نہ کرلیا جائے گا۔

۱ - اول یہ کہ پوری زندگی اور عمر کے بارے میں کہ کن کاموں میں گزاری۔

۲ - اور دوسرے اس کی جوانی (اور جوانی کی قوتوں) کے بارے میں کن مشاغل میں جوانی اور اس کی قوتوں کو بوسیدہ اور پرانا کیا۔

۳ - تیسرے مال و دولت کے بارے میں کہاں سے اور کن طریقوں سے اور کن راستوں سے اس کو حاصل کیا۔

۴ - اور اس دولت کو کن کاموں اور کن راہوں میں صرف کیا۔

۵ - پانچواں سوال یہ ہو گا کہ جو کچھ معلوم تھا اس کے بارے میں کیا عمل کیا۔

(جامع ترمذی۔ معارف الحدیث)

چار باتیں

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ارشاد فرمایا۔

"چار باتیں اور خصلتیں ایسی ہیں کہ اگر تم کو وہ نصیب ہو جائیں تو پھر دنیا (اور اس کی نعمتوں) کے فوت ہو جانے اور ہاتھ نہ آنے میں کوئی مضائقہ ہے اور نہ گھاٹا۔

۱ - امانت کی حفاظت۔

۲ - باتوں میں سچائی۔

۳ - حسن اخلاق۔

۴ - کھانے میں احتیاط اور پرہیزگاری۔

(مسند احمد۔ معارف حدیث)

نذر

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کو یہ فرماتے سنا کہ "نذر دو قسم کی ہے۔ ایک تو وہ نذر جو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کے لیے مانی جائے اس کا پورا کرنا ضروری ہے' اس لیے یہ خاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور دوسری نذر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کے لیے کی جائے' یہ نذر شیطان کے لیے ہے اور اس کا پورا کرنا جائز نہیں اور اس قسم کی نذر کا کفارہ دے جو قسم کا کفارہ دیا جاتا ہے۔"

(نسائی۔ مشکوۃ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا ہے کہ "جو شخص کسی غیر معین چیز کی نذر مانے تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جو شخص کسی گناہ کی نذر مانے اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جو شخص ایسی چیز کی نذر مانے جس کا پورا کرنا اس سے ممکن نہ ہو تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جو شخص ایسی چیز کی نذر مانے جس کو پورا کر سکے تو اس کو پورا کرے۔

(ابوداؤد۔ ابن ماجہ۔ مشکوۃ)

فال

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کو فرماتے سنا ہے۔

"بد شگونی کوئی چیز نہیں ہے۔ بہترین چیز فال نیک ہے۔"

لوگوں نے عرض کیا۔ "فال کیا چیز ہے؟"

آپ نے فرمایا۔ "وہ اچھا کلمہ جس کو تم میں سے کوئی شخص کسی شخص سے یا کسی ذریعے سے سنے۔"

(بخاری و مسلم۔ مشکوۃ)

آئیڈیل بیوی

اسلامی نقطہ نظر سے ایک آئیڈیل بیوی کے اوصاف نہایت جامع اور مختصر الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے یہ بیان فرمائے ہیں۔

"میں تمہیں بتاؤں کہ آدمی کا بہترین خزانہ کیا ہے' نیک بیوی..... جب آدمی اسے دیکھے تو اسے خوشی حاصل ہو' جب کسی بات کا حکم دے تو اس کی اطاعت کرے اور جب وہ کہیں باہر جائے تو اس کے گھر' بچوں اور (ناموس) ہر چیز کی حفاظت کرے۔"

عابدہ حسین شاہ..... فتح جنگ

دانائی

چھوٹا منصوبہ بنانا ہے تو تجارت کرو۔ اس سے بڑا منصوبہ بنانا چاہتے ہو تو باغات لگاؤ۔

اور اگر اس سے بھی بڑے منصوبے کا ارادہ ہے تو نئی نسل کو دانا اور لائق بناؤ۔

صوفیائے کرام

صوفیائے کرام نے مساوات کو اپنایا۔ وہ جانتے تھے کہ جن لوگوں پر اثر ڈالنا ہے۔ ہمیں ویسا بننا پڑے گا۔ اس حد تک کہ وہ سمجھیں یہ شخص ہم میں سے ہے۔ صوفیائے کرام سینکڑوں میل دور وسط ایشیا سے ہندوستان میں آتے تھے' یہاں پہنچ کر سچے دل سے اسے اپنا وطن سمجھتے' پورے طور پر ہمیں اپنا لیتے' ہماری بولی سیکھتے' ہمارا پہناوا پہنتے' ہمارا رہن سہن اپناتے' ہماری رسومات و رواج کو اپناتے پھر وہ ہم سے بات کرتے۔ وہ اس بھید سے واقف تھے کہ جب تک ہم جیسے نہیں بنیں گے' ان کی بات ہم تک نہیں پہنچے گی۔ جب مکمل طور پر ہم میں رچ بس جاتے تو وہ ہماری زبان میں ہماری عوامی کہانیاں لکھتے' ان تصانیف میں وہ ہمارے لیے پیغامات رکھ دیتے تھے۔ ان کی تصانیف اتنی اپنائیت لیے ہوتیں کہ عوام انہیں حفظ کرلیتے پھر تقریبات میں' محفلوں میں لوگ انہیں والہانہ پڑھتے اور سننے والے سر دھنتے۔

صوفیائے کرام نے کبھی اسلام کی تبلیغ نہیں کی تھی۔ انہوں نے کبھی بحث و مباحثے نہیں کیے تھے' انہوں نے کبھی تقریریں نہیں کی تھیں' وہ اسلام کا ڈنکا نہیں بجاتے تھے۔ صرف اسلام کے لیے جیتے تھے۔ ان کے پاس دو ہتھیار تھے' اخلاق اور حسن کردار۔ ان دونوں ہتھیاروں میں مساوات کی دھار تھی' جو لوہے کی دھار سے زیادہ کاٹ کرتی ہے۔

داتا صاحب نے کبھی کسی سائل سے یہ نہیں پوچھا کہ میاں تو ہندو ہے یا مسلمان..... وہ صرف دینا جانتے تھے اور وہ واحد قادر مطلق' جو دینے پر قادر ہے' اپنے چاکر کی لاج رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں میں آدھا لاہور مسلمان ہو گیا۔ متعصب لوگ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے۔ وہ سچ کہتے ہیں لیکن یہ تلوار فولاد کی نہیں' اسلامی کردار کی تھی۔

صاحبو! جان لو کہ مساوات سے زیادہ خطرناک ہتھیار کوئی نہیں ہے۔

(ممتاز مفتی کی تصنیف "تلاش" سے اقتباس)

انتخاب : روزی مہر حیدری..... ڈگری

انسانیت

دنیا میں رہتے ہوئے کچھ لوگ دولت کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور کچھ انسانیت کے حصول میں زندگی صرف کرتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ دولت والے اکثر زندگی میں نامراد ہو کر مرے اور انسانیت والے زندگی کی پیشانی بن کر مر کر بھی جی لیتے ہیں۔

روبینہ ناز..... کراچی

وقت

○ میں اپنے حریفوں پر اس لیے غالب آتا ہوں کہ وہ چند لمحوں کو عموماً "کچھ نہیں" سمجھتے جبکہ میں ان لمحوں کی قدر و قیمت خوب سمجھتا ہوں۔ (نپولین بوناپاٹ)

○ جو لوگ وقت کا سب سے زیادہ غلط استعمال کرتے ہیں، وہی سب سے زیادہ وقت کی کمی کی شکایت کرتے ہیں۔ (برونر)

○ وقت بدل جانے پر لوگوں کی نظریں بھی بدل جاتی ہیں۔ (ڈاکٹر ذاکر حسن)

باتوں سے خوشبو آئے

☆ جب عقل بڑھتی ہے تو باتیں کم ہو جاتی ہیں۔

☆ تھوڑا دینے پر مت شرماؤ کیونکہ خالی ہاتھ واپس کرنا اس سے بھی گری ہوئی بات ہے۔

☆ لوگوں سے اس طریقے سے ملو کہ اگر مر جاؤ تو وہ تم پر روئیں اور زندہ رہو تو تمہاری ملاقات کے مشتاق ہوں۔

☆ سب معاملے تقدیر کے آگے سرنگوں ہیں۔

☆ جسے اس کے اعمال پیچھے ہٹا دیں، اسے اس کا حسب و نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔

کیا تم بھی

کیا تم بھی پھر
شام کی دہلیز پہ اس کی آہٹ پر۔
دروازے کی جانب بھاگے جاتے ہو۔ کیا تم بھی
درد چھپانے کی کوشش کرتے
اکثر تھک جاتے ہو۔ اور بن کارن مسکاتے ہو
کیا تم بھی
نیند سے پہلے پلکوں پر ڈھیروں خواب سجاتے ہو
یا پھر بے خواب چیزوں میں
روتے روتے سو جاتے ہو
کیا تم بھی؟

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

انداز بیاں اور

مصیبت اصل میں یہ تھی کہ مخالف ٹیم کا لمبا تڑنگا بولر خدا جھوٹ نہ بلوائے پورے ایک فرلانگ سے ٹہلتا ہوا آتا، ایک بارگی جھٹکے کے ساتھ رک کر کھنکارتا پھر خلاف توقع نہایت تیزی سے گیند پھینکتا..... اس کے علاوہ حالانکہ صرف دائیں آنکھ سے دیکھ سکتا تھا مگر گیند بائیں ہاتھ سے پھینکتا تھا۔ مرزا کا خیال تھا کہ اس بے ایمان نے یہ چکر دینے والی صورت "انتظاماً" بنا رکھی ہے لیکن ایک مرزا ہی پر موقوف نہیں، کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ گیند کیسے اور کہاں پھینکے گا بلکہ اس کی صورت دیکھ کر کبھی کبھی تو یہ شبہ ہوتا تھا کہ اللہ جانے پھینکے گا بھی یا نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس نے گیند سے اتنے وکٹ نہیں لیے، جتنے پھینکنے کے انداز سے..... بقول مرزا "بولر سے کوئی خائف نہیں ہوتا وہ زیادہ سے زیادہ وکٹ ہی تو لے سکتا ہے، جان تو اناڑی سے نکلتی ہے۔" گیند پھینکنے سے پہلے جب وہ اپنی ڈھائی گھڑی کی چال سے لہراتا بناتا ہوا آتا تو اچھے اچھوں کے بیٹ ہاتھ کے ہاتھ میں رہ جاتے۔

(مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "چراغ تلے" سے اقتباس)

مشعال جنید۔ کراچی

ستم ظریفی

ٹرین کے ڈبے میں ایک صاحب کو سگار سلگاتے دیکھ کر ان کے سامنے والی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے نرمی سے ان سے کہا۔ "تمباکو کے دھوئیں سے میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔"

وہ صاحب ایک گہرا کش لگا کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولے۔ "محترمہ! ایسی صورت میں تو میں آپ کو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ تمباکو نوشی مت کیا کریں۔"

رفعت شمشیر۔ کوئٹہ

یادوں کے دریچے سے

بشریٰ محمود

نائلہ شہزادی، کی ڈائری میں تحریر
علامہ اقبال کی غزل

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

نبیلہ عزیز، کی ڈائری میں تحریر
ایک غزل

اس کو یہ بھی خراج ملتا ہے
شاعروں سے مزاج ملتا ہے

اس کے لہجے میں رنگ و خوشبو کا
اک حسین امتزاج ملتا ہے

آج اک عمر ہو چلی سنتے
آج آتا ہے، آج ملتا ہے

اشک آنکھوں نے یوں سنبھالے ہیں
جیسے لڑکی کو داج ملتا ہے

اک مدت گدائی کرتے ہیں
تب کہیں تخت و تاج ملتا ہے

قسمتیں کیوں نہیں ملا کرتیں
جب کسی سے مزاج ملتا ہے

قدر لازم ہے اس کی ساحر
اس زمیں سے اناج ملتا ہے

حور العین، کی ڈائری میں تحریر
ناصر کاظمی کی نظم

او میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا
جھونپڑی والوں کی تقدیر
بجھا بجھا سا اک دیا
خاک اڑاتے ہیں دن، رات
میلوں پھیل گئے صحرا
زاغ و زغن کی چیخوں سے
سونا جنگل گونج اٹھا
سورج سر پر آ پہنچا
گرمی ہے یا روز جزا
پیاسی دھرتی جلتی ہے
سوکھ گئے بہتے دریا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا
او میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر

فاطمہ حسن کی غزل

کس سے بچھڑی، کون ملا، بھول گئی
کون بُرا تھا، کون تھا اچھا بھول گئی

کتنی باتیں جھوٹی تھیں اور کتنی سچ
جتنے بھی لفظوں کو پرکھا، بھول گئی

چاروں اور تھے دُھندلے دھندلے چہرے سے
خواب کی صورت۔ جو بھی دیکھا بھول گئی

سُنتی رہی میں سب کے دُکھ خاموشی سے
کس کا دُکھ تھا میرے جیسا بھول گئی

بھول گئی ہوں کس سے میرا ناتا ہے
اور یہ ناتا کیسے ٹوٹا بھول گئی

مسکان خان، کی ڈائری میں تحریر

مجید امجد کی نظم

برسوں عرصوں میں اب نیندوں میں جاگے ہیں
خواب، جو جاگتے دِنوں کی آنکھوں میں جیتے تھے
خواب۔ جو کل بیداری میں بھی اپنے نہیں تھے
جواب نیندوں میں بھی اپنے نہیں ہیں
صرف یہ آنسو ہمیشہ سے اپنے تھے
جن میں ان خوابوں کی جوت جلی تھی
کسے خبر کیسی ہیں دُوریوں کی ہی دُنیائیں جو
برسوں عرصوں ہمارے دِلوں میں بعید رہتی ہیں
اور اچانک کبھی ہم اپنی زندگیوں کو
ان کے چمکتے مدار میں پاتے ہیں، پل بھر کو
پل بھر اتنے قریب تک آکر پھر وہ دُوریاں
اپنے سدا کے سفر پہ ہم سے دُور
اور دُور تر ہو جاتی ہیں
اور ہمارے آنسوؤں میں ان کے عکسوں کی
قربتیں بھی دھندلا جاتی ہیں
کیسے ہیں یہ انجمیں قافلے
جن کا پڑاؤ کبھی برسوں عرصوں میں
پل بھر کو روحوں کے ساحلوں پر ہوتا ہے
تو وقتوں کے دریاؤں میں
روشنیوں کے دودھ بہتے ہیں
اور پھر عمر بھر آنکھیں
اپنے آنسوؤں میں ان تسکینوں کو
ترستی رہ جاتی ہیں

ارم، کی ڈائری میں تحریر

انور شعور کی غزل

ٹوٹا طلسم وقت تو کیا دیکھتا ہوں میں
اب تک اُسی مقام پر تنہا کھڑا ہوں میں

یہ کشمکش الگ ہے کہ کس کشمکش میں ہوں
آتا نہیں سمجھ میں، بہت سوچتا ہوں میں

میں اہل تو نہیں ہوں کہ دیکھے کوئی مگر
دُنیا! مجھے بھی دیکھ، ترا آئینہ ہوں میں

اکثر غبارِ فکر جب اُترا دماغ سے
میں دنگ رہ گیا کہ یہ کیا لکھ گیا ہوں میں

مجھ سے نہیں اُسے مرے فردا سے ہے امید
منزل ہے کوئی اور فقط راستہ ہوں میں

کیا فائدہ مجھے جو پلٹ کر جواب دوں
اپنے لیے کہاں ہوں، بُرا یا بھلا ہوں میں

غافل اب اور کیا ہوں کسی سے کہ عمر بھر
آوارگی کی گود میں سوتا رہا ہوں میں

شگفتہ سلیمان

مجھے یہ شعر پسند ہے

شگفتہ خان ______ بھلوال
نہ ہاتھ تھام سکے، نہ پکڑ سکے دامن
بہت ہی قریب سے اُٹھ کر بچھڑ گیا کوئی

سونیا رباني ______ قاضیاں محلہ بالا
وہ کل کے آنے کی مطلق خبر نہیں رکھتا
وہ جی کے ماضی میں باتوں سے حال بنتا ہے

نبیلہ عزیز ______ ڈنگہ گجرات
میں سر جھکا کے کہہ دوں گی اپنے رب کے سامنے
کہ ہزاروں گناہ ہو گئے، تیری رحمت کے نازپہ

عقیلہ حنا ______ رینالہ خورد
آہ! یہ ضبط فغاں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دلاسا، فراموشی نہیں

صبا فضل بٹ ______ رینالہ خورد
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات
کون دیتا ہے محبت کو پرستش کا مقام
تم جو انصاف سے سوچو تو دُعا دو ہم کو

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ
ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے
بہت سے زخم ہیں ایسے جو اُن کے نام کے ہیں
بہت سے قرض سرِ دوستاں ہمارے ہوئے

جاسمہ مریم نوید ______ کراچی
میرے لہو میں کھلے ہیں تیرے ہجر کے پھول
کب آئے ان پہ تیرا موسم وفا دیکھیں
کبھی ہو یوں بھی کہ وہ آئے اور ہم نہ ملیں
کبھی تو اہلِ جفا کا بھی حوصلہ دیکھیں

حرا شاہ ______ شجاع آباد
میری دُعاؤں میں رہتا ہے تیرا وجود
اب اس سے بڑھ کر میرا اعتراف کیا ہوگا

سدرہ وزیر ______ خوشاب، پیل
وہ میری طرح ریاضت تو کرے مرنے کی
وہ میری طرح تمناؤں کو مارے تو سہی
میں پھر ایک ہنستی ہوئی صبح اسے لا کر دوں
رات وہ میرے لیے رو کر گزارے تو سہی

نوشین اقبال نوشی ______ گاؤں بدر مرجان
قربت کی تیری پیاس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں
اک دردِ دل کے پاس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں
تو مجھ کو اپنی ذات سے باہر نہیں ملا
یہ دُکھ بھرا قیاس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں

شمیم صدر دین رحمانی ______ صفدر آباد
ہم سمندر کو بھی جینے کا مزا دیتے ہیں
ہم ہی دریاؤں کی رفتار بنا کرتے ہیں

عظمیٰ غلام نبی ______ کراچی
ہمیں خبر ہے، ہوا کا مزاج رکھتے ہو
مگر یہ کیا، کہ ذرا دیر کو رُکے بھی نہیں

ندا، فضہ ______ کراچی
کاش صندل سے مری مانگ اُجالے آکر
اتنے غیروں میں وہی ہاتھ، جو اپنا دیکھوں
تو مرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر اے جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں

نمرہ، اقرأ ______ کراچی
تو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے اُلجھ جاتی ہیں

سعدیہ، مریم ______ کراچی
خوشبو تو سانس لینے کو ٹھہری تھی راہ میں
ہم بدگمان ایسے کہ گھر کو پلٹ گئے
ملنا۔ دوبارہ ملنے کا وعدہ۔ جدائیاں
اتنے بہت سے کام اچانک نمٹ گئے

طیبہ کرن ______ چمن
اے شوق کی بے باکی وہ کیا تیری خواہش تھی
جس پر انہیں غصہ ہے، انکار بھی حیرت بھی

خوش فہمی

تفریحی مقام پر پہنچنے والے ایک صاحب نے گائیڈ سے تصدیق چاہی۔ "یہ جگہ دمہ کے مریضوں کے لیے اچھی ہے؟"

"جی ہاں..." گائیڈ نے جواب دیا۔ "اور یہاں کی لڑکیاں اتنی بے وقوف ہیں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ان لوگوں کی سانسیں انہیں دیکھ کر تیز ہو رہی ہیں۔"

سائرہ علی خان... کورنگی، کراچی

خوفناک کام

فقیر نے ایک خاتون کو روک کر کہا۔ "اللہ کے نام پر ایک روپیہ دے دو، ورنہ مجھے ایک ایسا خوفناک کام کرنا پڑے گا، جس کے خیال ہی سے میری روح کانپ جاتی ہے، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔"

خاتون نے دہشت زدہ ہو کر فقیر کو ایک روپیہ دے دیا اور ڈرتے ہوئے پوچھا۔

"بتاؤ... وہ کون سا خوفناک کام ہے؟"

فقیر نے جواب دیا۔ "محنت مزدوری۔"

سمیعہ... کراچی

اجازت

دو پادری عبادت کرتے وقت سگریٹ پیے بغیر نہ رہ سکتے تھے مگر ان کا ضمیر انہیں اس پر ملامت کرتا رہتا تھا۔ دونوں نے اس مسئلے کا حل نکالنے کے لیے علیحدہ علیحدہ پوپ کو خط لکھے۔ تین ہفتے بعد جب خط کا جواب آیا تو ایک پادری کو پوپ نے سگریٹ پینے سے منع کر دیا تھا جبکہ دوسرے پادری کو اجازت دے دی تھی۔

انہوں نے اپنے خط نکالے تو ایک پادری نے لکھا تھا۔ "میں جب عبادت کر رہا ہوں تو سگریٹ پی سکتا ہوں؟"

جواب ملا۔ "نہیں۔"

جبکہ دوسرے پادری نے پوچھا تھا۔ "کیا میں جب سگریٹ پی رہا ہوں تم عبادت کر سکتا ہوں۔"

جواب ملا۔ "ہاں۔"

رفیعہ علی... نارتھ کراچی

قابل دید

ایک صاحب ہوٹل میں داخل ہوئے اور پانچ ڈش پلاؤ، پانچ ڈونگہ سالن، بیس چپاتیوں اور دس عدد سویٹ ڈش کا آرڈر دیا۔ ویٹر سارا کھانا لے کر آیا تو انہوں نے تھوڑی ہی دیر میں سب کچھ چٹ کر لیا۔

قریبی میز پر ایک سرکس کا مالک اس عمل کو بڑے تجسس سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ صاحب بل ادا کر چکے تو سرکس والے نے ان سے پوچھا کہ "وہ یہ عمل سرکس شو کے دوران بھی کر کے دکھا سکتے ہیں۔" جواب ملا "کیوں نہیں۔"

چنانچہ سرکس والا انہیں اپنے ساتھ لے گیا اور شائقین کے سامنے اعلان کیا کہ اب ایک خاص آئٹم پیش کیا جائے گا۔ جس میں ایک شخص ایک ہی وقت میں آپ کے سامنے دس آدمیوں کا کھانا اکیلے کھا کر دکھائے گا۔ چنانچہ بہت زیادہ کھانا منگوایا گیا، جسے انہوں نے منٹوں میں صاف کر ڈالا۔ لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔

جب وہ صاحب جانے لگے تو سرکس والے نے ان سے کہا۔

"اب تو یہ بات شہر میں بھی پھیل رہی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اگلے شو کے لیے بھی زحمت اٹھائیں؟" جس پر انہوں نے ہامی بھر لی۔ اگلے شو میں رش نسبتاً زیادہ تھا۔ شو میں پھر انہوں نے اپنے کمال کا مظاہرہ کیا، جس کی لوگوں نے بہت داد دی۔ پیٹو فنکار نے جانے کی اجازت چاہی تو سرکس کے مالک نے منت سماجت کے انداز میں ان سے آخری شو کے لیے بھی رکنے کو کہا۔ جس پر وہ بولا "بھائی صاحب یہ آپ نے مجھے کس کام پر لگا رکھا ہے آخر میں نے گھر جا کر روٹی شوٹی بھی کھانی ہے۔"

سہیلہ خان۔ لاہور

طبی نمک پارے

مریض کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "تمہیں کوئی خاص بیماری نہیں ہے۔ بس روزانہ دو کلو میٹر پیدل چلا کرو۔"

مریض کراہ کر بولا۔ "اور کتنا چلوں ڈاکٹر صاحب... میں چوکیدار ہوں... ساری رات علاقے میں گشت کرتا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

"ڈاکٹر صاحب! کیا میرا آپریشن کامیاب رہے گا۔"

"یہی دیکھنے کے لیے تو میں آپریشن کر رہا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

پروفیسر صاحب نے زیر تربیت ڈاکٹر سے پوچھا۔

"اگر کوئی بچہ حلق میں سکہ پھنسالے تو آپ کیا کریں گے۔"

"سر! میں پولیس والے کو بلا لاؤں گا... وہ لوگ ہر جگہ سے پیسا نکلوا سکتے ہیں۔"

امبر خان... کورنگی، کراچی

ترکیب نمبر 9

موکل نے وکیل سے پوچھا۔ "میرے مقدمے کی سماعت کون سا جج کرے گا؟"

وکیل نے جج کا نام بتایا تو موکل نے کہا۔ "میں جج کو ایک بیش قیمت تحفہ بھیج دیتا ہوں۔"

یہ سن کر وکیل گھبرا کر بولا۔ "ایسا کچھ نہ کرنا، جج نہایت منصف مزاج، اصول پرست اور سخت گیر شخص ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو جج تمہارے خلاف ہو جائے گا اور تم مقدمہ ہار جاؤ گے۔"

مقدمے کی سماعت کئی ماہ جاری رہی اور خلاف توقع موکل کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ وکیل نے اپنے موکل کو مبارک باد دی تو اس نے کہا۔

"جج کے نام بھیجا جانے والا تحفہ کارگر ہو ہی گیا۔"

موکل نے حیرت سے پوچھا۔ "تو کیا تم نے میرے مشورے کے خلاف جج کو تحفہ بھیج دیا تھا؟"

موکل نے چہرے پر معصومیت بکھیرتے ہوئے کہا۔ "میں نے جج کو بھیجے جانے والے تحفے پر اپنے مخالف کا نام لکھ دیا تھا۔"

حمیدہ صغیر... گلشن اقبال، کراچی

کارگر نسخہ

دو سہیلیوں میں شوہر سے حیلوں بہانوں سے پیسے اینٹھنے کی بات ہو رہی تھی۔ ایک نے کہا۔

"مجھے تو جب بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، میں اپنے شوہر کو دھمکی دے دیتی ہوں کہ میں اپنے میکے جا رہی ہوں اور وہ کوئی بحث کیے بغیر مجھے کرائے کی رقم تھما دیتے ہیں۔"

تبسم قیوم... نارتھ کراچی

دوائی

گلی میں کھڑے کھڑے ایک عورت نے اپنی پڑوسن سے بڑی بے چارگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے میاں ادھ مرے سے ہو رہے ہیں، مگر میں انہیں ان کی دوا لا کر نہیں دے سکتی۔"

پڑوسن فوراً ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ "نہیں ابھی اتنی رات تو نہیں گزری، بعض میڈیکوز تو رات، دن کھلے رہتے ہیں۔"

"مگر شراب کی دکانیں تو سب بند ہو جاتی ہیں۔"

خاتون نے بے بسی سے جواب دیا۔

سمیرا علی... لاہور

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

پالک کا رائتا

اجزا:

پالک	بارہ پتے
دہی	آدھا کلو
لہسن	چھ جوے
نمک	حسبِ ذائقہ
مکھن	دو چائے کے چمچے
سفید مرچ	حسبِ ذائقہ
پیاز	ایک عدد
زیرہ (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ	حسبِ ضرورت

ترکیب:

پالک کے پتوں کو گرم پانی میں ایک منٹ ابال کر ٹھنڈے پانی میں رکھ دیں۔ پھر انہیں باریک کاٹ لیں۔ پیاز کو چوکور چھوٹا چھوٹا کاٹ لیں۔ لہسن کے جوے کو بھی باریک کاٹ لیں۔ ایک فرائی پین میں مکھن ڈالیں۔ جب پگھل جائے تو پیاز کو چند سیکنڈ بھون لیں۔ اب پالک ڈال کر تیز آنچ پر پکائیں تاکہ پانی خشک ہو جائے۔ اب لہسن، نمک، کالی مرچ ڈال دیں۔ چند سیکنڈ بھون کر چولھا بند کر دیں پھینٹے ہوئے دہی میں اسے شامل کریں اچھی طرح مکس کریں اور زیرہ ڈالیں ٹھنڈا کر کے نوش فرمائیں۔

کھجور کی چٹنی

اجزا:

کھجور	ایک پاؤ
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
لہسن	ایک پوتھی
سرکہ	ایک پیالی
ہری مرچ	چھ عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ

ترکیب:

کھجور میں سرکہ ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں سرکہ پک جانے پر تمام اجزا مکس کر لیں۔ مزے دار کھجور کی چٹنی تیار ہے۔

انار دانہ کی چٹنی

اجزا:

انار دانہ	125 گرام
پودینہ	آدھی گٹھی
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
لوکاٹ	250 گرام
آلوچہ	60 گرام
املی	30 گرام
پیاز	250 گرام
سرخ مولیاں	ایک گٹھی
ٹماٹر	250 گرام
پسی ہوئی لال مرچ	ایک چمچہ
کالی مرچ	بیس عدد
نمک	حسبِ ذائقہ

ترکیب:

انار دانہ صاف کر لیں۔ دھنیے کی ڈنڈیاں الگ کر دیں۔ لوکاٹوں کو چھیل کر گودا الگ کر لیں۔ املی پانی میں بھگو دیں۔ انار دانے کو باریک پیس لیں۔ پھر اس میں ہرا دھنیا اور پیاز ملا کر پیس لیں اور اس مرکب میں آلوچہ، املی کا گودا، نمک اور پسی کالی مرچ بھی ملا دیں سب چیزوں کو یکجا کر لیں۔ انار دانہ کی چٹنی تیار ہے۔

یاسمین کنول ..... شکار پور

س: ذوالقرنین جی! سائنس نے اس دنیا کو کیا کچھ دیا؟

ج: سائنس نے اس دنیا کی مکمل بربادی کا سامان دیا اور مہلک امراض کے نام جس کا علاج سائنس ابھی تک نہ دے سکی۔

فوزیہ جمیل ..... نامعلوم

س: اگر میں اپنا نام ذوالقرنین رکھ لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟

ج: بے شک آپ اپنا نام ذوالقرنین رکھ لیں مگر میں اپنا نام فوزیہ نہیں رکھوں گا۔ آیا دماغ شریف میں۔

تمکین زیدی ..... کراچی

س: کیا وجہ ہے کہ جب میں چلتی ہوں تو میرے پاؤں ہلنے لگتے ہیں؟

ج: بے بے تمکین ایسا ہی کچھ معاملہ ہے ہمارے ساتھ بھی جب میں بولتا ہوں تو میرے لب ہلتے ہیں۔ آپ خود ہی بتائیے اس کی کیا وجہ ہے۔

یاسمین مرزا ..... سکھر

س: لوگ خیالی پلاؤ تو پکاتے ہیں مگر زردہ نہیں پکاتے؟

ج: زردہ میٹھا ہوتا ہے بی بی اور اس محاورے کا موجد زردہ کے ذائقے سے ناواقف تھا۔

آمنہ فرحانہ ..... کراچی

س: نین جی! آپ نے ابھی تک ہماری بھابھی کا تعارف ہم سے نہیں کرایا۔ آخر کیوں؟

ج: خود میرا ابھی ابھی تک آپ کی بھابھی سے تعارف نہیں ہوا۔

شاہدہ چوہان ..... کراچی

س: میں نے سنا ہے کہ آپ بہت مغرور ہیں؟

ج: قصبہ کے پھپھوں نے اڑائی ہو گی یہ بے پرکی۔

قمر سلطانہ ..... لاہور

س: کم از کم ہمارے خطوط تو نہ ہضم کر جایا کریں ورنہ ہم آپ کو ہی ہضم کر جائیں گے؟

ج: جیتی رہو بھتیجی کیا غضب کا غصہ پایا ہے۔ آخر ہو نا ہمارے گاؤں کی۔

آرزو کنول ..... کراچی

س: وقت کی قیمت کیا ہے؟

ج: وقت وقت کی بات ہے۔ ہمارے زمانے میں روپے کا ایک گھنٹہ ہوتا تھا۔ آج کل کا بھاؤ پتا نہیں۔

نغمانہ ہاشم ..... کراچی

س: کیا آپ کو ڈھنگ سے جواب دینے نہیں آتے؟

ج: آتے ہیں مگر ہم ڈھنگ سے جواب دینا نہیں چاہتے۔

☆ ☆

نگہت سیما

السلام علیکم۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گی۔ کرن میں بہت خوبصورت لکھا جا رہا ہے۔ کئی نام میرے لیے بالکل نئے ہیں لیکن تحریر میں جو پختگی روانی اور برجستگی ہے وہ بتاتی ہے کہ آنے والا کل ان کا ہوگا ان میں سے ہی ایک نام سعدیہ راجپوت کا ہے۔ میں نے ان کی کوئی تحریر "عشق آتش" سے پہلے نہیں پڑھی۔ دراصل میں ترتیب سے نہیں پڑھتی۔ جب فرصت ملتی ہے تب جو میگزین ہاتھ میں آتا ہے اسے پڑھ لیتی ہوں سو کبھی یوں ہوتا ہے کہ دو ہزار گیارہ میں، میں 1998ء کا میگزین پڑھ رہی ہوتی ہوں۔ اس لیے "ادبی سرقے" کا اتنا دیر سے پتا چلتا ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں پاتی اس بار میری ایک دوست نے مجھے سعدیہ راجپوت کی کہانی کی طرف متوجہ کیا۔ پہلی دو تین اقساط پڑھ کر مجھے لگا کہ سعدیہ راجپوت ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے مصنفین میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ اتنی رواں اتنی پختہ تحریر۔ ہر لفظ اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ۔ لیکن اگلی اقساط نے مجھے چونکا دیا صرف چونکایا ہی نہیں بلکہ ایک شاک سا لگا اور بے حد دکھ ہوا۔ میرے تصور میں مستقبل کی عظیم مصنفہ کا خاکہ بکھر گیا۔

98 یا 99 کی بات ہے خواتین یا شعاع میں پرانا ناولٹ چھپا تھا "بار وفا" 2003ء میں' ادارہ "خواتین ڈائجسٹ" نے ہی اسے کتابی شکل میں چھاپا "بارِ وفا" کی کہانی کیا تھی۔ اس کہانی کا مرکزی کردار منصور فاروقی، رابعہ ملک سے محبت کرتا ہے اور رشتے سے انکار پر Hurt ہو کر عالم بے خودی میں گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ اور ایک دن ایک گاؤں میں پہنچ جاتا ہے۔ مولوی ہدایت اللہ زخمی منصور کو اپنے گھر لے جاتے ہیں مرہم پٹی کرتے ہیں۔ بخار کی حالت میں اس کے سر پر پٹیاں رکھتے ہیں وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اعلا خاندان کا یہ شخص مجاز سے حقیقت کی طرف پلٹ رہا ہے وہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ سارا دن پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا انگلی سے الٹی سیدھی ٹیڑھی میڑھی لکیریں بناتا رہتا ہے۔ وہ الوژن کا شکار ہے اسے سرمئی آنچل اور رابعہ ملک کی شبیہ نظر آتی ہے۔ وہ اس شبیہہ کے پیچھے بھاگتا ہے اور وہ گلیوں میں غائب ہو جاتی ہے۔ مولوی ہدایت اللہ کی نظر اس پر ہے۔ وہ اسے خود ہی اللہ یار کا نام دے دیتے ہیں۔ (اللہ یار کی گفتگو اس کی بات چیت۔) وہ مولوی ہدایت اللہ کے سمجھانے پر کہ وہ کوئی ایک راستہ کیوں نہیں اختیار کر لیتا کہتا ہے اور بیٹھا خدا مجھ پر ہنستا ہے میں ایک راستے پر قدم رکھتا ہوں تو دوسرا مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے اس کی طرف لپکتا ہوں تو سرمئی آنچل لہراتی وہ آجاتی ہے اس کے پیچھے لپکتا ہوں تو وہ بند گلی کے پیچھے غائب ہو جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

حادثاتی طور پر خدیجہ کی ذمہ داری اللہ یار پر آپڑتی ہے تو اسے ہنسی آتی ہے کہ میں زنجیریں توڑتا ہوں۔ وہ ڈال دیتا ہے۔ ذمہ داری کا احساس مولوی اللہ یار کو ایک حکیم اور پھر ایک پنساری کی دکان پر ملازمت کے لیے لے جاتا ہے۔

وجدان کی محبوبہ مر چکی ہے لیکن منصور کی زندہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ سعدیہ نے لفظ بہ لفظ نقل کی ہے لیکن انہوں نے منصور' مولوی اللہ یار کا پورا کردار وجدان' عبداللہ کے کردار میں ڈھال دیا ہے۔ میری کہانیوں کے ساتھ پہلے بھی ایسا ہوا۔ لیکن میں نے کبھی خط نہیں لکھا۔ ایک محترمہ نے میرا ناولٹ "ایک تھی علیزہ" صرف ناموں کو بدل کر پورا کا پورا کسی دوسرے ڈائجسٹ میں چھپوا دیا۔ صرف میرا ہی نہیں وہ تو اکثر رائٹرز کے بہترین ناول اپنے نام سے چھپوا چکی ہیں۔ صرف کرداروں کے نام بدل کر معمولی سے رد و بدل کے ساتھ... اس بار خط لکھنے کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ میری دوست نے مجھے بہت مجبور کیا۔ دوسری اور بڑی وجہ خود سعدیہ راجپوت ہیں۔ اتنی پختگی، اتنی رواں تحریر کہیں بھی کوئی جھول نہیں۔ اگر "عشق آتش" کا پہلا حصہ انہوں نے کہیں کسی اور کا نہیں لیا تو... مجھے ان سے صرف یہ کہنا ہے کہ "اللہ نے آپ کو لکھنے کا ہنر دیا ہے۔ آپ کے پاس الفاظ کی طاقت ہے۔ آپ کہانی کا تانا بانا بن سکتی ہیں تو پھر ادھار دوسروں کے کردار لے (مکمل چرا) کر خود کو ضائع مت کریں۔ کسی کہانی کو پڑھ کر کسی نئی کہانی کا خیال آجانا... یا کسی ایک ہی موضوع پر لکھنا غلط نہیں ہے۔ حالات واقعات تو الگ ہوتے ہیں۔ لیکن ایک پورے کردار کو اسی طرح پینٹ کرنا۔ صحیح نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میں اپنی بات کی صحیح طرح سے وضاحت نہ کر پائی ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے افسوس ہے اتنی زیادہ مماثلت پر۔ امید ہے آپ میرا یہ خط چھاپ دیں گی یقین کریں میں تیس سالوں سے لکھ رہی ہوں۔ اور پہلی مرتبہ مجھے اپنا کردار چرائے جانے پر افسوس ہوا شاید میں سعدیہ کی پہلی اقساط پڑھ کر یہ توقع نہیں کر رہی تھی۔ مجھے سعدیہ میں لکھنے کی صلاحیت نظر آتی ہے۔ اللہ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

ج۔ پیاری نگہت! آپ کا خط من و عن شائع کیا جا رہا ہے آپ کے خط کا تسلی بخش جواب سعدیہ راجپوت ہی دے سکتی ہیں تاکہ آپ کی تسلی ہو سکے۔ اور جو غلط فہمی آپ کو یا انہیں ہوئی ہے دور ہو سکے۔

عاشی... فیصل آباد

آپی ابھی پورا رسالہ نہیں پڑھا کیونکہ میرے پیپر ہونے والے ہیں ابھی میں نے اپنی پسندیدہ کہانی "عشق آتش" پڑھی ہے اور دل نے مجبور کیا کہ اس کہانی کے بارے میں اپنی رائے ضرور پیش کروں۔

تو سعدیہ جی! آپ نے کیا خوب لکھا ہے۔ سچ میں رونے پر مجبور کر دیا۔ سعدیہ جی میں بہت جگہ مسکرائی اور بہت جگہ روئی ہوں۔ بہت جگہ تو مجھے یوں لگا کہ وجدان کے الفاظ وجدان کے نہیں میرے ہیں۔ اور میں نے خود کو کبھی ملیحہ میں دیکھا۔ اس کے علاوہ وجدان اور آفاق کی دوستی بیسٹ ہے آفاق نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ قسمت والوں کو اچھے دوست ملتے ہیں۔ آپ نے اس کہانی کا اختتام بہت اچھا کیا ہے مگر ایک بات ہے وہ یہ کہ شایان جیسے بچوں کو ہمیشہ وجدان جیسا شخص نہیں ملتا۔

آپی پلیز اور بھی اچھی کہانیوں کے ساتھ آتی رہیے گا آپ کو معلوم ہے اس کہانی کی آخری قسط پڑھ کر میں ویسے ہی روئی جیسے تانیہ روئی۔ مجھے اتنا دکھ ہوا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔

اس کے علاوہ "گوشۂ عافیت" کو پلیز ختم کریں۔ آپی ساحر لودھی کا انٹرویو بھی شامل کریں۔ میرا خط ضرور شائع کرنا ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا میں پہلے ہی بہت کمزور دل کی ہوں پلیز اچھی آپی پلیز۔

ج۔ پیاری عاشی۔ آپ کا خط شامل اشاعت ہے امید ہے اب آپ کا دل نہیں ٹوٹے گا۔ آئندہ آپ کے تفصیلی تبصرے کا انتظار رہے گا۔

ثمینہ اکرم... بہار کالونی لیاری

قلم اور کاغذ میرے ہاتھ میں ہے اور میں خالی ذہن لیے بیٹھی سوچ رہی ہوں کہ کیا لکھوں؟ میری یہ خود فراموشی کی کیفیت آج "عشق آتش" ناول کی آخری قسط پڑھ کر ہوئی۔ یہ کوئی لفاظی نہیں بلکہ میں اپنے احساسات کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ کیا کوئی کہانی اس حد تک قارئین پر اثر انداز ہو سکتی ہے کہ قارئین خود کو اس کہانی کا حصہ سمجھنے لگیں اور اس کے کردار انہیں آس پاس چلتے پھرتے نظر آئیں۔ اس کی خوشیاں انہیں اپنی خوشیاں لگیں اور اس کرداروں کے دکھ پر وہ افسردہ ہوں۔ اور یہ کام سعدیہ راجپوت نے بہت بہتر طریقے سے کیا کہ اپنے قارئین کو بھی وجدان اور ملیحہ کا اسیر کر لیا۔

اس ناول میں سب ہی کردار "اسیر محبت" رہے۔ ایسی پاکیزہ اور خالص محبت اب ناپید ہے واقعی جو لوگ محبت میں امر ہو جائیں ان ہی کی داستانیں تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اس ناول میں چند ایک اقتباس مجھے بہت پسند آئے اور وہ میری ڈائری کی زینت بن گئے۔

اس قسط کو پڑھ کر میں کچھ اور پڑھنے کے قابل نہ رہی مجھے ہر صفحہ پر ملیحہ اور وجدان کا چہرہ نظر آنے لگا میرے آنکھوں کے سامنے ہر چیز دھندلا گئی۔ آخری قسط پڑھ کر تو مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے کہ میں بھی ملیحہ کے عشق میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ آج پورا دن میں اتنی اداس رہی کہ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ ملیحہ کی موت کا سبب وجدان بنا اور وجدان کی موت کا سبب ملیحہ ٹھہری۔ دونوں کا ملن ہوا اور ان کی روحیں شانتی پا گئیں۔ زندگی میں دونوں نہ مل سکے تو کیا موت کے بعد تو دونوں ایک ہو گئے۔ ویل ڈن سعدیہ جی مگر یہ حقیقت ہے کہ اب تک میں آپ کے ناول کی تعریف درست طریقے سے نہیں کر سکی۔

بیاد محمود ریاض سے "بات سے بات" کالم پڑھا۔ اتنا برجستہ لہجہ اور شگفتہ مزاح۔ یہ مجھے اس قدر پسند آیا کہ

میری آپ سے درخواست ہے کہ اس کالم "بات سے بات" کو کرن میں مستقبل جگہ دیں۔ اس کو پڑھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہم انشاء جی کو پڑھ رہے ہوں۔ شگفتہ بھٹی جی! اس مرتبہ "گوشۂ عافیت" کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ "مجھ سے ملیے" میں آمنہ ریاض سے مل کر ان کی زندگی کے کئی گوشے سامنے آئے۔ "جگن کاظم" سے ملاقات بھی خوب رہی۔ نئی لکھنے والی رائٹرز بھی خوب لکھ رہی ہیں۔ نبیلہ عزیز کا ناول "گوری کرت سنگھار" پڑھا۔ پسند آیا پلیز آپی جی کرن کتاب میں "اعصابی کمزوری" اور "ہڈیوں میں بھربھرا پن" پر معلوماتی مضامین لکھیں۔

اس مرتبہ "کرن پکوان" میں نت نئی سبزیوں کی تراکیب دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔

اتنے مختلف انداز سے مختلف سبزیوں کو پکا کر نیا ذائقہ دینا پسند آیا۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" اس مرتبہ مجھے کوئی شعر پسند نہ آسکا۔ "نامے میرے نام" میں اپنا طویل ترین خط پڑھ کر سیروں خون بڑھ گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ترقی دے ہر قدم پر خوشیاں آپ کا مقدر بنیں (آمین)

سونیا غوری...... ہارون آباد

میں عرصہ آٹھ سال سے کرن کی خاموش قاری ہوں آج جس ناول نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ہے "عشق آتش" واہ واہ سعدیہ جی مجھے الفاظ نہیں مل رہے کہ میں کس طرح اس ناول کی تعریف کروں۔ یا آپ کی تعریف کروں اس ناول کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے اس ناول نے ہمیں اس طرح اپنے سحر میں جکڑا کہ ہمیں ارد گرد کا ہوش نہ رہا۔ سعدیہ جی آپ نے ہمیں کس موڑ پہ لا کھڑا کیا اتنی شدت سے عشق کہ میں اپنے آپ سے ڈرنے لگی۔

اور مولوی صاحب کی باتیں بہت اچھی تھیں۔ رائٹر ایسی باتیں کہاں سے سوچ لیتی ہیں۔ ہر قسط پڑھ کر میں اتنا روئی میں نے کہا چلو اینڈ تو ہیپی ہوگا لیکن نہیں آپ نے تو آخری قسط میں بھی رلا دیا۔ میرے چھوٹے بھائی کو بھی کرن پڑھنے کا شوق ہے۔ وہی لا کر دیتا ہے پلیز بتادیں یہ کتابی شکل میں کب آئے گا کیونکہ میں اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔ ویلڈن سعدیہ جی ویلڈن۔

اب باقی رائٹرز کی تعریف نہ کی تو ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ مجھے نایاب جیلانی، فوزیہ یاسمین، سائرہ عارف، نمرہ بخاری، نمرہ احمد، نبیلہ عزیز، غرضیکہ ساری رائٹرز بہت اچھی لگتی ہیں۔ اب اجازت دیں۔

سعدیہ خان...... لاہور

کرن سے تعلق دس سال سے زائد کا ہے گو کہ اس دوران بہت بار دل کی آواز پہ قلم کو تھامنا چاہا لیکن اس کی شنوائی نہ ہوسکی۔ بے تحاشا کردار راستہ روکے رہے مگر...... پر اب کی بار دل کچھ اس طرح سے بے قابو ہوا کہ کوئی راہ نہ سجھائی دی بجز اس ایک راہ کے......

تیری مت کچی میرا عشق سچا
ویکھ کا تیین ہویا ہڑوک مائے
نصیحت پانی نال پریم نہ اگ بجھدی
استر بجھدا نہ نال پھونک مائے

جی ہاں سعدیہ راجپوت! آپ کی بہت خوبصورت اور دل میں میٹھی سی کسک جگاتی تحریر "عشق آتش" ہی وہ تحریر رہی جس نے سات ماہ ہمارے آتش ذوق کو بڑھائے رکھا۔ عشق و محبت کی وہ رمز جو وجدان کی صحرائے نوردی نے سکھائی، وہ رمز جو ملیحہ کی پر تقدس و پاکیزہ محبت نے سکھائی، اک ایسا عشق تھا کہ جس کا تصور دیا۔ جس نے کہانی کے ہر کردار کو اپنی بنت میں لے رکھا تھا کہیں تشنگی، کہیں پا کر کھو دیتا تو کہیں پر سرور حزن۔ عشق کے چہرے پر کرداروں کی کئی ان مٹ داستانیں کہ جنہیں کھوجنے کی چاہ میں انسان فانی سے لافانی کا سفر کر بیٹھے۔ اتنا خوبصورت انداز تحریر اپنے تھیم سے مکمل ہم آہنگ تھا۔ بظاہر صفحات پہ رقم اس کہانی میں کچھ ایسا بھی تھا کہ جس نے روح کو بے چین کر ڈالا۔ شاید کسی کردار کی لاحاصل مسافت...... بہت مبارکباد سعدیہ آپ کو آپ کی اس خوبصورت کاوش پر۔

آمنہ ریاض سے ملنا بہت اچھا لگا اور تنزیلہ ریاض کی یاد نے در دل پر زور دار دستک دی مستقل سلسلے اچھے تھے "بخت آور" اچھی کاوش تھی اور واقعی وہ بخت آور تھی کہ جو محفوظ ہاتھوں میں تھی ورنہ بخت کی ایسی آوری ہر بار نہیں ہوتی۔ نبیلہ عزیز کا مکمل ناول اچھا لگا۔ عاصمہ ریاض کا افسانہ دل میں ایک بے نام کسک چھوڑ گیا۔

کیا ادارہ کرن ڈائجسٹ کے توسط سے قاری اپنی پسندیدہ مصنفین کو خطوط ارسال کر سکتا ہے۔ جواب ضرور دیجیے گا۔ شکریہ

ج: پیاری سعدیہ! آپ کی تعریف تمام مصنفین تک

ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ مصنفین کو آپ کرن کی معرفت خط لکھ سکتی ہیں۔

ذکیہ نسرین...... لیہ

پہلی مرتبہ "کرن" میں لکھنے کی کوشش کررہی ہوں امید ہے آپ میرا خط ضرور شائع کردیں گی۔ مئی 2011ء کا خوبصورت شمارہ بے حد پسند آیا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے ابھی تک ایک ہی ناولٹ پڑھ سکی ہوں جو مجھے بہت بہت اچھا لگا۔ "بخت آور" روشنی بخاری نے ہم سب کو بہت متاثر کیا ہے امید ہے ایسی تحریر آئندہ بھی پڑھنے کو ملے گی۔

"عشق آتش" کی تعریف میں ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ دوسری مصنفین نے بھی بہت اچھا لکھا۔ آئندہ ماہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

ڈاکٹر سعدیہ زمان...... ملتان

مئی 2011ء کا کرن موصول ہوا ٹائٹل حسب معمول خوبصورت تھا پیلے کلر میں ملبوس حسینہ جس کے ہونٹوں پر مسکان آنکھوں میں کاجل اور ہاتھوں پر مہندی کے خوبصورت ڈیزائن نظر کو بے حد بھلے محسوس ہوئے حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے فیضیاب ہونے کے بعد محمود ریاض صاحب کا کالم پڑھا جس نے ان کی یادیں تازہ کردیں اس کے بعد فہرست کی طرف متوجہ ہوئے ہمیشہ سے "کرن" میں شائع ہونے والے ناولٹ ہی سب سے پہلے پڑھتے ہیں۔ اس مرتبہ صرف ایک ہی ناولٹ تھا جسے روشنی بخاری صاحبہ نے تحریر کیا تھا "بخت آور" کے نام سے شائع ہونے والی یہ اچھوتی تحریر دل کو چھو گئی۔ خصوصاً اس میں شامل محفل کی منظر کشی اور نصرت فتح علی خان کا گایا ہوا خوبصورت کلام مزا دے گیا۔ روشنی بخاری صاحبہ نے سچویشن کے حساب سے اسے بڑے خوبصورت انداز میں استعمال کیا ساتھ ہی ساتھ عابدہ پروین کا گایا ہوا عارفانہ کلام کا بھی بڑا خوبصورت استعمال نظر آیا۔ مجموعی طور پر ناولٹ "بخت آور" زبردست رہا۔ ویلڈن روشنی بخاری، صبا علی احمد اور الماس یاسمین کے افسانے بھی خوبصورت تھے۔

ادارہ کرن کے لیے بہت سی دعائیں۔

تہمینہ بلوچ...... کرم داد قریشی

اس ماہ کا "کرن" دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ موصول ہوا۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت حاصل کرنے کے بعد خوبصورت ناول "دست کوزہ گر" فوزیہ یاسمین اور "در دل" نبیلہ عزیز کی خوبصورت قسط پڑھنے کو ملی وقت مختصر تھا اس لیے افسانے میں "پرانی کہانی" صبا علی احمد ہی پڑھا جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

اس بار ناولٹ میں سب سے بہترین ناولٹ "بخت آور" قرار پایا۔ میری طرف سے اتنی خوبصورت تحریر لکھنے پر ادارے کو اور روشنی بخاری کو مبارک ہو آئندہ بھی روشنی بخاری کے ناولٹ کے انتظار رہے گا۔ نبیلہ عزیز کا ناول "در دل" سست جارہا ہے۔ شگفتہ بھٹی اب آپ ناولٹ "گوشۂ عافیت" کا اختتام کرہی دیں۔ مستقل سلسلے سارے ہی اچھے تھے۔

فوزیہ ثمروٹ...... گجرات

مئی کی چودہ تاریخ کو میں اور فرخندہ رئیس بازار جاکر کرن خرید کر لائے اور جب گھر آکر کرن کو پڑھا۔ میرے تو چودہ کے چودہ طبق روشن ہوگئے بھئی اس شمارے میں ہم تو کہیں نظر ہی نہیں آرہے تھے۔ ستم ہائے ستم۔ صدمے سے کرن کے تمام الفاظ ٹمٹماتے ستارے نظر آرہے تھے دوسرا ہانیہ عمران مجھ سے الگ ناراض۔ پھوپھو آپ نے میرے بارے میں بتایا ہی نہیں۔ بہرکیف کرن کی اس ستم گری کے باوجود خط لکھ رہی ہوں۔ کہ کرن سے محبت کا دعوا ہمیں بھی ہے۔ "نامے میرے نام" میں نئے ناموں کی بھرمار اچھی لگی۔

سرورق کی ماڈل بس ٹھیک ہی لگ رہی تھی۔ اس کی مہندی دیکھ کر ہمارا بھی دل مہندی لگانے کو مچل گیا۔ حسب عادت سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔

ہر کوئی یہاں جو چھوٹا ہے یا بڑا بس لفظوں کی مار مار رہا ہے کر کچھ نہیں رہا۔ کرنا ہوتا ہے تو اس 62 سالوں میں اتنے حکمران بدلے ہر کوئی اپنی مدت حکومت میں کچھ نہ کچھ کرتا تو آج پاکستان کا شمار بہترین ملکوں میں ہوتا ہے۔

انٹرویوز میں "رز کمالی" کی ملاقات اچھی رہی۔ کرن کے تمام نئے سلسلے اچھے لگ رہے ہیں۔ "مجھ سے ملیے" میں آمنہ ریاض کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ اگلی بار "نادیہ امین" سے ملاقات کروا دیں۔ سب سے پہلے سعدیہ

راجپوت کا "عشق آتش" پڑھا۔ اس لازوال داستان کا اینڈ وجدان کی وفات پہ ہی ہونا تھا۔ محبت کی اس کہانی نے بڑا رلایا ہے۔ کیا کوئی مرد وفا میں اس حد تک جا سکتا ہے' وجدان اور ملیحہ ناقابل فراموش کردار ہے۔

مکمل ناول "برگ زرد" اچھا لگا۔ مگر تعبیر جیسے کردار مجھے ذرا اچھے نہیں لگتے۔ محبت کوئی خیرات تو نہیں جو مانگنے سے یا چھیننے سے مل جائے گی۔ کوئی لڑکی اپنے آپ کو اس حد تک گرا سکتی ہے حیرت ہے۔ بہزاد جیسے صاحب کردار حقیقی محبت کے حق دار ہوتے ہیں۔ شکر ہے تعبیر کے ضمیر نے اسے ملامت کی تو بہزاد کی سچائی سامنے آگئی۔

سب سے اچھا نبیلہ عزیز کا ناول "گوری کرت سنگھار" تھا۔ کبھی کبھی بڑوں کی ضدیں بچوں کی خوشیاں نگل جاتی ہیں۔

گوری اور دلاور کی محبت پہ رشک آیا اور گوری کا منفرد اسٹائل بھی کیا مزے تھے۔

"گوشۂ عافیت" کی کمی محسوس ہوئی' اللہ پاک شگفتہ جی کی والدہ صاحبہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین

نازیہ جمال کا افسانہ بہت تلخ تھا۔ یہ این جی او والے اگر ایمان داری سے اپنے فرائض نبھائیں اور غریبوں کی امداد کے لیے جو پیسہ اکٹھے کرتے ہیں انہیں ٹھیک طریقے سے حق داروں کا ان کا حق دیں' تو میرے خیال میں کسی بھی سفید پوش کو ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ رہے۔ مگر ان لوگوں نے تو جو بھی امدادی کام کرنا ہے کیمرہ کی آنکھ کے سامنے کرنا ہے۔

الماس یاسین کا افسانہ "مشعال" میں مشعال کی سمجھ داری بہت اچھی لگی۔ ہر انسان کو اس کی عقل و بساط کے مطابق ڈیل کرنا آجائے تو مشعال جیسی لڑکیاں اپنی ازواجی خوشیاں ڈھونڈ لیتی ہیں۔ صبا علی احمد کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ باقی کرن بہتر سے بہترین ہوتا جا رہا ہے۔ مستقل سلسلے سب ہی لاجواب تھے۔ "یادوں کے دریچے سے" میں ارم اور سدرہ وزیر کی ڈائری اچھی لگی۔

ام کلثوم۔۔۔ سرگودھا

کرن میں یہ میرا پہلا خط ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ "عشق آتش" ہے پہلی قسط سے آخری قسط تک ایک نہ ٹوٹنے والا حصار میرے گرد کھچا رہا ... ایک ایک لفظ میرے لیے آ... اس کے ہر کریکٹر کے ساتھ میں پورے سات ماہ روئی بھی اور ہنسی بھی' خاص کر وجدان کے لیے اس کا خالق حقیقی سے جڑا تعلق بہت پسند آیا۔ واقعی سچی محبت قسمت والوں کو ملتی ہے۔ "ملیحہ فاروقی" جانے کیوں اچھے لوگوں کو اللہ اتنی جلدی اپنے پاس بلا لیتا ہے۔

بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر منہ سے بے ساختہ واؤ نکلتا ہے اور سعدیہ جی ان ہی لوگوں میں سے ہیں۔ بے شک اس سے اچھا اینڈ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے بہت دفعہ قارئین کے خطوط میں پڑھا ہے کہ یہ اینڈ ایسے نہیں ایسے ہونا چاہیے تھا۔ ایک رائٹر جو اپنے کردار تخلیق کرتا ہے ہر اچھے برے کردار کے ساتھ ہنستا روتا ہے ان سے بہتر یہ کوئی نہیں جان سکتا کہ اپنے کرداروں کے ساتھ انصاف کیسے کرنا ہے۔ ابھی فی الحال شمارے کی کسی دوسری چیز کو ہاتھ نہیں لگایا' کیونکہ میں "عشق آتش" کے حصار میں کچھ دن اور رہنا چاہتی ہوں' اس کی خوشبو کو چاروں جانب محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ بہرحال جی۔ سعدیہ راجپوت کو اتنا زبردست ناول لکھنے پر مبارک باد۔ آخر میں بس یہ ہی دعا ہے کہ کرن دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ (آمین)

ام طیفور۔۔۔ گوجرانوالہ

اس ماہ کا "کرن" میں آتے ہی اور کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف سب سے پہلے "عشق آتش" لے کر بیٹھ گئے اور عشق آتش کے بعد خط لکھنے بیٹھ گئے۔ مگر اب سمجھ نہیں آرہی کہ کن الفاظ میں' کیا تعریف کروں' وجدان کی موت نے رلایا بھی ہے پر اس کا مرنا ایک مکمل اختتام بھی ہے۔ پچھلی تمام اقساط میں نور الہدیٰ' وجدان کی پرسنالٹی پر حاوی تھے۔ پر اس آخری قسط میں وجدان بازی لے گیا۔ ابھی صرف "عشق آتش" ہی پڑھی ہے اس لیے دوسرے سلسلوں پہ تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ ان شاء اللہ اگلے خط میں ضرور حاضر ہوں گی۔

پچھلے ماہ میں نے اپنا ایک افسانہ "پس پردہ" ارسال کیا تھا اور گزارش کی تھی جلد از جلد بتا دیجیے گا کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں؟ آپ نے قبول کرلیا کہ نہیں؟ لیکن لگتا ہے کہ ردی کی نذر ہو گیا' کیونکہ اس ماہ کے خطوط میں مجھے اپنا خط بھی نظر نہیں آیا۔ پلیز اب دوبارہ پوچھ رہی ... اور ضرور جواب دیجیے گا۔

ج: پیاری ام طیفور! آپ کا افسانہ شامل اشاعت ... کا انتظار ہے۔